وَلَقَدْ یَسَّرْنَا الْقُرْآنَ لِلذِّکْرِ فَھَلْ مِنْ مُّدَّکِرٍ

شمائل شریف مترجم

جس کا ترجمہ

حضرت حافظ روشن علی صاحبؓ

و

حضرت علامہ میر محمد اسحٰق صاحبؓ

نے کیا

مکتبہ احمدیہ قادیان

لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ

[illegible] اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ

ماہنامہ

ریویو آف ریلیجنز (اردو)

یعنی

دنیا کے مذاہب پر نظر اور اہل مذاہب کا تشحیذ الاذہان

جلد [illegible] | ربیع الثانی ۱۳۶۵ھ مطابق ماہ مارچ ۱۹۴۶ء | عدد ۳

فہرست مضامین

مذہب کیا ہے اور کامل مذہب کیسا ہونا چاہیئے

(از جناب مولوی غلام احمد صاحب بشیر واقف زندگی)

ماہ جون ۱۹۴۵ء میں مجلس انصار سلطان القلم مرکزیہ کے زیر اہتمام مضمون نویسی کا ایک مقابلہ ہوا تھا جس میں مکرم مولوی غلام احمد صاحب بشیر واقف تحریک جدید کا مضمون اوّل رہا۔ جو درج ذیل ہے۔ مولوی صاحب موصوف آجکل انگلستان میں ہیں۔ احباب اُن کے نیز سلسلہ کے دیگر مبلغین کی صحت و عافیت اور کامیابی کے لئے دُعا فرماتے رہیں۔ (ایڈیٹر)

اِس وقت دُنیا علم، سائنس اور فلسفہ و حکمت کی ترقی کے نشہ میں سرشار ہو کر خدا تعالیٰ کو بھول کر اپنے حقیقی مقصد سے دُور جا پڑی ہے۔ مذہب کو علم اور سائنس کی ترقی کی راہ میں روک سمجھا جاتا ہے۔ حالانکہ مذہب علمی ترقی میں سدِ راہ ہونے کی بجائے اس کا ممد و معاون ہے اور انسان کو علمی ترقیات کی طرف توجہ دلاتا ہے۔

(۱) مذہب کیا ہے؟

مذہب کے لغوی معنی

لغت کی رو سے مذہب کے معنی مطلق راستہ کے ہیں۔

اصطلاح — اصطلاح میں مذہب سے مراد:

(۱) بعض لوگوں کے نزدیک مذہب سے مراد وہ اصول و قوانین ہیں جن کے مطابق خدا تعالیٰ کی عبادت کی جائے۔ (دائرہ معارف قرآن)

(۲) بعض لوگوں کے نزدیک اس سے مراد خدا تعالیٰ کی عبادت کے وہ طریق ہیں جو ہر قبیلہ اور ہر قوم اور ہر جماعت کے ممبروں میں مخصوص طور پر رائج ہیں۔ اور ان کی بنیاد اس یقین پر ہوتی ہے جو ان کے افراد میں عام طور پر ہوتا ہے۔ چنانچہ انسائیکلوپیڈیا برٹینیکا میں زیر لفظ ریلیجنز لکھا ہے:-

"Religions by which are meant the modes

of divine worship proper to different tribes, and based on the belief held in common by the members of them severally."

گویا مذہب سے مخصوص عبادت کے طریق مراد ہیں۔

(۳) بعض لوگوں کے نزدیک مذہب سے وہ اصول و قوانین مراد ہیں جو انسان اپنے کسی مقصد کے حصول کے لئے مقرر کر لیتا ہے۔ گویا اس سے مراد دستور العمل ہوتا ہے۔

مگر ان میں سے کوئی تعریف بھی جامع مانع نہیں ہے۔ کیونکہ نہ تو مذہب صرف عبادت کے طریق کا نام ہے اور نہ ہی صرف اصول و قوانین کا بلکہ اس کے علاوہ بھی ہے۔ حضرت مسیح موعود علیہ السلام اور بزرگانِ سلسلہ کی کتب کے رو سے مذہب کی یہ تعریف ہے:۔

"مذہب سے وہ اصول و قوانین مراد ہیں جو اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کی ہدایت و رہنمائی کے لئے اور ان کی پیدائش کا مقصد پورا کرنے کے لئے اپنی مرضی سے اپنے برگزیدہ انسان پر نازل فرماتا ہے۔"

(۲) مذہب کی ضرورت

مذہب ہر انسان کی فطرت میں داخل ہے۔ اور جو چیز فطرتی ہو اس کی ضرورت عیاں ہے۔ کیونکہ فطرت کے خلاف انسان جا ہی نہیں سکتا۔ قرآن مجید نے اس حقیقت کو ظاہر فرمایا ہے:۔

"فاقم وجھک للدین حنیفا۔ فطرۃ اللہ التی فطر الناس علیھا۔ لا تبدیل لخلق اللہ ذلک الدین القیم ولکن اکثر الناس لا یعلمون۔"

یعنی ہم نے دین حنیف پر تمہیں چلایا۔ لہٰذا اس کی طرف پوری توجہ اور کوشش سے راغب ہو جاؤ۔ اور ایسا دین دیا ہے جو عین فطرت ہے۔ اسی پر اللہ تعالیٰ نے ہر انسان کو پیدا کیا ہے۔ اور یہ فطرت اللہ تعالیٰ کی مخلوق ہے اس میں کسی قسم کا تغیر نہیں ہو سکتا۔ یہ دین قیم ہے۔ مگر اکثر لوگ نہیں جانتے۔

آج یورپ کے بڑے بڑے محققین بھی اس کی شہادت دیتے ہیں کہ مذہب انسان کی

فطرت میں داخل ہے۔ چند مثالیں ملاحظہ ہوں :-

(۱) پروفیسر سبیٹر (Sabatier) فلسفۂ دینیہ میں لکھتے ہیں :-

"میں کیوں پابند مذہب ہوں؟ اس لئے کہ اس کے خلاف ہو ہی نہیں سکتا تھا۔ کیونکہ پابندِ مذہب ہونا میری ذاتیات میں ہے۔ لوگ کہیں گے کہ یہ وراثت یا تربیت یا مزاج کا اثر ہے ——— میں نے خود اپنی رائے پر یہی اعتراض کیا ہے۔ لیکن میں نے دیکھا کہ سوال پھر پیدا ہوتا ہے اور وہ حل نہیں ہوتا۔ مذہب کی ضرورت جس قدر مجھکو اپنی ذاتی زندگی کے لئے ہے اس سے زیادہ عام سوسائٹی کو ہے۔ مذہب کے شاخ و برگ کئی دفعہ کاٹ ڈالے گئے ہیں لیکن جڑ ہمیشہ قائم رہی ہے۔ اور اس نے نئے برگ و بار پیدا کر لئے ہیں۔ اسی بناء پر مذہب ابدی چیز ہے جو کبھی زائل نہیں ہو سکتی۔ مذہب کا چشمہ روز بروز وسیع ہوتا جاتا ہے اور فلسفیانہ فکر اور زندگی کے دردناک تجربے اس کو اور گہرا کرتے جاتے ہیں۔ انسانیت کی زندگی مذہب ہی سے قائم ہوئی ہے اور اسی سے قوت پائے گی" (از الحیوۃ سال اول ص۱۵۱)

(۲) مسٹر مینسل (M. Mansel) لکھتے ہیں :-

"We are compelled by the constitution of our minds, to believe in the existence of an Absolute and Infinite Being, a belief which appears forced upon us, as the complement of our consciousness of the relative and finite."

یعنی ہم اپنے ذہنوں کی ساخت کی وجہ سے فطرتی طور پر مجبور ہیں کہ ایک ایسی ہستی پر ایمان رکھیں جو غیر محدود، غنی مطلق اور غیر متناہی وجود ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ اقرار ہمارے نفسوں میں نہایت قوی طور پر مرکوز کر دیا گیا ہے۔ اور یہی وہ عرفان ہے جس کے ذریعہ سے ہمارا متناہی اور محدود اشیاء کے متعلق علم مکمل ہوتا ہے۔ یہ عرفان گویا ہماری فطرتوں میں گاڑ دیا ہے۔

(۳) سر ولیم ہملٹن (Sir William Hamilton) لکھتے ہیں :-

"By a wonderful revelation we are thus, in the very conciousness of our inability to concieve, aught above the relative and finite, inspired with belief in the existance of something unconditioned beyond the sphere of all comprehenciable reality."

یعنی باوجود بخوبی جاننے کے ہم نسبتی اور متناہی اشیاء کے علاوہ دوسری چیزوں کے تعقل کی قابلیت نہیں رکھتے ۔ پھر بھی ہمارے نفسوں میں ایک قادرِ مطلق ہستی کے وجود کا اقرار حیران کن طریق سے الہاماً مرکوز ہے۔

اِن تمام حوالہ جات سے یہ بات صاف ظاہر ہو جاتی ہے کہ مذہب انسان کی فطرت میں داخل ہے۔ اور یہ فطری تقاضا ہے ۔ لہٰذا ضروری ہے کہ اللہ تعالیٰ اس تقاضا کو پورا کرنے کے لئے اپنے کسی بندہ پر الہام نازل کر کے لوگوں کی صحیح رہنمائی کرے ، اور انسان جو خدا تعالیٰ سے طبعی اُنس رکھتا ہے اسے حقیقی عرفان عطا کرے۔

(۲) خدا تعالیٰ نے انسان کی فطرت میں اپنی محبت کی تڑپ رکھدی ہے اور اس کی پیدائش کا مقصد عرفان و معرفت الٰہی مقرر کیا گیا ہے ۔ مگر انسان غفلت اور تفکراتِ دُنیا کی وجہ سے اپنے اس مقصد کو بُھول بھی جاتا ہے اور خدا کی محبت کی جو تڑپ اس کے دل میں رکھی گئی تھی وہ دُنیا کی چیزوں میں لگ جاتی ہے اور اس طرح انسان خدا تعالیٰ سے بہت دُور جا پڑتا ہے ۔ لہٰذا ضروری ہے کہ اللہ تعالیٰ انسان کی رہنمائی کے لئے اپنے رسول بھیجے ۔ جو انہیں صحیح راستہ پر چلائیں ۔ کیونکہ وہ فرماتا ہے انّ علینا للھدٰی ۔

(۳) انسان مدنی الطبع واقع ہوا ہے ۔ مل جُل کر رہنا اور باہم مدد و تعاون سے زندگی بسر کرنا اس کے لئے لابدی اور ضروری امر ہے ۔ مگر طمع ، حرص اور لالچ انسان کو حق و صداقت سے دُور کر دیتا ہے ۔

پس ضروری ہے کہ ایسا قانون ہو اور ایسا ضابطہ ہو جو انسان کو اخلاق کے دائرہ میں رکھے اور اِدھر اُدھر تجاوز نہ کرنے دے ۔ اور ہر انسان کے حقوق محفوظ ہوں ۔ اسے اپنے حقوق کی پامالی کا خوف نہ ہو تا وہ اطمینان کا سانس لے سکے ۔

(۳) مذہب کا مقصد

(۱) انسان کو کامل بنانا (خدا کی معرفت اور عرفان عطا کرنا) چنانچہ حضرت مسیح موعود علیہ السلام فرماتے ہیں:۔

"مذہب کی اصل غرض خدا پر ایسا یقین دلانا ہے کہ وہ نظر آجائے۔ کیونکہ جب تک خدا کی معرفت نہ ہو انسان گناہ کی ہلاکت سے بچ نہیں سکتا۔ اور اس یقین کے حاصل ہونے کی ایک ہی راہ ہے کہ انسان خدا تعالیٰ کے مکالمہ کے ذریعہ سے اس کے خارق عادت نشان دیکھے۔ اور بار بار کے تجربہ سے اس کی جبروت اور قدرت پر یقین کرے۔" (نسیم دعوت)

انسان کے اندر دو قسم کی قوتیں پائی جاتی ہیں:۔

(ا) بہیمی۔ جیسے کھانا پینا، شہوت، حرص و طمع، استیلا و جبر وغیرہ۔

(ب) ملکوتی۔ جیسے غور و فکر، علم و معرفت۔

انسان کی روحانی کامیابی کے لئے ضروری ہے کہ اس کی بہیمی قوتیں ملکوتی قوتوں کے تابع ہو جائیں۔ پس مذہب کی غرض اور مقصد انسان کی بہیمی قوتوں کو ملکوتی قوتوں کے تابع کرنا ہے۔ حضرت مسیح موعود علیہ السلام فرماتے ہیں:۔

"اوّل خدا نے یہ چاہا کہ انسان کو نشست و برخواست اور کھانے اور پینے اور بات چیت اور تمام اقسام معاشرت کے طریق سکھلا کر اس کو وحشیانہ طریقوں سے نجات دیوے۔ اور حیوانات کی اخلاقی حالت جس کو ادب اور شائستگی کے نام سے موسوم کر سکتے ہیں سکھلاوے۔

پھر انسان کی نیچرل عادات کو جن کو دوسرے الفاظ میں اخلاقِ رذیلہ کہہ سکتے ہیں اعتدال پر لاوے تا وہ اعتدال پا کر اخلاقِ فاضلہ کے رنگ میں آجائیں۔"

(۴) مذہب کا اثر

کامل مذہب کا متبع اخلاقِ فاضلہ سے متصف ہونے کے علاوہ حقوق اللہ اور حقوق العباد کو نہایت احسن طور پر ادا کرتا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ اور اس کی مخلوق سے اس کا تعلق

نہایت خوشگوار ہوتا ہے وہ اللہ تعالیٰ کی معرفت اور عرفان حاصل کرنے کے علاوہ بنی نوع انسان سے بھی ہمدردی کرتا ہے اور تمام انسانوں کے لئے مادرِ مہربان کی طرح درد محسوس کرتا ہے۔ ہر چیز کو اس کے مقام پر رکھتا ہے۔ کسی کو عزت اور حقارت کی نظر سے نہیں دیکھتا۔

حضرت مسیح موعود علیہ السلام فرماتے ہیں :۔

"مذہب کی جڑ وہ خداشناسی اور معرفتِ نعماءِ الٰہی ہے اور اس کی شاخیں اعمالِ صالحہ اور اس کے پھول اخلاقِ فاضلہ ہیں اور اس کا پھل برکاتِ روحانیہ اور نہایت لطیف محبت ہے جو رب اور اس کے بندوں میں پیدا ہو جاتی ہے۔ اور اس پھل سے متمتع ہونا روحانی تقدس اور پاکیزگی کا مثمر ہے۔" (سرمہ چشم آریہ صفحہ ۲)

ایک اور مقام پر فرماتے ہیں :۔

"جب تک انسان کی اخلاقی حالت بالکل درست نہ ہو وہ کامل ایمان جو منعم علیہ گروہ میں داخل کرتا ہے اور جس کے ذریعہ سچی معرفت کا نور پیدا ہوتا ہے داخل نہیں ہو سکتا۔ پس سچا موحد بننے کے بعد اخلاقی حالت کی اصلاح کے لئے دن رات کوشش کرنا چاہئے۔" (تقریر حضرت مسیح موعودؑ صفحہ ۲۳ جلسہ سالانہ ۱۹۰۶ء)

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں :۔

"بعثت لاتمم مکارم الاخلاق۔" (مسند احمدؒ) میری بعثت کا مقصد مکارمِ اخلاق کو مکمل کرنا بھی ہے۔ اور فرمایا "احب عباد اللہ الی اللہ احسنہم اخلاقاً" (طبرانی) کہ اللہ کا زیادہ محبوب وہ ہوگا جو زیادہ اچھے اخلاقِ فاضلہ کا اظہار کرے گا۔

پس مذہب کا اثر ہے کہ انسان وحشی سے انسان اور انسان سے با اخلاق انسان اور با اخلاق انسان سے باخدا انسان بن جاتا ہے۔

(۵) مذہب کا نزول۔ خاص افراد پر

مذہب کی حقیقت، ضرورت، مقصد اور اثر بیان کرنے کے بعد یہ بتانا چاہتا ہوں کہ مذہب خاص افرادِ انسانی پر کیوں نازل ہوتا ہے، ہر فرد پر کیوں نازل نہیں ہوتا۔ یاد رکھنا چاہئے کہ خدا تعالیٰ اپنی رحمت اور فضل مختلف وسائل و ذرائع سے اپنے بندوں پر نازل کرتا ہے جس طرح ظاہری نظام میں سلسلہ علت و معلول کا قائم ہے اور کسی ایک چیز کو اپنی رحمت

کو فیضان کرنے کے لئے بطور آلہ قرار دیتا ہے۔ مثلاً جس طرح سورج کے ذریعہ گرمی پہنچا کر دورانِ خون جاری رکھتا ہے اور آنکھوں کے نور کی مدد کرتا ہے۔ اسی طرح روحانی عالم میں بھی خدا نے وسائط اور ذرائع کو استعمال کیا ہے۔ اور روحانی زندگی کے خون کو نوعِ انسان کے تمام اعضا تک پہنچانے کے لئے انسانوں میں سے کسی انسان کو منتخب کرتا ہے جو دل کی طرح طبعاً اپنا کام کرتا رہتا ہے۔ خدا سے حاصل کرتا اور بندوں کو زندگی کا خون پہنچاتا رہتا ہے۔ اور اس ایک فرد کو منتخب کرنے کی وجوہ مندرجہ ذیل ہیں:۔

خاص افراد میں مذہب کے نزول کی وجوہ

(۱) خدا تعالیٰ نے اپنی قدرتوں کے اظہار اور تمدن و معاشرت کے قیام کے لئے انسانوں کو مختلف استعدادیں دیکر پیدا کیا ہے۔ اور ان میں سے بعض کامل استعدادیں رکھتے ہیں اور بعض ناقص اور ادنیٰ درجہ کی۔ اور جس طرح ظاہری طور پر بعض اندھے اور گونگے پیدا ہوتے ہیں اسی طرح قوائے دماغیہ اور انوارِ قلبیہ کا تفاوت ہے اور یہ بھی ظاہر ہے کہ ہر انسان اپنی استعداد اور قویٰ کے مطابق عقل میں، تقویٰ میں اور معرفت میں ترقی کر سکتا ہے۔ لیکن اپنے دائرۂ قابلیت سے زیادہ ترقی نہیں کر سکتا۔ اور الہامِ الٰہی کے مورد ہونے کے لئے کامل الطبائع ہونا ضروری ہے۔ جس طرح ہم ظاہری قانون میں دیکھتے ہیں کہ سورج چمکتا ہے تو جو چیز جتنی سفید اور صاف ہوگی اتنا ہی سورج کی روشنی زیادہ حاصل کریگی۔ اگر شیشہ سورج کے سامنے رکھیں تو اس قدر روشنی حاصل کرکے عکس ڈالتا ہے کہ آنکھیں چندھیا دیتا ہے۔ اور جتنی کوئی چیز غلیظ ہو اتنا ہی کم سورج سے روشنی لیتی ہے۔ پس خدا تعالیٰ سے نور حاصل کرنے کے لئے بھی صفائی قلب کی ضرورت ہے۔ اور مذہب کے مورد ہونے کے لئے کامل انسان کی ضرورت ہے۔ اور سب سے کامل انسان ایک وقت میں ایک ہی ہو سکتا ہے۔ پس اللہ تعالیٰ اس پر اپنا کلام اور الہام نازل کرتا ہے اور اسے تمام انسانوں کے لئے بمنزلہ دل بنا دیتا ہے جو ایک طرف سے لیتا اور دوسری طرف دیتا ہے۔ (زیادہ وضاحت کے لئے براہین احمدیہ حصہ سوم جواب سوال عدا دیکھو)

(۲) تا خدا تعالیٰ کی گوناگوں قدرتوں اور رنگا رنگ صفات کا اظہار ہو۔ اور خدا تعالیٰ کے وجود کا زندہ ثبوت قائم ہو۔ انبیاء اللہ تعالیٰ کی ہستی کا زندہ اور تازہ ثبوت ہوتے ہیں۔ ان کے ذریعہ اس کا عالم الغیب ہونا، قادر و مختار ہونا، سمیع و بصیر اور متکلم ہونے کا ثبوت

...ہیں ثبوت ملتا ہے۔ اور خدا تعالےٰ کی ہستی کا ثبوت اس قدر واضح ہوتا ہے کہ اسکے مقابلہ میں کوئی شبہ نہیں ٹھہر سکتا۔

(۳) تا خدا تعالےٰ اپنے پیارے بندوں کو نوازے اور ان پر انعام و اکرام کرے اور کافروں کو سزا دے۔ کیونکہ بلا امتحان نہ تو کسی کو انعام مل سکتا ہے اور نہ سزا۔ عند الامتحان یکرم المرء او یھان۔ اگر خدا تعالےٰ ہر انسان کو بلا وجہ اپنے مکالمہ مخاطبہ سے مشرف کرے تو مومن و کافر میں تمیز نہیں ہو سکتی۔ جس طرح بلا امتحان پاس اور فیل ہونے والے میں فرق نہیں ہو سکتا۔

پس ان وجوہ کی بناء پر خدا تعالےٰ اپنے بندوں میں سے ایک کو بوقت ضرورت اس کام کے لیے منتخب کرتا رہا ہے۔ اللہ تعالےٰ قرآن مجید میں فرماتا ہے" انّ اللّٰہ یجتبی من الملٰئکۃ رسلاً و من النّاس" کہ اللہ ملائکہ میں سے بھی اور انسانوں میں سے بھی رسول منتخب کرتا رہا ہے اور آئندہ بھی کرتا رہے گا۔ اور کوئی قوم ایسی نہیں گذری جس کی ہدایت و رہنمائی کے لیے اللہ تعالےٰ نے اپنی طرف سے انتظام نہ کیا ہو۔ اللہ فرماتا ہے۔ وان من اُمّۃ الا خلا فیھا نذیر۔ ولقد بعثنا فی کل امّۃ رسولاً۔ کہ کوئی بھی ایسی امت نہیں گذری جس میں اللہ کی طرف سے نذیر اور ڈرانے والا نہ آیا ہو۔ اور ہر امت اور قوم میں ہم رسول مبعوث کرتے رہے ہیں۔

اس وقت دُنیا میں بہت سے مذاہب پائے جاتے ہیں جن کی تعداد بہت زیادہ ہے مگر وہ سب کے سب مخصوص اقوام اور مخصوص ممالک اور مخصوص زمانہ کے لئے آتے رہے اور چونکہ وہ ایسے زمانہ میں نازل ہوتے رہے ہیں کہ ابھی انسان نے ارتقائی منازل طے نہیں کی تھیں، اس لئے وہ مرتبہ کمال پر نازل نہیں کئے گئے۔ بلکہ اُس زمانہ کے لوگوں کی مخصوص ضروریات کو مدنظر رکھکر نازل کئے گئے تھے۔ مگر اسلام ایسے وقت میں آیا جب دُنیا ارتقائی منازل طے کر چکی تھی اور انسانی دماغ اپنی نشوونما میں کامل ہو چکا تھا۔ تب اللہ تعالےٰ نے مکہ کی سرزمین میں اپنا ایک پیارا رسولؐ مبعوث فرمایا۔ جس پر کامل شریعت، کامل قانون اور کامل ضابطہ نازل کیا اور فرمایا الیوم اکملت لکم دینکم و اتممت علیکم نعمتی۔

۲- کامل مذہب کیسا ہونا چاہیئے

اِس وقت دُنیا میں کئی قسم کے مذہب پائے جاتے ہیں۔ جن میں سے قریباً سب کے متبعین یہ دعوےٰ کرتے ہیں کہ ان کا مذہب ہی کامل ہے۔ حالانکہ اُن کی مذہبی کتب اِس دعویٰ کی تصدیق نہیں کرتیں۔ اور طالبِ حق کے لئے کامل مذہب کا پتہ لگانا مشکل ہو گیا ہے لہٰذا ذیل میں وہ امور بیان کرتا ہوں جو ایک کامل مذہب میں پائے جانا ضروری ہیں۔

(۱) اس کی کتاب الہامی اور کامل ہو۔ (۲) بے مثل ہو۔ (۳) محفوظ ہو، انسانی دستبرد سے پاک ہو۔ (۴) جو عقل کے مطابق ہو۔ (۵) عالمگیر ہو۔ (۶) مساوات کا علمبردار ہو۔ (۷) معاشرتی، اقتصادی، تمدنی اور سیاسی مشکلات کا حل پیش کرے۔ (۸) کامل خدا پیش کرے۔ (۹) انسان کو کامل بنا دے۔ (۱۰) کامل نمونہ پیش کرے۔

پس جس مذہب میں مندرجہ بالا باتیں پائی جائیں گی وہی کامل مذہب ہو گا۔ ذیل میں اِن امور کی کسی قدر تشریح کرتے ہوئے بتاؤں گا کہ اِس وقت صرف اسلام ہی ایک ایسا مذہب ہے جس میں یہ خوبیاں پائی جاتی ہیں۔

اسلام ہی ایک ایسا مذہب ہے جس کی کتاب کامل اور الہامی ہونے کی مدعی ہے۔ اور ببانگ دہل اپنے منزل من اللہ ہونے کا اعلان کر رہی ہے۔ الٓمٓ۔ ذلك الكتب لا ريب فيه۔ یعنی اس کو خدا تعالےٰ نے اپنے علم سے اتارا ہے۔ الله نزّل احسن الحديث کہ اس احسن الحدیث کو اللہ نے نازل کیا ہے۔ الٓمٓ۔ تنزيل الكتب من الله العزيز الحكيم۔ کہ یہ کتاب عزیز حکیم خدا تعالےٰ نے نازل فرمائی ہے۔

قرآن مجید یہ بھی دعویٰ کرتا ہے کہ وہ کامل و مکمل ہے۔ چنانچہ فرمایا "اليوم اكملت لكم دينكم واتممت عليكم نعمتي ورضيت لكم الاسلام دينا" کہ دین مکمل کر دیا اور تم پر اپنی نعمت پوری کر دی (کوئی خوبی ایسی نہیں جو باقی رکھی ہو) اور اب تمہارے لئے اسلام کو دین پسند کیا ہے۔ اب کسی نئے قانون کی ضرورت نہیں۔ کسی نئی کتاب اور نئے دین کی حاجت نہیں اسی کے ذریعہ خدا ملے گا۔

پھر قرآن مجید کا یہ بھی دعویٰ ہے کہ اس میں تمام دینی صداقتیں جمع ہیں۔ چنانچہ فرمایا:-

(۱) ما فرّطنا في الكتب من شيء (الجزء ملک) کہ ہم نے اس کتاب میں کسی چیز کی

کیا ہے یعنی ہر دینی صداقت جو انسان کے لئے ضروری تھی وہ اس میں بیان کر دی ہے۔

(۲) یتلو صحفاً مطھرۃ فیھا کتب قیمۃ (الجز ءعمّ) قرآن مجید میں تمام وہ صحیفے جو نوع انسان کی ہدایت کے لئے وقتاً فوقتاً نازل ہوتے رہے ہیں ہم نے جمع کر دیئے ہیں۔ اور ان تمام صحائف میں جس قدر دینی صداقتیں تھیں وہ سب اس میں بیان کر دی ہیں۔

(۳) وکل شیء فصلناہ تفصیلاً (الجز ء ۱۵) ہر چیز کو ہم نے کھول کھول کر بیان کیا ہے۔ ضروریاتِ دینی میں سے کوئی بھی ایسی ضرورت نہیں جس کو ہم نے پورا نہ کیا ہو۔

(۴) انزلنا علیک الکتٰب تبیاناً لکل شیءٍ وّھدًی وّرحمۃ وبشرٰی للمسلمین۔ ہم نے تجھ پر (اے رسول) ایسی کتاب نازل کی ہے کہ ہر ضروری امر کا ذکر کرتی ہے۔ اور وہ مسلمانوں کے لئے موجبِ ہدایت، رحمت اور خوشخبری ہے۔ اب انہیں کسی نئے قانون کی ضرورت نہیں کسی نئے لائحہ عمل کے تجویز کی فکر نہیں۔ ان کی روحانی اور جسمانی ترقیات کے لئے یہ کتاب کافی ہے۔

یہ صرف دعویٰ ہی نہیں بلکہ واقعہ میں بھی کوئی ایسی ضرورت پیش نہیں آتی جس کو یہ کتاب پورا نہ کرتی ہو۔ معاشرتی ہو یا اقتصادی۔ تمدنی ہو یا سیاسی۔ دُنیاوی ہو یا روحانی ہر مقصد کے پورا کرنے اور ہر ضرورت کو پورا کرنے کے لئے یہ کتاب کافی ہے۔ چنانچہ مخالفین اسلام بھی اس کی شہادت دیتے ہیں۔

(۱) مسٹر کارلائل لکھتے ہیں:۔

"میرے نزدیک قرآن کے تمام معانی میں سچائی کا جوہر موجود ہے۔ یہ کتاب سب سے اوّل اور سب سے آخر جو خوبیاں بیان ہو سکتی ہیں اپنے اندر رکھتی ہے۔ بلکہ دراصل ہر قسم کی توصیف اس سے ہو سکتی ہے۔"

(۲) مسٹر گبن نے لکھا ہے کہ:۔

"قرآن کو مسلمانوں کا ایک عام مذہبی، تمدنی، ملکی، تجارتی، قومی قانون اور دیوانی و فوجداری وغیرہ کا ضابطہ کہہ سکتے ہیں۔ وہ ہر ایک امر پر حاوی ہے۔ مذہبی عبادات سے لیکر رات دن کے کاروبار، روحانی نجات سے لیکر صحتِ جسمانی جماعت کے حقوق سے لیکر حقوقِ افراد۔ اخلاق سے لیکر جرائم اور دُنیوی سزا سے

لیکر دینی سزا و جزا وغیرہ تک کے تمام احکام قرآن میں موجود ہیں۔ اسی سبب سے قرآن اور بائیبل دو مختلف چیزیں ہیں ؛

پس قرآن مجید نہایت کامل و مکمل کتاب ہے۔ اور چونکہ کامل مذہب کے لئے کامل کتاب کا ہونا ضروری ہے اس لئے اسلام کامل مذہب ہے۔

(۲) "بے مثل کتاب کا ہونا کامل مذہب کیلئے ضروری ہے"

کامل مذہب وہ ہوگا جس کی کتاب بے مثل ہو اور انسانوں میں سے کوئی انسان اسکی مثل نہ بنا سکے۔ کیونکہ خدا تعالےٰ کی پیدا کی ہوئی ہر چیز بے مثل ہوتی ہے۔ اور دُنیا کا بڑے سے بڑا سائنسدان ، آرٹسٹ اور صانع اس کی مثل لانے سے قاصر ہوتا ہے۔ پس کامل مذہب کے لئے ضروری ہے کہ بے مثل کتاب پیش کرے تا خدا کی ہستی پر دلیل ہو۔ اور معرفت و عرفان کا موجب ہو کیونکہ اس کے بغیر عرفان کا حصول ناممکن ہے۔

اس اصل کے مطابق جب ہم مذاہب عالم پر غور کرتے ہیں تو ان میں سے کوئی مذہب بھی ایسا نہیں پاتے جو یہ دعوے کرتا ہو کہ اس کی کتاب بے مثل ہے۔ اور پھر وہ کتاب خود بھی یہ دعوے کرے اور مخالفین کو مقابلہ کے لئے بُلائے۔ صرف اور صرف اسلام ہی ایسا مذہب ہے جس کی کتاب خود اپنے بے مثل ہونے کا دعویٰ کرتی اور مخالفین اسلام کو ہر ممکن طریق سے مقابلہ کے لئے آمادہ کرتی ہے۔

قرآن مجید نے پانچ جگہ یہ چیلنج دیا ہے:۔

(۱) ایک جگہ سارے قرآن کی مثل لانے کا چیلنج ہے (بنی اسرائیل غ) فرمایا۔ قُلْ لَئِنِ اجْتَمَعَتِ الْاِنْسُ وَالْجِنُّ عَلٰٓی اَنْ یَّاْتُوْا بِمِثْلِ هٰذَا الْقُرْاٰنِ لَا یَاْتُوْنَ بِمِثْلِهٖ وَلَوْ كَانَ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ ظَهِیْرًا ۔ کہ اگر تم اس کو انسان کی بنائی ہوئی کتاب کہتے ہو تو تم اس کی مثل مل کرلے آؤ۔ مگر یاد رکھو کہ تم جن و انس مل کر بھی اس کی مثل نہیں لاسکو گے۔ اس جگہ بحیثیت مجموعی بطور ضابطہ قرآن مجید کو پیش کیا گیا ہے کہ دینی و دُنیاوی اُلجھنوں کو دُور کرنے کے لئے اس جیسی کوئی کتاب پیش کرو۔

(۲) ایک جگہ دس سورتوں کی مثل کا چیلنج کیا (ہود) فَاْتُوْا بِعَشْرِ سُوَرٍ مِّثْلِهٖ۔

(۳) دو جگہ ایک ایک سورۃ لانے کا۔ (یونس ع۔ بقرہ ع)

(۲) ایک جگہ ایک بات کی مثل لانے کا چیلنج ہے۔ (طور ع۲) فلیاتوا بحدیث مثلہ ان کانوا صادقین (علم غیب کے متعلق)

باوجود اس چیلنج پر قریبًا پونے چودہ سو سال گذرنے کے آج تک کسی کو جرأت نہیں ہوئی کہ اس کی مثل بنائے۔ سب مخالفینِ اسلام نے زبانِ حال سے یہ ثابت کر دیا ہے کہ قرآن مجید بے مثل و مانند ہے۔ چنانچہ گبن نے لکھا ہے :-

"حقیقت یہ ہے کہ محمد کی شریعت سب پر حاوی ہے۔ وہ اپنے تمام احکام میں بڑے بڑے شہنشاہ سے لیکر چھوٹے چھوٹے فقیر و گدا تک کے لئے مسائل و احکام رکھتی ہے۔ یہ وہ شریعت ہے کہ ایسے دانشمندانہ اصول اور عظیم الشان قانونی انداز پر مرتب ہوئی ہے کہ سارے جہان میں اس کی نظیر نہیں مل سکتی۔"

(۳) کامل مذہب کے لئے ضروری ہے کہ اسکی کتاب محفوظ ہو

کامل مذہب کے لئے ایک یہ بھی ضروری امر ہے کہ اس کی کتاب بے مثل اور کامل ہونے کے علاوہ محفوظ اور تغیر و تبدل سے پاک ہو۔ اور انسان اس میں اپنی طرف سے کوئی بات زائد یا کم نہ کر سکے۔ مگر دنیا کے موجودہ مذاہب میں سے کسی مذہب کی کتاب بھی اس بات کی مدعی نہیں کہ وہ محفوظ ہے اور اس میں انسانی ہاتھ تصرف نہیں کر سکتا۔ اسلام ہی ایک ایسا مذہب ہے جو ایسی کتاب پیش کرتا ہے کہ انسانی ہاتھ اس میں تصرف نہیں کر سکے اور نہ کر سکیں گے وہ نہایت محفوظ اور غیر محرف و مبدل کتاب ہے۔ چنانچہ اللہ تعالےٰ نے فرماتا ہے :-

"انا نحن نزلنا الذکر وانا لہ لحافظون" کہ ہم نے ہی اس کتاب کو نازل کیا ہے اور ہم ہی اس کے محافظ ہوں گے۔ وانہ لکتب عزیز لا یاتیہ الباطل من بین یدیہ ولا من خلفہ۔ یہ نہایت عزیز کتاب ہے اس میں کسی طریق سے بھی باطل راہ نہیں پا سکتا۔"

آج یورپ کے محققین بھی اس امر کا اقرار کرتے ہیں کہ قرآن مجید غیر محرف و مبدل کتاب ہے۔ اور جس طرح اور جس حالت میں نبی اکرم ؐ نے لوگوں کے سامنے پیش کی تھی اسی طرح

اب بھی محفوظ ہے۔ چنانچہ ذیل میں بعض کے اقوال درج کئے جاتے ہیں۔

(۱) سر ولیم میور لکھتے ہیں:۔

"دنیا کے پردے پر غالباً قرآن کے سوا کوئی اور کتاب ایسی نہیں جو بارہ سو سال کے طویل عرصہ تک بغیر کسی قسم کی تحریف تبدیل کے اپنی اصلی صورت میں محفوظ رہی ہو۔ ہماری اناجیل کا مسلمانوں کے قرآن کے ساتھ مقابلہ کرنا جو بالکل غیر محرف و مبدل چلا آتا ہے دو ایسی چیزوں کا مقابلہ کرنا ہے جن میں آپس میں کوئی بھی نسبت نہیں۔" (دیباچہ لائف آف محمدؐ ص۲۱)

(۲) پھر سر مذکور لکھتے ہیں:۔

"There is otherwise every security internal and external that we possess the text which Mahammad himself gave forth and used." (دیباچہ لائف آف محمدؐ)

ہمارے پاس اِس بات کی اندرونی اور بیرونی ضمانت موجود ہے کہ موجودہ قرآن وہی ہے جو حضرت محمدؐ نے دُنیا کے سامنے پیش کیا تھا اور آپ استعمال کرتے تھے۔

(۳) نولڈکے جرمن مستشرق لکھتے ہیں:۔

"آج کا قرآن بعینہٖ وہی ہے جو صحابہ کے وقت میں تھا۔۔۔ یورپین علماء کی یہ کوشش کہ قرآن میں کوئی تحریف ثابت کریں بالکل ناکام رہی ہے۔"

(انسائیکلوپیڈیا برٹینیکا۔ زیر لفظ قرآن)

پس اسلام کامل مذہب ہے۔

"تفصیل الخطاب فی التحدی عن اھل الکتاب"
یعنی
کتب اہل کتاب اور انکی روایات

(از جناب مولانا تاج الدین صاحب لائلپوری)

قرآن مجید، احادیث اور معقولی دلائل کی تائید مزید میں جب واقعہ صلیب مسیح علیہ السلام کے متعلق انجیل سے بھی حوالہ پیش کیا جاتا ہے تو ہمارے مخالف کہہ دیتے ہیں کہ کتب اہلِ کتاب (تورات و انجیل وغیرہ) تو "محض جعلی" اور اُن کے بیانات مطلقاً ناقابلِ اعتبار ہیں؛ اس لئے اُن سے دلیل پکڑنا غلط ہے۔ چنانچہ مولوی ابراہیم صاحب میر سیالکوٹی لکھتے ہیں "یہ متحقق ہو چکا ہے کہ یہ کتابیں محض جعلی ہیں اور ان کے بیانات ہرگز قابلِ وثوق نہیں ہیں"
(شہادۃ القرآن ص۵)

پھر حاشیہ ص۱۵ پر لکھتے ہیں "نہ تو یہ کتابیں معتبر ہیں اور نہ ان کے بیانات قابلِ اعتبار ہیں" حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ ہم اِن کتب کو بطور اصل و بُنیاد ہرگز پیش نہیں کرتے اور نہ ہمارے کسی دعوے کا بالاستقلال یہ موقوف علیہ ہیں اور نہ ہم ان کی یہ حیثیت مانتے ہیں، بلکہ بطور تائیدِ مزید ہم اِن کتب کا حوالہ دیتے ہیں۔ اور ظاہر ہے کہ ایسا کرنا ہرگز ممنوع اور حرام نہیں ہے۔ اور ہمیشہ سے اہلِ اسلام کا یہ طریق چلا آیا ہے۔ نواب صدیق حسن خاں اکسیر ص۲۶ پر لکھتے ہیں کہ راسخ در ایمان مسلمانوں کے لئے اِن کتب کا مطالعہ اور حوالہ دینا وغیرہ جائز ہے۔ چنانچہ ائمہ سلف و خلف کا طریقِ عمل اس پر شاہد ہے۔ دلالت میکند براں نقل ائمہ قدیماً و حدیثاً از تورات و الزام ایشاں بتصدیق محمد صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم باستخراج از کتابِ ایشاں" اور مولوی ثناء اللہ صاحب نے ولادت مسیح بن باپ کے ثبوت میں انجیل کی شہادت بھی ذکر کی ہے۔ تفسیر ثنائی جلد ۲ صفحہ ۱۳ حاشیہ ص۳ اور جلد ۴ صفحہ ۱۲۹ پر معجزہ ید بیضاء و عصا کے لئے تورات موجودہ کا حوالہ دیا ہے۔ بلکہ بعض صحابہؓ بھی اہلِ کتاب سے نقل کرتے تھے۔

اور اُن سے بڑھکر تابعین ایسا کرتے رہے ہیں۔ (تفسیر القرآن جلد ۲ صفحہ)

ہاں جس صورت میں قرآن مجید اور احادیث صحیحہ مرفوعہ کی تصریحات کے خلاف کتب اہل کتاب کا بیان ہو تو وہ یقیناً مردود اور مطرود ہے۔ لیکن جب ان کے خلاف نہ ہو تو پھر اُسے قبول کرنا عند الشرع قطعاً ناجائز نہیں ہے۔

کہا گیا ہے کہ یہ کتب چونکہ محرّف و مبدّل ہیں اس لئے ان کا کوئی حوالہ پیش نہیں کیا جا سکتا۔ مگر یہ خیال سرے سے باطل اور عدم تدبر کا نتیجہ ہے کیونکہ اِن میں تحریف و تبدیلی سے یہ لازم نہیں آتا کہ اِن میں کوئی مضمون اور کوئی بات بھی صحیح، درست اور الہامی نہیں وہذا اظہر من الشمس فی نصف النہار۔ چنانچہ علاوہ علماء سلف کے زمانہ حال کے اُن علماء نے بھی کہ جن کو عیسائیوں سے مناظرات کے اثناء میں اِس مسئلے پر کچھ لکھنا پڑا ہے یہ تسلیم کیا ہے کہ اِن کتب میں اصلی مضامین اور احکام خداوندی بھی موجود ہیں "جعلی محض" نہیں ہیں۔ چنانچہ

(۱) مولینا محمد علی صاحب مونگھیری لکھتے ہیں:۔

(اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں) توریت کی نسبت یہ فرمایا ہے کہ اس میں حکم الٰہی ہے نصیحت ہے، حضرت محمد مصطفےٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام کی بشارت ہے، بنی اسرائیل کے لئے نور ہے، ہدایت ہے۔ اور یہ بھی فرمایا ہے کہ اہلِ کتاب کے پاس ہے۔ اب انصاف اس کا مقتضی ہے کہ جو کتاب یہود و نصاریٰ کے پاس ہے اور اس میں اوصاف مذکورہ پائے جاتے ہیں اس کو یوں کہہ سکتے ہیں کہ یہ توریت کے مضامین ہیں"۔ (پیغام محمدی صفحہ ۱۲)

پھر صفحہ ۱۶ پر لکھتے ہیں:۔

"الغرض توریت خود اس بات کی شہادت دیتی ہے کہ اس میں خالص الہامی کلام حضرت موسیٰ کا نہیں ہے بلکہ دوسرا کلام بھی خلط ہو گیا ہے"

اور صفحہ ۱۷ پر ہے:۔

"حضرت موسیٰ کی الہامی تحریر خالص نہ رہی بلکہ اس میں غیر الہامی تحریر بھی مخلوط ہو گئی"

پھر لکھتے ہیں:۔

"قرآن مجید کی تصدیق سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ بیشک اِن کتب عہد عتیق و جدید

کلام الٰہی ہے۔ پیغام محمدی صفحہ ۳)

اور صفحہ پر انجیل مرقومہ میں بھی الہامی کلام اور مضامین کا ہونا تسلیم کیا ہے۔ پھر اپنی کتاب "آئینہ اسلام" میں لکھتے ہیں:۔

(ہم) مسلمان یہ کہتے ہیں کہ جس کلام الٰہی پر ہم اعتقاد رکھتے ہیں اسکا مضمون بیشتر اس مجموعہ عہد عتیق و جدید میں پایا جاتا ہے۔" (صفحہ)

اور صفحہ پر لکھا ہے:۔

"ہم ان کتابوں (عہد عتیق و جدید) کی حرمت اس قدر ضروری سمجھتے ہیں جسقدر اُس کتاب کی ہونی چاہئے۔ جس میں خدا کا پاک کلام ملا ہوا ہے"

اور کتاب "دلائل حقانی" کے حاشیہ صفحہ ۹ میں لکھتے ہیں:۔

"قرآن مجید اور توریت مقدس دونوں کا حوالہ اس لئے دیا ہے تاکہ معلوم ہو جائے کہ اس مضمون میں قرآن مجید اور توریت بالکل مطابق ہیں۔ اس سے کامل طور سے ظاہر ہے کہ توریت کا یہ مضمون تحریف سے پاک ہے . . . . قرآن مجید سے ظاہر ہے کہ جس طرح قرآن مجید خدا کی پاک کتاب ہے اُسی طرح توریت و انجیل بھی خدا کی کتابیں ہیں"

اور صفحہ ۱۱ پر لکھتے ہیں:۔

"میں نے توریت کا حوالہ یہاں اس لئے دیا ہے تاکہ معلوم ہو جائے کہ یہ بات تمام انبیاء سابقین سے لیکر حضرت محمد مصطفےٰ صلے اللہ علیہ وسلم تک یکساں مانی گئی ہے اور اس مقام پر تحریف کا الزام بھی نہیں ہو سکتا کیونکہ قرآن مجید میں جس طرح کتب سابقہ کی تحریف کا دعوےٰ کیا ہے اسی طرح یہ بھی فرمایا ہے کہ یہ آخری کتاب مقدس کتب سابقہ کی مصدق اور مہیمن یعنی محافظ ہے۔ اس لئے جو مضمون توریت کا قرآن کریم کے مطابق ہے وہ بالیقین توریت مقدس کا مضمون ہے۔ اس میں تحریف کا گمان نہیں ہو سکتا"

(۴) مراسلات مذہبی میں (جس کے مضامین دراصل مولوی صاحب موصوف کے ہیں مگر چھپے شیخ صاحب کے نام پر ہیں) شیخ مولا بخش صاحب لکھتے ہیں:۔

"اس میں ایسا شبہ نہیں ہے کہ اس (بائیبل) میں کلام الٰہی مخلوط ہے" (صفحہ حصہ اوّل)

(۳) مولینا عبدالحق صاحب محدث دہلوی مفسر تفسیر حقانی لکھتے ہیں :-

"اس قدر ہم بھی مانتے ہیں کہ ان میں (اناجیل) میں کچھ مضامین الہامی ماخوذ ہیں"

مقدمہ تفسیر حقانی ص۱۷۱ اور ص۱۷۲ پہ ہے :-

"پس یہ کتاب جو موسیٰؑ کے بعد میں تصنیف ہوئی اور کچھ مضامین تورات الٰہی کے یادداشت کے طور پر اس میں درج کر کے تورات نام رکھا گیا ...... اسی طرح وہ کتابیں کہ جو حضرت عیسیٰؑ کے بعد لوگوں نے تصنیف کی ہیں اور اُن میں حضرت عیسیٰؑ کے حالات و اقوال کو صحیح و غلط طور پر جمع کر دیا ہے کہ جس کو اب عیسائی انجیل متی و مرقس و لوقا و یوحنا کہتے ہیں ..." انتہیٰ

پھر لکھا :-

"نزولِ قرآن مجید کے وقت ...... اصل تورات و انجیل کے صدہا احکام اور بے شمار باتیں اہل کتاب میں زبانی یا ان فرضی کتابوں کے وسیلے سے مشہور و معروف تھیں۔" (ص۱۸۱)

(۴) مولوی ثناء اللہ صاحب لکھتے ہیں :-

"کچھ شک نہیں کہ کتب سابقہ (توریت و انجیل) ناقل اپنی ہیئت اور ترتیب سے صاف بتا رہی ہیں کہ ان میں الہامی نوشتوں کے ساتھ بہت سا حصہ غیر الہامی بھی ہے۔" (کتاب الرحمٰن ص۵)

اور ص۵۲ پر لکھتے ہیں :-

"جس مضمون کی قرآن تصدیق کرے وہ درست اور جس کی تکذیب کرے وہ غلط۔"

(۵) شیخ الاسلام حافظ مولوی محمد انوار اللہ صاحب معین المہام امور مذہبی و صدر الصدور صوبہ جات دکن لکھتے ہیں :-

"جتنے امور ہمارے خدا اور رسولؐ نے فرما دیئے ہیں گو یہود کے بھی وہ اعتقاد ہوں ان سب کو ہم مانتے ہیں۔ کیونکہ ہمارا قرآن تورات و انجیل کا مصدق ہے جیسا کہ حق تعالیٰ فرماتا ہے۔ ولما جاءهم كتاب من عند الله مصدق لما معهم۔ اور ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے یہود کے بعض اقوال کی تصدیق بھی کی ہے۔ چنانچہ اس حدیث شریف سے ظاہر ہے جو بخاری شریف میں ہے کہ

ایک عالم یہود کا حضرت کی خدمت میں حاضر ہوکر عرض کیا کہ ہماری کتاب میں یہ ہے کہ حق تعالیٰ قیامت کو تمام آسمانوں کو ایک انگلی پر اور زمینوں وغیرہ کو ایک ایک انگلی پر رکھ کر فرمائے گا کہ میں ہی بادشاہ ہوں۔ یہ سن کر آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم ہنسے۔ جس سے تصدیق اس عالم کی ہوتی تھی۔ پھر حضرت نے یہ آیت پڑھی۔ والارض جمیعاً قبضته یوم القیٰمة۔ الحاصل ہمارے قرآن اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے یہود کی جن جن باتوں کی تصدیق کی ہے ان کی تصدیق کرنے میں ہمیں کوئی عار نہیں۔" (ازالۃ الاوہام حصہ دوم ص۲۵۲)

(۶) مولوی ثناء اللہ صاحب لکھتے ہیں:۔

"موجودہ تورات و انجیل باوجود یکہ ہماری مسلمہ اور مقبولہ نہیں تاہم حقیقت ان میں ہے۔ اسی حقیقت کے لحاظ سے قرآن مجید نے ان کی تصدیق کی ہے۔"

نیز لکھا ہے:۔

"مسیحی انجیل میں چند نصائح تھیں جو اسی مروجہ انجیل میں درج ہیں باقی سوانحی ہے۔" (اخبار اہلحدیث ۲۰ رجب ۱۳۴۹ھ)

(۷) مولینا عبدالحق محدث و مفسر دہلوی لکھتے ہیں:۔

"علمائے اسلام نے یہ فیصلہ کر دیا ہے کہ تورات و انجیل کتب میں جہاں تک احکام و قصص قرآن کے موافق ہیں تو صحیح ہیں اور جہاں مخالف ہیں اگر وہ احکام ہیں تو ان کو منسوخ کہیں گے ورنہ غلط۔ یہ سمجھنا کہ اسلام نے تورات و انجیل کو بالکل منسوخ کر دیا غلط فہمی ہے۔" (عقائد الاسلام ص۵۹)

ان حوالجات سے ظاہر ہے کہ کتب مروجہ اہل کتاب "جعل محض" نہیں ہیں بلکہ ان میں صحیح، واقعی اور الہامی مضامین بھی موجود ہیں۔ اور اس سے انکار بھی کیسے کیا جا سکتا تھا جبکہ قرآن مجید میں مندرجہ ذیل آیات وارشادات موجود ہیں:۔

۱۔ ولو انهم اقاموا التوراة والانجيل وما انزل اليهم من ربهم لاكلوا من فوقهم ومن تحت ارجلهم۔

۲۔ قل يا اهل الكتاب لستم على شيء حتى تقيموا التوراة والانجيل وما انزل اليكم من ربكم۔

۳۔ وکیف یحکمونک وعندھم التورٰیۃ فیھا حکم اللہ۔

۴۔ قل فاتوا بالتورٰیۃ فاتلوھا ان کنتم صٰدقین۔

۵۔ ولیحکم اھل الانجیل بما انزل اللہ فیہ

۶۔ فاسئلوا اھل الذکر ان کنتم لا تعلمون۔

۷۔ نسوا حظاً مما ذکروا بہ (من التورٰیۃ) (کشاف جلد اوّل ص۳۲۹)

یعنی یہود و نصاریٰ اگر توریت و انجیل وغیرہ پر قائم ہوتے تو اپنے اوپر اور نیچے سے خدا کی نعمتیں کھاتے۔ جب تک یہ لوگ توریت و انجیل ۔ ۔ ۔ ۔ پر قائم نہ ہوں کسی چیز پر قائم نہیں۔ توریت میں حکم اللہ ہے۔ اے اہل کتاب اگر سچے ہو تو توریت لاکر پڑھو۔ اہل انجیل کو چاہئے کہ اس میں اللہ تعالیٰ نے جو اتار رکھا ہے اس سے فیصلہ کریں بعض باتوں کے متعلق اگر معلوم نہ ہو تو اہل ذکر سے پوچھ سکتے ہو۔ اہل کتاب کو جن باتوں کی نصیحت کی گئی تھی ان میں سے ایک حصہ بھول گئے ہیں۔

امید ہے کہ وہ لوگ جو کتب موجودہ اہل کتاب کو کذب محض اور مطلقاً ناقابل اعتبار سمجھتے ہیں وہ آیاتِ مذکورہ بالا پر بنظرِ تعمق و تدبّر غور فرما کر اس خیال سے رجوع کرنے پر مجبور ہوں گے۔

علاوہ ازیں متقدمین و متاخرین اہلِ اسلام میں سے محدثین، صوفیا اور متکلمین کی ایک جماعت اور ایک گروہ ایسا بھی ہے کہ جن کے نزدیک قرآن مجید میں اہلِ کتاب پر جو الزام تحریف لگایا گیا ہے اس سے مراد تحریفِ لفظی نہیں بلکہ معنوی تحریف مراد ہے۔ چنانچہ رئیس الائمہ سید المحدثین حضرت امام بخاری علیہ رحمۃ اللہ الباری کا یہی مذہب ہے۔ اور امام المتکلمین حضرت امام فخر الدین رازی رحمۃ اللہ اور علماء احناف و اہل حدیث کے مسلّم عالم ربانی استاذ الہند حضرت سید ولی اللہ شاہ صاحب محدث دہلوی بھی اسی خیال کے مؤید ہیں۔ بلکہ رئیس المفسرین ترجمان القرآن حضرت ابن عباسؓ کا بھی یہی مذہب بیان کیا گیا ہے۔ ملاحظہ ہوں منددجہ ذیل حوالجات:۔

۱۔ واعلم ان التوراۃ والانجیل الذین عند الیھود والنصارٰی الآن اختلف فیھما ھل ھما مبدلان ومحرفان لفظاً وتاویلاً ۔ ۔ ۔ فذھبت طائفۃ من الفقھاء والمحدثین الی ان ذلک انما وقع فی التاویل فقط کما صرح بہ البخاری واختارہ الفخر الرازی وغیرہ

بقوله تعالیٰ قل فأتوا بالتوراة فاتلوها ان کنتم صٰدقین وھو امر النبی صلی اللہ علیہ وسلم بالاحتجاج بھا والمبدل لا یحتج بہ ولما اختلفوا فی الرجم لم یمکنھم تغییر آیتہ منھا۔" (فتح البیان جلد اوّل ص...)

یعنی یہود و نصاریٰ کے پاس آجکل جو توریت و انجیل موجود ہیں علمائے اسلام میں ان کے متعلق یہ اختلاف ہے کہ آیا یہ لفظاً محرّف و مبدّل ہیں یا معناً۔ فقہاء اور محدّثین کی ایک جماعت جن میں حضرت امام بخاریؒ اور امام رازیؒ وغیرہ بھی شامل ہیں یہ عقیدہ رکھتی ہے کہ ان کتب میں تحریف صرف معنوں میں ہوئی ہے نہ ان کے الفاظ میں۔ کیونکہ اللہ تعالےٰ نے قل فاتوا بالتوراۃ فاتلوھا فرما کر ان سے احتجاج کرنے کا حکم دیا ہے۔ اور لفظاً محرّف و مبدّل سے احتجاج نہیں کیا جاتا۔ دوسرے اس وجہ سے کہ جب رجم میں اختلاف ہوا تو وہ آیت رجم کے الفاظ نہ بدل سکے تھے۔

۲:۔ قسطلانی در ارشاد الساری شرح صحیح البخاری زیر قول وے لیس احد یزیل لفظ کتاب من کتب اللہ عزّ وجلّ ولکنھم یحرفونہ یتأولونہ علی غیر تاویلہ نوشتہ محتمل ست کہ کلام مؤلف یعنی بخاری باشد کہ بطریق ذیل بر تفسیر ابن عباس آوردہ یا از بقیۂ کلام ابن عباس در تفسیر آیت باشد۔"

(اکسیر فی اصول التفسیر ص...)

یعنی قسطلانی شرح بخاری میں لکھا ہے کہ یہ قول کہ کوئی شخص کسی کتاب الٰہی کا کوئی لفظ زائل نہیں کر سکتا۔ ہاں اہل کتاب اپنی کتاب میں تحریف معنوی کرتے تھے۔ امام بخاریؒ کا بھی ہو سکتا ہے اور یہ بھی احتمال ہے کہ حضرت ابن عباسؓ ہی کا یہ کلام ہو۔

۳۔ حضرت امام رازیؒ لکھتے ہیں:۔

"وھذا التحریف یحتمل التأویل الباطل، ویحتمل تغییر اللفظ وقد بینا فیما تقدم ان الاوّل اولیٰ۔" (تفسیر کبیر جلد ۳ ص...)

کہ تحریف کتب سابقہ سے مراد معنوی تحریف لینا اولیٰ ہے بہ نسبت لفظی تحریف کے۔

پھر جلد ۳ ص... پر لکھتے ہیں:۔

"قد قال جماعۃ من اھل المعرفۃ بالتحقیق بان التحریف

الواقع فی التوراۃ معنوی لا لفظی والیہ ذھب جماعۃ الامۃ و ترجمان القرآن ابن عباس والشیخ ولی اللہ المحدث الدھلوی فی الفوز الکبیر وغیرھما "

کہ اہل معرفت اور محققین کی ایک جماعت تحریف معنوی کی قائل ہے نہ تحریف لفظی کی چنانچہ یہی مذہب ہے جماعت ترجمان القرآن حضرت ابن عباسؓ اور حضرت سید ولی اللہ شاہ محدث دہلوی وغیرہ کا۔

۵۔ حضرت شاہ ولی اللہ صاحب محدث اپنی تفسیر فوز الکبیر میں فرماتے ہیں:۔

" اما در تحریف لفظی در ترجمہ توریت و امثال آں بکاری بردند نہ در اصل توریت پیش ایں فقیر ایں چنیں محقق شدہ ہو قول ابن عباس "

نیز ملاحظہ ہو اکسیر صلا و صلہ کہ اہل کتاب توریت وغیرہ کے ترجمہ اور معنوں میں تحریف کرتے تھے نہ اصل توریت میں۔ یہی مسئلہ حق ہے اور حضرت ابن عباس کا بھی یہی قول ہے۔

۶۔ اہل حدیث کے مسلم عالم نواب صدیق حسن خاں صاحب اپنی تفسیر میں لکھتے ہیں:۔

" او المراد انھم یتاولونہ علی غیر تاویلہ والیہ ذھب طائفۃ من الفقہاء والمحدثین قال ابن عباس یحرفون حدود اللہ فی التوراۃ .... قال الحافظ بن القیم رحمہ اللہ فی اغاثۃ اللھفان قد اختلف فی التوراۃ التی بایدیھم ھل ھی مبدلۃ ام التبدیل وقع فی التاویل دون التنزیل علی ثلاثۃ اقوال .... وقالت طائفۃ من ائمۃ الحدیث والفقہ والکلام انما وقع التبدیل فی التاویل قال البخاری فی صحیحہ یحرفون یزیلون .... وھو اختیار الرازی ایضاً فتح البیان جلد ۲ صلا واکسیر فی اصول التفسیر صلا مصنفہ نواب صدیق حسن خاں۔)

کہ یا تحریف سے مراد غلط تفسیر ہے اور یہی مذہب ہے فقہاء اور محدثین کی ایک جماعت کا چنانچہ حضرت ابن عباسؓ نے کہا ہے کہ توریت میں بیان کردہ حدود اللہ بدل دیتے تھے اور حافظ ابن قیم نے کہا ہے کہ علم حدیث، فقہ اور علم کلام کے ائمہ کی ایک جماعت صرف تحریف معنوی کی قائل ہے۔ حضرت امام بخاری اور حضرت امام رازی کا بھی یہی مذہب ہے۔

حافظ ابن کثیر زیر آیت یحرفون الکلم عن مواضعہ لکھتے ہیں :-

"یتأولونہ علی غیر تأویلہ ویفسرونہ بغیر مراد اللہ عزوجل" (تفسیر ابن کثیر جلد ۲ صلا)

اور ص۲ پر لکھتے ہیں :-

"تأولوا کتابہ علی غیر ما انزلہ وحملوہ علی غیر مرادہ" معلوم ہوا اس آیت میں تحریف سے مراد غلط تاویل و تفسیر ہے۔

۸۔ "قال عبد الرحمٰن بن خلدون فی کتاب العبر وما یقال من ان علماءھم بدلوا مواضع من التوراۃ بحسب اغراضھم فی دیانتھم فقد قال ابن عباس علی ما نقل عنہ البخاری فی صحیحہ ان ذلک بعیدۃ وقال معاذ اللہ ان تعمد امۃ من الامم الی کتابھا المنزل علی نبیھا فتبدلہ او ما فی معناہ قال وانما بدلوہ وحرفوہ بالتأویل ویشھد بذلک قولہ تعالیٰ وعندھم التوراۃ فیھا حکم اللہ ولو بدلوا من التوراۃ الفاظھا لم یکن عندھم التوراۃ التی فیھا حکم اللہ وما وقع فی القرآن من نسبۃ التحریف والتبدیل فیھا الیھم فانما المعنی بہ التأویل" (فتح البیان جلد ۳ ص۲۳)

یعنی علامہ ابن خلدون نے کتاب العبر میں کہا ہے کہ یہ جو کہا جاتا ہے کہ علماء اہل کتاب نے از راہ بد دیانتی توریت کے الہامی الفاظ بدل ڈالے تھے۔ بقول حضرت امام بخاریؒ حضرت ابن عباسؓ اسے بعید از عقل و قیاس قرار دیتے ہیں۔ پھر کہا ہے کہ کوئی امت اپنے نبی کا الہامی کلام نہیں بدل سکتی۔ وہ صرف غلط تفسیر کرتے تھے۔ اور آیت وعندھم التوراۃ فیھا حکم اللہ بھی اس پر شاہد ہے۔ کیونکہ اگر انہوں نے الفاظ بدل دیئے تھے تو پھر ان کے پاس توریت جس میں حکم اللہ ہو موجود نہ تھی۔ اور ان کی طرف جو تحریف قرآن مجید میں منسوب کی گئی ہے۔ اس سے مراد صرف غلط تفسیر کرنا ہے۔

۹۔ "کانت الیھود یغیر معانی التوراۃ بالاشباہ" (تاج العروس جلد ۶ ص۹۹) علامہ زبیدی لکھتے ہیں کہ یہود توریت کے معنے بدل ڈالا کرتے تھے۔

۱۰- مولوی ثناء اللہ صاحب لکھتے ہیں :-

"ہم راستی سے کہتے ہیں کہ بعض علمائے اسلام بائیبل میں تحریف لفظی کے قائل نہیں۔ ان میں سے امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ بھی ہیں" (اخبار اہلحدیث ۱۳ ؍جون ۱۹۱۳ء)

۱۱- تفسیر ابن جریر میں زیر آیت یحرفون الکلم لکھا ہے :-

"یبدلون معناھا و یغیرونھا عن تأویلہ" کہ تحریف الکلم سے مراد ان کے معنوں اور تفسیر میں تبدیل و تغیر ہے نہ الفاظ میں۔ (جلد ۵ صفحہ)

۱۲- مولوی محمد حسن فیضی متوطن بھیں لکھتے ہیں :-

"ہمارے اسلام کے محقق فضلاء اس امر کے قائل ہیں کہ توریت کی تحریف صرف اس طرح پر ہوئی ہے کہ الفاظ محتمل المعانی کی تفسیر میں تاویل بےجا سے کام لیا گیا ہے۔ یا کہ بشارات محمدیہ جو کہ اجمالی طور پر واقع ہیں (جیسا کہ پیشگوئیوں کا شیوہ ہے) ان کے محمل بیان کرتے وقت تعصب سے کسی دوسرے آدمی پر اٹھا دیں۔ لکن یہ کہ یہودیوں نے تورات کے تمام نسخہ جات تبدیل کر ڈالے تھے۔ اور ان میں سے کچھ کاٹ دیا ہو یا کہ اپنی طرف سے کچھ بڑھا دیا ہو خیال باطل ہے۔ قرآن کریم اس خیال کی تردید کرتا ہے۔ وعندھم التوراۃ فیھا حکم اللہ - اگر تورات کے الفاظ میں تحریف ہوتی تو پھر یہ کہنا کب صحیح ہوتا کہ ان کے پاس تورات ہے اور اس میں خدا کے حکم ہیں" (روض الربیٰ صفحہ)

اور صفحہ پر بحوالہ ابن خلدون جلد ۲ صفحہ لکھا ہے :-

"یہ جو کہا جاتا ہے کہ یہودیوں نے اپنی اغراض کے مطابق تورات کے بعض مقاموں کو بدل دیا ہے۔ ابن عباسؓ اس کی اس طرح تردید فرماتے ہیں جیسا کہ صحیح بخاری میں لکھا ہے۔ کہ یہ امر نہایت ہی بعید ہے کہ کوئی امت اپنے نبی کی الہامی کتاب کو دیدہ دانستہ بدل دے۔ ان کی تبدیلی صرف بعض آیات کی تفسیر میں بطور تاویل ہے۔ خدا کا کلام وعندھم التوراۃ فیھا حکم اللہ اس بات کا گواہ ہے کہ انہوں نے لفظی تبدیلی نہیں کی تھی"

۱۳- سرسید مرحوم لکھتے ہیں :-

"میں اس بات کا قائل نہیں ہوں کہ یہودیوں اور عیسائیوں نے اپنی کتب مقدسہ

میں تحریف لفظی کی ہے اور نہ علمائے متقدمین و محققین اِس بات کے قائل تھے۔"

(تفسیر القرآن جلد اوّل ص۸ خطبات احمدیہ ص۲۵۱)

پس جب مسئلہ تحریف کتب اہل کتاب کا یہ حال ہے تو ظاہر ہے کہ ان میں سے بطور تائید و تصدیق بیانات قرآن و حدیث کوئی مضمون پیش کرنا ممنوع نہیں ہو سکتا۔

اور جو لوگ تحریف لفظی کے قائل ہیں ان کی مراد بھی یہ نہیں ہے، کہ یہ کتب بتمامہا حرفاً حرفاً محرف و مبدّل ہیں بلکہ وہ تسلیم کرتے ہیں کہ ان کے اکثر مضامین اصلی اور حقیقی ہیں۔ گو کسی قدر الفاظ میں تبدیلی بھی ہو گئی ہے۔ چنانچہ فتح البیان میں اس گروہ کا بیان بحوالہ حافظ ابن قیم لکھا ہے۔ "وقالوا قد زید فیہا و غُیّر اشیاءُ یسیرۃٌ جداً واختارہ شیخنا فی الجواب الصحیح لمن بدل دین المسیح" کہ ان میں نہایت ہی قلیل اور معمولی زیادتی ہوئی ہے۔ شیخ ابن تیمیہ کا یہی مسلک ہے۔ (فتح البیان جلد ۲ ص۲۵۱ و اکسیر فی اصول التفسیر ص۶) اور ص۲۵۲ میں لکھا ہے "وقال الخفاجی فی العنایۃ فی تفسیر الفاتحۃ واما الانجیل ففیہ تبدیل و تحریف فی بعض الفاظہ ومعانیہ" کہ علامہ خفاجی کے نزدیک انجیل کے بعض الفاظ اور معنوں میں تحریف ہوئی ہے۔ اور خود نواب صدیق حسن خان صاحب کا میلان بھی اِسی خیال کی طرف ہے۔ (ملاحظہ ہو جلد ا ص۱۳۲ و ترجمان القرآن جلد ا ص۱۱۱) اور علامہ عبد الرحمٰن بن خلدون ایسی معمولی تبدیلی کو جو اُن کے نزدیک غفلت و عدم ضبط کی وجہ سے ہو گئی ہو کوئی زیادہ اہمیت نہیں دیتے۔ بلکہ کہتے ہیں کہ اس کے باوجود تحقیق و تفتیش کرنے سے ان کتب میں سے اصل اور صحیح بات معلوم ہو سکتی ہے۔ "ویمکن مع ذالک الوقوف علی صحیح منہا اذا تحرّی القاصد لذالک بالبحث عنہ" (فتح البیان جلد ۳ ص۳۶ و ابن خلدون جلد ۲ ص۶) یعنی یہ ہو سکتا ہے کہ ان سے سہواً بعض غلطیاں ہوئی ہوں لیکن اگر کوئی جستجو کرنیوالا محقق ان کتب کے مسائل میں اصلیت پر پہنچنا چاہے تو پہنچ سکتا ہے۔ پس اِس قول کی بناء پر بھی یہ لازم نہیں آتا کہ کتب اہلکتاب کی ہر ایک بات غلط اور ناقابلِ وثوق ہے۔

احادیث نبویہ اور روایات اہل کتاب

علاوہ ازیں احادیث نبویہ میں بھی غیر مبہم اور نہایت واضح الفاظ میں روایات اہل کتاب قبول کرنے اور بیان کرنیکی اجازت موجود ہے۔ ملاحظہ ہوں مندرجہ ذیل احادیث۔

(۱) حَدِّثُوا عن بنی اسرائیل ولاحرج "(بخاری کتاب الانبیاء باب ما ذکر عن بنی اسرائیل)

ترجمہ: یہود و نصاریٰ سے روایت بیان کر لیا کرو، اس میں کوئی حرج نہیں۔

علامہ ابن حجر لکھتے ہیں:- "ان الامر فیہ للاباحۃ" یعنی فعل امر حدثوا سے اباحت اور اجازت مراد ہے۔ (فتح الباری جلد ۶ ص ۳۶۱)

مولوی ثناء اللہ صاحب لکھتے ہیں:-

"حدیث میں بنی اسرائیل سے روایت کی اجازت آئی ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ہے حدثوا عن بنی اسرائیل ولاحرج یعنی بنی اسرائیل سے صحیح روایت جو قرآن سے کسی طرح مخالف نہ ہو بیان کر لیا کرو..... چنانچہ موجودہ توریت کی پہلی کتاب پیدائش باب دوم کا صریح مضمون ہے..." الخ
(تفسیر ثنائی جلد ۲ ص ۱۰ حاشیہ)

(۲) عن عبداللہ بن سلام انہ جاء الی النبی صلی اللہ علیہ وسلم فقال انی قرأت القرآن والتوراۃ فقال اقرأ بھذا لیلۃ و بھذا لیلۃ۔" (کنز العمال جلد ۷ ص ۱۶)

یعنی حضرت عبداللہؓ بن سلام نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں عرض کیا کہ میں نے قرآن مجید اور توریت دونوں کتابیں پڑھی ہیں تو حضور علیہ السلام نے فرمایا۔ ایک رات قرآن مجید اور ایک رات توریت پڑھ سکتے ہو۔

(۳) حضرت معاویہؓ نے حضرت کعب الاحبار صحابیؓ کا ذکر کر کے فرمایا۔ ان مسلمانوں سے جو کتب بنی اسرائیل کی باتیں بیان کرتے ہیں کعبؓ زیادہ سچا تھا، مگر پھر بھی ان کتب کی بعض بیان کردہ باتیں درست نہ ہوتی تھیں۔ اس سے صاف عیاں ہے کہ عہد صحابہؓ میں کتب سابقہ کے مضامین روایت کئے جاتے تھے۔ اور بعض صحیح ہوتے تھے اور ان کی تصدیق کی جاتی تھی۔ اگر ایسا کرنا مطلقاً حرام ہوتا تو حضرت معاویہؓ ضرور منع فرما دیتے (انہوں نے اپنی امارت اور بادشاہت کے زمانہ میں یہ بات بیان کی تھی)" ذکر کعب الاحبار فقال ان کان اصدق ھؤلاء المحدثین الذین یحدثون عن اھل الکتاب (التوراۃ والانجیل والصحف) وان کنا مع ذلک لنبلو علیہ الکذب"
(بخاری کتاب الاعتصام)

(۴) "جاء حبر من الاحبار الی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فقال یا محمد انا نجد ان اللہ یجعل السمٰوات علی اصبع والارضین علی اصبع ..... فیقول انا الملک فضحک النبی صلی اللہ علیہ وسلم تصدیقاً لقول الحبر ثم قرأ رسول اللہ صلعم وَمَا قَدَرُوا اللّٰہَ حَقَّ قَدْرِہٖ" (بخاری کتاب التفسیر و کتاب الرد علی الجہمیۃ)

یعنی ایک یہودی عالم نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر کہا کہ اے محمدؐ! ہم (توریت میں۔ قسطلانی) یہ پاتے ہیں کہ خدا تعالےٰ ایک انگلی پر آسمان، ایک پر زمین، ایک پر درخت، ایک پر پانی اور ایک انگلی پر باقی ساری مخلوقات اُٹھا کر فرماتا ہے میں ہی بادشاہ ہوں۔ حضور علیہ السلام نے اس کی ہنس کر تصدیق فرمائی اور فرمایا سچ مچ ہر چیز خدا ہی کے قبضۂ قدرت میں ہے۔ مگر افسوس لوگوں نے اس کا حقیقی مرتبہ نہیں پہچانا۔ پس جب خود رسول مقبول صلعم نے ایک عالم یہود کی روایت کی قرآن مجید کے مطابق پا کر تصدیق فرمائی تو ہمارے لئے ایسا کرنا کیوں حرام ہے؟

(۵) "عن ابن عباس کان یحب موافقۃ اھل الکتاب فیما لم یؤمر بہ" (مسلم جلد دوم باب سدل النبی صلعم شعرہ)

حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم بہت پسند فرمایا کرتے تھے کہ جس امر میں خدا تعالےٰ وحی کے ذریعہ کوئی حکم نازل نہ فرماوے، اس میں اہل کتاب سے موافقت و مطابقت کی جائے۔

نووی شرح مسلم میں اس حدیث کی شرح میں لکھا ہے کہ بعض علماء اہل اصول نے اس حدیث سے یہ استدلال کیا ہے کہ شریعت سابقہ ہمارے لئے بھی شریعت ہے جب تک ہماری شریعت اس کے برخلاف کوئی حکم نہ دے۔ "استدل بعض الاصولیین بھذا الحدیث ان شرع من قبلنا شرع لنا مالم یرد شرعنا بخلافہ" (نووی جلد دوم ص۲۵۹)

اس حدیث سے عیاں ہے کہ اگر کتب اہل کتاب اور ان کی باتیں علی الاطلاق مردود اور ناقابل اعتبار ہوتیں تو حضور علیہ السلام کو ان سے موافقت ہرگز محبوب نہ ہوتی۔

بعض روایاتِ پیش کردہ کی حقیقت

چونکہ کتب اہل کتاب سے سند لینے اور ان سے احتجاج کرنے کے خلاف بعض روایات بھی پیش کی جاتی ہیں اس لئے مناسب ہے کہ اُن کی اصلیت بھی ظاہر کر دی جائے۔ اور وہ روایات یہ ہیں :-

(۱) حضرت عمرؓ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں اہل کتاب کی ایک کتاب پڑھنی شروع کی اس پر حضورؐ نے ناراضگی کا اظہار فرمایا۔

(۲) لا تصدقوا اھل الکتاب ولا تکذبوھم۔ یعنی اہل کتاب کی نہ تصدیق کرو اور نہ تکذیب کرو۔

(۳) کیف تسئلون اھل الکتاب عن شیء * (ابن عباس) اہل کتاب سے کسی چیز کے متعلق کس طرح سوال کرتے ہو۔

امّا الجواب۔ اوّلاً :- اگر ان روایات کا یہی مفہوم ہے کہ مطلقاً یہ کتب ناقابل احتجاج ہیں تو ظاہر ہے کہ یہ مفہوم قرآن کریم کی بہت سی آیات کے صریح خلاف ہے کیونکہ قرآن مجید میں تسلیم کیا گیا ہے کہ ان میں "حکم اللہ" موجود ہے۔ اور پھر بعض امور کے متعلق حجت کے طور پر ان کا حوالہ بھی دیا گیا ہے۔ کما ذُکر آنفاً۔ وقال اللہ۔ یجدونہٗ مکتوباً عندھم فی التوراۃ والانجیل۔ چنانچہ آیت ہذا کے ماتحت مولوی ثناء اللہ صاحب نے تورات و انجیل موجودہ میں سے آنحضرت صلعم کے حق میں پیشگوئیاں درج کی ہیں۔ (تفسیر ثنائی جلد ۳ صفحہ ۱۵)

ثانیاً :- یہ روایات ان احادیث اور ارشادات کے صریحاً خلاف ہیں جن میں کتب اہل کتاب پڑھنے اور ان کی بعض روایات قبول کرنے کی اجازت دی گئی ہے۔

ثالثاً :- حضرت ابن عباسؓ، حضرت امام بخاریؒ، حضرت امام رازیؒ اور حضرت سید ولی اللہ شاہ صاحب وغیرہ ائمہ کا جو مذہب تحریف کے متعلق اوپر گذرا ہے وہ ان روایات کی موجودگی میں ہے، کیا اُن کو اِن کا علم نہ ہوسکا تھا، اگر علم تھا اور یقیناً تھا (حدیث ۱ و ۲ صحیح بخاری میں موجود ہیں اور ۳ خود حضرت ابن عباس کا قول ہے۔) تو پھر وہ کیوں تحریف لفظی سے منکر ہوتے۔ پس ظاہر ہے کہ اِس صورت میں ان کتب کو "جعلی محض" اور مطلقاً ناقابل اعتبار نہیں کہا جا سکتا۔ اور نہ اِن سے بہرصورت احتجاج باطل لازم آتا ہے۔

رابعًا :- جو علماء تحریف لفظی کے قائل ہیں اُن کے مذہب کے مطابق بھی احتجاج جائز ہے اور تحقیق و تفتیش کرنے سے صحیح بات کا پتہ چل سکتا ہے۔ فافہم!

خامسًا :- علمائے متقدمین و متأخرین نے ان کتب سے احتجاج کیا ہے اور اپنی تصانیف اور کتب تفاسیر وغیرہ میں ان کے حوالجات دیئے ہیں اور زمانۂ حال کے علماء بھی برابر اس کا ارتکاب کر رہے ہیں۔ الملل والنحل مصنفہ امام ابن حزمؒ، الجواب الصحیح لمن بدّل دین المسیح مصنفہ امام ابن تیمیہ، تفسیر ثنائی (جلد ۲ صـ) سیرۃ النبی جلد چہارم (صفحہ ۵۲۴، ۵۴۴) نواب صدیق حسن خاں لکھتے ہیں کہ بوقت احتیاج ان کتب کا دیکھنا جائز ہے۔" ائمہ نے قدیمًا و حدیثًا توریت و انجیل سے نقل کیا ہے اور تصدیق حضرت صلی اللہ علیہ وسلم ان کی کتابوں سے نکال کر بتائی ہے۔" (ترجمان القرآن صـ سورۃ مائدہ)

سادسًا :- اوّل الذکر روایت کے ایک طریق میں مجالد ضعیف راوی ہے۔ اور دوسرے میں جابر جعفی راوی ضعیف ہے (فتح الباری)۔ رسالہ اکسیر فی اصول التفسیر کے صـ پر بحوالہ حافظ ابن قیم لکھا ہے۔" ودریں باب احادیث دیگر ہست کہ ہمہ ضعیف است" یعنی اس بارے میں جو دیگر احادیث ہیں وہ سب ضعیف ہیں۔

پس اس سے استدلال کرنا درست نہیں۔ دوسرے ناراضگی کبھی خلافِ فعل اولیٰ، فعل مکروہ اور تنزیہ کی وجہ سے بھی ہوتی ہے۔ ہمیشہ حرمت ہی کی وجہ سے نہیں ہوتی۔ جیساکہ حضرت معاذؓ کی لمبی قرامت در نماز پر حضرت رسول مقبول صلے اللہ علیہ وسلم ناراض ہوئے تھے۔ نواب صدیق حسن خاں لکھتے ہیں" امّا استدلال بتحریم بغضب فرمودن آنحضرت صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم پس مردود ست" کہ آنحضرت کی ناراضگی سے حوالجات کتب سابقہ دینے کی حرمت پر استدلال کرنا مردود اور غلط ہے۔ (اکسیر صـ٦)

خود شرّاح حدیث نے بھی اس کی یہ توجیہہ قبول کی ہے۔ ملاحظہ ہو اکسیر صـ٦ بحوالہ فتح الباری:

" آنچہ ظاہر میشود آنست کہ کراہت تنزیہ باشند نہ تحریم"

تیسرے یہ نہی شرعی احکام (حلت و حرمت وغیرہ) سے متعلق ہے نہ کہ گذشتہ واقعات تاریخیہ، قصص ماضیہ اور ہماری شریعت کے مصدق امور سے۔ ارشاد الساری شرح صحیح بخاری جلد ۱۰ صـ۲۳ میں ہے" یتعلق بالشرائع ... نعم لا یدخل فی

النھی عن سؤالھم عن الاخبار المصدقة لشرعنا والاخبار الامم السالفة " نیز ملاحظہ ہو عینی جلد ۱۱ صـ و فتح الباری جلد ۱۳ صـ ۔ جائزۃ الشعوذی ترجمہ جامع ترمذی صـ ۲۲۔

اور ثانی الذکر یں جملہ لا تصدقوا اھل الکتب اگر ہمارے خلاف پیش کیا جا سکتا ہے تو ہمارے مخالفین لا تکذبوھم کی خلاف ورزی کا ارتکاب کر کے زیر الزام آتے ہیں۔ فتدبر۔

دوسرے اس میں اصل و متن توراۃ کی تصدیق و تکذیب سے نہیں روکا گیا۔ بلکہ اُسوقت کے یہود جو عبرانی توریت کا مطلب عربی میں صحابہ کو بتاتے تھے۔ اس کی تصدیق و تکذیب سے روکا ہے۔ کیونکہ وہ لوگ خائن تھے، کیا معلوم کہ وہ مطلب درست بتاتے ہیں یا غلط جیسا کہ رجم کے حکم میں انہوں نے خیانت کی تھی اور چونکہ بعض باتیں وہ درست بھی بتا دیتے تھے، اس لئے تحقیق سے قبل عام مسلمانوں کو ان کی تصدیق و تکذیب سے روکدیا۔ چنانچہ حدیث کے باقی الفاظ اس کی تائید کرتے ہیں۔

" کان اھل الکتاب یقرءون التوراۃ بالعبرانیۃ ویفسرونھا بالعربیۃ لاھل الاسلام فقال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لا تصدقوا اھل الکتاب ولا تکذبوھم " (بخاری کتاب الاعتصام)

یعنی اہل کتاب عبرانی سے عربی میں تورات کا ترجمہ کر کے اہل اسلام کو سُنایا کرتے تھے۔ اس پر رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ان اہل کتاب کی تصدیق و تکذیب نہ کرو۔ اور اگر نفس توریت کی تصدیق و تکذیب سے روکنا حضورؐ کا مقصود و مطلوب ہوتا تو یوں فرماتے لا تصدقوا التوراۃ ولا تکذبوھا۔ کہ تورات کی تصدیق و تکذیب نہ کرو۔ یا ان کی عام اخبار کے متعلق قبل از تحقیق حقیق یہ نہی ہے۔ عینی میں ہے۔

"یعنی اذا کان ما یخبرونکم بہ " (جلد ۲ صـ)

یہی ارشاد خداوندی ہے کما قال ۔ اِنْ جَآءَکُمْ فَاسِقٌۢ بِنَبَاٍ فَتَبَیَّنُوْا ۔

سوم ۔ کیا اس حدیث کے یہ معنے ہیں کہ یہودی اور عیسائی مسلمانوں کو جب کوئی خبر بتایا کریں تو مسلمان عالم سکوت میں چلے جایا کریں۔ اور ان کی بات پر ہاں یا نہ کہنے سے بھی پرہیز کریں۔ اگر کہا جائے کہ یہود و نصاریٰ کی ہر خبر کے متعلق یہ حکم نہیں بلکہ صرف ان کی کتب الہامیہ

کے متعلق ہے تو یہ امر اور بھی مضحکہ خیز ہے کہ عام بیانات میں تو ان قوموں پر اعتماد و اعتبار کیا جا سکتا ہے مگر ان کی کتب الہامیہ کے متعلق نہیں۔ فساء ما یحکمون۔ نیز مضامین کتب پر بھی محض خاموشی مضحکہ خیز اور بچوں کی سی بات معلوم ہوتی ہے۔

چہارم۔ کیا اس پر کبھی مسلمانوں نے عمل بھی کیا ہے؟ کیا یہ امر واقع نہیں کہ قرنِ اول سے لیکر آج تک بعد ہمارے مولوی صاحبان باوجود اس حکم کے کتب اہل کتاب کے بعض مضامین کی تکذیب و تردید اور بعض کی تصدیق و تائید کرتے رہے ہیں۔ پھر یہ روایت ہمارے خلاف پیش کرنے کے کیا معنے؟

پنجم۔ ان کتب میں ابنیت و الوہیت مسیح، کفارہ اور تثلیث وغیرہ ایسے باطل مسائل بھی موجود ہیں، کیا ہم ان کی بھی تکذیب نہ کیا کریں؟ اور اگر جواب اثبات میں ہے تو آیاتِ قرآنیہ مثل لقد کفر الذین قالوا اِنّ اللہ ھو المسیح کے کیا معنے ہونگے؟

ششم۔ اس حدیث کے معنی محدثین اور شراح نے یہ کئے ہیں لم یرد النھی عن تکذیبھم فیما ورد شرعنا بخلافہ ولا عن تصدیقھم فیما ورد شرعنا بوفاقہ۔" (عمدۃ القاری شرح صحیح بخاری جلد ۸ ص۴۷۱ و ص۴۷۲)

تیسیر الباری ترجمہ صحیح بخاری میں مولینا وحید الزمان صاحب لکھتے ہیں:۔

"حافظ نے کہا ہے یہ حکم ان باتوں میں ہے جن کے صحیح یا غلط ہونے میں شبہ ہو لیکن قرآن کے موافق جو باتیں ہوں ان کی تصدیق، اسی طرح قرآن کے خلاف جو باتیں ہوں ان کی تکذیب کی ممانعت نہیں ہے۔ امام شافعیؒ نے ایسا ہی کہا ہے۔" (پارہ ۱۸ ص۹)

حضرت امام مالکؒ اور حضرت امام شافعیؒ کا بھی یہی مذہب ہے کہ اہل کتاب کی سچی اور صحیح باتیں ماننا اور قبول کرنا منع نہیں ہے۔ ہاں جھوٹی اور غلط باتیں رد کرنے کا حکم ہے۔ اور یہ حدیث اور حدثوا عن بنی اسرائیل ہم معنی و ہم مآل ہیں۔ (فتح الباری جلد ۶ ص۳۶۱)

علامہ ابن حجر لکھتے ہیں۔ ان کی درست باتیں بیان کرنے میں کوئی حرج نہیں۔ لا ضیق علیکم فی الحدیث عنھم (ایضاً)

حاشیہ مشکوٰۃ ص۲۸ پر ہے:۔ "لا تصدقوا ای فیما لم یتبین لکم صدقہ لاحتمال ان یکون کذباً و لا تکذبوھم ای فیما حدثوا من التوراۃ و

الانجیل لاحتمال ان یکون صدقاً"۔ پس اگر یہ کتب بوجہ تحریف و تنسیخ ناقابلِ قبول اور "جعل محض" ہیں تو احتمال صدق و کذب کا محل کیونکر ٹھہریں۔ پھر تو مجسم کذب اور سراسر غیر معتبر ہوتیں۔ اور ظاہر ہے کہ اِس صورت میں نہی لا تصدقوا کا فی تھی لا تکذبوا کا کوئی محل نہ تھا۔

ہفتم:۔ نہی سے ہمیشہ حرمت ہی مراد نہیں ہوتی بلکہ کبھی اِس سے مراد کراہت تنزیہ بھی ہوتی ہے۔ جیساکہ حدیث لا تصحب الملٰئکۃ رفقۃً فیہا جرس کے متعلق شارح مسلم نے لکھا ہے "یہ نہی تنزیہی ہے"۔ (المعلم جلد ۵ ص۱۹۴) یا حضرت علیؓ کے گھر دعوت پر آپؐ تشریف لائے، مگر گھر کے ایک کونہ میں منقش کپڑا دیکھ کر واپس تشریف لے گئے۔ (مشکوٰۃ ص۲۷۸) تو کیا منقش کپڑا گھر میں رکھنا حرام ہے؟

ثالث الذکر مرفوع حدیث نہیں بلکہ حضرت ابن عباسؓ کا قول و اجتہاد ہے۔ اور بقول مولوی ثناء اللہ صاحب "قول الصحابی لیس بحجۃ محدثین کا اصول ہے"۔ (رسالہ اجتہاد و تقلید ص۸)

دوم:۔ یہ قول حدیث نبویؐ حدثوا عن بنی اسرائیل ولا حرج کے صریح خلاف ہے۔

سوم:۔ کراہتِ تنزیہیہ پر محمول ہے نہ ذمت قطعیہ پر۔ "ابن حجر نے کہا ہے۔ ظاہر یہ ہے کہ کراہتِ تنزیہ ہے نہ تحریم"۔ (تفسیر ترجمان القرآن ص۱۰۱ تفسیر سورۃ مائدہ)

چہارم:۔ بعض دیگر صحابہ کا قول اور عمل اس کے خلاف ہے۔ مولٰنا عبد الحی لکھنوی مرحوم لکھتے ہیں:۔

"صحابہ دو قسم کے تھے۔ بعض احبار یہود اور کتب بنی اسرائیل سے اخذ کرتے تھے، جیسے عبد اللہ بن عمرؓو بن العاصؓ وغیرہ۔ اور بعض اس سے اجتناب کرتے تھے، بلکہ فقط آنحضرت صلعم سے اخذ کرتے تھے، مثل ابن مسعود وغیرہ"۔ (اثر ابن عباسؓ فی دافع الوسواس ص۱۷، نیز ملاحظہ ہوں کتب اصول)

(حضرت ابن مسعود وغیرہ صحابہ بھی مطلقاً حرام اور خلافِ اسلام سمجھکر مجتنب نہ تھے، بلکہ کراہت تنزیہیہ کی وجہ سے مستقبح اور ناپسندیدہ سمجھتے تھے۔)

پنجم:۔ اگر اِسے حدیث نبوئی بھی تسلیم کر لیا جائے، تو علاوہ تیسرے جواب کے ارشادِ نبویؐ حدثوا عن بنی اسرائیل سے منسوخ ہو چکی ہے۔ کما مرّ

ششم — اس کے معنے صرف یہ ہیں کہ احکام دین اور مسائل شرعیہ متعلقہ حلت و حرمت میں ان کی طرف رجوع نہ کیا جائے۔ نہ یہ کہ اُمم ماضیہ اور انبیائے سابقہ کے حالات و واقعات بھی سنائے جائیں۔ سچ یہ حدیث مطلق نہیں بلکہ مقید ہے۔ ورنہ علی الاطلاق یہ خیال ناقابل عمل و خلاف عقل سلیم ہے۔ وھذا لا یخفی علی ذی لب سابعًا۔ یہ روایات ثلاثہ ان احادیث صحیحہ سے کہ جو اہل کتاب سے خبریں اخذ کرنے کے جواز پر صریحۃ الدلالت ہیں منسوخ ہیں۔ چنانچہ قاضی القضاۃ خاتم الحفاظ ابو الفضل شہاب الدین احمد ابن علی اعنی امام حافظ ابن حجر عسقلانی (جن سے بڑھ کر ان کے بعد کوئی محدث نہیں ہوا) اپنی شرح صحیح بخاری میں لکھتے ہیں کہ ابتدائے اسلام میں جبکہ ابھی احکام اسلامیہ اور قواعد دینیہ کا استحکام و استقرار نہ ہوا تھا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بنظر احتیاط و خوف فتنہ اہل کتاب کی روایات لینے اور ان کی کتب پڑھنے سے منع فرما دیا تھا۔ لیکن بعد میں جب خوف و محذور جاتا رہا تو حضور علیہ السلام نے بنظر وسعت و منفعت اذن و اجازت دیدی "کان تقدم منہ صلی اللہ علیہ وسلم الزجر عن الاخذ منھم والنظر فی کتبھم ثم حصل التوسع فی ذلک و کان النھی وقع قبل الاستقرار الاحکام الاسلامیۃ والقواعد الدینیۃ خشیۃ الفتنۃ ثم لما زال المحذور وقع الاذن فی ذلک۔" (فتح الباری جلد ۶ صفحہ ۳۶۱)

اسی طرح تیسیر الباری ترجمہ و شرح صحیح بخاری میں لکھا ہے:۔

"شروع شروع میں آپ نے اس سے منع فرما دیا تھا۔ جب اسلام دلوں میں خوب جما نہ تھا۔ اس کے بعد اجازت دیدی۔ مگر یہ اجازت انہی باتوں کے متعلق ہے جو قرآن و حدیث کے خلاف نہ ہوں۔" (تیسیر الباری پارہ ۱۳ صفحہ ۱۱۱)

اس مسئلے میں اصل صواب

اصل حقیقت یہ ہے کہ لاریب کتب سابقہ میں انسانی تصرفات ضرور ہوئے ہیں، اس لئے ان میں بیان کردہ کوئی مضمون اگر خدا کی محفوظ کتاب قرآن مجید کی تصریحات کے صریح خلاف ہو تو وہ مردود سمجھا جائے گا۔ ہاں اگر خلاف نہ ہو تو پھر اُسے رد کرنے کی کوئی وجہ وجیہہ معلوم نہیں ہوتی۔ بلکہ سابقہ تمام تواریخ کے متعلق یہی اصل اور قانون واجب القبول و العمل ہے۔ گویا اصل معیار اور کسوٹی قرآن مجید ہے۔ اور مضامین بائیبل یا دیگر تاریخ اس کے تابع اور ماتحت ہیں۔ یہ نہیں کہ

نعوذ باللہ قرآن مجید کو اُن کے تابع سمجھا جائے۔ چنانچہ یہی عقیدہ علمائے اسلام کا ہے جیسا کہ اُوپر کے حوالجات سے ظاہر ہے۔ نیز ملاحظہ ہوں مندرجہ ذیل حوالجات:۔

ا۔ "قال ابن جریج القرآن امینٌ علی الکتب المتقدمۃ قبلہ فما وافقہٗ منہا فہو حقٌ وما خالفہ فہو باطل" (ابن کثیر جلد ۳ صفحہ)

یعنی حضرت ابن جریجؒ نے فرمایا ہے کہ قرآن مجید کتب سابقہ پر امین ہے۔ اس سلئے ان کا جو مضمون اس کے موافق ہو وہ حق اور جو مخالف ہو وہ باطل ہے۔

۲۔ مولوی ثناء اللہ صاحب لکھتے ہیں:۔

"پس جو مضمون اِس محفوظ مضمون کے مخالف ہوگا وہ مردود متصور ہوگا اور جس کی قرآن شریف تصدیق کرے گا وہی صحیح اور قابلِ اعتبار ہوگا۔ رہی یہ بحث کہ توریت و انجیل میں تحریف لفظی ہے یا معنوی، سو یہ بحث طویل الذیل ہے۔ ...... الخ (تفسیر ثنائی جلد ۲ صلا حاشیہ ملا)

۳۔ مولوی صاحب موصوف لکھتے ہیں:۔

"قرآن خود کہتا ہے۔ انہٗ لفی زبر الاوّلین (شعراء ع) یعنی قرآن شریف پہلے نبیوں کی کتابوں میں ہے۔ قرآن شریف خود بتلاتا ہے کہ میں پہلی کتابوں کے سچے مضامین کی تصدیق کرتا ہوں۔ اور ساتھ ہی ان کی غلطیوں پر اطلاع دیتا ہوں۔ سُنو! مصدقاً لما بین یدیہ ومہیمناً علیہ (مائدہ ع) یعنی قرآن اپنے سے پہلے مضامین کی تصدیق کرتا ہے اور اُن پر نگہبان بھی ہے۔ کہ جو مضامین غلط گوؤں کی غلط گوئی سے ان میں آملے ہیں اُن کی چھانٹ کرتا ہے چنانچہ بتلاتا ہے جو لوگ کہتے ہیں خدا تین ہیں وہ کافر ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن شریف کا بیان بعض مواقع پر کتب سابقہ سے مخالف ہو جاتا ہے۔" (ترکِ اسلام ص ۱۸۶/۱۸۷)

۴۔ "سیف الاسلام جناب بابو محمد پیر بخش صاحب سیکرٹری انجمن تائید اسلام لاہور" اپنی کتاب "الاستدلال الصحیح فی حیات المسیح" میں توریت و انجیل کے بعض حوالجات تحریر کر کے لکھتے ہیں:۔

"تورات خدا کی آسمانی کتاب ہے اور قرآن شریف کا دعویٰ ہے کہ وہ دوسری آسمانی کتابوں کا مصدق ہے۔ انجیل کی بھی تصدیق کر دی۔" (ص۳۳)

۵۔ مولوی قاسم علی صاحب فاضل ہیڈ مولوی اسلامیہ ہائی سکول راولپنڈی لکھتے ہیں:۔

"جو مسئلہ تورات میں لکھا ہؤا مل جائے اور وہ قرآن کریم یا حدیث کے بخلاف بھی نہ ہو تو اُس کے ماننے یا محرّف کہنے کے لئے کوئی وجہ نہیں ہے۔"

(روض الریانی فی حقیقۃ الربانی ص۶۲)

اور جن علماء نے بائیبل کی تحریف پر قلم اُٹھایا ہے اس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ عیسائی بائیبل کو اصل معیار اور محک قرار دیتے ہیں اور اس بناء پر قرآن مجید کے اُن مضامین کی تکذیب کر دیتے ہیں جو بائیبل کے خلاف ہوتے ہیں۔ اس لئے علماءِ اسلام نے یہ ثابت کرنے کے لئے کہ اصل محک و میزان قرآن مجید ہے بائیبل پر ہر جہت سے تنقید کی۔ جس کے نتیجے میں یہ روشن ہو گیا کہ بائیبل میں میزان الحق اور فرقان بین الصحیح والغلط ہونے کی اہلیت ہرگز نہیں ہے۔ چنانچہ مولوی عبدالحق صاحب محدّث دہلوی لکھتے ہیں:۔

"اس زمانے میں . . . پادری لوگوں کو بہکاتے پھرتے ہیں بلکہ اہلِ اسلام کے گھروں میں میموں کو بھیجتے ہیں اور وہ گھر کی نوجوانوں سے آکر کہتی ہیں۔ اوّل تمہارے قرآن میں بھی تورات و انجیل و زبور پر ایمان لانے کی تاکید ہے کیتابیں ہمارے پاس ہیں ان پر ایمان لاؤ۔ ان میں جو کچھ لکھا ہے ان کو مانو مسیح خدا کا بیٹا اور دُنیا کا کفارہ ہے۔ جب سادہ لوح اس دام میں آئے تب ان کو اور کچھ سُنایا کہ تمہارے نبی کے پاس کوئی معجزہ نہ تھا۔ اگر ہوتا تو قرآن میں مندرج ہوتا۔ جن کو تم نبی کہتے ہو وہ نبی نہ تھے۔ اس لئے قرآن میں بہت سی غلط باتیں لکھ دیں۔ اور جب کسی نے پوچھا اچھا میم صاحب ان باتوں کے غلط ہونے کی کیا دلیل؟ تو انہوں نے کہا جس کو تم چندروز ہوئے تورات و انجیل مان چکے ہو یہ باتیں ان کے برخلاف ہیں اس لئے غلط ہیں . . . . اس لئے اس پُرآشوب زمانے میں ان کتابوں کی تحقیقات کی ہم کو زیادہ ضرورت ہوئی۔" (مقدمہ تفسیر حقانی ص۱۶)

پھر ص۱۲۳ پر ان کتب کی بعض اغلاط ظاہر کر کے لکھتے ہیں:۔

"پس ایسی غلط کتابوں کے اعتماد پر قرآنی واقعات کو جھوٹ کہنا بڑی سینہ زوری ہے۔ کیا ان اغلاط کے لئے قرآن اصلاح دہندہ نہیں ہو سکتا۔"

اس سے ظاہر ہے کہ بائیبل کے ناقابلِ اعتبار اور غیر الہامی ہونے کے صرف یہ معنی ہیں کہ اس کے مضامین کو اصل اور بطور اساس کے نہ قرار دیا جائے بلکہ اس کی تصحیح و تغلیط کیلئے قرآن مجید کی طرف رجوع کرنا ضروری ہے۔ ورنہ یہ مطلب نہیں کہ اس میں کوئی مضمون بھی صحیح اور الہامی نہیں۔ ہاں بائیبل میں مندرجہ بعض "مضامین کا الہامی ہونا اور بات ہے اور کتاب کا الہامی ہونا اور بات۔ بہت سی غیر الہامی کتابوں میں الہامی مضامین ہوتے ہیں" (مقدمہ تفسیر حقانی صد۱۸۲) "دیکھئے ہدایہ وغیرہ کتب فقہ میں قرآن کے احکام موجود ہوتے ہیں مگر ہدایہ کو قرآن (یا الہامی کتاب) نہیں کہہ سکتے" (صد۱۸۱) پس ٹھیک یہی حال بائیبل کا ہے کہ اس میں الہامی مضامین اور صحیح باتیں بھی موجود ہیں، مگر چونکہ اس میں بعض دیگر غلط باتیں بھی درج ہیں اس لئے اسے الہامی کہنا اور قرآن مجید فی لوح محفوظ کیلئے محک قرار دینا یقیناً سینہ زوری ہے۔ باقی رہا یہ شبہ کہ اس کے الہامی وغیر الہامی مضامین اور صحیح و غلط باتوں میں تمیز کیسے کی جائے تو اس کے لئے الٰہی کتاب مہین کی طرف رجوع کیا جائے گا۔ جو ہر قسم کے انسانی تصرفات سے محفوظ ہے اور محفوظ رہے گی۔ جیسا کہ خود کتب احادیث کے لئے بھی یہی قرآن مجید معیار ہے۔ فتدبر!

علاوہ ازیں حضرت مسیح کے صلیبی واقعات مندرجہ اناجیل ایک تاریخی حیثیت رکھتے ہیں۔ اور اسی حیثیت میں ہم انہیں پیش کرتے ہیں نہ یہ کہ حضرت مسیح علیہ السلام پر الہام اور وحی کے ذریعہ یہ واقعات نازل ہوئے تھے۔ کہ قرآن مجید کے عائد کردہ الزام تحریف کے نیچے آسکیں۔ پس معترضین بتائیں کہ اس صورت میں کیوں ہمیں اختیار نہیں ہے کہ ان پرانی اور دیرینہ کتب کو عہد قدیم کی ایک تاریخی کتب سمجھ کر اور تاریخی کتابوں کے مرتبہ پر رکھکر ان سے فائدہ اٹھائیں۔ اور کس شرعی دلیل اور نص کی رو سے ایسا کرنا حرام اور ممنوع ہے؟

حضرت مسیح موعود علیہ السلام اور کتب اہل کتاب

کتب سابقہ کے متعلق ارشادات حکم و عدل حضرت مسیح موعود علیہ السلام کا خلاصہ یہ ہے کہ یہ کتب اپنی اصلی حالتِ نزول پر اب قائم نہیں رہیں ان میں لفظی و معنوی تحریف ہو چکی ہے۔ تاہم بعض صداقتیں اب بھی ان میں موجود ہیں۔ پس جو باتیں خلافِ قرآن و حدیث نہ ہوں ان کو صحیح تسلیم کرنا شرعاً ممنوع اور ناجائز نہیں ہے۔ اس بارے میں حضرت اقدس علیہ السلام کے بعض حوالجات ذیل میں لکھے جاتے ہیں۔

(۱) "آزرہ دستی سے یہ نہیں کہنا چاہئے کہ یہ ساری کتابیں محرف و مبدل ہیں۔ بلاشبہ ان مقامات (نزولِ ایلیا۔ ناقل) سے تحریف کا کچھ علاقہ نہیں اور دونو فریق یہود و نصاریٰ ان عبارتوں کی صحت کے قائل ہیں۔ اور پھر ہمارے امام المحدثین حضرت...... اسمٰعیل صاحب اپنی صحیح بخاری میں یہ بھی لکھتے ہیں کہ ان کتابوں میں کوئی لفظی تحریف نہیں۔" (ازالہ اوہام حصہ اول صـ۱۱۳)

(۲) چشمۂ معرفت میں فرماتے ہیں:۔

"یہ کہنا کہ وہ کتابیں محرف و مبدل ہیں، ان کا بیان قابلِ اعتبار نہیں ایسی بات وہی کہے گا جو خود قرآن شریف سے بے خبر ہے۔ کیونکہ اللہ جلّ شانہٗ مومنوں کو قرآن شریف میں فرماتا ہے فاسئلوا اھل الذکر ان کنتم لا تعلمون۔ یعنی فلاں فلاں باتیں اہل کتاب سے پوچھ لو اگر تم بے خبر ہو۔ پس ظاہر ہے کہ اگر ہر ایک بات میں پہلی کتابوں کی گواہی ناجائز ہوتی تو خدا تعالیٰ کیوں مومنوں کو فرماتا کہ اگر تمہیں معلوم نہیں تو اہل کتاب سے پوچھ لو۔ بلکہ اگر نبیوں کی کتابوں سے کچھ فائدہ اٹھانا حرام ہے تو اس صورت میں یہ بھی ناجائز ہوگا کہ ان کتابوں میں سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نسبت بطور استدلال پیشگوئیاں پیش کریں۔ حالانکہ خود صحابہ رضی اللہ عنہم اور بعد ان کے تابعین بھی ان پیشگوئیوں کو بطور حجت پیش کرتے رہے ہیں۔ بلکہ اصل بات یہ ہے کہ کتب سابقہ کے بیان تین قسم کے ہیں (۱) ایک تو وہ باتیں ہیں جو واجب التصدیق ہیں۔ جیساکہ خدا کی توحید اور ملائک کا ذکر اور بہشت و دوزخ کے وجود کی نسبت بیان۔ اگر ان کا انکار کریں تو ایمان جائے۔ (۲) دوسری وہ باتیں ہیں جو رد کرنے کے لائق ہیں جیساکہ وہ تمام امور جو قرآن شریف کے مخالف ہیں (۳) تیسری قسم کی وہ باتیں ہیں جو قرآن شریف میں اگرچہ ان کا ذکر مفصّل نہیں مگر وہ باتیں قرآن شریف کے مخالف نہیں۔ بلکہ اگر ذرا غور سے کام لیا جائے تو بالکل مطابق ہیں۔ جیسے مثلاً یاجوج ماجوج کی قوم کہ اجمالی طور پر ان کا ذکر قرآن شریف میں موجود ہے۔" (حاشیہ ۷۶، ۷۷)

(۳) "تحریف تو بے شک بعض مقاماتِ بائیبل میں ہوئی ہے۔ مگر جس

مقام کو خود حضرت مسیح نے غیر محرف ٹھہرادیا ہے وہ مقام بلاشبہ حضرت مسیح اور یہود کے اتفاق سے تحریف کے الزام سے پاک ہے۔ ..... پس ہم بہر حال اس قصہ (آمد ایلیا) کی تکذیب کے مجاز نہیں ہیں۔"

(ضیاء الحق صفحہ ۲)

اور صفحہ ۲۳ پر فرمایا:-

"ہم کہتے ہیں کہ اللہ اور رسول نے اس (قصہ) کی تحریف کی ہم کو خبر نہیں دی۔ للذا ہم بموجب حدیث صحیح کے تکذیب کرنے کے مجاز نہیں ہیں۔ اگر لا تصدقوا پر نظر ہے تو لا تکذبوا بھی ساتھ یاد رکھو"

(۴) "اِن انجیلوں پر قدیم سے یہ بھی الزام چلا آتا ہے کہ وہ اپنی صحت پر باقی نہیں رہیں ..... ہمارے پاس کوئی پختہ دلیل اِس بات پر نہیں کہ کیوں ..... اِن انجیلوں کا کُل لکھا ہوا مان لیا جائے۔"

(مسیح ہندوستان میں صفحہ ۲)

اور صفحہ ۲ پر فرمایا:-

"یہ انجیلیں اپنی اصلی حالت پر قائم نہیں رہیں۔"

ضروری تصحیح

افسوس ہے کہ باوجود کافی احتیاط کے گذشتہ رسالہ میں طبع شدہ مضمون میں حسب ذیل اغلاط رہگئی ہیں۔ ناظرین درست فرمالیں۔

نمبر شمار	صفحہ / سطر	غلط	صحیح
۱	۳ / ۱۹	مغیرتانہ	مفتریانہ
۲	۲۴ / ۱۸	مشورہ نہیں	مشورہ مانیں
۳	۲۵ / ۵	اسی ارشاد	اِس ارشاد
۴	۲۵ / ۲۴	بیری کالمہ مفات	بُری کالمرہفات
۵	۵۳ / ۳	آپ	آپ نے

ایڈیٹر

۲۰ فروری

(از جناب مولوی بشیر احمد صاحب سیالکوٹی مولوی فاضل)

سیدنا حضرت اقدس مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اوائل جنوری ۱۸۸۶ء میں اللہ تعالیٰ کی مشیت اور اس کے حکم کے مطابق ہوشیارپور میں شیخ مہر علی صاحب رئیس ہوشیارپور کے طویلہ میں اعزلت نشینی کی۔ آپ کی یہ چلہ کشی کی غرض جیسا کہ حضورؑ کی تحریرات سے معلوم ہوتا ہے، اسلام کے مستقبل کے لئے دعائیں کرنا تھی۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کی ان دعاؤں کو سُنا اور قبول فرمایا۔ چنانچہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے ۲۰ فروری ۱۸۸۶ء کو ایک اشتہار کے ذریعہ اِس امر کی خبر تمام دُنیا کو دی کہ اللہ تعالیٰ نے میری تضرعات کو سُنا ہے، اور قبول فرمایا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ تیری ذریت اور نسل سے ایک عظیم الشان انسان پیدا ہوگا، جس کے ہاتھ سے میں حمایت اسلام کی بُنیاد رکھوں گا۔ اِس لحاظ سے ۲۰ فروری سلسلہ عالیہ احمدیہ کی تاریخ میں ایک اہم تاریخی دن ہے۔ کیونکہ اِس دن اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک عظیم الشان مصلح کے پیدا ہونے کی خبر دی گئی۔ جس کے ساتھ اسلام کی آئندہ ترقیات وابستہ تھیں۔ اِس پیشگوئی کے اصل الفاظ یہ ہیں:-

"مَیں تجھے رحمت کا ایک نشان دیتا ہوں۔ اُسی کے موافق جو تُو نے مجھ سے مانگا۔ سو مَیں نے تیری تضرعات کو سُنا اور تیری دُعاؤں کو بپایۂ قبولیت جگہ دی۔ اور تیرے سفر کو (جو ہوشیارپور اور لدھیانہ کا سفر ہے) تیرے لئے مبارک کر دیا۔ سو قدرت اور رحمت اور قربت کا نشان تجھے دیا جاتا ہے فضل اور احسان کا نشان تجھے عطا ہوتا ہے اور فتح اور ظفر کی کلید تجھے ملتی ہے۔ اے مظفر تجھ پر سلام۔ خدا نے یہ کہا تا جو زندگی کے خواہاں ہیں موت کے پنجے سے نجات پاویں۔ اور وہ جو قبروں میں دبے پڑے ہیں باہر آویں اور تا دین اسلام کا شرف اور کلام اللہ کا مرتبہ لوگوں پر ظاہر ہو۔ اور حق اپنی

تمام برکتوں کے ساتھ آجائے اور باطل اپنی تمام نحوستوں کے ساتھ بھاگ جائے۔ اور تا لوگ سمجھیں کہ میں قادر ہوں۔ جو چاہتا ہوں سو کرتا ہوں۔ اور تا وہ یقین لائیں کہ میں تیرے ساتھ ہوں۔ اور تا انہیں جو خدا کے وجود پر ایمان نہیں لاتے اور خدا اور خدا کے دین اور اس کی کتاب اور اس کے پاک رسول محمد مصطفیٰ کو انکار اور تکذیب کی نگاہ سے دیکھتے ہیں ایک کھلی نشانی ملے۔ اور مجرموں کی راہ ظاہر ہو جاوے۔ سو تجھے بشارت ہو کہ ایک وجیہہ اور پاک لڑکا تجھے دیا جائے گا۔ ایک زکی غلام (لڑکا) تجھے ملے گا۔ وہ لڑکا تمہارا مہمان آتا ہے۔ اس کا نام عنموائیل اور بشیر بھی ہے۔ اس کو مقدس روح دی گئی ہے۔ اور وہ رجس سے پاک ہے اور وہ نور اللہ ہے۔ مبارک وہ جو آسمان سے آتا ہے۔ اس کے ساتھ فضل ہے جو اس کے آنے کے ساتھ آئے گا۔ وہ صاحب شکوہ اور عظمت اور دولت ہوگا وہ دنیا میں آئے گا اور اپنے مسیحی نفس اور روح الحق کی برکت سے بہتوں کو بیماریوں سے صاف کرے گا۔ وہ کلمۃ اللہ ہے۔ کیونکہ خدا کی رحمت و غیوری نے اسے کلمۂ تمجید سے بھیجا ہے۔ وہ سخت ذہین و فہیم ہوگا اور دل کا حلیم۔ اور علوم ظاہری و باطنی سے پُر کیا جائے گا۔ اور وہ تین کو چار کرنے والا ہوگا (اس کے معنی سمجھ میں نہیں آئے۔) دوشنبہ ہے۔ مبارک دوشنبہ۔ فرزند دلبند گرامی ارجمند مظہر الاول والآخر مظہر الحق والعلاء کان اللہ نزل من السماء۔ جس کا نزول بہت مبارک اور جلال الٰہی کے ظہور کا موجب ہوگا۔ نور آتا ہے۔ نور جس کو خدا نے اپنی رضامندی کے عطر سے ممسوح کیا۔ ہم اس میں اپنی روح ڈالیں گے۔ اور خدا کا سایہ اس کے سر پر ہوگا۔ وہ جلد جلد بڑھے گا اور اسیروں کی رستگاری کا موجب ہوگا۔ اور زمین کے کناروں تک شہرت پائے گا۔ اور قومیں اس سے برکت پائیں گی۔ تب اپنے نفسی نقطہ آسمان کی طرف اٹھایا جائیگا۔ وکان امراً مقضیاً۔" (تبلیغ رسالت جلد اول ص۔)

[illegible] پسر موعود کے الہامی الفاظ ہیں۔ جن میں یہ خبر دی گئی ہے۔ کہ [illegible] اللہ تعالیٰ اس کے ذریعہ سے احمدیت اور اسلام کو نمایاں ترقی [illegible] بمنزلہ ایک عظیم انقلاب کے ہوگا۔ اس کے ذریعہ [illegible] وہ دنیا کے کناروں تک شہرت پائے گا۔ اور قومیں اس سے برکت پائیں گی [illegible] اللہ ہوگا اور اللہ تعالیٰ کی رضامندی کے عطر سے ممسوح ہوگا وہ جلد جلد بڑھے گا اور خدا تعالیٰ کے جلال کا مظہر ہوگا۔ ان الفاظ سے ظاہر ہے کہ وہ فرزند دلبند گرامی ارجمند کس شان کا انسان ہوگا۔

اگرچہ جماعت احمدیہ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کی زندگی میں بھی یہ عقیدہ رکھتی تھی کہ سیدنا محمود ایدہ اللہ الودود ہی اس پیشگوئی کے مصداق ہیں جیسا کہ صاجزادہ پیر منظور محمد صاحب کے رسالہ "پسر موعود" سے ظاہر ہوتا ہے۔ اور ایسے ہی دیگر صحابہؓ کا عقیدہ تھا جیسے پیر سراج الحق صاحب نعمانی اور جناب سیٹھ محمد اسمٰعیل صاحب تاجر بمبئی وغیرہ۔ مگر جب اللہ تعالیٰ نے اس امر کو زیادہ نمایاں کرنا چاہا تو سیدنا حضرت امیر المومنین ایدہ اللہ تعالیٰ کو بذریعہ الہام اطلاع دی گئی، کہ آپ ہی اس پیشگوئی کے مصداق ہیں۔ چنانچہ حضور نے ۲۸ جنوری ۱۹۴۴ء کو اپنے خطبہ جمعہ میں اس امر کا اعلان فرمایا کہ مجھے اللہ تعالیٰ نے خبر دی ہے کہ میں ہی اس پیشگوئی کا مصداق ہوں۔ میں نے یہ فیصلہ اپنی رائے اور عقل سے نہیں کیا بلکہ اللہ تعالیٰ کے فرمان اور اسکے ارشاد وانا المسیح الموعود مثیلہ وخلیفتہ سے کیا ہے۔ چنانچہ اس کے بعد وہ سوال بھی حل ہوگیا جو اہل پیغام کی طرف سے متواتر کیا جاتا تھا۔ کہ اگر آپ (حضور ایدہ اللہ) اس پیشگوئی کے مصداق ہیں تو خود کیوں اعلان نہیں کرتے۔ کہ میں اس پیشگوئی کا مصداق ہوں۔

اس پیشگوئی کی عظمت کے لحاظ سے، اور اس لحاظ سے کہ یہ پیشگوئی اللہ تعالیٰ نے ہمارے زمانہ میں پوری کی اور جس کی گذشتہ انبیاء نے خبر دی تھی ۲۰ فروری کا دن جماعت احمدیہ کی تاریخ میں ایک اہم تاریخی دن ہے۔ اور یہ کہنا بجا ہوگا کہ [illegible] احمدیہ کے لئے عید کا دن ہے۔ اس دن اللہ تعالیٰ نے ایک عظیم الشان [illegible] کے پیدا ہونے کی خبر دی۔ جو کہ ہماری آنکھوں کے سامنے زندہ موجود ہے۔

ہم اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں کہ وہ تمام علامات جو اس پیشگوئی میں اس مصلح کے لئے بتائی گئی ہیں وہ سب سیدنا حضرت اقدس امیرالمومنین خلیفۃ المسیح الثانی ایدہ اللہ بنصرہ العزیز کے وجود باجود میں پائی جاتی ہیں پس ہمیں اللہ تعالیٰ کا شکریہ ادا کرنا چاہئے کہ اس نے ہمیں ایک عدیم المثال امام اور مصلح عطا فرمایا اور اپنی ذمہ داریوں کا احساس بھی کرنا چاہئے یہ ایک مسلّمہ بات ہے کہ جس انسان یا جس قوم پر اللہ تعالیٰ کا انعام ہو اس کی ذمہ واری بہت بڑھ جاتی ہے۔ پس ہمیں بھی چاہئے کہ اللہ تعالیٰ کا خاص طور پر شکریہ ادا کریں کہ اس نے ہمیں یہ نعمت غیر مترقبہ عطا فرمائی۔ اور اس کے حضور پُر زور دعائیں کریں کہ اللہ تعالیٰ حضور کے سایہ کو زیادہ سے زیادہ دیر تک ہمارے سروں پر قائم رکھے۔ آپ کو لمبی سے لمبی اور صحت بخش عمر عطا فرمائے۔ تاکہ ہم آپ کے فیوض سے زیادہ سے زیادہ متمتع ہو سکیں۔ ربّنا تقبّل منّا انّک انت السّمیع العلیم۔

مصلح موعود کی بعض علامات اس قدر واضح اور بیّن ہیں کہ کوئی صاحب انصاف ان سے انکار نہیں کر سکتا۔ مثلاً ایک علامت یہ بتائی گئی ہے کہ قومیں اس سے برکت پائیں گی۔ چنانچہ اس وقت سیدنا حضرت اقدس امیرالمومنین ایدہ اللہ بنصرہ العزیز کے طفیل بہت سی اقوام حلقہ بگوش احمدیت ہو چکی ہیں۔ مشرقی اور مغربی افریقہ میں ہزاروں کی تعداد میں احمدیہ جماعت کے افراد پائے جاتے ہیں جو محض حضور کے طفیل احمدیت کو قبول کر چکے ہیں۔ امریکہ میں سینکڑوں کی تعداد میں احمدی پائے جاتے ہیں۔ جزائر سماٹرا، جاوا، بورنیو، سنگاپور، سٹریٹ سیٹلمنٹ وغیرہ میں اللہ تعالیٰ کے فضل سے بڑی بڑی جماعتیں قائم ہو چکی ہیں اور سیدنا حضرت اقدس امیرالمومنین ایدہ اللہ الودود کے خدام غیر ممالک میں دوسری اقوام کو برکت دینے کے لئے جس کثرت سے جا رہے ہیں اس سے یہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ حضور ایدہ اللہ کے دل میں اس بات کے لئے کس قدر جوش ہے کہ آپ کے عہد میں جماعت ترقی کرے اور دوسری اقوام حلقہ بگوش احمدیت ہو کر زیادہ سے زیادہ برکت حاصل کریں۔ اس وقت تک قریباً پچیس تیس کے قریب مبلغ غیر ممالک میں جا چکے ہیں اور اس قدر ہی تیار بیٹھے ہیں۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ حضور کے ان خدام کے ساتھ ہو اور حضور کے مقصد اور منشاء کے مطابق ان کو کام کرنے کی توفیق دے۔ اور ہر رنگ میں اُن کا محافظ اور حامی و ناصر ہو۔ آمین۔

ایک علامت یہ بتائی گئی ہے کہ وہ اسیروں کی رستگاری کا موجب ہوگا۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ

یہ علامت بھی حضور ایدہ اللہ کی ذاتِ مبارک میں پوری شان سے جلوہ گر ہے۔ حضور ایدہ اللہ تعالیٰ نے کشمیر ایجی ٹیشن کے موقع پر اہلِ کشمیر کی جس رنگ میں مدد فرمائی اس سے عیاں ہے کہ کشمیری قوم جو کہ صدیوں سے غلامانہ زندگی بسر کرتی چلی آرہی تھی اور اس کو انسانیت کے حقوق سے بھی حصہ نہیں دیا جاتا تھا آپ نے اس قوم کی مدد کی اور آپ کی کوشش بارآور ہوئی۔ چنانچہ بہت سی رعائتیں اور حقوق آپ کی کوشش کے مطابق اس قوم کو دیئے گئے۔

اگر اسیر سے مراد بُری رسم و رواج میں جکڑے ہوئے انسان ہوں، اور وہ انسان مراد ہوں جن کے عقائد اور خیالاتِ فاسدہ اُن کو اصل مقصدِ حیات سے دُور لے جا رہے ہوں اور یہی معنے زیادہ مناسب اور موزوں بھی ہیں تو بھی حضور ایدہ اللہ تعالیٰ کے ذریعہ سے غیر مذاہب اور غیر اقوام کے لوگ اپنی اپنی قیدوں سے نکل کر اسلام میں داخل ہو رہے ہیں۔

اس ضمن میں کارزارِ شُدھی کا واقعہ بیان کرنا خالی از دلچسپی نہ ہوگا۔ ملکانہ میں آریہ تحریک نے زور پکڑا اور کئی ہزار مسلمانوں کو آریہ بنا لیا گیا۔ حضور ایدہ اللہ تعالیٰ نے جو کہ اسیروں کے رستگار تھے اپنے خدام کو جمع کر کے وہاں بھجوایا۔ اور آپ کی کوشش سے وہ مسلمان دوبارہ حلقہ بگوش اسلام ہوئے اور آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی مخالفت کی بجائے آپ پر درود بھیجنے لگے۔ اللّٰھم صلّ علیٰ محمّد وبارک علیٰ محمّد صلّی اللہ علیہ وسلم۔

ایک علامت یہ بتائی گئی ہے کہ وہ موجبِ ظہورِ جلالِ الٰہی ہوگا۔ چنانچہ یہ علامت بھی حضور ایدہ اللہ کی شان میں پوری طرح صادق آتی ہے۔ حضور ایدہ اللہ تعالیٰ جب مسندِ خلافت پر جلوہ افروز ہوتے ہیں تو اللہ تعالیٰ نے اپنے جلال کا ظہور فرمایا۔ اور جنگِ عظیم شروع ہوئی۔ جس میں اللہ تعالیٰ کا جلال پوری طرح ظاہر ہوا۔ تمام دُنیا اس ہیبتناک جنگ میں لپیٹی گئی اور اس نے اللہ تعالیٰ کے جلال کو ملاحظہ کیا۔ اس کے بعد ۱۹۳۹ء میں دوسری جنگ عظیم شروع ہوئی جو کہ پہلی سے بھی زیادہ خطرناک اور پہلی سے بھی زیادہ جلال الٰہی کے ظہور کا موجب ہوئی۔

الغرض آپ کی خلافت میں ان دو عظیم الشان جنگوں کا ہونا اس امر پر دال ہے کہ آپ کا ظہور جلالِ الٰہی کا موجب ہے۔ اس کے علاوہ بھی حضور ایدہ اللہ تعالیٰ کا وجود جلال الٰہی کا موجب ہے کیونکہ ایدہ اللہ نے کئی ایک ایسے نشانات اور پیشگوئیاں شائع فرمائی ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ واقعی آپ کا ظہور جلال الٰہی کا موجب ہے۔ اللّٰھم متّعنا بطولِ حیاتہم۔ آمین۔

پھر ایک علامت یہ بتائی گئی ہے کہ وہ علوم ظاہری و باطنی سے پُر کیا جائے گا [illegible]
بھی بڑی شان کے ساتھ حضور ایدہ اللہ کی ذات میں جلوہ گر ہے کہ سیدنا حضرت امیر المومنین
ایدہ اللہ تعالیٰ کو اللہ تعالیٰ نے کس قدر علم غیب سے نوازا ہے۔ اکثر احباب کو علم ہوگا کہ جس
احرار نے احمدیت اور اسلام کی مخالفت میں سر دھڑ کی بازی لگا دی تھی۔ اور انہوں نے احمدیت
کو نقصان پہنچانے کی پوری کوشش اور جدّ و جہد خرچ کر دی تھی۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے اس
عظیم الشان مصلح کی معرفت فرمایا کہ "میں احرار کے پاؤں تلے سے زمین نکلتی دیکھ رہا ہوں"۔ احرار کی
اُس وقت بہت عزت تھی، اللہ تعالیٰ نے اس کے بعد ایسے مواقع پیش کر دیئے جس سے احرار
کی عزت خاک میں مل کر رہ گئی۔ شہید گنج کا واقعہ پیش آگیا۔ جس میں ان کی اس قدر مٹی پلید
ہوئی کہ الامان۔ اور اس کے بعد پے در پے اس قدر واقعات رونما ہوئے کہ ان کی ساری
تدبیریں خاک میں مل گئیں۔ چنانچہ اس وقت بھی یہ الہام اپنی طاقت دکھلا رہا ہے۔ موجودہ
الیکشن میں احرار نے مسلم لیگ سے علیحدگی اختیار کر کے اپنے نمائندے سنٹرل اور صوبجاتی
اسمبلی میں کھڑے کئے۔ اللہ تعالیٰ کی مشیت سے اس میں بھی ان کو کامیابی نہیں ہوئی بلکہ انکے
وقار اور عزت کو مزید صدمہ پہنچا ہے۔ یہ اجر اور بدلہ ہے اس امر کا کہ ان لوگوں نے احمدیت
کو ذلیل کرنا چاہا مگر اللہ تعالیٰ نے خود ان کے ہاتھوں سے ان کی مٹی پلید کر دی۔

خیر یہ تو دیر کی بات ہے، اس وقت بھی حضرت امیر المومنین ایدہ اللہ تعالیٰ کی ایک درجن
سے زیادہ قبل از وقت بتائی ہوئی باتیں پوری ہو چکی ہیں۔ موجودہ جنگ میں حضرت امیر المومنین
ایدہ اللہ کو جس قدر علم غیب سے نوازا گیا اس کی مثالیں دُنیا میں تلاش کرنے پر نہیں مل سکتیں۔
اللہ تعالیٰ نے آپ کو انگریزوں کی فتح کی خوشخبری دی، اور اس وقت جبکہ انگریز پے در پے
شکستیں کھا کر افریقہ میں اپنے دم توڑ رہے تھے، آپ نے فرمایا کہ مجھے بذریعہ علم الٰہی بتایا
گیا ہے کہ آخر انگریزوں کی فتح ہوگی۔

پھر مسٹر مارلیسن جو کہ انگلستان کی اپوزیشن پارٹی کے ایک رُکن تھے اور حضور کو انکے
متعلق کوئی خاص علم نہ تھا اُن کے متعلق آپ کو قبل از وقت اطلاع دی گئی کہ وہ نئی حکومت میں
ایک نمایاں حیثیت حاصل کرنے والے ہیں۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔

کنگ لیوپولڈ تخت سے علیٰحدہ کر دیا گیا، اس کی خبر بھی آپ کو دی گئی تھی۔ پھر فرانس اور
برطانیہ کا آپس میں اتحاد اور دونوں حکومتوں کے وجود کو آپس میں اس طرح مدغم کر دینا کہ دونوں

[illegible] وجود ہے۔ یہ تاریخ میں ایک عدیم المثال واقعہ تھا جس کی آپ کو خبر دی گئی۔

مستالفین کی بیماری کی خبر آپ کو دی گئی۔ الغرض کئی ایک خبریں ہیں جو کہ اس جگہ بیان کی گئی اطلاع کے مطابق پوری ہوئی ہیں۔ اور بعض پوری ہو رہی ہیں۔ اللّٰھم زدفزد۔

اللہ تعالےٰ نے آپ کو علوم قرآن کا ایک بہت بڑا خزانہ عطا کیا ہے۔ حضور ایدہ اللہ کئی موقعوں پر اپنے اوپر اللہ تعالےٰ کے اس انعام کا ذکر کر کے فرما چکے ہیں کہ اللہ تعالےٰ نے مجھے اپنی طرف سے قرآن مجید کے ایسے ایسے حقائق اور معارف سے آگاہ کیا ہے کہ جس کی نظیر اس زمانہ میں کوئی شخص پیش نہیں کر سکتا۔ چنانچہ ہم اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں کہ تفسیر کبیر میں حضور نے حقائق و معارف اور علوم کے دریا بہائے ہیں کہ جو واقعی بے نظیر ہیں حضور نے بار بار اپنے مخالفین کو علوم قرآن میں مقابلے میں آنے کی دعوت دی ہے مگر کسی کو جرأت نہیں ہوئی کہ اسے قبول کرے۔ مولوی محمد علی صاحب اور مولوی ثناء اللہ صاحب ہمیشہ میدانِ مقابلہ سے فرار کے بہانے تلاش کرتے رہتے ہیں مگر سامنے نہیں آتے۔

الغرض آپ کے ذریعہ اسلام کی ترقی کا ایک نیا دور شروع ہوا ہے اور نظر آ رہا ہے کہ انشاء اللہ بہت جلد اسلام دُنیا میں غالب آجائے گا۔ کیونکہ یہی آسمانی فیصلہ ہے جس سے اللہ تعالےٰ نے ۲۰ر فروری ۱۸۸۶ء کو حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کو اطلاع دی۔

عرشی صاحب میرے سوالات کا جواب کیوں نہیں دیتے

(از جناب ماسٹر عطا محمد صاحب ریٹائرڈ اورنٹیل ٹیچر)

۲۴ر نومبر ۱۹۴۵ء کو میں نے ایک خط کے ذریعہ عرشی صاحب سے چند ایک سوالات کر کے ان کے جواب کا مطالبہ کیا۔ جس کے جواب میں انہوں نے ۷ر دسمبر ۱۹۴۵ء کو سوالات کا جواب دینے کی بجائے مجھ سے چند ایک اور مطالبے کر دیئے۔ ان مطالبات کا جواب دینے کے لئے بھی جب میں نے فوری طور پر اپنی آمادگی کا اظہار کیا تو عرشی صاحب ؎

"لب از گفتن چناں بستم کہ گوئی ، دہاں بر چہرہ زخمے بود بہ شد"

کا مصداق ہو گئے۔

متواتر دو ماہ کے بے سود انتظار کے بعد میں وہ خط و کتابت شائع کر کے ان سے صرف یہ دریافت کرنا چاہتا ہوں کہ کیا آئندہ کے لئے اس معاملہ کو ختم سمجھا جاوے؟

محلہ دار الفضل قادیان بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ـ نحمدہ و نصلی علی رسولہ الکریم

ایم عطا محمد ریٹائرڈ اورنٹیل ٹیچر

مکرمی جناب عرشی صاحب

السلام علیکم و رحمۃ اللہ و برکاتہٗ۔ میرے سامنے رسالہ البیان ماہ نومبر ۱۹۴۵ء پڑا ہے جس میں آپ نے اپنے ایک فقرہ "حضرت مرزا صاحب کو میں نے کبھی جھوٹا نہیں سمجھا" کے متعلق برقی صاحب کی تحریک کے جواب میں اپنے خیالات کا اظہار فرمایا ہے۔ چونکہ اسی رسالہ کے سرورق پر یہ ادعا کیا گیا ہے کہ "ہندوستان بھر میں البیان ہی ایک ایسا جریدہ ہے جو پوری فراخدلی کے ساتھ مخالفانہ تنقیدوں کو بھی اپنے آغوش میں جگہ دے سکتا ہے۔ اس لئے میں بھی یہ توقع رکھ سکتا ہوں کہ آپ میرے سوالات کو اس رسالہ میں شائع فرما کر مجھے ان کے جوابات سے سرفراز فرمائیں گے اگر آپ رسالہ کے ذریعے جواب دینا کسی وجہ سے پسند نہ فرمائیں تو براہ کرم خط کے جواب سے بذریعہ ڈاک ہی خوش وقت فرما کر عند اللہ ماجور ہوں۔ سوالات حسب ذیل ہیں:-

(۱) مولوی محمد علی صاحب کی ملاقات کا ذکر کرتے ہوئے رسالہ ہذا کے صفحہ پر آپ نے

تحریر فرمایا ہے "کاش مسلمان بھائی اس حقیقت کو سمجھیں اور فرقہ بازی سے بلند ہو کر اپنی تمام کوششیں اشاعت اسلام کی تبلیغ و تعمیل میں صرف کریں" اس کے متعلق عرض ہے کہ اسی رسالہ کے صفحہ ایک طرف تو آپ یہ فرماتے ہیں کہ "یہ حقائق ہیں اور یہ واقعات .... ان کی موجودگی میں یہ دعویٰ کس قدر مضحکہ خیز معلوم ہوگا کہ مسلمانوں کی تہذیب صرف ٹونٹی والا لوٹا ہے۔ نہیں، بلکہ مسلمانوں کی تہذیب ہے دشنام طرازی .... نفاق پروری .... شرانگیزی .... سفلہ خوئی ...... ان کے لیڈر ایک دوسرے کے خون کے پیاسے، ان کے عوام سیلیوں، کلہاڑیوں اور لاٹھیوں سمیت ایک دوسرے کے دشمن اور ان کے اخبار بہتان و تہمت اور سب وشتم کے پلندے .... اسلام اور مسلمانوں کی بربادی تو اب مکمل ہو چکی ہے۔ اور اس کی نوحہ گری بالخصوص شعر ذیل کی صحیح مناسبت تو اب پیدا ہوئی ہے

اے محمدؐ گر قیامت را برآری سر زخاک ÷ سر برآر و ایں قیامت در میان خلق بیں

یہ تو فرقہ باز مسلمانوں کا حال ہے۔"

اور دوسری طرف البیان ماہ جون ۱۹۴۵ء کے صفحہ پر خود اپنے متعلق یہ فتویٰ صادر فرماتے ہیں:-

"بڑے ہی دکھ کے ساتھ اس تلخ حقیقت کا اعتراف کرنا پڑتا ہے۔ کہ سچ مچ ہم لوگ کافر ہیں۔ اس لئے کہ ہم قرآن مجید اور سنت انبیاء علیہم السلام کو عملاً ترک کر چکے ہیں۔ اور ہم اللہ کی راہ میں رکاوٹ بنے ہوئے ہیں۔"

سوال یہ ہے کہ جب اسلام اور دوسرے مسلمانوں کی اصل بربادی مکمل ہو چکی ہے اور آپ خود اپنے کفر اور "صد عن سبیل اللہ" کے اقراری مجرم بن چکے ہیں تو قادیانیوں سے مایوس ہو کر اپنے ان لاہوری بھائیوں کو کونسے اسلام کی طرف بلا رہے ہیں؟ اور اس اسلام کا دعویدار اور صحیح معنوں میں مصداق ہے کون اور وہ رہتا کہاں ہے؟

(۴) رسالہ البیان ماہ جون ۱۹۴۳ء کے صفحہ پر آپ رقمطراز ہیں:-

"صوم و صلوٰۃ اور حج و زکوٰۃ کے جو نتیجے قرآن نے بتائے اور صحابہ کرام (رضوان اللہ علیہم) نے حاصل کئے ہم ان سے کلیۃً محروم ہیں۔"

اس کے متعلق عرض ہے کہ (۱) صوم و صلوٰۃ، حج و زکوٰۃ کے نتیجے قرآن نے

کیا بیان فرمائے (۲) صحابہ کرام کو وہ نتیجے کیوں حاصل ہو گئے۔ (۳) آپ کی ان نتائج سے محرومی کی وجہ کیا ہے۔ اور یہ نتائج کسی طرح آپ کے لئے ممکن الحصول بھی ہو سکتے ہیں ؟"

(۳) البیان نومبر ۱۹۵۰ء کے صفحہ ۳ پر آپ فرماتے ہیں "کوئی بتائے کہ اس قسم کے الہام "مجھے حمل ہوا۔ حیض آیا۔ درد زہ نے ستایا۔ اپنے پیٹ سے میں خود پیدا ہوا" کس چیز کی غمازی کر رہے ہیں۔ یہ الہام آپ نے حضرت مرزا صاحبؑ کی کونسی کتاب میں پڑھا ہے۔ براہِ کرم مکمل حوالہ دیکر ممنون فرمائیں۔

(۴) البیان نومبر ۱۹۵۰ء کے صفحہ ۴ پر آپ نے اخبار بدر، الحکم اور سیرۃ المہدی میں سے چند ایک حوالجات درج کر کے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ "مرزا صاحبؑ ایک مریض دل و دماغ کے آدمی تھے" اسکے متعلق عرض ہے کہ کوئی عقلمند دنیا میں ایسا نہیں ہو سکتا جو مریض دل و دماغ کے آدمی کی ہر بات کی تردید کے پیچھے پڑ جائے اور اپنا قیمتی وقت اور محنت سے کمایا ہوا مال ایسی فضول کام میں نہ صرف یہ کہ ایک دفعہ صرف کرے بلکہ اس مصرف کو اپنی زندگی کا نصب العین مقرر کرلے اور اگر کوئی ایسا ہو تو اسکے اپنے "مریض دل و دماغ کے آدمی" ہونے میں کیا شبہ ہو سکتا ہے۔ غالباً آپ میرے اس نظریے سے متفق ہونگے۔ اگر جواب اثبات میں ہے تو میں آپ سے دریافت کرتا ہوں کہ فرض کرلیں مرزا صاحبؑ "مریض دل و دماغ کے آدمی تھے" مگر مسلمانوں، ہندوؤں، سکھوں اور عیسائیوں کے عقلمندوں کی عقل پر پتھر کس طرح پڑ گئے کہ وہ سب پنجے جھاڑ کر اس "مریض دل و دماغ کے آدمی" کے پیچھے پڑ گئے۔ اور اگر جواب نفی میں ہو تو کسی ایسے "مریض دل و دماغ" کی باقی دنیا کو چھوڑ کر اپنے ہی شہر امرتسر میں نشان دہی کریں جو باوجود "مریض دل و دماغ کا آدمی" ہونیکے ہر قسم کے چوٹی کے عقلمندوں کا ہدف ملامت بھی بنا ہوا ہو۔

(۵) فرقہ بازی کی دلدل سے نکلنے اور خالص اسلام کی خدمت (تبلیغ) کرنیکا جو مشورہ قادیانیوں سے مایوس ہو کر اپنے ان لاہوری بھائیوں کو دیا ہے اسکے متعلق تو وہ خود ہی فیصلہ کرینگے کہ انہیں اس مشورہ پر کس رنگ میں اور کہاں تک عمل کرنا چاہیئے۔ البتہ جہاں مجھے اس بات کا افسوس ہے کہ باوجود اسکے کہ وہ گذشتہ ۳۲ سال سے تابمقدور اس مشورہ پر عمل درآمد کرنیکی کوشش کر رہے ہیں آپنے انکی ان مساعی جمیلہ کی کوئی داد نہیں دی وہاں میں آپکی خدمت میں بھی یہ سوال کرنیکی جرأت ضرور کرونگا کہ اگر آج آپنے خود کو کسی امام کی طرف منسوب کرنیکی بجائے "بے نامی" کی دلدل میں ہی پھنسے

رہنے پر اصرار کیا تو بنیں واں یوم ندعوا کل اناس بامامہم کے منشائے ایزدی کے مطابق اللہ تعالےٰ لوگوں کو انکے اپنے اپنے امام کے نام سے پکاریگا۔ ذرا قرآن کریم کی رو سے اتنا بتلادیجئے کہ اسدن آپکا ٹھکانا کہاں ہوگا؟

امید ہے کہ رسالہ میں شائع کرنیکی صورت میں آپ میرے سوالات من وعن درج کرکے جواب دینے کی کوشش فرمادیں گے۔ چونکہ مجھے معلوم نہیں کہ رسالہ کے ایڈیٹر آپ ہیں یا کوئی اور صاحب اور دوسری صورت میں آپکے مکمل ایڈریس کا بھی مجھے علم نہیں اس لئے ایڈیٹر صاحب رسالہ البیان کے نام پر خط ارسال کر رہا ہوں۔ اور اگر کوئی اور صاحب ہوں تو براہِ کرم یہ خط عرشی صاحب تک پہنچادیں۔ ممنون ہوں گا۔ ۲۲/۱۱/۴۵

خاکسار۔ عطاء محمد ریٹائرڈ اورنٹیل ٹیچر محلہ دارالفضل قادیان

۲۰-۱۲-۴۵

حضرت محترم جناب عطاء محمد صاحب۔ السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ'

یاد فرمائی کا شکریہ۔ میں نے آپکے سوالات بغور پڑھ کر محفوظ کر لیئے ہیں۔ برق صاحب کے اعتراضات ان سوالات سے مقدم ہیں۔ اصولاً آپ کو اپنے سوال پیش کرنے سے پہلے ان کو رفع کرنا چاہیئے تھا۔ چنانچہ میں نے برق صاحب کے مقالہ کی اشاعت کیساتھ ہی خطوط کے ذریعے دفتر "ریویو آف ریلیجنز" و "پیغام صلح" کو اس طرف متوجہ کیا تھا۔ آخر دو ماہ کے مایوس انتظار کے بعد میں نے وہ سطور لکھیں جن کو پڑھکر آپ نے سوالات کئے ہیں۔ آج سے دو سال قبل میں نے چند سوالات شائع کرکے آپ کے سالانہ جلسے میں تقسیم کرائے تھے اور دستی طور پر بھی بعض اکابرِ احمدیت کے پاس بھیجے تھے۔ اُن کا بھی کوئی جواب نہیں ملا۔ اس کے بعد حضرت خلیفہ صاحب کے نام ایک چیلنج اگست ۱۹۴۴ء کے البیان میں شائع کیا۔ اسکی نقل قلمی بذریعہ ڈاک انکی خدمت میں بھیجی (جسکی رسید خلیفہ صاحب کے اپنے دستخط سے مزین میرے پاس موجود ہے) اس پر بھی توجہ نہیں کی گئی۔ اگر آپ بحیثیت سائل اپنے سوالوں کا جواب لینے میں حق بجانب ہیں اور اسکو مجیب کا اخلاقی و دینی فریضہ سمجھتے ہیں تو یہ فریضہ آپ لوگوں پر بھی عائد ہونا چاہیئے۔ یاد دہانی کیلئے میں اپنے سوالات مکرر ارسال خدمت کر رہا ہوں۔ پس

۱۔ پہلے میرے سوالات کا جواب عنایت فرمائیں۔

۲۔ پھر میرے چیلنج پر توجہ فرمائیں۔

...سنے کے بعد اعتراضات پر شارع کریں۔

...تین مرحلوں سے گذر کر جتنے سوال آپ چاہیں مجھ سے کریں۔ میں انشاء اللہ حق کے سامنے سر جھکا دوں گا۔ اور باطل کو باطل تسلیم کر لوں گا۔ فقط

بسم اللہ الرحمن الرحیم ——— نحمدہ ونصلی علیٰ رسولہ الکریم

مکرم بندہ

...علیکم السلام ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔ آپکا ملفوف محررہ ۲ دسمبر ۳۵ء ملا۔ اگرچہ یہ غیر متعلق سطور جو آپ نے میرے خط کے جواب میں تحریر کی ہیں آپکی نیت بخیر نہ ہونیکی پورے طور پر عکاسی کر رہی ہیں کیونکہ میں نے وہ سوالات اسلئے تحریر نہیں کئے تھے کہ آپ انہیں بغور پڑھکر "محفوظ" کر لیں۔ بلکہ آپ سے ان کے جوابات طلب کئے تھے اور اگر آپکی نیت نیک ہوتی تو آپکا دیانتداری سے اولین فرض یہ تھا کہ پہلی فرصت میں میرے سوالات کے جواب دیتے اور اسکے بعد اگر کوئی اور مطالبات آپ کرنا چاہتے تو پیش کر کے مجھ سے انکے جواب طلب کرتے مگر کس قدر حیرت کا مقام ہے کہ آپ بجائے جواب دینے کے آج سے دو سال قبل کے وہ مطالبے پیش کر رہے ہیں جو کسی وقت آپ نے احمدی اکابر سے کئے تھے اور انہوں نے بقول آپکے انکے کوئی جواب نہ دیئے تھے مجھ غریب سے نہ صرف انکے جوابات طلب کرتے ہیں بلکہ اپنے جوابات کو میرے جوابات سے مشروط ٹھہرا کر پھر بھی میرے سوالات کے جوابات دینے کا نام نہیں لیتے۔ بلکہ ان تین مرحلوں سے گذر کر "جتنے سوال آپ چاہیں کریں" کی اجازت دیتے ہیں اور خود "انشاء اللہ حق کے سامنے سر جھکا دینے اور باطل کو باطل تسلیم کرنے" کی تکلیف گوارا کر لینگے مگر جواب پھر بھی نہیں دینگے۔ چونکہ میں چاہتا ہوں کہ یہ جھوٹی خوشی بھی آپکو نصیب نہ ہو اسلئے میں بطریق تنزل آپکی یہ بات بھی ماننے کیلئے تیار ہوں۔ کہ اگر آپ مجھ سے ہی اپنے ہر سہ مطالبات پورے کروانا چاہتے ہیں تو آپ سب سے پہلے میرے سوالات اپنے رسالہ میں شائع کر کے یہی مطالبات مجھ سے بذریعہ البیان کیجئے اور وہ رسالہ مجھے ارسال فرمایئے۔ پھر میں انشاء اللہ تعالیٰ آپکے مطالبات کا کافی وشافی جواب دونگا اور دونگا بھی بیک وقت۔ بشرطیکہ آپ رسالہ کے ذریعے ہی یہ اعلان بھی کر دیں کہ آپ میرے جوابات کو بلا کم وکاست اپنے رسالہ میں بیک وقت شائع کر دینگے۔ امید ہے کہ اب آپ راہِ گریز تلاش نہیں کریں گے۔

جواب کا طالب عطاء محمد ریٹائرڈ اوورسیئر محلہ دار الفضل قادیان۔ ۴ دسمبر ...

خط کا جواب بواپسی ڈاک دے رہا ہوں۔ نقل مطابق اصل ہے۔

یہ بھی تحریر کریں کہ رسالہ کے ایڈیٹر آپ ہیں یا کوئی اور صاحب۔ بصورت دیگر اپنا نام ... تحریر کریں تاکہ اگر آپ جواب میں غیر معمولی تاخیر کریں تو امرتسر کے کسی دوست کو آپ سے جواب حاصل کرنے کے لئے مقرر کیا جاسکے۔

عطاء محمد

لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ

قَالَ اللّٰہُ تَعَالٰی ہُوَ الَّذِیْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَہٗ بِالْہُدٰی وَدِیْنِ الْحَقِّ لِیُظْہِرَہٗ عَلَی الدِّیْنِ کُلِّہٖ

ماہنامہ

ریویو آف ریلیجنز (اردو)

یعنی

دنیا کے مذاہب پر نظر اور اہلِ مذاہب کا تشحیذ الاذہان

جلد ۴۵ | ماہ جمادی الثانی ۱۳۶۵ھ مطابق ماہ مئی ۱۹۴۶ء | عدد ۵

فہرست مضامین

فلسفۂ خودی کا اثر مسلمانوں پر

(از جناب مسعود احمد صاحب بی۔ اے ابن ماسٹر محمد حسن صاحب آسان دہلوی)

تاریخ اسلام میں پھر یہ دن آنے مقدر تھے کہ نام نہاد مسلمان یونانی فلسفے کے رنگ میں رنگین ہوکر اور اس کے دلفریب نظریوں کو اپنا کر اسلام اور اس کی تعلیم کو اس فلسفے اور اس کی روشنی میں تراشیدہ نظریوں کے سانچے میں ڈھالنے کی کوشش کریں۔ جب قرآنی علوم کی تفہیم ندارد ہو اعلوم دینیہ میں کوئی بصیرت میسر نہ ہو اور خالی علوم عقلیہ میں دسترس حاصل ہو تو انسانی دماغ سفلی نظریوں کی دلفریبی کا شکار ہوئے بغیر نہیں رہتا۔ اور بجائے تعمیر کے تخریب کی راہوں میں اپنے فکر و عمل کو گم کر دیتا ہے اور اس طرح اسلامی تعلیمات کو توڑ مروڑ کر غیر اسلامی نظریوں کی تائید میں دماغ سوزی کی جاتی ہے۔ یہ وہ خرابی تھی جس کے خلاف صحیح اسلامی تعلیم کی تجدید حضرت امام غزالیؒ نے پانچویں صدی ہجری میں کی اور یہی وہ خرابی ہے جس نے حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کی بعثت کے وقت سر اٹھایا۔ چنانچہ آپ نے ان فاسد عقیدوں کی بیخ کنی میں اسلام کی پُرشوکت تائید فرمائی اور نہ صرف قلمی جہاد کیا بلکہ سرسید احمد خاں کو مقابلے کی دعوت دیکر ایسے لوگوں پر اتمام حجت کی۔ اس زمانے میں ڈاکٹر سر محمد اقبال کا شمار بھی ایسے ہی فلسفیوں میں کرنا پڑتا ہے جنہوں نے غیر اسلامی نظریوں سے متاثر ہوکر اسلام کو ان پر منطبق کرنا چاہا۔ ان کا پیش کردہ فلسفۂ خودی ان کی اس تڑپ کا آئینہ دار ہے جو ان کے دل میں اسلام کو یورپ کے فلسفے کے مطابق ڈھالنے کے لئے موجزن تھی۔ اگر غور سے دیکھا جائے تو ان کا فلسفۂ خودی اسلام کی تعلیم کے سراسر مخالف ہے۔ لیکن مغربیت کے دلدادہ اور یورپ کی مادی ترقی پر رال ٹپکانے والے نوجوان اسلامی تعلیمات کی صحیح تفہیم سے عاری ہونیکی وجہ سے اس کو عین اسلام سمجھتے ہوئے اس کی اشاعت پر کمربستہ ہیں

کہنے کو تو یہی کہا جاتا ہے کہ ڈاکٹر سر محمد اقبال کی پیش کردہ خودی کو تکبر و غرور سے دُور کا بھی واسطہ نہیں لیکن اگر ذرا تدبر کیا جائے تو وہی ڈھاک کے تین پات اور مرغے کی ایک ٹانگ نظر آتی ہے۔ کبھی خودی کو ایک مستقل فلسفۂ زندگی قرار دیا جاتا ہے کہیں پُرشوکت الفاظ میں طول و طویل فقرات میں مزین کنایہ و استعارات میں فلسفۂ خودی کو نئی نئی شکلوں میں پیش کیا جاتا ہے تا انسانی دماغ مرعوب ہو کر اس کے آگے سر تسلیم خم کر دے۔ کبھی مفسرین اقبال خودی سے مراد انسانی قوتوں کا بروئے کار لانا لیتے ہیں۔ کہیں خودی کو فلسفۂ تمدن کا سنگِ بنیاد قرار دیتے ہیں اور کبھی حیاتِ عالم اور زندگی کی استواری کی بُنیاد زورِ خودی پر ٹھہراتے ہیں۔ بعض لوگ خودی کا استحکام زندگی کا واحد مقصد اور معیار سمجھتے ہیں اور بعض نے تو سب پردہ داری بالائے طاق رکھکر نہایت سادگی سے فرما دیا اور کہہ بھی گئے مطلب کی کہ "مَیں ہوں" کے پُرزور اظہار کا نام خودی ہے (دیکھو رسالہ اُردو اکتوبر ۱۹۴۰ء صفحہ ۵۷۳)

اب اگر دوسرا اس "مَیں ہوں" کو غرور کہے تو غلط۔ اگرچہ اِس "مَیں ہوں" کی رٹ خدا کے مقابلہ پر بھی قائم رہے جیسا کہ آئندہ چل کر ثابت کیا گیا ہے۔ لیکن معتقدین اقبال کو اِس سے مطلب نہیں کہ محمد رسول اللہ کا لایا ہوا دین متین کہاں تک اسکی تائید میں ہے۔ اور اگر تائید میں نہ بھی ہو جیسا کہ امر واقعہ ہے تو بھی تو انہیں اُس کی طرف توجہ دینے کی ضرورت نہیں کیونکہ وہ اقوامِ یورپ کی طرح برسرِ اقتدار آنا چاہتے ہیں اور ہر اس چیز کو جو ان کے خیال کے مطابق اس کے حصول کے راستے میں روک ہے ہر وقت قربان کرنے اور ترک کرنے کے لئے تیار ہیں اسلام کو بکلی اس لئے ترک نہیں کر سکتے کہ اِس کو ترک کرنا سیاسی اغراض کے پیشِ نظر موجبِ زیاں ہے کیونکہ اِس کی بدولت جُدا گانہ متحدہ قومیت قائم نظر آتی ہے اس لئے ماشاء اللہ کہنے کو مسلمان ہیں۔ مادی ترقی کی آرزو منتہائے نظر ہے اس لئے ان کے نظریئے اپنانے اور اپنا راہبی رُوحانی متاع لُٹانے پر ہر دم تیار ہیں۔ کیا کریں خوبیٔ قسمت سے اور امتدادِ زمانہ کی بدولت اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی پیشگوئی کے مطابق عقیدے ایسے اختیار کر بیٹھے ہیں کہ آسمانی ہدایت کے دروازے اپنے اُوپر بند کر لئے ہیں۔ اپنی بُرائی اور بھلائی میں خدا کو بے دخل سمجھتے ہیں اور مجرّد عقل کے بل بوتہ پر زمینی بادشاہت

کے خواہاں ہیں۔

الغرض ڈاکٹر سر محمد اقبال نے مسلمانوں کو پست حالت میں دیکھ کر ان میں سیاسی بیداری پیدا کرنے کے لئے خود اعتمادی کا مادہ پیدا کرنا چاہا اور یہی درس دیا کہ وہ اپنی قوتِ ایجاد کو بڑھائیں اور اپنے آپ کو کائنات میں مؤثر بنانیکی فکر کریں۔ چنانچہ مغربی مفکرین کی تقلید میں فلسفۂ خودی تراشا گیا۔ کون کہتا ہے کہ خود اعتمادی اور خودشناسی بُری چیز ہے اور کون اس سے انکار کریگا کہ انفرادی قوتِ ایجاد کو بڑھایا جائے لیکن اس کا کیا علاج کہ بقائے خودی کے درس میں تمام مذہبی اور اخلاقی قیود کو نظر انداز کر کے انسان کو خدا کے مدمقابل لا کھڑا کیا ہے۔ چنانچہ لکھتے ہیں ؎

مرا دل سوخت بر تنہائی او ✤ کنم سامانِ بزم آرائی او

روحِ اقبال میں اس کی تشریح ان الفاظ میں کی گئی ہے:۔

"ذاتِ واجب تعالےٰ کی تنہائی پر انسانی خودی کو ترس آیا تو اس نے اس کی بزم آرائی کا سامان بہم پہنچایا" (ص۲۹۵)

اس کو زعم کہو یا مبالغہ بہرصورت یہ بے لگام خودی سراہنے کے قابل نہیں بصورتِ مبالغہ تو ڈاکٹر صاحب کو معذور خیال کیا جا سکتا تھا کہ بحیثیت شاعر ہونیکے مبالغہ آمیزی فطرتاً حصہ میں آئی ہوگی لیکن نوجوان مسلمانوں میں خدا کے مقابلہ پر اس جذبۂ انانیت کے پیدا ہونیکی ذمہ واری جناب ڈاکٹر صاحب کی مبالغہ آمیز طبیعت پر ہوگی۔ پھر افسوس یہ ہے کہ ہم ان خیالات کو جناب ڈاکٹر صاحب کی شاعرانہ مبالغہ آمیزی پر محمول کر نہیں سکتے کیونکہ وہ خود کہتے ہیں ؎

مری نوائے پریشاں کو شاعری نہ سمجھ ✤ کہ میں ہوں محرمِ رازِ درونِ میخانہ

اسی طرح معتقدینِ اقبال کے نزدیک "حلاج کا دعویٰ انا الحق انسانی شخصیت کو بیباک تحقق کا ادعا تھا" کیونکہ ان کے نزدیک "خودی کا سرگم کائناتِ ہستی کے ہر ذرے میں نمایاں ہے لیکن اس کا انتہائی کمال انسان میں ظاہر ہوتا ہے" جنابِ اقبال خود بھی "اسلامی الہیات کی جدید تشکیل" کے صفحہ ۹۱ پر تحریر کر چکے ہیں کہ انا الحق کی صحیح توجیہہ

یہ ہے کہ یہ دعویٰ انسانی خودی کی حقیقت اور استقلال کا ادعا تھا مطلب یہ کہ انسان اپنی خودی کو تیز کر کے اس قدر بیباک ہو سکتا ہے کہ خود کو خدا سمجھنے لگے مولنا عبدالسلام خان ندوی رامپوری نے "اقبال کی الٰہیات کے مجمل خاکہ" میں اس نکتہ کی طرف ان الفاظ میں اشارہ کیا ہے :-

"ان (اقبال) کے فلسفے کا نقطۂ آغاز ہی انفرادیت اور خودی ہے۔ اس انفرادیت اور خودی کے ارتقاء کی کوشش اقبال کے پورے فلسفۂ اخلاق کا سنگِ بُنیاد ہے۔ اس خودی اور انانیت کی اعلیٰ ترین اور کامل ترین صورت خدا ہے اس کے بعد انسانی خودی اور انانیت۔ وہ انسانی خودی اور انانیت کے اِس حد تک ارتقاء کے قائل ہیں کہ وہ اپنے آپ میں تمام دوسری انانیتوں کو حتیٰ کہ خود خدا کو بھی جذب کر لے اور اس طرح پوری کائنات مکون سمیت اس میں سما جائے" (کتاب "اقبال پر ایک نظر" ص۲۱)

برخلاف اِس مغربی توجیہہ کے حضرت معین الدین چشتی رحمۃ اللہ علیہ مجدد ساتویں صدی ہجری فرماتے ہیں اور یہی صحیح توجیہہ ہے ؎

من نمی گویم اناالحق یار میگوید بگو + چوں نہ گویم چوں مرا دلدار میگوید بگو

ڈاکٹر اقبال کی جدتِ طبع نے جو اثر لوگوں کے دماغوں پر چھوڑا اور جوان کے ذہنی رجحانات میں تبدیلی پیدا کی وہ مادی دُنیا کے پرستاروں کی نگاہ میں قابلِ قدر وعظمت ہو سکتی ہے لیکن ایک مذہبی ذوق کے انسان کے لئے وہ ہرگز قابلِ قبول نہیں ہو سکتی۔ ڈاکٹر یوسف حسن خاں اپنی کتاب "روحِ اقبال" کے صفحہ ۱۲۱ پر تحریر فرماتے ہیں :-

"اِس کو (شعورِ انسانی) کلیم کی طرح طور کی چوٹی پر جانیکی ضرورت نہیں رہتی اس لئے کہ وہ اپنی ہستی سے شعلۂ سینائی پیدا کرنیکی قدرت رکھتا ہے"

خدا تعالےٰ سے بے نیازی کی اِس سے بڑھ کر اور کیا مثال ہوگی۔ اگر خودی کا کرشمہ یہی ہے کہ خدا کی الوہیت پر قبضہ کر کے انسانوں کا مرتبہ بلند کر دے تو ہم بےخودی بھلے

بھٹ پڑے وہ سونا جس سے ٹوٹیں کان۔ قابلِ غور امر یہ ہے ختم نبوت کے عقیدے کے ساتھ ساتھ شعلۂ سینائی پیدا کرنے کا دعویٰ ہے جس کے معنی یہ ہوئے کہ نبوت تو بند نہیں ہوئی لیکن خودی اجازت نہیں دیتی کہ خدا کی طرف سے عطا کردہ نبوۃ کو قبول کیا جائے۔ اِس طرح تو حضرتِ موسیٰ جذبۂ خودی سے عاری ٹھہرے اور موجودہ مسلمان شعلۂ سینائی پیدا کرنے پر قادر ابھی تک تو ربانی مصلح کی ضرورت کے منکر تھے، یہاں رب کی ضرورت بھی ختم ہوتی دکھائی دیتی ہے۔ اقبال خود بھی فرما گئے ہیں ؎
میں نہ عجمی نہ ہندی نہ عراقی و حجازی ✤ کہ خودی سے میں نے سیکھی دو جہاں سے بے نیازی
دین کے رہے نہ دُنیا کے خودی نے کہیں کا بھی نہ چھوڑا۔

سیّد ذوالفقار علی صاحب رضوی نسیم نے بھی اپنے مقالے "اقبال کا نظریۂ خودی" میں خدا تعالےٰ کو خوب سُنائی ہیں اور سند جنابِ اقبال کے کلام سے پیش کی ہے۔ اِس بات کا ذکر کرتے ہوئے کہ ارتقاءِ خودی کا پہلا زینہ خواہش یا آرزو کا پیدا کرنا ہے وہ تحریر کرتے ہیں:-

"اقبال آرزو کا اس قدر دلدادہ ہے کہ خدا کو بھی نہیں چھوڑتا اور کہتا ہے کہ خدا نے دُنیا اِس لئے پیدا کی ہے کہ خود اس کا تماشہ کرے۔ وہ کبھی برگِ لالہ پر اپنا پیغام لکھتا ہے کبھی پرندوں کے سینوں سے چہچہوں کی صورت میں نمودار ہوتا ہے اور کبھی نرگس میں آکر بیٹھ جاتا ہے کہ انسان کے جمال کا نظارہ کرے۔ اِس نے انسان کا نظارہ کرنے کے لئے دُنیا کا یہ سارا کھڑاگ تیار کیا ہے۔"

ما از خدائے گم شدہ ایم او بہ جستجوست ✤ چوں ما نیاز مند و گرفتارِ آرزو است
گاہے بہ برگِ لالہ نویسد پیامِ خویش ✤ گاہے درونِ سینۂ مرغاں بہ ہا و ہوست
در نرگس آرمید کہ بیند جمالِ ما ✤ چنداں کرشمہ داں کہ نگاہش بہ گفتگو است
آہے سحر گہے کہ زند در فراقِ ما ✤ بیرون و اندرون زبر و زیر و چار سو است
ہنگامہ بست از پئے دیدارِ خاکئے ✤ نظارہ را بہانہ تماشائے رنگ و بو است

یہی ہمکو گلہ ہے کہ واقعی اقبال اور اُن کے معتقدین زعمِ خودی میں خدا کو بھی نہیں چھوڑتے

لیکن قرآن حکیم کی تعلیم سے بے خبر ہیں کہ خدا بھی ایسوں کو نہیں چھوڑتا۔

فَاَتٰهُمُ اللّٰهُ مِنْ حَيْثُ لَمْ يَحْتَسِبُوْا ۔

پس اُن پر عذاب الٰہی ایسی طرف سے آیا کہ انکو اس کا گمان بھی نہ تھا۔

آگے چل کر لکھتے ہیں :۔

"یہ تو خدا کے اس دیئے ہوئے زمین و آسمان کو بھی مستعار سمجھ کر پھونک ڈالنا اور اپنا جہان آپ پیدا کرنا چاہتا ہے۔ مانگے تانگے کے زمین و آسمان کے درمیان رہنا اس کی خودی کے منافی ہے"

جو صداقت کیلئے جس دل میں مرنے کی تڑپ ✦ پہلے اپنے پیکرِ خاکی میں جاں پیدا کرے
پھونک ڈالے یہ زمین و آسمانِ مستعار ✦ اور خاکستر سے آپ اپنا جہاں پیدا کرے

اگر یہی حقیقت ہے تو اقبال خود مانگ تانگ کر گذارہ کرتے رہے اور اس آیت کے ماتحت فیھا تحیون و فیھا تموتون و منھا تخرجون ان کی زندگی بے چارگی اور بے بضاعتی کا مرقع تھی لیکن دم بھرتے رہے خودی کا۔ یہ ہیں چند مثالیں اس ذہنی عیاشی کی جو جناب اقبال کے فلسفۂ خودی کی بدولت ہندوستان کے مسلمان نوجوانوں کو نصیب ہوئی اور جس کی بدولت وہ اپنے تئیں خدا اور خدائے وحدہٗ ولاشریک کو ایک واہمہ تصور کرتے ہیں۔

ایک اور نظریہ جو فلسفۂ خودی کو تقویت دینے کے لئے تراشا گیا وہ خدا اور بندے کے تعلق کا ہے۔ اقبال خدا کو اپنے آگے جھکانا چاہتے ہیں اور خدا کے سامنے اپنا سر جھکانے کے لئے تیار نہیں قبل اس کے کہ اُن کے کلام سے چند نمونے اس نظریئے کی تائید میں پیش کئے جائیں "سیرۃ اقبال" سے ایک واقعہ نقل کیا جاتا ہے جو جناب اقبال کے فلسفۂ خودی کی اصلیت اور خدا اور بندے کے تعلق کے جدید نظریئے کو بے نقاب کر دیتا ہے :۔

"ایک بار ایک درویش علامہ اقبال کے پاس آیا۔ آپ نے اس سے دُعا کی درخواست کی۔ پوچھا دولت چاہتے ہو۔ جواب دیا "نہیں میں درویش

ہوں دولت کی ہوس نہیں"۔ پوچھا "عزت وجاہ مانگتے ہو"۔ جواب دیا "وہ بھی خدا نے کافی دی ہے"۔ پوچھا "تو کیا خدا سے ملنا چاہتے ہو"۔ جواب دیا "سائیں جی! کیا کہہ رہے ہو۔ میں بندہ وہ خدا، بندہ خدا سے کیونکر ملسکتا ہے۔ قطرہ دریا میں جائے تو قطرہ نہیں رہتا۔ میں قطرے کی حیثیت میں قائم رہ کر دریا بننا چاہتا ہوں"۔ (سیرۃ اقبال)

ایسے ہی لوگوں کے لئے اللہ تعالےٰ نے فرمایا ہے

قَدْ خَسِرَ الَّذِیْنَ کَذَّبُوْا بِلِقَآءِ اللّٰہِ (سورۂ انعام پارہ)

ان لوگوں نے ضرور خسارہ اٹھایا جنہوں نے جھٹلایا اللہ سے ملنے کو

مختصر یہ کہ جناب اقبال دیگر شعرا کی طرح نفس انسانی کو قطرے سے اور ذات ایزدی کو دریا سے تشبیہہ دیتے ہیں لیکن مرتبے میں قطرے کو دریا سے کم نہیں سمجھتے۔ کیونکہ یہ ان کی خودی کے منافی ہے کہ وہ اپنے آپ کو خدا میں فنا کر دے۔ چنانچہ کہتے ہیں ؎

اس ذرّے کو رہتی ہے وسعت کی ہوس ہر دم + یہ ذرہ نہیں شاید سمٹا ہوا دریا ہے

چنانچہ اقبال خدا سے مہجوری کو پسند کرتے ہیں اس لئے کہ یہی ان کی خودی کی وجہ حیات ہے اور ان کے نزدیک انسان کی آبرو اسی میں ہے کہ وہ خدا سے دُور بھاگتا رہے۔

گرمیٔ آرزو فراق لذّتِ ہائے ہو فراق + موج کی جستجو فراق قطرے کی آبرو فراق

لقاءِ الٰہی سے مُنہ موڑنے کے بعد ان کا احساس خودداری ان کو ایسی خطرناک بلندیوں میں لے جاتا ہے کہ وہ خدا کو بھی نیچا دیکھنے لگتے ہیں کہ وہ ایک عاجز بشر ہوتے ہوئے سوز وگدازِ فراق کی کیف پرورستیوں کے لطف کو علیم وخبیر خدا تعالےٰ کے علم سے باہر سمجھتے ہیں اور خدا تعالےٰ کو اس سے محروم و بے نصیب گردانتے ہیں ؎

سوز وگدازِ حالتے است بادہ زمن طلب کُنی + پیشِ تو گر بیاں کنم مستیٔ ایں مقام را

اور پھر ان الفاظ میں اس پر فخر کا اظہار کرتے ہیں ؎

متاعِ بے بہا درد وسوزِ آرزومندی + مقام بندگی دیگر نہ گُوں شانِ خداوندی

وہ لقاءِ الٰہی جو اپنی ہستی کو خدا کے سامنے ختم کر دینے کے بعد نصیب ہو (جیسا کہ قرآن عزیز کی تعلیم سے ثابت ہے کہ خدا ملنا ہی اپنے وجود پر ایک موت وارد کرنیکے

بعد ہے اقبال کے نزدیک ہرگز قابلِ قبول نہیں بلکہ وہ ایسے وصال سے یہ بہتر سمجھتے ہیں کہ انسان اپنی ہستی کو حسرت اور نامرادی کیساتھ غیر فائز المرامی کے طور پر جہانِ آب و گل کی تلخ کامیوں میں ختم کردے لیکن واصل باللہ نہ ہو۔

خوش آں جُرئہ تنک مایہ کہ از ذوقِ خودی ✦ در دِلِ خاک فرو رفت و بدریا نہ رسید

بھلا اِس نظریۂ خودی کو اسلام سے دُور کا بھی واسطہ ہے۔ اگر اس کو اسلام جیسے دینِ فطرت کی طرف منسوب کیا جائے تو اسلام کا پیش کردہ خدا تو عیسائیوں کے خدا سے بھی زیادہ بیچارہ بے بس، مجبور اور بے غیرت ثابت ہوگا (العیاذ باللہ)۔ دراصل بات یہ ہے جیسا کہ ڈاکٹر سیّد عابد حسین صاحب نے بھی اپنے مضمون "اقبال کا تصورِ خودی" میں کسی حد تک اِس امر کا اقرار کیا ہے۔ ڈاکٹر اقبال نے یورپ کے فلسفوں سے مرعوب ہو کر یورپ کی عملیت جس کی بُنیاد کسی رُوحانی عالمگیر عقیدے کی بجائے اِس دُنیا میں مادی اسباب کے وسائل سے مادی ترقی حاصل کرنے کی غیر اسلامی آرزو پر تھی اسلام کی عالمگیر آسمانی تعلیم کے اندر سمونا چاہا اور بجائے سنوارنے کے اسلام کی عملی شکل کو بگاڑ کر رکھ دیا۔

جہاں اِس قسم کے غلط عقیدے اور باطل نظریئے پیدا ہونے مقدر تھے وہاں خدا تعالےٰ نے اِس صدی کے سر پر حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کو مبعوث فرما کر اسلام پر جس جس جہت سے اور جس جس نوعیت کے اعتراض اب تک ہوئے تھے یا آئندہ ہونے تھے ان کے مدلّل جواب جری اللہ فی حلل الانبیاء کی قلمِ معجز رقم سے تحریر کرا کے دفاع کے لئے ایک مضبوط قلعہ تیار کرا دیا۔ آپؑ کی بعثت کے وقت اسلام اِس قدر کمزور ہو چکا تھا کہ ہر طرف سے بے پناہ حملوں کا نشانہ بنا ہوا تھا۔ آپؑ نے صحیح اسلامی نظریئے دُنیا میں پیش کئے اور تمام باطل نظریوں کے خلاف جن کو مسلمان کم علمی کی وجہ سے اسلامی عقیدے سمجھ بیٹھے تھے جہادِ کبیر کیا۔ ان فلسفیوں کے خلاف جو مغربی مفکروں سے مرعوب ہو کر نت نئے نظریئے اسلام کی طرف منسوب کر رہے تھے اور خدا کی الوہیت میں انسان کو کسی نہ کسی رنگ میں خواہ وہ کتنا ہی مخفی کیوں نہ ہو شریک گردانتے تھے آپؑ اپنی معرکۃ الآرا

تصنیف آئینۂ کمالاتِ اسلام میں تحریر فرماتے ہیں :-

"یہ کارروائیاں خلق اللہ کے اغوا کے لئے ہزارہا پہلو سے جاری کی گئی ہیں جن کے لکھنے کے لئے ایک دفتر چاہیئے۔ اور ان میں مخالفین کو کامیابی بھی ایسی اعلیٰ درجہ کی ہوئی ہے کہ دلوں کو ہلا دیا ہے۔ اور انکے مکروں نے عام طور پر دلوں پر سخت اثر ڈالا ہے اور ان کی طبیعی اور فلسفے نے ایسی شوخی اور بے بیباکی کا تخم پھیلا دیا ہے کہ گویا ہر ایک شخص اس کے فلسفہ دانوں میں سے انا الرب ہونے کا دعویٰ کرتا ہے۔ پس جاگو اور اٹھو اور دیکھو کہ یہ کیسا وقت آگیا اور سوچو کہ یہ موجودہ خیالات توحیدِ محض کے کس قدر مخالف ہیں۔ یہاں تک کہ خدا تعالےٰ کی قدرت کا خیال بھی ایک بڑی نادانی کا طریق سمجھا جاتا ہے اور تقدیر کے لفظ کو مُنہ پر لانے والا بڑا بیوقوف کہلاتا ہے اور فلسفی دماغ کے آدمی دہریت کو پھیلاتے جاتے ہیں اور اس فکر میں لگے ہوئے ہیں کہ تمام کل الوہیت کی کسی طرح ہمارے ہاتھ میں ہی آ جاوے۔ ہم ہی جب چاہیں وباؤں کو دُور کر دیں۔ موتوں کو ٹال دیں اور جب چاہیں بارش برسا دیں کھیتی اُگا لیں اور کوئی چیز ہمارے قبضۂ قدرت سے باہر نہ ہو۔"

جب "مَیں ہُوں" کے پُر زور اظہار کا نام خودی ہو تو اندازہ لگائیے کہ کیا اقبال یہ کہکر الوہیت کی تمام کل اپنے ہاتھ میں نہیں لینا چاہتے کہ ؎

خودی کو کر بلند اتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے ٭ خدا بندے سے خود پُوچھے بتا تیری رضا کیا ہے

یقیناً یہ وہ شوخی اور بیباکی ہے جو انسان کو انا الرب کہنے پر مجبور کرتی ہے۔

حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے عرفانِ نفس اور انسانی طاقتوں کے صحیح اندازے کے بارے میں بالکل درمیانی رستہ اختیار کیا ہے۔ آپ اِس عرفانِ نفس کی دو حالتیں پیش کرتے ہیں ایک خودداری اور خود اعتمادی پیدا کر کے انسانی طاقتوں کو بروئے کار لانا لیکن انسان کی یہ حالت اپنے ماحول تک ہی محدود ہے یعنی یہ کہ کشمکشِ حیات کے سلسلہ میں انسانوں، قوموں اور ملکوں کے مابین تعلقات تک۔ لیکن دوسری حالت وہ

ہے جس میں انسانی خودی کی کچھ پیش نہیں جاتی۔ یہ وہ حالت ہے جس میں انسان اپنے خالقِ حقیقی کی طرف رجوع کرتا ہے۔ پہلی حالت میں بھی آپؑ نے ایک قید لگائی ہے تا یہ خودداری اپنے محدود دائرے میں بھی غرور کی صورت اختیار کر کے ظلم و تعدّی کا موجب نہ بننے پائے۔ اور وہ قید آپؑ نے اپنی اس تعلیم میں ظاہر کی ہے کہ مظلوم ہو کر زندگی بسر کرو لیکن بے غیرت بن کر نہیں یعنی یہ کہ کسی پر بے جا ظلم مت توڑو لیکن دوسرے کو موقعہ نہ دو کہ وہ تمہاری حمیت کو کچل کر تم پر ظلم روا رکھے۔ یہ وہ تعلیم ہے جس کی اشاعت آپؑ اپنے فعل سے اور تحریر سے برابر کرتے رہے اور آج بھی آپؑ کے ہاتھوں خدا تعالیٰ کی قائم کردہ جماعت یعنی جماعت احمدیہ کر رہی ہے۔ یہ وہ خودی کا مبالغہ آمیز فلسفہ نہیں جو کبھی عملی صورت اختیار نہ کر سکے اور اگر کبھی یورپ کی طرح عمل میں آ جائے تو دُنیا کے امن کو برباد کرنے کا موجب ہو بلکہ یہ وہ حقیقت ہے جو عملی جامہ پہن کر دُنیا میں امن کی کفیل ہو سکتی ہے۔ آپؑ کی تحریرات سے بے شمار مثالیں اسکی تائید میں پیش کی جا سکتی ہیں لیکن طوالت کے ڈر کی وجہ سے صرف چند پر ہی اکتفا کیا جاتا ہے۔ جب آپؑ خدا تعالیٰ کی طرف توجہ پھیرتے ہیں تو فرماتے ہیں ؎

کرمِ خاکی ہوں مرے پیارے نہ آدم زاد ہوں ✦ ہوں بشر کی جائے نفرت اور انسانوں کی عار

برخلاف اس کے جب آپؑ دُنیا والوں کی طرف متوجہ ہوتے ہیں تو مخالفت کے بے پناہ تموّج کے باوجود آپؑ للکار کر کہتے ہیں ؎

جو خدا کا ہے اُسے للکارنا اچھا نہیں ✦ ہاتھ شیروں پر نہ ڈال اے روبۂ زار و نزار

اسی طرح آپؑ شعورِ خودی کا پورا احترام کرتے ہوئے دُنیا کو اولوالعزمی، بلند خیالی اور اعلیٰ ظرفی کا سبق ان الفاظ میں دیتے ہیں :-

"سو تم آنکھیں کھولو اور خدا کے اس قانون کو دیکھو جو تمام دُنیا میں پایا جاتا ہے۔ چوہے مت بنو جو نیچے کی طرف جاتے ہیں۔ بلکہ بلند پرواز کبوتر بنو جو آسمان کے فضا کو اپنے لئے پسند کرتا ہے۔"

آپؑ اقبال کی طرح یہ نہیں چاہتے کہ خودی غیر خود سے ٹکرا کر اپنی نشوونما کا سامان مہیا کرے یا طاقتور خودی کمزور خودی کو اپنی طرف کھینچ کر خود کو اور تیز کرے بلکہ آپؑ فرماتے ہیں :-

"بڑے ہو کر چھوٹوں پر رحم کرو نہ اُن کی تحقیر۔ اور عالم ہو کر نادانوں کو نصیحت کرو نہ خود نمائی سے ان کی تذلیل۔ اور امیر ہو کر غریبوں کی خدمت کرو نہ خود پسندی سے اُن پر تکبر"

دوسری جگہ جہاں آپ یہ فرماتے ہیں کہ "متکبر اس کا قُرب حاصل نہیں کر سکتا" ساتھ ہی آپ یہ بھی تحریر فرماتے ہیں "ہر ایک جو اس کے نام کے لئے غیرتمند نہیں وہ اُس کا قُرب حاصل نہیں کر سکتا"۔ پس اصلی خودی، خودداری اور خود اعتمادی وہی ہے جو خدا کے خاطر اور اس کی ذات پر کامل بھروسہ کر کے اپنے میں پیدا کی جائے! در حقیقت تو یہ ہے کہ حقیقی خودی پیدا ہوتی ہی تعلق باللہ کے بعد ہے۔ اس کے آستانے پر گرنے اور اپنے آپ کو خدا تعالےٰ کی راہ میں فنا کرنے کے بعد انسان کو خدا تعالےٰ کی ربوبیت خاک سے اُٹھا کر ثریا تک پہنچاتی ہے۔ پھر انسان خدا کے لئے اتنا غیرت مند ہو جاتا ہے کہ بیک وقت تمام دُنیا سے مقابلہ کرنیکو تیار ہو جاتا ہے! اقبال کی طرح خودی کے بقاء کا ذریعہ آرزو کا پیدا کرنا نہیں بلکہ خدا کے آستانے پر گرنا ہے۔

جب ہم قرآن کریم پر نظر ڈالتے ہیں تو حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کے پیش کردہ اسلامی نظریئے کی حرف بحرف تائید اس میں ملتی ہے۔ کیونکہ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام دُنیا میں قرآنی علوم کی اشاعت کرنے کے لئے ہی کھڑے کئے گئے تھے۔ اقبال کے نزدیک انسان میں احساسِ خودی اس لئے تیز ہے کہ وہ جمیع مخلوقات کے مقابلے میں اعلیٰ درجہ کی استعدادوں اور قابلیتوں اور صلاحیتوں کے ساتھ پیدا کیا گیا ہے۔ قرآن کریم یہ تو فرماتا ہے۔ اِنَّ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِیْ اَحْسَنِ تَقْوِیْمٍ لیکن انسان کے لئے یہ احسن تقویم اس وقت تک قابلِ افتخار نہیں جب تک کہ وہ تعلق باللہ پیدا کر کے خدا تعالیٰ کی عطا کردہ استعدادوں کو صحیح معنوں میں بروئے کار نہ لائے۔ ورنہ یہ خودی انسان کی تذلیل کا موجب ہو جاتی ہے۔ کیونکہ اس کے بعد ہی اللہ تعالےٰ فرماتا ہے اِلَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ اس سے صاف ظاہر ہے کہ اعمالِ صالح خودی کو تیز کرنے کے لئے ضروری ہیں۔ یہ احسن تقویم کا درجہ خدا کو چھوڑ کر اس دُنیا میں آپس کے تعلقات اور کشمکش حیات تک ہی محدود ہے اور وہ بھی اعمالِ صالح کی قید کے ساتھ۔ ورنہ جہاں تک خدا اور بندے کے تعلق

کا سوال ہے وہاں احساس خودی ہیچ ہے۔ کیونکہ اس کی نسبت خدا تعالیٰ خود فرماتا ہے خلق الانسان ضعیفا۔ کہ ہم نے انسان کو کمزور، بے بس اور بے بضاعت پیدا کیا ہے۔ صاف ظاہر ہے کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے عین قرآنی نظریہ دُنیا کے سامنے پیش کیا ہے اور جناب اقبال مغربی فلسفہ پیش کر گئے ہیں جو اس قدر بے لگام ہے کہ اس میں ظلم اور تعدی کے خلاف کوئی روک نہیں اور خدا کی مالکیت کے اعتراف کے لئے کوئی گنجائش نہیں۔

اقبال کا فلسفۂ خودی خصوصاً وہ خودی جس کی بدولت وہ انسان کی انفرادیت کو اس درجہ محکم و استوار بنانا چاہتے ہیں کہ وہ خدائے خالق ارض و سماء کے سامنے بھی اپنی انفرادی حیثیت کو ختم کرنا نہیں چاہتے اور وہاں جذبۂ انا کو برقرار رکھتے ہوئے اپنی ہستی کو گرا کر نہیں بلکہ خدا کے عطا کردہ عظمت و وقار کو ایک خاص معیار پر قائم رکھکر خدا سے معاملہ کرنا چاہتے ہیں۔ صوفیاء کے مخصوص نظریئے وحدت وجود یا فناء وجودی کے خلاف ایک نیا نظریہ ہے۔ نظریۂ وحدتِ وجود کا لُبّ لباب یہ ہے کہ وجود حقیقی صرف خالق کائنات کی ذات کا ہے۔ مخلوق جس میں عالم طبعی اور انسان سب ہی داخل ہیں محض اعتباری اور موہوم وجود رکھتے ہیں۔ اور اسی ایک نُورِ ایزدی کے پرتو ہیں اپنا علیحدہ وجود نہیں رکھتے بلکہ خدا کے وجود ہی کا حصہ ہیں۔ اقبال کے نزدیک اس مسئلے نے انفرادی نفس کے وجود کو باطل قرار دیکر مسلمانوں کے دلوں سے سعی و عمل کے ذوق کو فنا کر دیا اور اس طرح وہ دن بدن کمزور ہوتے چلے گئے اور اپنے آباء و اجداد کی رہی سہی عظمت کو خاک میں ملانے کا موجب بنے۔ اقبال نے اس بے عملی کو عمل پیہم میں تبدیل کرنے کے لئے اس نظریئے کا [illegible] خودی" کے فلسفے سے کرنا چاہا اور اس میں اس قدر مبالغہ کیا کہ انفرادی نفس کے وجود کو حقیقی وجود کے سامنے اس درجہ بیباکی اور شوخی کا حامل قرار دیا کہ جس سے خدا کی صفتِ مالکیت پر دھبہ آنے لگا۔ چنانچہ بجائے اصلاح کے ایک دوسری نوعیت کی خرابی میں مبتلا ہو گئے۔ وحدتِ وجود کے قائل انفرادی نفس کے وجود کو باطل قرار دینے میں تمام حدود سے تجاوز کر کے انتہا تک پہنچ گئے۔ ادھر جناب اقبال

بقائے خودی کے درس میں انفرادی نفس کے وجود کو اس درجہ قائم بالذات بنا گئے کہ الامان والحفیظ۔ غرض دونوں نظریئے مخالف سمتوں میں مبالغے کی برکت سے حدِ اعتدال سے ایسے بھٹکے کہ اسلام کے پیش کردہ صحیح نظریئے سے کوسوں دُور جا پڑے۔ صحیح نظریہ اس زمانے میں پیش کرنا خدا تعالیٰ نے مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کیلئے مقدر کر رکھا تھا۔ آپؑ نے آکر دونوں فلسفوں کی مخالفت کی اور صحیح اسلامی عقیدہ جو دونوں کے بین بین ہے پیش کیا۔ آپؑ نہ اس نظریئے کے قائل تھے کہ انسان اپنے وجود کو خدا تعالیٰ کا پرتو اس رنگ میں خیال کرے کہ وہ خود خدا ہے اور نہ ایسی بقائے خودی کے قائل تھے کہ انسان خدا کے سامنے اپنی ہستی کو بالذات اس طرح قائم رکھے کہ اس کے نفس کی انانیت خدا تعالیٰ کے قرب اور وصال کی خواہش سے ہی اس کو بے نصیب کر دے۔ بلکہ آپؑ نے خالق و مخلوق کے رشتے کو اس رنگ میں ظاہر کیا ہے کہ انسان بحیثیت مخلوق ہونے کے وما خلقت الجن و الانس الا لیعبدون کے ماتحت اپنے ہر ایک فعل اور حرکت میں ہر سکون اور استراحت میں توجہ اللہ کی طرف رکھے اور اپنے ہر فعل کو خدا کی مرضی کے تحت لے آئے اور بایں معنیٰ خدا میں فانی ہوجائے کہ عالمِ کائنات کی ہر حرکت میں الٰہی ارادہ او رمشیت کارفرما نظر آئے۔ لیکن آپؑ کے نزدیک فنا کا یہ مقام انسان کی انفرادیت کو اس طرح ختم نہیں کر دیتا جس سے اقبال خوفزدہ ہیں۔ بلکہ اس سے انسان کو ایک نئی زندگی عطا ہوتی ہے جو اس کو لازوال بنا دیتی ہے اور جو اپنی انانیت اور شعورِ خودی کو خدا کے مقابلے پر قائم رکھکر نصیب نہیں ہوتی۔ چنانچہ آپؑ خدا کے حضور اپنے جذبۂ انانیت کو مٹانے کی یوں تلقین فرماتے ہیں:۔

"اگر تمہارے کسی پہلو میں تکبر ہے یا ریا ہے یا خود پسندی ہے یا کسل ہے تو تم ایسی چیز نہیں ہو جو قبول کے لائق ہو۔ ایسا نہ ہو کہ تم صرف چند باتوں کو لیکر اپنے تئیں دھوکہ دو کہ جو کچھ ہم نے کرنا تھا کرلیا ہے۔ کیونکہ خدا چاہتا ہے کہ تمہاری ہستی پر پُورا پُورا انقلاب آوے اور وہ تم سے ایک موت مانگتا ہے جس کے بعد وہ تمہیں زندہ کرے گا تم آپس میں جلد صلح کرو اور اپنے بھائیوں کے گناہ بخشو کیونکہ شریر ہے وہ

انسان جو اپنے بھائی کے ساتھ صلح پر راضی نہیں۔ وہ کاٹا جائے گا کیونکہ وہ تفرقہ ڈالتا ہے۔ تم اپنی نفسانیت ہر ایک پہلو سے چھوڑ دو اور باہمی ناراضگی جانے دو اور سچے ہو کر جھوٹے کی طرح تذلل کرو تا تم بخشے جاؤ۔ نفسانیت کی فربہی چھوڑ دو کہ جس دروازے کے لئے تم بلائے گئے ہو اُس میں سے ایک فربہ انسان داخل نہیں ہو سکتا۔"

پھر فرماتے ہیں:۔

"رحم کے لائق ہو تا تم پر رحم کیا جائے۔ اضطراب دکھلاؤ تا تسلی پاؤ۔ باربار چلاؤ تا ایک ہاتھ تمہیں پکڑ لے۔ کیا ہی دشوار گذار راہ ہے جو خدا کی راہ ہے پھر اُن کے لئے آسان کی جاتی ہے جو مرنے کی نیت سے اِس اتھاہ گڑھے میں پڑتے ہیں وہ اپنے دلوں میں فیصلہ کر لیتے ہیں کہ ہمیں آگ منظور ہے ہم اس میں اپنے محبوب کے لئے جلیں گے۔ پھر وہ آگ میں اپنے تئیں ڈال دیتے ہیں۔ پس وہ کیا دیکھتے ہیں کہ وہ بہشت ہے۔"

اسی طرح فرماتے ہیں ؎

جو خاک میں ملے اسے ملتا ہے آشنا ✦ اے آزمانے والے یہ نسخہ بھی آزما

دوسری طرف آپ وحدت وجود کے خلاف فرماتے ہوئے صحیح اسلامی نظریہ ان الفاظ میں پیش کرتے ہیں:۔

"جو راستباز اکابر گذرے ہیں اصل میں وہ فنائے نظری کے قائل تھے۔ اس کے یہ معنی ہیں کہ انسان ہر ایک فعل اور حرکت اور سکون میں توجہ اللہ کی طرف رکھے اور اس قدر فانی اس میں ہو کہ گویا اور کسی شے کی قدرت بذاتہٖ اسے نظر نہ آوے ہر ایک شے کو فانی جان لے اور اس قدر تصرف الٰہی اُسے نظر آوے کہ بلا ارادہ الٰہی کے اور کچھ نہیں ہو رہا۔ اسی مسئلے میں غلطی واقع ہو کر آخر فناء وجودی تک نوبت آگئی اور یہ کہنے لگے کہ سوائے خدا کے اور کوئی شے نہیں ہے اپنے آپکو بھی خدا ماننے لگے۔ اس خیال سے یہ مذہب پھیلا ہے کہ فناء نظری کے شوق میں اولیاء اللہ سے کچھ ایسے کلمات نکلے

ہیں کہ جن کی اُلٹی تاویل کر کے یہ وجودی فرقہ بن گیا ہے۔ فناء نظری تک انسان کا حق ہے کہ محبوب میں اور اپنے آپ میں کوئی جدائی نہ سمجھے اور من تو شدم تو من شدی من جاں شدم تو تن شدی تا کس نگوید بعد ازیں من دیگرم تو دیگری کا مصداق ہو۔ کیونکہ محب اور محبوب کا علاقہ فناء نظری کا تقاضا کرتا ہے اور یہ ہر ایک سالک کی راہ میں ہے کہ وہ محبوب کے وجود کو اپنا وجود جانتا ہے لیکن فناء وجودی ایک من گھڑت بات ہے جس کا ذوق شوق محبت صدق اور وفاء اور اعمالِ صالح سے کوئی تعلق نہیں۔ فناء نظری کی مثال وہی ہے جو ماں اور بچے کی ہے کہ اگر کوئی بچے کو لکی مارے تو درد ماں کو ہوتا ہے سخت تعلق جو محبت کا ہے یہ اس سے بھی دردناک ہے۔ اور یہ ایک سچی اور حقیقی محبت ہوتی ہے لیکن وجودی کا مدعا جھوٹا ہے۔ یہ وہ کرے جو خدا پر محیط ہو۔ وجودی چونکہ ترک ادب کا طریق اختیار کرتا ہے۔ اس لئے طاعت محبت و عبادتِ الٰہی سے محروم رہتا ہے۔" (البدر ۱۶ر جولائی ۱۹۰۴ء)

مندرجہ بالا اقتباسات سے ظاہر ہے کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے نزدیک خدا کے مقابلے میں بقاء خودی اور فناء وجودی دونوں نظریئے باطل ہیں۔ یہ اس وقت تک عمل میں نہیں آسکتے جب تک انسان خدا پر محیط نہ ہو اور سردو طریق طاعت، محبت اور عبادتِ الٰہی سے محروم کرنے والے ہیں۔ صحیح راستہ یہ ہے کہ انسان مخلوق ہے خدا تعالیٰ نے کے علم اور ارادے نے جس طرح چاہا اسی کے مطابق وہ عالمِ وجود میں آیا۔ اس کا فرض ہے کہ اس امتیاز اور فرق کو اپنے ذہن میں رکھے۔ جو کچھ قویٰ اور اعلیٰ استعدادیں خدا نے اس کو دی ہیں ان کی بدولت اپنی فوقیت دوسری مخلوق چیزوں تک محدود رکھے اور خدا کے سامنے اپنی تمام انانیت سے دست بردار ہو جائے۔ تب خدا اس کو اپنے قریب کرلیگا اور انسان کو ایک نئی زندگی بخشیگا۔

خدا سے معاملہ کرنے میں اپنے احساسِ خودی کو پیش پیش رکھنے کے لئے

معتقدین اقبال یہ جواز پیش کرتے ہیں کہ خدا نے انسان کے سپرد ایک امانت کی ہے اور وہ شعورِ خودی یا احساسِ خودی کا جذبہ کامل ہے اور اسی بنا پر اسنے انسان کو جمیع مخلوقات پر فوقیت بخشی ہے اس لئے انسان کو چاہیئے کہ خدا کے ساتھ معاملہ کرنے میں بھی انسان اس امانت کو نہ بھولے اور خودی کا کامل ترین احساس اس کو خدا کے سامنے اپنی منفرد حیثیت کو ختم نہ ہونے دے ورنہ اپنی ہستی کی کم مائیگی کا احساس اس کو جذب و عمل کی راہوں سے دور ڈالدیگا اور انسان ترقی نہ کر سکے گا۔ ان کے نزدیک خدا اس بات سے خوش ہوگا کہ میرا بندہ اس امانت کو خوب نبھا رہا ہے کہ میری بھی پرواہ نہیں کرتا۔ چنانچہ لکھا ہے :۔

"لیکن اقبال کا طرز خیال ہی سب سے جُدا ہے اس لئے انکے تصوف نے خود بخود اپنے لئے ایک نیا راستہ پیدا کر لیا ہے۔ اور وہ اسی منزل کی طرف لے جاتا ہے جو ان کے فلسفۂ حیات کی منزل ہے یہی وہ نازک مقام ہے (خدا اور بندے کا تعلق) جس میں رُوحانیت کا ذوق رکھنے والی طبیعتیں آکر کھو جاتی ہیں۔ بادۂ معرفت کے پہلے ہی جام میں علم کائنات اور احساسِ خودی کا رشتہ ہاتھ سے چھُوٹ جاتا ہے۔ یہ اقبال ہی کا ظرف ہے کہ عالمِ بےخودی میں بھی انہیں اتنا ہوش رہتا ہے کہ اس امانت کو نہیں بھُولتے جو خدا نے انسان کے سپرد کی ہے۔"

مطلب یہ کہ جناب اقبال اس امانت کی خاطر جو خدا نے ہی ان کو دی ہے خدا کے سامنے بھی اپنے احساسِ خودی کی برکت سے اپنی انفرادیت کو ٹھیس لگانا نہیں چاہتے حالانکہ یہ نہیں سوچتے کہ خدا نے وہ امانت غیر اللہ پر فوقیت بخشنے اور حکومت کرنے کے لئے دی ہے نہ کہ خود خدا پر۔ امین کا فرض تو یہ ہے کہ وہ امانت کو اسکے حوالے کرے کہ جو اس کا مالک ہے اس امانت سے بے تعلق ہو جائے۔ خدا تعالےٰ نے اپنی امانت انسان کو احسنِ تقویم پر پیدا کر کے اس لئے نہیں دی تھی کہ وہ خود با اختیار بن بیٹھے اور خدا کے آگے بھی ان اختیارات سے دست بردار نہ ہو، بلکہ انسان کو یہ امانت دینے کی وجہ یہ تھی کہ چونکہ انسان میں اللہ تعالےٰ نے ایسی صلاحیت رکھی تھی کہ وہ خدا تعالےٰ کے لئے اپنے نفس پر اکراہ اور جبر کر سکتا تھا اور

نفس کے جذبات کو اللہ جلشانہٗ کو راضی کرنیکی غرض سے کم کرکے ہر یک خود روی سے باز آکر حقیقی عبد بننے کی اہلیت رکھتا تھا۔ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام اس مسئلہ کی تشریح ان الفاظ میں فرماتے ہیں :-

"خدا تعالےٰ نے جس جگہ اعلیٰ درجے کی مدح بیان کی ہے اور اسکو فرشتوں پر بھی ترجیح دی ہے اِس مقام میں اس کی یہی فضیلت پیش کی ہے کہ وہ ظلوم اور جہول ہے جیساکہ وہ فرماتا ہے حملها الانسان انه کان ظلوما جهولا۔ یعنی اس امانت کو جو ربوبیت کا کامل ابتلا ہے جس کو فقط عبودیت کاملہ اُٹھا سکتی ہے انسان نے اُٹھالیا کیونکہ وہ ظلوم اور جہول تھا یعنی خدا تعالےٰ کے لئے اپنے نفس پر سختی کرسکتا تھا اور غیر اللہ سے اس قدر دُور ہوسکتا تھا کہ اس کی صورت علمی سے اس کا ذہن خالی ہوجاتا تھا . . . .

. . . . اور امانت سے مراد انسانِ کامل کے وہ تمام قویٰ اور عقل اور علم اور دل اور جان اور حواس اور خوف اور محبت اور عزت اور وجاہت اور جمیع نعماءِ رُوحانی وجسمانی ہیں جو خدا تعالےٰ انسانِ کامل کو عطا کرتا ہے اور پھر انسانِ کامل برطبق آیت ان اللہ یامرکم ان تؤدوا الامانات الیٰ اھلھا اِس ساری امانت کو جنابِ الٰہی کو واپس دیدیتا ہے یعنی اس میں فانی ہوکر اس کی راہ میں وقف کردیتا ہے۔"

پس جناب اقبال اپنے احساسِ خودی کی برکت سے اور تصوّف کی اس نئی راہ کی بدولت جو جناب نے اختراع کی ہے ہم کو خدا کے سامنے خائن بنانا چاہتے ہیں۔ العیاذ باللہ۔

فلسفۂ خودی نے جناب اقبال کو اسلام کی تعلیم سے اس قدر دُور جا ڈالا کہ وہ قرآنی تعلیم کے خلاف نظریہ پیش کرنے میں انتہائی جرأت اور دلیری کا ثبوت دے گئے۔ خدا اور بندے کے تعلق میں ایک نکتہ یہ بیان فرما گئے کہ لقاءِ الٰہی ایک دھوکہ ہے - وہ رویتِ الٰہی کے تو قائل ہیں جو ایک عارضی چیز ہے۔ لیکن لقاءِ الٰہی جو ایک مستقل درجہ ہے اور جو روحانی ترقیات کا ایک اعلیٰ ترین مقام ہے ان کے نزدیک غیر حقیقی اور

لا یعنی امر ہے۔ جناب ڈاکٹر سید عابد حسین اقبال کے فلسفہ کے اِس پہلو کو ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں :۔

"اقبال کے نزدیک اس عشق (عشقِ الٰہی) کی دو منزلیں ہیں۔ پہلی منزل سوز و گداز آرزو کی ہے۔ دوسری کیفِ دیدار کی جو راحت بخش بھی ہے اور اضطراب افزا بھی۔ تیسری کوئی منزل نہیں۔ لذتِ دیدار سے کامیاب ہونے کے بعد بھی نفسِ انسانی روحِ مطلق سے جُدا رہتا ہے اور درد جُدائی سے تڑپتا ہے۔ یہی اس کی فطرت ہے اور یہی اس کی تقدیر"

آگے چل کر پھر لکھتے ہیں :۔

"لیکن جیسا کہ ہم کہہ چکے ہیں محدود کا حقیقی وصل نا محدود سے یہی ہے کہ اُس کے اندر محو ہو جائے۔ بندے اور خدا کا یہ وصل جو اقبال کے پیشِ نظر ہے حقیقت میں وصل نہیں ہے۔ یہ ایک خاص حالت ہے جس میں سکون حاصل نہیں ہوتا۔ بلکہ سوز و سازِ فراق اور بڑھ جاتا ہے"

قرآن کی کھُلی کھُلی تعلیم یہ بتاتی ہے کہ رویت کے بعد لقاءِ الٰہی کا درجہ ہے جس میں انسان کو تمام غموم و ہموم، سوز و درد اور اضطراب و بے کلی سے بکلی نجات مل کر اِس دُنیا میں سرمدی راحت، ابدی سکون اور لازوال مسرت حاصل ہوتی ہے۔ لیکن یہ مرتبہ اپنے اُوپر ایک موت وارد کرنے کے بعد میسر آتا ہے۔ دُنیا میں پھنس کر انسان خدا سے اس رنگ میں تعلق نہ پیدا کر سکنے کی وجہ سے جو ترقیات کے نئے راستے اس پر کھول دے مایوس ہو جاتا ہے اور لقاءِ الٰہی سے بے نصیبی اس کو اس مقام اور اس درجہ عالیہ ہی کا سرے سے انکار کرنے پر مجبور کر دیتی ہے۔ جنابِ اقبال کی مایوسی ان کے اِس نظریئے سے ظاہر ہے۔ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے دُنیا کو اِس مایوسی سے نجات دلائی اور لوگوں کو لقاء کے درجے کی طرف بلایا اور قرآن سے ثابت کیا کہ لقاءِ الٰہی کوئی موہومی چیز نہیں بلکہ ایک مستقل درجہ ہے جو انسانوں کی ترقیات کا انتہائی مقام ہے۔ چنانچہ آپ بندے اور خدا کے تعلق کے تین درجوں کا ذکر قرآن کریم کی روشنی میں مندرجہ ذیل الفاظ میں بیان فرماتے ہیں :۔

(۱) "اس جگہ یہ نکتہ بھی یاد رہے کہ آیت موصوفہ بالا بلیٰ من اسلم وجهه لله وهو محسن فله اجره عند ربه ولا خوف عليهم ولا هم يحزنون سعادت تامہ کے تینوں ضروری درجوں یعنی فنا اور بقا اور لقاء کی طرف اشارہ کرتی ہے۔ کیونکہ جیسا کہ ہم ابھی بیان کر چکے ہیں اسلم وجهه لله کا فقرہ یہ تعلیم کرتا ہے کہ تمام قویٰ اور اعضاء اور جو کچھ اپنا ہے خدا تعالےٰ کو سونپ دینا چاہیئے اور اس کی راہ میں وقف کر دینا چاہیئے اور یہ وہی کیفیت ہے جس کا نام دوسرے لفظوں میں فنا ہے وجہ یہ کہ جب انسان نے حسب مفہوم اس آیت ممدوحہ کے اپنا تمام وجود معہ اس کی تمام قوتوں کے خدا کو سونپ دیا اور اس کی راہ میں وقف کر دیا اور اپنی نفسانی جنبشوں سے اور سکونوں سے بکلی باز آگیا تو بلاشبہ ایک قسم کی موت اس پر طاری ہو گئی اور اسی موت کو اہل تصوف فنا کے نام سے موسوم کرتے ہیں"

(۲) "اور پھر بعد اس کے وهو محسن کا فقرہ مرتبہ بقا کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ کیونکہ جب انسان بعد فنا اکمل و اتم و سلب جذبات نفسانی الٰہی جذبہ اور تحریک سے پھر جنبش میں آیا اور بعد منقطع ہو جانے تمام نفسانی حرکات کے پھر ربانی تحریکوں سے پُر ہو کر حرکت کرنے لگا تو یہ وہ حیات ثانی ہے جس کا نام بقا رکھنا چاہیئے"

(۳) "پھر اس کے بعد یہ فقرات فله اجره عند ربه ولا خوف عليهم ولا هم يحزنون جو اثبات و ایجاب اجر و نفی و سلب خوف و حزن پر دلالت کرتی ہیں یہ حالت لقا کی طرف اشارہ ہے۔ کیونکہ جس وقت انسان کے عرفان اور یقین اور توکل اور محبت میں ایسا مرتبہ عالیہ پیدا ہو جائے کہ اس کے خلوص اور ایمان اور وفا اور اجر اس کی نظر میں وہمی اور خیالی اور ظنی نہ رہے بلکہ ایسا یقینی اور قطعی اور مشہود اور مرئی اور محسوس ہو کہ گویا وہ اس کو مل چکا ہے

اور خدا تعالےٰ کے وجود پر ایسا یقین ہو جائے کہ گویا وہ اس کو دیکھ رہا ہے اور ہر ایک آئندہ کا خوف اس کی نظر سے اُٹھ جاوے اور ہر ایک گذشتہ اور موجودہ غم کا نام و نشان نہ رہے اور ہر ایک رُوحانی تنعم موجود الوقت نظر آوے تو یہی حالت جو ہر ایک قبض اور کدورت سے پاک اور ہر ایک دغدغہ اور شک سے محفوظ اور ہر ایک دردِ انتظار سے منزہ ہے لقا کے نام سے موسوم ہے"

جناب اقبال ہماری رہنمائی کا دم تو بھرتے ہیں لیکن ہم کو اپنے ساتھ ناکامی اور نامرادی کے گڑھے میں دھکیل کر ہم کو تسلی دینا چاہتے ہیں۔ وہ ہماری ترقی کی معراج سوز و سازِ فراق اور دردِ انتظار میں پوشیدہ بتاتے ہیں۔ ہاں ایسے دردِ انتظار میں جو کبھی وصل میں تبدیل نہ ہو سکے۔ جو ناسور بنکر وبالِ جان بن جائے اور جس کے مداوے کی کوئی صورت نہ ہو۔ وہ رہنمائی کرتے ہیں لیکن منزل پر پہنچنے سے پہلے ہی ہمت ہار بیٹھتے ہیں اور مایوسی سے اپنے مقتدیوں کی کمرِ ہمت توڑ دیتے ہیں۔ برخلاف اس کے حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام ہماری رہنمائی تمام مراحل میں سے ایسے رنگ میں فرماتے ہیں کہ مایوسی کو پاس نہیں پھٹکنے دیتے۔ ابتداء میں آپ فنا کا درجہ پیش کرتے ہیں لیکن اسکے نتیجے میں بقا کے درجے کی بشارت بھی ساتھ سُنا دیتے ہیں اور اس نئی زندگی کے بعد سوز و دردِ فراق اور غموم و ہموم میں حیران و پریشان اور گمراہ و سرگرداں نہیں چھوڑ دیتے بلکہ آپ بلا توقف درجۂ لقا کی نوید سُناتے ہیں۔

اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیوں جناب اقبال لقاءِ الٰہی کے خلاف ہیں اور کیوں درد و سوزِ فراق میں تڑپتے رہنا چاہتے ہیں۔ سو اس لئے کہ اس سے ان کے فلسفۂ خودی کو تقویت پہنچتی ہے۔ ان کے نزدیک خدا تعالےٰ سے فراق میں ہی دیدارِ الٰہی کی آرزو کی حیات ہے اور بقاءِ آرزو میں ہی عمل کوشش اور جد و جہد کا استوار پنہاں ہے۔ ان کے خیال کے مطابق اگر انسان کو لقا کا درجہ میسر آجائے تو دردِ فراق جو محرک ہے عمل پیہم کا مسرت میں تبدیل ہو کر جمود کی صورت اختیار کر لیگا اور اس طرح انسانی خودی کی ارتقاء میں روک واقع ہو جائیگی۔ چنانچہ

ڈاکٹر یوسف حسن خاں اِس نظریئے کی تائید میں "رُوحِ اقبالؒ" کے صفحہ ۲۹۰ پر تحریر کرتے ہیں:۔

"انسان کے لئے فطری ہے کہ وہ اپنے آپ کو ذاتِ الٰہی سے علیحدہ تصوّر کرے۔ اُس کی جستجو میں انسان کی نارسائیاں ہی اس کے لئے سب سے بڑی محرک عمل کا حکم رکھتی ہیں۔ فراق ایسی نعمت ہے جو وصال میں بھی باقی رہنی چاہیئے۔ جدائی عشق کی آئینہ دار اور عاشقوں کو سازگار ہے۔ اس کی بدولت انسانی دِل تابناک رہتا ہے۔ فراق کے نالہ وفغاں کے بغیر شخصیت کی بالیدگی ممکن نہیں۔ غمِ فراق ہی خودی کی بنیادوں کو مستحکم کرنیکا ذریعہ ہے۔"

اقبال خود کہتے ہیں :۔

عالمِ سوز و ساز میں وصل سے بڑھکے ہے فراق + وصل میں مرگِ آرزو۔ ہجر میں لذتِ طلب

کس قدر حیرت کا مقام ہے کہ اقبال جیسا فلسفی خدا اور بندے کی محبت کو ایک دُنیوی اور حادث عاشق و معشوق کی محبت پر قیاس کرتا ہے۔ جیسے اِس دُنیا میں مدعا اور مقصد حاصل ہونے کے بعد اس مقصد کے حصول کے لئے جدّوجہد ختم ہو جاتی ہے اسی طرح وہ سمجھتے ہیں کہ خدا کا وصال انسان کو پیہم عمل اور فکر سے محروم کر دیگا اور ایک ایسی مسرت نصیب ہوگی جس سے انسان اُکتا جائے گا۔ حالانکہ یہ ایک واضح بات ہے کہ محدود سے وصال ایک محدود خوشی کا موجب ہوگا اور ایک غیر محدود ہستی سے وصال خوشی و انبساط کا ایک غیر محدود خزانہ اپنے ساتھ لائیگا۔ اگر انسان اس مسرت سے اُکتا سکتا ہے تو پھر وہ خوشی غیر محدود نہیں بلکہ محدود ہو جائیگی اور خدا حادث ٹھہرے گا۔ دوسرے یہ خیال غلط ہے کہ لقا کا درجہ حاصل کرنے کے بعد کوشش اور جدّوجہد کا سلسلہ ختم ہو جائیگا۔ کیونکہ خدا اگرچہ الآنَ کَمَا کَانَ ہے لیکن اس کی صفت یہ بھی ہے کُلَّ یَومٍ هُوَ فِی شَان۔ جب وہ ہر روز ایک نئی شان کے ساتھ ظاہر ہوتا ہے تو لقاء کے بعد بھی اس کی نت نئی قدرتوں اور صفات کو دیکھنے کی خواہش اور آرزو انسان میں باقی رہیگی اور ہر روز پُوری بھی ہوتی رہے گی اور اِس طرح بجائے جستجو میں

انسان کی نارسائیاں محرکِ عمل ثابت ہونے کے انسان کی رسائیاں اور اس کی آرزوؤں کا پورا ہونا اس کے لئے جذبۂ عمل کو ایک نیا جوش اور ولولہ عطا کرے گا اور کل یوم ھو فی شان کے ماتحت وہ عمل میں روز بروز برق رفتاری سے ترقی کرتا چلا جائے گا۔ اور کیونکہ خدا تعالیٰ کی ذات غیر محدود ہے اس لئے اس کی صفات کا نئے سے نیا اظہار بھی غیر محدود ہوگا اور اس کے نتیجے میں بندے کی کوشش اور جدوجہد بھی غیر محدود ہوگی۔ برخلاف اس کے جستجو میں نارسائیاں تو مایوسی کا پہلو اختیار کرکے جذب و عمل سے محروم کرنے کا موجب بن سکتی ہیں تو یہ خیال اور نظریہ جسکے ماتحت لقاء الہٰی کا انکار لازم آتا ہے سراسر باطل اور اسلام کی تعلیم کے قطعاً خلاف ہے۔ آج مسلمان کہلانیوالے غیر اسلامی نظریوں کی دُنیا میں اشاعت کریں اور خدا کی غیرت جوش میں نہ آئے اور وہ اپنے کسی فرستادہ کو مبعوث نہ فرما کر ان کی بیخ کنی نہ فرمائے، ایسا نہ ہوسکتا تھا۔ خدا کی غیرت جوش میں آئی اور اُس نے حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کو مبعوث فرما کر اسلام کو اصلی صورت میں پھر پیش کیا تا اس کی مخلوق جھوٹ اور سچ میں تمیز کرسکے اور اس راستے کو اختیار کرے جس کے ساتھ اس کی نجات وابستہ ہے۔

درخت اپنے پھلوں سے پہچانا جاتا ہے۔ جنابِ اقبال کے فلسفہ نے جو اثر لوگوں کے دماغوں پر ڈالا اس کی چند مثالیں اُوپر بیان ہوچکی ہیں جو اس بات کو ظاہر کر رہی ہیں کہ مسلمان کس طرح مخفی طور پر دہریت کی رَو میں بہے چلے جارہے ہیں۔ دراصل بات یہ ہے کہ جناب اقبال مغربی فلسفے اور اس کی روشنی میں تراشیدہ نظریوں سے اس درجہ مرعوب ہوگئے کہ انہوں نے ان کو اپنانے کی خاطر اور مغربی اقوام کی طرح ترقی حاصل کرنے کی غرض سے ان کو اسلام پر منطبق کرنے کے لئے اسلام کی طرف سے "ایسی ذلت کے ساتھ صلح کا پیغام پہنچایا کہ جیسے عاجز اور مغلوب دشمن درماندہ ہوکر اور ہر طرف سے رُک کر کچے اور بیہودہ عذرات سے مصالحت کا طالب ہوتا ہے"۔ لیکن برخلاف اِس کے حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے جو اِس زمانے میں علومِ رُوحانیہ کے انتشار کے لئے مبعوث کئے گئے

تھے۔ حضرت امام غزالیؒ کی طرح مغربی نظریوں کی تردید کرکے صحیح اسلامی نظریئے پیش کئے اور باطل نظریوں کی موت کی خبر دے کر اسلام کی فتح کی خوشخبری دُنیا کو سُنادی۔ حضورؑ فرماتے ہیں:۔

"اسلام کی سلطنت کو ان چڑھائیوں سے کچھ بھی اندیشہ نہیں ہے جو فلسفہ اور طبعی کی طرف سے ہو رہے ہیں۔ اس کے (اسلام کے) اقبال کے دن نزدیک ہیں۔ اور مَیں دیکھتا ہوں کہ آسمان پر اس کی فتح کے نشان نمودار ہیں۔ یہ اقبال رُوحانی ہے اور فتح بھی رُوحانی۔ تا باطل علم کی مخالفانہ طاقتوں کو اس کی الٰہی طاقت ایسا ضعیف کرے کہ کالعدم کر دیوے۔"

بے نصیب ہیں وہ جو مغربی فلسفوں کی دلفریبی کا شکار ہو کر انکی طرف کھنچے چلے جاتے ہیں۔ کیونکہ وہ موت کے مُنہ میں اپنے آپ کو دھکیلتے ہیں اور مبارک ہیں وہ جو آسمانی آواز پر کان دھر کر ایمان لاتے ہیں۔ کیونکہ اُن کیلئے فتح کی بشارت ہے۔

اِرشَادُ اللّبِیب اِلٰی کَسرِ الصَّلِیب

یعنی

شہادۃ القرآن مصنفہ میر سیالکوٹی کا جواب

(۵)

(از مولنا تاج الدّین صاحب لائلپوری۔ مولوی فاضل)

(تسلسل کے لئے ملاحظہ ہو ریویو آف ریلیجنز اردو نومبر ۱۹۳۶ء)

قولہٗ:- "یہ کس جاہل سے سیکھا تھا کہ نصاریٰ مسیح کے مصلوب ہونے پر اتفاق رکھتے تھے۔" (صفحہ ۸۴)

اقول:- (۱) مولنا ثناء اللہ صاحب سے (۲) پیر مہر علی شاہ صاحب گولڑوی سے (۳) ہم نے سیکھا ہے حضرت علّامہ نظام الدّین قمی نیشاپوری سے لکھتے ہیں:- النّصاریٰ . . . . باسرھم متفقون علیٰ انّ الیھود قتلوہ۔ کہ نصاریٰ سارے کے سارے بلا استثناء احدے اس بات پر متفق ہیں کہ حضرت مسیح مقتول و مصلوب ہوئے۔ (تفسیر غرائب القرآن برحاشیہ تفسیر ابن جریر جلد ۶ ص۱۹ مطبوعہ مصر ۱۳۲۶ھ)

(۴) ہم نے سیکھا ہے الامام الکبیر والمحدّث الشّہیر اعنی حضرت محمّد ابن جریر الطبری سے جو بقول مولنا سیف بنارسی "لغت عرب کے امام اور حدیث رسولؐ و آثار صحابہؓ حافظ تھے" (اہلحدیث ۱۰ اپریل ۱۹۲۲ء ص۳) وہ اپنی تفسیر میں جو بقول مولوی (ثناء اللہ) صاحب "اُمّ التفاسیر" ہے (اجتہاد ص۴) لکھتے ہیں:- فاتفقوا جمیعھم (یعنی) الیھود والنصاریٰ من اجل ذٰلک علیٰ انّ المقتول کان عیسٰی۔ کہ یہود و نصاریٰ (حواری) سب کے سب متفق ہو گئے کہ مقتول و

مصلوب خود حضرت عیسیٰؑ تھے۔ (تفسیر ابن جریر جلد ۶ صفحہ ۱۲)
پھر صفحہ ۱۲ پر لکھتے ہیں:۔

"وظن اصحابه واليهود ان الذى قُتِلَ وصُلِبَ هو نبيهم ..... فحكوا ما كان عندهم يقيناً .....
... فلم يستحق الذين حكوا ذلك من حواريه ان يكونوا كذبة۔"

یعنی چونکہ حواریوں نے وہی کہا جو ان کے نزدیک حق تھا کہ مصلوب حضرت مسیحؑ ہیں اس لئے ان کو جھوٹا نہیں کہا جا سکتا۔

قولہ:۔ "نصاریٰ کے قدیم فرقے یہی اعتقاد رکھتے تھے کہ حضرت مسیح علیہ السلام مصلوب نہیں ہوئے، بلکہ ایک اور شخص صلیب پر لٹکایا گیا تھا۔ جس پر حضرت عیسیٰ کی شکل ڈالی گئی تھی۔" (شہادت القرآن صفحہ ۴۳)

اور کہ:۔ "جب یہود حضرت مسیح کو پکڑنے جا رہے تھے آپ بوساطت چار فرشتگان تیسرے آسمان پر اٹھا لیئے گئے اور آپ کی بجائے یہودہ اسکریوطی صلیب دیا گیا۔" (ایضاً صفحہ ۴۵)

اقول:۔ اوّلاً اپنے "سردار" کو سمجھائیے کہ وہ ان کے **اتفاق** اور **تواتر** سے انکار نہ کریں، بلکہ ان کو بتائیے کہ بہت سے نصاریٰ مسیح کی طبعی موت کے بھی قائل ہیں۔ پس اگر اس قسم کے افراد کے خیال سے قومی اتفاق اور تواتر منقوض ہو جاتا ہے تو پھر آپ کے "سردار" کا یہ دعویٰ بھی باطل ہوا جاتا ہے کہ مسیح کے طبعی موت سے نہ مرنے پر نصاریٰ کا اتفاق اور تواتر ہے (فتح ربانی و تفسیر ثنائی)
نیز تکذیب کیجئے اپنے "محقق و مدقق اور عالم نبیل و فاضل جلیل" کی جو کہتے ہیں "قبل از واقعۂ صلیب مسیح کے زندہ بجسدہ العنصری اٹھایا جانے کا کوئی اہل کتاب (نصاریٰ) میں سے قائل نہیں۔" اور کہ "قبل از قتل صحیح وسالم (مسیح کا) آسمان کی طرف اٹھایا جانا ان کے معتقدات سے ہرگز نہیں ہو سکتا۔" نیز یہ کہ "اہل کتاب (نصاریٰ) قبل از واقعۂ صلیب مرفوع ہونے مسیح کے قائل ہی نہیں۔" (شمس البدایت)
علاوہ ازیں آپ کے اِس خیال کی تردید میں بقول "سردار اہلحدیث" مولوی ثناء اللہ صاحب

"ہم ایک گواہ مسلمہ فریقین (احناف و اہلحدیث) کی شہادت پیش کرتے ہیں (یعنی) استاد الہند حکیم الامت حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی قدس سرہٗ (کی)" (تقلید شخصی وسلفی ص ۶۳) آپ فرماتے ہیں:۔

"نیز از ضلالت ایشاں (نصاریٰ) یکے آنست کہ جزم میکنند کہ حضرت عیسیٰ مقتول شدہ است وفی الواقع در قصہ عیسیٰ اشتباہ ہی واقع شدہ بود..... وکابر اُعن کابر ہماں غلط روایت نمودند۔ خدائے تعالیٰ در قرآن شریف ازالۂ شبہ فرمود کہ مَا قَتَلُوْهُ وَمَا صَلَبُوْهُ وَلٰكِنْ شُبِّهَ لَهُمْ۔ در انجیل آنچہ..... بقول حواریاں (ازیں باب مذکور) است۔ منشائے آں وقوع اشتباہ است وعدم اطلاع بر حقیقت رفع، کہ مالوف اذہان واسماع نبود۔"

(تفسیر فوز الکبیر ص۱۱)

خلاصہ مطلب یہ ہے کہ نصاریٰ کا اِس امر پر جزم اور پختہ اعتقاد ہے، کہ حضرت عیسیٰ مقتول ومصلوب ہوئے تھے، اور حواریوں کو جو یہ غلطی لگی تو اس کا منشاء امر قتل مسیح میں وقوع اشتباہ ہے۔ اور کہ نصاریٰ میں نسلاً بعد نسلٍ یہی عقیدہ چلا آتا ہے۔ مولوی صاحب! کیا اب بھی اپنی ضد پر اڑے رہیں گے؟

ثانیاً:۔ آپ لوگ کہا کرتے ہیں کہ جو قرآن مجید ہمارے ہاتھوں میں ہے یہ وہی ہے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوا تھا، اس میں کسی لفظ کی کمی بیشی نہیں ہوئی۔ اور کہ یہ عقیدہ متواتر اور اجماعی ہے۔ مگر اس سے کون ناواقف ہے کہ مسلمانوں کے بعض فرقے یہ عقیدہ فاسدہ رکھتے ہیں کہ نعوذ باللہ قرآن مجید میں کمی بیشی کی گئی ہے۔ ملاحظہ ہو رسالہ "بحث قرآن" مصنفہ سید سجاد حسین صاحب تفسیر مجمع البیان و بحر العلوم و تفسیر صافی وغیرہا۔

اسی طرح اور بہت سے اسلامی مسائل وعقائد جن کے متعلق یہ کہا جاتا ہے، کہ وہ مسلمانوں کے اتفاق اور تواتر سے ثابت ہیں اِس وجہ سے گِر جائیں گے مثلاً صلوات خمسہ، عدد رکعات اور مقادیر زکوۃ اور آمد مہدی وغیرہا۔

ثالثاً:۔ عیسائی کلیسیا جو عیسائیت کی نمائندہ جماعت ہے ہمیشہ سے یہی

عقیدہ رکھتی رہی ہے کہ حضرت مسیح علیہ السلام [illegible] صلیب پر چڑھائے گئے تھے۔ اور اگر چند افراد یا نام نہاد "فرقوں" نے اس کے خلاف کبھی کچھ کہا ہو تو ان کو گمراہ، بدعتی بلکہ مرتد قرار دیکر اپنی عیسائی کلیسیا سے خارج کر دیا اور سوائے کتب میں چند ایک کا ذکر ہونے کے آج دنیا میں کہیں اُن کا وجود اور اُن کی ہستی تک قائم وموجود نہیں۔ پس بعد کے چند بدعتی لوگوں کے خیال سے اِس قومی اتفاق پر کچھ اثر نہیں پڑ سکتا۔ یہود کا اتفاق تو آپ کو بھی مسلّم ہے اور اسی طرح اُس وقت کے رُومی لوگوں کی شہادت کے خلاف بھی آپ نے کچھ نہیں کہا۔ اور کہہ بھی کیا سکتے تھے جبکہ علاوہ بیان اناجیل کے قدیم رومی مؤرخ بھی اسی کی تصدیق کرتے ہیں۔ اور یہ کہ "یہودی چونکہ دشمن اور کافر ہیں، اس لئے اُن کی گواہی معتبر نہیں" آپ کا محض عُذرِ خام ہے۔ اتنا تو غور کیا ہوتا کہ کافر اور دشمن کی بات کو رد کرنے کا حق سب سے پہلے نصاریٰ کا تھا جن کے وہ براہِ راست اور اوّلین دشمن تھے، مگر وہ تو قبول کرتے ہیں کہ اُن کی یہ گواہی حق ہے، مگر ہمارے مولوی ہیں کہ انکار کئے جاتے ہیں۔

مولینا! اُن کی شہادت کی پڑتال اگر ہو سکتی تھی تو اس واقعہ کے وقت یا اس کے قریب ترین زمانے میں، سو اُس وقت کے محقق نصاریٰ نے تو اس شہادت کو حق اور سچ پاکر قبول کیا، مگر آپ دو ہزار سال کے بعد یہ رٹ لگا رہے ہیں کہ "یہود کافر ہیں، ان کی بات ماننے کے قابل نہیں۔ عیسائیوں نے تو اس قدر وزنی اور ناقابلِ ردّ ان کی یہ شہادت پائی کہ بجز ماننے کے کوئی چارہ نہ رہا، آخر مجبوراً کفارہ کا حیلہ سوچکر اپنے محبوب ترین مسیح کو ملعون قرار دینا پڑا، مگر اس واقعہ سے انکار نہ کر سکے۔ مولینا! اگر عیسائیوں کے پاس کوئی بھی ثبوت اس کے خلاف ہوتا اور اس سے انکار کر دینے کی ذرہ بھر بھی گنجائش ہوتی تو وہ کبھی بھی اپنے پیارے اور منجی مسیح کے متعلق یہ باور نہ کرتے کہ اُس کے دشمنوں نے اُس پر قابو پالیا۔ وہ ضرور کہتے کہ ہمارا مسیح یہود بے بہبود کے ہاتھ سے صاف بچ نکلا تھا۔ وہ اس سے انکار کی گنجائش نہ پاکر بادلِ ناخواستہ اُنکی بات ماننے پر مجبور ہو گئے[1] بلکہ میں تو کہتا

[1] رہا یہ کہ ان کا ادعائے قتل وصلب پھر کیوں مردود [illegible]، تو اس کی تفصیل و تحقیق

ہوا کہ مسیح کا صلیب پر چڑھایا جانا ایسا بدیہی اور یقینی امر ہے، کہ آپ بھی اس سے انکار نہ کر سکے۔ آپ تسلیم کرتے ہیں کہ سولی پر ایک ایسا شخص چڑھایا گیا تھا جس کا سر، ماتھا، ناک، کان، آنکھیں، رخسارے، یعنی سارا چہرہ مہرہ۔ گردن، مونڈھے، بازو، ہاتھ، پاؤں، اُن کی اُنگلیاں، ٹانگیں، غرضکہ سر سے لیکر پاؤں تک تمام اعضاء اور اُس کی شکل وشباہت، رفتار، گفتار، لب و لہجہ اور رنگ ڈھنگ دیکھ کر اُس کے دوست، دشمن، عزیز و اقارب، اپنے، بیگانے اور اُس کے بچپن سے جان پہچان والے اُسے مسیح عیسےٰ ابن مریم یقین کر رہے تھے۔ جیسا کہ آپ نے بحوالہ انجیل برناباس لکھا ہے کہ "یہ مشابہت صوری ایسی عجیب تھی کہ اس سے حضرت مریم اور حواری بھی بھول گئے" (شہادۃ القرآن صفحہ) نیز ملاحظہ ہو تفسیر ابن جریر جلد ۶ صفحہ ۱۲، ۱۳)

پھر وہ خود بھی یہ نہ کہتا تھا کہ میں مسیح نہیں ہوں، مجھے کس جرم کی پاداش میں پھانسی دے رہے ہو (اس سے صاف پتہ چلتا ہے، کہ وہ خود بھی اپنے تئیں عیسےٰ بن مریم ہی سمجھتا تھا، ورنہ اس کا شور کرنا ایک لازمی اور طبعی امر تھا) بلکہ بقول وہب اُس نے صاف کہا تھا کہ میں عیسےٰ ہوں، فخرج الیھم فقال انا عیسیٰ (تفسیر ابن جریر جلد ۶ صفحہ)

پس ایسی حالت میں کہ جب آپ بھی اسے ہو بہو اور بعینہ عیسےٰ مانتے ہیں پھر آپ کا یہ کہنا کہ "یہودی چونکہ دشمن اور کافر ہیں اس لئے اُن کی گواہی معتبر نہیں" کیا معنے رکھتا ہے۔ اُن کی یہ "گواہی" تو اس قدر زبردست، یقینی اور قطعی ہے کہ آپ بھی اس کے ماننے پر مجبور ہیں۔ پھر آپ کا کفر اور دشمنی کا بہانہ کیا اثر رکھتا ہے۔ اور دبی زبان سے یہ کہہ دینا بھی کہ وہ دیکھنے میں تو بے شک عیسیٰ تھا

بقیہ حاشیہ: اپنے موقعہ پر آئے گی۔ مختصراً یہ کہ خدائے علیم کی شہادت صریحہ اسے باطل قرار دے رہی ہے۔ ومن اصدق من اللہ قیلاً۔ اور یوں عقلاً اور عادۃً بھی کسی شخص کی موت کے متعلق دھوکا اور اشتباہ ہو جانا امور ممکنہ بلکہ واقعات مشہودہ میں سے ہے حتیٰ کہ بسا اوقات اطباء اور حکماء کی رائے بھی خطا کر جاتی ہے۔ فتدبر! - منہ

اور سب واقف کار اُسے علیٰ ہی سمجھتے تھے ، لیکن اندرؔ سے عیسیٰ نہ تھا ، اس گواہی کو مخدوش نہیں کر سکتا۔ کیونکہ مشہودات اور محسوسات کے متعلق جس حد تک گواہی دُنیا میں ہؤا کرتی ہے وہی انہوں نے دی جو آپ کو بھی مسلّم ہے۔

مولوی صاحب! خدارا غور کیجئے ، کہ یہ عقل و فہم سے کوسوں دُور "اندر" کی بات کس نے بتائی۔ خدا تعالیٰ نے ، یا اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے ، یا عقل نے۔ آخر ہزارہا سال کے بعد آپ کو یہ کیونکر معلوم ہو گیا کہ وہ "اندر" سے مسیح نہ تھا۔ سچ کہتا ہوں ، اِس خلافِ عقل اور ناقابلِ تسلیم امر پر نہ قرآن کی شہادت اور نہ حدیث صحیح کی شہادت آپ پیش کر سکتے ہیں اور نہ اس میدان میں عقل آپ کا ساتھ دے سکتی ہے ، بلکہ عقل و نقل ہر دو آپ کے اِس عقیدہ کو شمشیرِ برہنہ لے کر کاٹ رہے ہیں۔

آپ کا ایک پادری (جارج سیل۱؎) کی بات پر اعتبار کرنا اور اپنے مسلّم "سردار اہلحدیث" اور دیگر معترضین کی بات پر اعتبار نہ کرنا اور اہل کتاب کے اس عقیدے کو متفقہ عقیدہ قرار نہ دینا سخت موجب حیرت و جائے تعجب ہے۔ حالانکہ جیسا کہ مَیں بتا چکا ہوں یہ قول چند گمنام محض اور نام نہاد عیسائیوں کی طرف اس نے منسوب کیا ہے ، جو کلیسیا سے خارج ، مرتد اور خارج از مسیحیت قرار دیئے گئے ہیں ، اور جن کا آج نام و نشان نہیں ملتا۔ اور تمام کلیسیا جو کہ عیسائیت کی نمائندہ رہی ہے اور ہے ، اِس عقیدہ سے ہمیشہ بیزار ہے۲؎۔ پھر مَیں پوچھتا ہوں کہ یہ کس نے کہا کہ

۱؎ معلوم ہے کہ سیل صاحب نے حسبِ عادتِ پادریاں اپنے ترجمۂ قرآن میں موقعہ بموقعہ یہ ظاہر کرنا چاہا ہے کہ اسلامی عقائد وغیرہ نعوذ باللہ الہامی نہیں بلکہ دوسری قوموں خصوصاً عیسائیوں سے لئے گئے ہیں اور بعض مسائل تو بعض بدعتی اور نام نہاد عیسائیوں سے بھی اخذ کر لئے گئے ہیں ، جن میں سے ایک یہ عقیدہ بھی ہے (ملاحظہ ہو ینابیع الاسلام فصل چہارم) مگر افسوس! ہمارے مولوی صاحبان اس نیت بد و دجلی کا شکار ہو گئے۔ منہ

۲؎ جن نام نہاد بعض عیسائیوں کی طرف یہ عقیدہ منسوب کیا گیا ہے انکو بھی یہ مسلّم

کہ ایک جماعتِ کثیرہ کے مقابلے میں بعد کے چند ایک گمراہ اور بدعتی لوگوں کی رائے اگر خلاف ہو جائے تو تواتر قائم نہ رہے گا۔ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ ایک "جماعت" کے مقابلہ میں کسی مخلص کا انکار بھی تواتر میں مخل نہیں ہو سکتا۔ اور انجیل برناس کے متعلق کہ غالباً جس کی بنا پر پادری کسیل نے یہ بات لکھی تھی، اس کا بعد کا خیال بھی سن لیں کہ وہ باقی عیسائیوں کی طرح اس کے جعلی ہونے کا مُقر ہے (ملاحظہ ہو رسالہ مسیحِ مصلوب اور انجیل برناس مطبوعہ ۱۹۲۴ء)

حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام بے شک" عیسائیوں کے مقابلہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کو ثابت کرنے کے لئے اسی انجیل برناس سے نہیں ملزم کیا کرتے تھے" مگر اوّل تو یہ الزامی طریق تھا اور تمام علمائے اسلام اس طریق کو استعمال کرتے رہے ہیں اور اب بھی کر رہے ہیں، کہ اناجیل و دیگر صحفِ انبیاءؑ مندرجہ بائیبل میں سے باوجود محرّف و مبدّل و نامعتبر ماننے کے اسلام کی تائید میں حوالجات پیش کرتے ہیں۔ پھر کسی کتاب کی بعض باتوں کو صحیح یا درست ماننے سے اس ساری کتاب کی صحت کا اقرار لازم نہیں آتا۔ حضرت اقدس علیہ الصلوٰۃ والسلام نے تو اناجیلِ مروّجہ میں سے بھی حوالے دیئے ہیں اور ساتھ ہی آپ انکے محرّف و مبدّل ہونے کے بھی قائل ہیں، بلکہ خود قرآن مجید باوجود تورات و انجیل کا مصدق ہونے کے ان کی غلط باتوں کی تردید و تغلیط بھی کرتا ہے پس کسی کتاب میں سے ایک آدھ بات سچ مان لینے سے ساری کتاب کا صحیح ہونا مان لینا لازم نہیں آتا۔ اور نہ یہ ضروری ہے کہ اگر اس میں

بقیہ حاشیہ

ہے کہ جو شخص صلیب پر لٹکایا گیا تھا اُسے تمام دیکھنے والے عیسیٰ ہی بیان کرتے ہیں اور کہ وہ اپنے اس بیان اور شہادت میں سچے ہیں کیونکہ واقعی وہ عیسیٰ ہی نظر آتا تھا۔ پس فی الحقیقت وہ بھی اس قومی اتفاق اور تواتر کے خلاف نہیں ہیں صرف اپنے اس خیالی اور ذہنی عقیدہ کی بنا پر کہ بھلا کہیں خدا اور ابن اللہ بھی تألمِ جسمانی کا محل ہو سکتا ہے انہوں نے یہ حیلہ تراش لیا۔ او ظاہر ہے کہ امر زیر بحث حقیقۃً یہ نہیں کہ کسی کا ذاتی خیال کیا ہے، بلکہ یہ ہے کہ اس تاریخی واقعہ پر اہل کتاب کا اتفاق اور تواتر ہے کہ دیکھنے والوں نے صلیب پر لٹکے ہوئے حضرت عیسیٰ کو دیکھا اور اس سے نہ آپکو انکار ہے اور نہ آپکے پیش کردہ عیسائیوں کو۔ فثبت المدعیٰ۔ منہ

بیان کردہ کسی بات کا بھی انکار کیا جائے تو اُس کی ساری باتوں سے انکار لازم آتا ہے۔
چنانچہ مولانا شیخ مولا بخش صاحب کانپوری اسی انجیل کی بحث میں لکھتے ہیں:۔

"ایک مضمون کے تقریباً الہامی سمجھنے سے کل کتاب کا الہامی سمجھنا لازم نہیں آتا۔ اور یہ امر کچھ تعجب انگیز اور غیر ممکن نہیں ہے کہ ایک کتاب میں کلام الہامی اور غیر الہامی دونوں خلط ہوں۔" (مراسلات[1] مذہبی حصہ اول، صفحہ ۹۸، ۹۹ مطبوعہ مطبع رحمانیہ مونگھیر)

علاوہ ازیں بریناس کا یہ مضمون آپ کے بھی خلاف ہے۔ مثلاً اس میں لکھا ہے کہ حضرت مسیح آخر دُنیا تک نہیں مریں گے۔" (شہادۃ القرآن صفحہ) حالانکہ کسی مسلمان کا ایسا عقیدہ نہیں ہو سکتا۔

قولہ: "حضرت عیسٰے کا مصلوب ہونا تو پولوس نے گھڑا۔" (حاشیہ صفحہ ۳۳)

اقول: مصلوب وہ ہے جو بعلتِ تصلیب مر جائے۔ پس آپ کا یہ قول ہمیں مضر نہیں۔ لیکن یہ کہ صلیب پر چڑھنے سے انکاری "فرقے" پولوس سے بھی قبل تھے اس کا ثبوت آپ کے ذمہ ہے۔ (مزید بحث آگے آتی ہے)

اب میں صلیب پر خود حضرت مسیح کا چڑھایا جانا یہود و نصاریٰ کے "اتفاقی مسئلہ ہونے پر" ایک ایسی مضبوط اور ناقابلِ انکار دلیل پیش کرتا ہوں جس کے سامنے مولوی صاحب کے لئے بجز سر تسلیم خم کرنے کے کوئی چارہ نہ ہوگا کیونکہ وہ ان کے مسلّم "سردار" کی مسلّم بلکہ مایۂ ناز، سب سے پہلی اور "زبردست دلیل" ہے حیاتِ مسیح علیہ السلام پر۔ جسے انہوں نے اپنی تفسیر ثنائی، پاکٹ بک، اور "فتح ربانی" تصنیفات میں بڑے شدّ و مد کے ساتھ پیش کیا ہے۔ اور پھر اسی دلیل سے ولادتِ مسیح بن باپ پر بھی استدلال کیا ہے۔ اور بوجہ "سردار اہلحدیث" کا طریق استدلال ہونے کے بمصداق "من تو شدم تو من شدی" مولوی صاحب پر بھی یہ دلیل حجت ہوگی۔ پس بطریق معارضہ بالقلب جس سے افحام و اسکات خصم بطریق احسن سرانجام پاتا ہے، میں بتغییر یسیر بموقعہ مناسب انہی کے الفاظ میں وہ دلیل تحریر کرتا ہوں؛

---

[1] اس کتاب کے مضامین مولانا سید محمد علی صاحب مونگھیری کے لکھوائے ہوئے ہیں۔ ملاحظہ ہو کتاب کا سرورق صفحہ ۲۔ منہ

لکھتے ہیں :-

"دُنیا میں جو مقتداء اور پیشوا ہوئے ہیں ان کے حالات کو محفوظ رکھنے والے دو قسم کے لوگ ہوتے ہیں، ایک موافق دوسرے مخالف، ان دونوں کی نگاہیں اس مقتداء (ہیرو) کے افعال واقوال پر متفق پڑتی ہیں۔ گو ان کی نیتیں الگ الگ ہوتی ہیں۔ معتقدین تو بغرض اتباع انکو دیکھتے ہیں اور مخالفین بغرض نکتہ چینی۔

خدا کی شان ہے حضرت عیسےٰ علیہ السلام اِس خصوصیت میں خاص ممتاز ہیں۔ کسی نبی کے حالات اس طرح مخالفین اور موافقین نے قلمبند نہیں کئے جس طرح حضرت موصوف کے معتقدین نصاریٰ نے انجیلوں میں اور یہودیوں نے اپنی تاریخ میں ان کے حالات قلمبند کر رکھے ہیں۔

ان سب کا متفقہ بیان ہے کہ حضرت عیسےٰ علیہ السلام کو پھانسی دی گئی ہے۔ جس سے بطور بین لازم کے یہ نتیجہ ثابت ہوتا ہے کہ ان دونوں کے نزدیک حضرت ممدوح (بذاتِ خود صلیب پر چڑھائے گئے تھے نہ کہ ان کا کوئی ہمشکل) اب ہمارے سامنے تواتر سے دو باتیں ثابت ہیں، ایک (خود) حضرت عیسےٰ کا سولی پر (چڑھایا جانا) دوسرا موت (غیر) طبعی سے مرنا۔ قرآن مجید کا دعویٰ ہے کہ میں کتب اور حالات سابقہ پر بطور مہیمن کے آیا ہوں۔ یعنی ان کے غلط خیالات کے اصلاح اور صحیح عقائد کے القا کے لئے قرآن کا آنا ہے۔ مذکورہ بالا دونوں عقائد میں سے عقیدہ (ثانیہ) کو تو کھُلے لفظوں میں رد کر دیا۔ فرمایا وما قتلوہ و ما صلبوہ۔ نہ انہوں مسیح کو قتل کیا نہ سولی پر مارا۔

قاعدہ کی بات ہے کہ تواتر غلط نہیں ہوتا، اگر تواتر کے منشاء میں غلطی لگ جاتی ہے۔ جیسے کسی شخص کو مُردہ سمجھ کر بے شمار لوگ اس کی مردگی کی روایت کر دیں اور وہ تواتر تک پہنچ جاوے۔ لیکن اس کی ابتدا اگر

لہ نقل مطابق اصل۔ منہ

غلط ہو تو جو شخص اس تواتر کا انکار کرے، اس کا فرض ہے کہ اس منشاء غلطی کی غلطی کو کھول دے۔ چنانچہ قرآن مجید نے اس اصول کے مطابق فرمایا ولٰکن شُبّہ لھم قتل اور مصلوب نہیں ہوئے ہاں ان دونوں گروہوں کے حق میں مسیح مشتبہ ہو گئے۔ پس بحکم قرآن کوئی مسلمان عیسائیوں اور یہودیوں کے متفقہ عقیدوں میں سے (دوسرے عقیدے کو تو مان نہیں سکتا۔ البتہ ان کا پہلا عقیدہ کہ وہ (صلیب پر بذات خود چڑھائے گئے نہ ان کا کوئی ہمشکل) چونکہ قرآن مجید نے اس کی تردید نہیں کی بلکہ ایک طرح تائید کی ہے، اس لئے ہم اس عقیدہ کو غلط نہیں کہیں گے۔ قرآن مجید نے کیسے تائید کی، اس کا ذکر میں آگے کروں گا۔ (انشاء اللہ تعالیٰ)" فتح ربانی از ص۹ تا ص۱۲ و ثنائی پاکٹ بک ص۵)

نوٹ:- یہ تمام کی تمام دلیل "سردار اہلحدیث" کے اپنے الفاظ میں ہے صرف وہ الفاظ میرے ہیں جو ہلالین میں لکھے گئے ہیں۔

امید ہے مولوی صاحب اس "تواتر" اور "متفقہ عقیدہ" سے انکار کی جرأت نہ کریں گے۔ فالمرءُ یُؤخذُ بالاقرار وانّی عارضتُ بالمختار۔

خبر متواتر علم الکلام والاصول میں الخبر الصادق کی ایک قسم متواتر کے نام سے موسوم ہے جس کی تعریف یوں کی گئی ہے:-

"الخبر الثابت علی السنۃ قوم لا یُتصوّر تواطئھم علی الکذب"

(عقائد نسفی ص۱۳ مطبوعہ لکھنؤ)

لہ التواطؤ ھو ان یتفق قومٌ علی اختراع معیّن بعد المشاورۃ والتقریر بأن لا یقول احدٌ خلاف صاحبہ، والتوافق حصول ھذا الاختراع من غیر مُشاورۃٍ ولا اتفاقٍ علی اختراع معیّنٍ۔ یعنی تواطؤ یہ ہے کہ کوئی قوم ایک معین اختراع پر مشورہ اور تقریر کے بعد اس حد تک اتفاق کر لے کہ ان میں سے کوئی اس کے خلاف نہیں کہیگا اور توافق یہ ہے کہ کسی معین اختراع پر اتفاق اور مشورہ کے بغیر یہ اختراع

یعنی خبر متواتر وہ ہے جو کسی ایسی قوم کی زبان پر ثابت ہو جس کا تواطؤ و توافق علی الکذب متصور نہ ہو سکے۔ اور کسی خبر کے متعلق یہ فیصلہ کرنے کے لئے کہ وہ حدِ تواتر کو پہنچی ہوئی ہے۔ بطور ضابطہ یہ اصل مقرر کیا گیا ہے۔ کہ اس سے یقینی اور قطعی علم حاصل ہو۔ لا یشترط فیہ عددٌ معیّن بل ضابطۃ وقوعُ العلمِ من غیر شبہۃٍ (خیالی) اس کے لئے کوئی عدد معیّن شرط نہیں کہ اتنی تعداد میں لوگ خبر دیں تو متواتر ہے ورنہ نہیں۔ چنانچہ جن لوگوں نے تین سے لے کر تین سو تک عدد معیّن کیا ہے اُن کے اقوال کے متعلق علامہ بحر العلوم لکھتے ہیں ھٰذہِ المَذاھبُ کلّھا باطلۃ لا یستحق ان یلتفت الیھا کہ یہ سب باطل اور ناقابلِ التفات خیالات ہیں (شرح سلّم الثبوت ص) اور نہ یہ شرط ہے کہ ایسی خبر دینے والے مسلمان ہی ہوں۔ بلکہ یہ بھی شرط نہیں کہ وہ ضرور عادل[1] ہوں۔ چنانچہ بحر العلوم مذکور میں لکھا ہے۔ فعُلم ان العدالۃ غیر مشروطۃ وکذا الاسلام۔ نیز لکھا ہے۔ ان المتواتر مفیدٌ للعلم وان کان المُخبرون غیر عدولٍ (ص)

اسی طرح شرح نخبہ میں ہے۔ والمتواتر لا یُبحث عن رجالہٖ بل یجبُ العمل بہٖ من غیر بحثٍ (ص) کہ خبر متواتر پر اس کے راویوں کے متعلق بحث کئے بغیر ہی اعتقاد اور عمل واجب ہے۔

حاصل ہو جائے (حاشیہ شرح نخبہ ص) تواتر میں یہ دونوں صورتیں ممنوع ہیں۔ منہ

[1] والمراد بالعدلِ مَن لہٗ ملکۃٌ تحملہٗ علیٰ مُلازمۃ التقویٰ والمروّۃ والمرادُ بالتقویٰ اجتنابُ الاعمالِ السیّئۃ من شرکٍ اوفسقٍ او بدعۃٍ وبالمُروّۃ الاحترازُ عمّا یذمّ عُرفًا عند ذوی العقولِ السّلیمۃ کالبول علی الطریق والاکل فیہ وصُحبۃِ الارذالِ واللّعبِ بالحمامِ وامثالِ ذٰلک۔ یعنی شرعاً وعرفاً بُرے اعمال مثل شرک، فسق، بدعت اور بازار میں

خلاصہ یہ کہ جب ایک خبر اتنے آدمیوں کی طرف سے پہنچے جن کا اجتماع علی الکذب عادتاً ناممکن ہو تو وہ یقینی اور قطعی خبر ہوگی، اس کا انکار نہیں کیا جا سکتا۔ خواہ خبر دینے والے لوگ کسی قوم اور مذہب سے تعلق رکھتے ہوں۔ پس چونکہ حضرت عیسیٰ کے سُولی پر چڑھائے جانے کی خبر ساری یہودی قوم کی طرف سے ہم تک پہنچی ہے، اور اب تک ان کی مسلّم تاریخ میں یہی بیان کیا گیا ہے، جس میں کسی کو انکار نہیں پھر نصاریٰ جو حضرت مسیح کے ماننے والے اور قوم یہود کے سخت دشمن ہیں ان کی بھی یہی شہادت ہے، اس لئے یہ خبر متواتر ہونے کی وجہ سے قطعی اور یقینی ہے۔

بلکہ یوں کہنا چاہیئے، کہ چونکہ نصاریٰ بھی اس واقعۂ ہائلہ کے وقوع کے وقت موجود تھے اس لئے ان کا بیان بجائے خود ایک الگ تواتر کا رنگ رکھتا ہے لیکن جب اس خبر کے راوی نصاریٰ اور یہود دونوں قوموں کا اتفاق ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام صلیب پر چڑھائے گئے تھے۔ بلکہ ایک تیسری قوم یعنی رُومی جو اُس وقت حاکم تھے، اور جن کے سامنے کئی عدالتوں میں یہ قضیہ نامرضیہ طے ہوا تھا، وہ بھی یہی خبر دیتے ہیں کہ واقعی حضرت عیسیٰؑ کو صلیب پر چڑھایا گیا تھا۔ گویا مسیح کی دشمن قوم یعنی یہود اور ان کی خیرخواہ قوم یعنی عیسائی اور اُس وقت کی حاکم قوم جو ان دونوں قوموں سے جُدا حیثیت میں تھی یہ تینوں اس خبر پر متفق ہیں تو میں نہیں سمجھ سکتا کہ اس قدر زبردست اور قطعی شہادت کے ہوتے ہوئے کیونکر انکے اس بیان کو رد کرنے کی جسارت کی جا سکتی ہے۔

ہاں اس پر یہ سوال ہو سکتا ہے کہ پھر ان سب کا یہ بیان بھی تو ہے کہ حضرت عیسیٰؑ مقتول و مصلوب ہو گئے تھے۔ تو کیا ان کی یہ خبر بھی مان لینا چاہیئے۔ سو یاد رہے کہ اوّل تو یہ درست نہیں کہ ان تینوں کی تاریخ مسیح کے مقتول و مصلوب ہونے پر متفق ہے۔ ومن یدعی ذٰلک فعلیہ البیان۔

ثانیاً ان کی اس خبر سے کہیں زیادہ اللہ تعالیٰ کا وہ کلام قطعی اور یقینی ہے جو

(بقیہ حاشیہ) کھانے، بول کرنے، رذیل لوگوں کی صحبت اور کبوتر کے ساتھ کھیلنے وغیرہ امور سے اجتناب و احتراز کا نام عدل ہے۔ (شرح نخبہ ص۲۱) منہ۔

اصدق الصادقین واصدق الصادقین پہ نازل ہؤا یعنی قرآن مجید۔ سو چونکہ اس میں بالتصریح ان کے اس حصۂ بیان کی تردید ہے۔ قال اللہ تعالیٰ۔ وَمَا قَتَلُوْہُ وَمَا صَلَبُوْہُ اور وَمَا قَتَلُوْہُ یَقِیْنًا۔ اس لئے کوئی مسلمان ان کی یہ بات تسلیم نہیں کر سکتا۔ جیسا کہ مولوی ثناء اللہ صاحب لکھتے ہیں :۔

"مسیح کے مصلوب و مقتول ہونے کو چونکہ قرآن شریف نے صاف لفظوں میں رد کر دیا ہے اس لئے اس کا خیال کوئی مسلمان بلحاظ اتفاق اہل کتاب صحیح نہیں کہہ سکتا" (تفسیر ثنائی جلد ۲ صفحہ ۳۰)

ثالثاً۔ حضرت عیسےٰ علیہ السلام کا سُولی پر چڑھایا جانا تو ایک مشخص اور حسی امر ہے جس میں غلطی کا امکان نہیں لیکن ان کا مرجانا ایسا نہیں ہے پس مشخصات و محسوسات کا انکار کرنا تو بے شک سفاہت و سفسطہ ہے لیکن کسی کا میت انسان کو میت سمجھ لینا یقیناً محتمل غلطی کا ہے۔ اور عادتاً و عقلاً محال نہیں ہے، بلکہ امور عادیہ میں سے ہے۔ وھذا غیر خفی علی من لہ علم وفھم۔

رابعاً۔ امر واقعہ یہ ہے کہ خود ان قوموں کی تاریخی شہادات بھی ان کے اس عقیدہ کے خلاف اظہار کر رہی ہیں۔ باوجود اس کے کہ عقیدہ مقتولیت مسیح کی آبپاشی کے لئے ان کی تاریخ میں کئی ایک تالاب کھود دیے گئے، یعنی واقعات کو بگاڑنے کی ازحد سعی کی گئی۔ مگر پھر بھی صداقت جھانک جھانک کر اپنا منور چہرہ دکھا رہی ہے۔ اور خدا کے کلام وما قتلوہ یقیناً کی تصدیق کر رہی ہے کما ثبت فی محلہ۔

خامساً۔ آپ کے "سردار صاحب" اسی واقعۂ قتل مسیح کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں :۔

"اب ہمارے سامنے تواتر سے دو باتیں ثابت ہیں۔ ایک حضرت عیسےٰ کا سُولی پر مرنا . . . . . قاعدہ کی بات ہے، کہ تواتر غلط نہیں ہوتا۔ مگر تواتر کے منشاء میں غلطی لگ جاتی ہے۔ جیسے کسی شخص کو مُردہ سمجھ کر بے شمار لوگ اس کی مُردگی کی روایت کر دیں اور وہ تواتر تک پہنچ جاوے۔ لیکن اس کی ابتداء اگر غلط ہو تو جو شخص اس تواتر کا

انکار کرے۔ اس کا فرض ہے کہ اس منشائے غلطی کی غلطی کو کھول دے۔
چنانچہ قرآن مجید نے اس اصول کے مطابق فرمایا ولٰکن شبّہ لہم
قتل اور مصلوب نہیں ہوئے۔ ہاں ان دونوں گروہوں کے حق میں
وہ مسیح مشتبہ ہو گئے۔ پس بحکم قرآن کوئی مسلمان عیسائیوں اور
یہودیوں کے متفقہ عقیدوں میں سے پہلے عقیدے (سُولی پر مرنے
ناقل) کو تو مان نہیں سکتا۔" (فتح ربانی صفحہ ۱۱)

قولہ:- "شرح نخبہ میں ہے فاذا جمع ھٰذہ الشروط
الاربعۃ وھی .... الخ۔ پس جب چاروں شرطیں پوری ہو جائیں
(۱) یہ کہ اتنی بڑی جماعت روایت کرے کہ عادت کی رو سے ان کا
جھوٹ پر اتفاق کر لینا محال سمجھا جائے۔ (۲) یہ کہ ابتداء سے انتہاء
تک سارا سلسلہ عادل ضابط راویوں کا ہو۔ (۳) یہ کہ ان کے انتہاء
کی استناد امر حسی پر ہو۔ (۴) یہ کہ ان کا خبر دینا سامع کو یقین
کا فائدہ دیوے تو اسے متواتر کہتے ہیں۔" (شہادۃ القرآن صفحہ ۳)

اقول:- اوّلاً۔ اس میں آپ سے تین غلطیاں سرزد ہوئی ہیں۔
پہلی غلطی یہ کہ آپ نے پہلی اور دوسری شرط یعنی (۱) عدد کثیر اور (۲) احالت
العادۃ تواطئہم علی الکذب کو ایک ہی سمجھ لیا ہے۔ اور دوسری
غلطی یہ کہ جس امر کو آپ نے چوتھی شرط لکھا ہے وہ کوئی مستقل شرط نہیں بلکہ
چار شروط کے علاوہ ایک زائد امر ہے جو بطور تتمہ اضافہ کیا گیا ہے۔ چنانچہ
آپ کی نقل کردہ عبارت میں بھی شرائط اربعہ کے بعد یہ الفاظ موجود ہیں۔
وانضاف الی ذٰلک ان یصحب خبرھم افادۃ العلم لسامعہ
اور نزہۃ النظر کے اسی صفحہ میں فھٰذا ھو المتواتر پر محشی نے ای
الخبر الجامع للشروط المتقدمۃ مع الانضاف المذکور
لکھ کر مزید وضاحت کر دی ہے۔ پس آپ کا اس کو مستقل چوتھی شرط
سمجھ لینا بایں ادعائے علم وفضل موجبِ حیرت ہے۔ تیسری غلطی یہ کہ تیسری
شرط رووا ذٰلک عن مثلھم من الابتداء الی الانتہاء کے

معنے آپ نے یہ کئے ہیں کہ "ابتداء سے انتہاء تک سارا سلسلہ عادل وضابط راویوں کا ہو" حالانکہ یہ معنے صریحاً غلط ہیں۔ کیونکہ جیساکہ اوپر مذکور ہوا خبر متواتر پر یقین کرنے کے لئے مخبرین کا عدالت اور ضبط صفات الرجال سے متصف ہونا شرط نہیں۔ مولنا اشرف علی صاحب تھانوی مرحوم لکھتے ہیں۔

"متواتر میں راوی کا صدق یا ضبط یا عدل کچھ بھی شرط نہیں"

(انتباہات مفیدہ ص۵)

پس آپ نے جو عن مثلھم سے مراد ان کا "عادل وضابط" ہونا خیال کر لیا ہے یہ درست نہیں، بلکہ ان کے جھوٹ پر اجتماع کا عادۃً ناممکن ہونا مراد ہے۔ جیساکہ مولنا محمد عبداللہ صاحب ٹونکی نے بھی لکھا ہے۔ قال المصنف فی تقریر ھٰذا المحل المراد مثلھم فی کون العادۃ تحیل تواطئھم علی الکذب۔ اور جبکہ خود علامہ ابن حجر نے بتصریح لکھ دیا ہے کہ خبر متواتر پر یقین کرنا بغیر اس کے راویوں کی تفتیش کے ضروری ہے۔ اور کہ صرف استدلال بالاحاد کے لئے بحث عن احوال الرواۃ کی ضرورت ہے دون المتواتر فکلہ مقبول (نزھۃ ص۱۶) تو پھر عن مثلھم کے یہ معنے کیسے ہوسکتے ہیں؟ پس اس مقام میں آپ کی یہ تیسری غلطی ہے۔

ثانیاً۔ اصولِ حدیث میں متواتر سے مراد اوّلاً وبالذات حدیث نبویہ کی ایک قسم ہوتی ہے لیکن مطلق خبر متواتر کے لئے ان شرائط کا وجود ہرگز شرط نہیں۔ والدلیل علی من ادعی ذٰلک۔

اب میں آپ ہی کے الفاظ میں یہ عرض کرنیکی اجازت چاہتا ہوں کہ "جناب مولوی صاحب! آپ کتب درسیہ کے سمجھنے کی استعداد نہیں رکھتے۔ لہٰذا نقل عبارات سے اپنی تفضیح نہ کرایا کریں"

قولہ:۔ "شرح عقائد نسفی میں اس امر کی تصریح ہے کہ مصلوبیت حضرت مسیح کا تواتر ممنوع ہے" (شہادۃ القرآن ص۵)

اقول:۔ اگر آپ شرح عقائد نسفی میں "اس امر کی تصریح" دکھادیں کہ حضرت مسیح کے سُولی پر چڑھائے جانے "کا تواتر ممنوع ہے" تو میں

شرح عقائد نسفی کا حوالہ دینے میں آپ کو دیانت دار تسلیم کر لوں گا۔ اور اگر علم عقائد کی کسی کتاب میں سے بھی یہ دکھا دیں تو میں آپ کی عالمیت کا قائل ہو جاؤں گا۔
قارئین کرام یہ سُنکر متعجب نہ ہوں گے کہ مولوی صاحب نے حسب عادت یہاں بھی فریب دہی کا ارتکاب کیا ہے۔ کیونکہ کتاب محوّلہ بالا میں جس امر پر تواتر کا ممنوع ہونا لکھا ہے وہ حضرت مسیح کا **قتل** ہو جانا ہے نہ کہ سُولی پر محض چڑھایا جانا۔ چنانچہ اس کی اصل عبارت یہ ہے :۔

"واَمّا خبر النصاریٰ بِقتلِ عیسیٰ علیہ السلام فتواترہٗ ممنوع" (صلا)

یعنی نصاریٰ کی اِس خبر کا کہ حضرت عیسےٰ **قتل** ہو گئے تھے تواتر ممنوع ہے۔ مولوی صاحب نے محض دھوکا دینے کے لئے **قتل** کا لفظ عمداً ترک کر کے "مصلوبیت" کا لفظ لکھ دیا ہے۔ اور جیسا کہ ظاہر ہے "مصلوبیت" سے ان کی مراد سُولی پر محض چڑھایا جانا ہے۔ کیونکہ مصلوبیت بمعنی صلیب پر مرجانے کے تواتر کے ممنوع ہونے میں تو کسی مسلمان کو کلام نہیں اور نہ یہ ہمارے اور اُن کے درمیان محلّ نزاع ہے۔ پس اظہر من الشمس ہے کہ مولوی صاحب نے صریحاً مغالطہ دیا ہے جو اُن کی شانِ فضیلت پر ایک کھُلا کھُلا دھبہ ہے۔
شرح عقایدِ نسفی کے اُردو ترجمہ میں لکھا ہے :۔

"نصاریٰ تمام یہ اعتقاد رکھتے ہیں کہ عیسےٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام **قتل** کئے گئے ہیں۔"

اِس کے جواب میں آگے لکھا ہے کہ :۔

(اِس خبر کا) "متواتر ہونا غیر مسلّم ہے بلکہ ممنوع، ابتدا میں یہ خبر آحاد تھی۔" (شرح عقائد نسفی اُردو صلا مطبوعہ ۱۹۲۱ء)

قولہ :۔ "سدرا اوّل میں اس کی بابت چشمدید شہادت دینے والا ایک شخص بھی نہیں بلکہ حضرت عیسےٰ علیہ السلام کی گرفتاری کے وقت آپ کے سب حواری بھاگ گئے تھے۔" (حاشیہ صلا)

اقول :۔ "اِس کی بابت" سے مراد اگر مقتولیتِ مسیح ہے تو مسلّم! اور اگر

ولی پر مجرد چڑھایا جانا مراد ہے تو غلط ہے۔ کیونکہ عہدِ واقعہ میں واقعہ کے گواہ"
لمائے اسلام نے تسلیم کئے ہیں (ملاحظہ ہوں کتب اصول وعقائد و کتب تفاسیر) ۔
ں یہ کہنا تو بہر حال غلط ٹھہرا کہ گواہ "ایک شخص بھی نہیں"۔ دیگر اناجیل سے بھی بصراحت
ثابت ہے کہ مسیح کے بہت سے مخلصین اور فدائیوں نے صلیب پر لٹکے ہوئے مسیح
کو دیکھا اور بعض نے اس سے باتیں بھی کیں (اناجیل اربعہ و رسالہ تشہید شہادت
رات تو یوں الحاً اناجیل آپ کو بھی اقرار ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی گرفتاری کے
قت آپ کے سب حواری "موجود تھے"۔ پس مسیح کے سب حواریوں کی یہ تو عینی
شہادت ٹھہری کہ حضرت مسیح گرفتار ضرور ہوئے تھے۔ نیز اس سے آپ کا یہ دعویٰ
بھی کہ مسیح کو کسی نے چھوا تک نہیں" باطل ہوا جاتا ہے۔ رہا یہ ثبوت بدستور آپ کے
مہ ہے کہ بعد گرفتاری کے مسیح علیہ السلام کب اور کس طرح ان کے ہاتھ سے چھوٹ
گئے تھے۔

قولہ: "اگر فعل صلب صورت فعلیہ میں صادر ہوتا تو اللہ تعالیٰ
فعل کو سبب لعنت قرار دیتا نہ مجرد قول کو۔ اور پھر عبارت وقولہم
إِنَّا قَتَلْنَا الْمَسِيحَ کی بجائے وبصلبہم المسیح ہوتی" (ص ۹۳)

اقول: درست ہے لیکن جب فعل صلب جس میں موت لازمی ہی بصورت
فعلیہ صادر ہی نہیں ہوا تو اس فعل کو سبب لعنت کس طرح قرار دیدیا جاتا۔ اور
عبارت بصلبہم المسیح خلافِ واقعہ کیونکر کلام الٰہی میں موجود ہو سکتی تھی۔
اور شاید حضرت مسیح کو صلیب پر چڑھانے اور ان کے ہاتھوں میں میخیں لگانے
کا ذکر "وقتلہم الانبیاء" میں بھی ہو۔ فافہم ولا تکن من
القاصرین۔

(باقی دارد) ——————

جناب سید سلیمان صاحب ندوی اور ترکیب خاتم النبیین

(از جناب مولوی عطاء محمد صاحب ریٹائرڈ اورسیئر قادیان)

اگرچہ سید سلیمان صاحب ندوی نے سیرت النبیؐ جلد سوم کے صفحہ ۔۔۔ پر اپنی کسی مخصوص اغراض کے مد نظر نہایت ہی تکلف سے کام لیتے ہوئے لکھا ہے :-

"لفظ خاتم کی دو قرأتیں ہیں۔ مشہور قرأت تو خاتِم بکسر تا کی ہے (تفسیر ابن جریر) جس کے معنے ختم کرنے والے اور بند کرنے والے کے ہیں۔ اور دوسری قرأت خاتَم کی ہے۔ جس کے معنی ہیں وہ شے جس کے ذریعہ سے کوئی شے بند کی جاوے۔ اور اس پر مُہر لگائی جاوے۔ تاکہ وہ کھولی نہ جاسکے۔ اور نہ اُسکے اندر کوئی چیز باہر سے جاسکے۔ الغرض دونوں حالتوں میں آیت پاک کا حاصل معنی ایک ہی ہوگا۔ کہ آپؐ کا وجود پیغمبروں کے سلسلہ کو بند کرنے والا اور اُن پر مُہر لگا دینے والا ہے۔ کہ پھر آئندہ کوئی نیا شخص اس جماعت میں داخل نہ ہوسکے۔"

اور جب خاکسار نے سید صاحب سے دریافت کیا کہ (۱) خاتم النبیین کی ترکیب میں لفظ خاتَم کے یہ معنی عربی، فارسی، اُردو میں سے کونسی لغت کے رُو سے ہیں۔ (۲) اگر خاتم کے معنے بند کرنے والے ہی کے ہیں تو یہ آیت تو متنازعہ فیہ ہے۔ کیا ان معنوں کی تائید کرنے والی کوئی اور آیت بھی قرآن کریم میں ہے ؟ تو امر اوّل کے متعلق تو آپ لسان العرب اساس البلاغہ اور صحاح جوہری کے حوالہ سے ختم اور طبع اور ختم علی القلب کی مثالیں پیش کرنے لگ گئے۔ اور جب عرض کیا گیا کہ حضرت! لغت سے میری مراد یہ کتابیں نہیں۔ بلکہ وہ زبان ہے جو عملی رنگ میں بولی اور سمجھی جاتی ہے۔ تو آپ نے باوجود اس امر کو تسلیم کر لینے کے اس کے سوا اور کچھ جواب نہ دیا کہ :-

"خیر معلوم ہؤا کہ خاتم النبیین کے معنی بند کرنے کے بیان کا جو مطالبہ کسی لغت کی رُو سے تھا، اس لغت سے آپ کی مراد لغت کی کتاب نہیں بلکہ لغت یعنی

زبان ہے تو عرض ہے کہ ختم کے معنی بند کرنے کے عربی لغت ہی میں ہیں"
اور دوسرے سوال کے جواب میں آپ نے صرف یہ لکھا کہ قرآن پاک میں ہے "خِتَامُہٗ مِسْكٌ" اور جب آپ کو توجہ دلائی گئی کہ "خَاتَمَ النَّبِيِّيْنَ" اور "خِتَامُہٗ مِسْكٌ" میں تو معنوی جوڑ ہی کوئی نہیں۔ تو اس کے بعد آپ ایسے خاموش ہوئے کہ ؎

لب از گفتن چناں بستم کہ گوئی ✦ دہن بر چہرہ زخمے شود بہ شد

کا مصداق ہو گئے۔

لیکن حق آخر حق ہی ہے۔ اسے زیادہ دیر تک چھپایا نہیں جا سکتا۔ اور وہ ضرور ظاہر ہو کر رہتا ہے۔ سید سلیمان صاحب ندوی نے علامہ شبلی کی سوانحعمری لکھی ہے۔ جو حیاتِ شبلی کے نام سے شائع ہو چکی ہے۔ اس کتاب کے صفحہ ۱ پر سید صاحب نے لکھا ہے:-

"ملا نظام الدین کے زمانہ سے لیکر تقریباً ڈیڑھ سو سال تک یعنی خاتمۃ العلماء مولنا عبدالحی فرنگی محلی المتوفی ۱۳۰۴ھ تک یہ چشمۂ فیض یکساں جاری رہا۔"

پھر اسی کتاب کے صفحہ ۴ پر آپ لکھتے ہیں:-

"سہارنپور میں مولنا احمد علی محدث اور دیوبند میں مولنا محمد قاسم کی بدولت خاتم المحدثین مولنا شاہ عبدالعزیز مرحوم کا سلسلۂ فیض جاری تھا۔"

ان ہر دو اقتباسات سے ظاہر ہے کہ سید صاحب نے خاتم کا لفظ انہیں معنوں میں استعمال کیا ہے جن معنوں میں عام طور پر ایسی تراکیب میں یہ لفظ استعمال ہوتا ہے اور جسکی طرف باوجود بار بار متوجہ کرنیکے آپ آنیکے لئے تیار نہیں ہیں۔ چنانچہ میں نے جب سید صاحب کی خدمت میں یہ حوالے تحریر کئے تو آپ خود تو خاموش ہی رہے البتہ سید ریاست علی صاحب نے ارشاد فرمایا کہ "جب آپکا تعلق اُس فرقہ سے ہے جس کا سرپا وجود ختم اللہ علی قلوبہم کا محل تام و مصداق اکمل ہے تو آپکا ذہن خاتمیت کا مفہوم سمجھنے سے قاصر ہے اور قاصر رہیگا۔ اسلئے اِس بحث و جدل میں دوسروں کا وقت برباد نہ کریں۔" سید صاحب کا یہ جواب پڑھکر مجھے عیسائیوں کا وہ جواب یاد آ گیا جو وہ تثلیث کے متعلق سوال کرنے پر کہ تین ایک اور ایک تین کس طرح ہو گیا، نہایت سادگی سے دیا کرتے ہیں۔ کہ یہ مسئلہ بڑا دقیق ہے انسانی دماغ اسے سمجھنے کی قابلیت ہی نہیں رکھتا! اور جب کہا جائے کہ حضرت مسیح علیہ السلام بھی تو انسان ہی تھے انکی سمجھ میں بھی یہ مسئلہ آیا تھا یا نہیں تو کھسیانے سے ہو جاتے ہیں اور کوئی جواب نہیں دے سکتے

میں سید ریاست علی صاحب کی خدمت میں بڑے ادب سے عرض کرتا ہوں کہ آپ بدظنی سے کام لینے کی بجائے اپنی عالمانہ شان کے مطابق پہلے مجھے سمجھانے کی کوشش تو فرمائیں، یونہی موردِ الزام نہ ٹھہرائیں۔ بھلا میرے متعلق تو آپ کا یہ خیال ہے کہ میں ایسے فرقہ سے تعلق رکھتا ہوں جو بقول آپ کے ختم اللہ علی قلوبہم کا مصداق ہے مگر مولوی عبد الحق صاحب سیکرٹری انجمن ترقی اُردو کے متعلق آپ کیا فرمائیں گے جو اس زمانہ کے نہ صرف بہت بڑے ادیب ہیں بلکہ بین الاقوامی شہرت کے مالک بھی ہیں۔ میرے اس سوال کے جواب میں کہ مندرجہ ذیل حوالجات میں خاتم الشعراء اور خاتم المصنفین کے کیا معنے ہیں۔

(۱) جو لوگ اپنے تئیں دِلّی کی طرف منسوب کرتے تھے وہ ان الفاظ اور محاورات کو وطن کی یادگار سمجھتے تھے۔ چنانچہ غالب و ذوق جو خاتم الشعراء ہیں ان کے ہاں وہ الفاظ بے تکلف ملتے ہیں جن کو شیخ ناسخ مدتوں سے چھوڑ چکے تھے۔ (موازنہ انیس و دبیر ص ۲۹ مصنفہ شبلی نعمانی مرحوم)

(۲) خاتم المصنفین شبلی نے ہمارے لئے کم و بیش پانچ ہزار صفحوں کا ذخیرۂ ادب چھوڑا ہے (افادات مہدی ص ۲۷ مہدی حسن مرحوم)

مولوی عبد الحق صاحب مذکور رقمطراز ہیں :-

"یہ محض مبالغہ ہے۔ لوگ اپنے ممدوح کی شان میں اکثر اس قسم کے الفاظ استعمال کر جاتے ہیں۔ ان کے لغوی معنے مراد نہیں بلکہ انتہائی تعریف مقصود ہے۔ یہ ادیبوں اور شاعروں کا طرزِ کلام ہے۔"

فرمائیے! کیا یہ شہادت بھی معتبر نہیں؟

اللہ تعالیٰ اِس اُمت کے حال پر رحم فرمائے جس کے علماء ضد و تعصب میں اس حد تک بڑھ چکے ہیں کہ وہ قرآن کریم میں وارد شدہ ایک ترکیب کو جن معنوں میں آپ آزادانہ طور پر استعمال کرتے ہیں اُن معنوں میں اور تو اور خود خدا تعالیٰ کو بھی استعمال کرنے کی اجازت نہیں دیتے۔ انا للہ و انا الیہ راجعون۔

ے

گردنوں پہ انکی ہے سب عام لوگوں کا گنہ ✦ جنکے وعظوں سے جہاں کے آگیا دلمیں فساد

نوعِ انساں میں بدی کا تخم بونا ظلم ہے ✦ وہ بدی آتی ہے اُس پر جو ہو اس کا کاشتکار

(حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام)

حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کی صداقت معلوم کرنیکا آسان طریق!

(از مولوی رشید احمد صاحب چغتائی مولوی فاضل - واقفِ زندگی قادیان)

اللہ تبارک وتعالےٰ کی قدیم سُنّت کے مطابق عین ضلالت وگمراہی کے دَور دَورہ کے وقت حضرت مرزا غلام احمد قادیانی مسیح موعود ومہدی معہود مبعوث کئے گئے جنہوں نے تائیدِ ایزدی کے ساتھ تاریکی وگمراہی کے پردوں کو چاک کرکے خدائے واحد سے ملنے کا راستہ صاف کر دیا۔ ایسے ایسے واضح نشانات وبراہین آپ کو عطا کئے گئے کہ انکار کی گنجائش ہی نہیں۔ مگر کیا کیجئے کہ تاریکی کے فرزند انکار کے عادی ہو گئے ہیں۔ آنکھیں رکھتے ہوئے وہ تعصب کی پٹی سے جان بُوجھکر اندھے ہوجاتے ہیں۔ نشان پورا ہوتا دیکھکر اُسے عوام کی نظروں میں مشتبہ کرنے کی سعی کرتے ہیں۔ ان حیلے بہانے اور مخالفت کرنے میں پیش پیش کون لوگ ہوتے ہیں؟ آہ! یہ عالم کہلاتے ہیں۔ عوام سے کچھ زیادہ شُدبُد رکھتے ہیں۔ کس قدر عظیم الشان نشان تھا جو حضرت موسیٰؑ کے وقت میں فرعون کے دربار میں اُمراء وعلماء وعوام میں خدا تعالےٰ نے موسےٰؑ کے ذریعہ ظاہر فرمایا۔ یعنی ایک سوٹا جو بے جان تھا ایک زبردست اژدہا بن گیا۔ یہ واقعہ روزِ روشن میں لوگوں کی نظروں کے سامنے ان کے دیکھتے ہوئے ظہور پذیر ہوا۔ مگر کیا اس پر اس کے درباری ایمان لائے؟ نہیں، بلکہ خوب اچھی طرح سمجھتے ہوئے اس شاندار اور عدیم المثال نشان سے فرعون اور اس کے ملاؤں نے فائدہ نہ اُٹھایا بلکہ موسیٰؑ کو جادوگر کا خطاب دے کر نشان کو مشتبہ کرنے کی پوری کوشش کی گئی اور انکار اختیار کیا گیا۔

مَیں سمجھتا ہوں کہ قرآن کریم میں سے اس واقعہ کو پڑھنے والا یا سُننے والا ہر مسلمان

اپنے دل میں یہ خیال کرتا ہوگا کہ ایسے واضح نشان کو دیکھکر پھر کیوں کر اُن بدبختوں نے انکار کر دیا۔ اگر ہم اُس زمانہ میں ہوتے تو انکار کجا ہم فوراً اس پر ایمان لاتے اور ہمارے ایمان میں ترقی اور زیادتی ہوتی۔ حالانکہ خود اُن کے اِس اپنے زمانہ میں خداوند تعالےٰ نے سینکڑوں نشانات ظاہر فرمائے ہیں اور ان کے ذریعہ حضرت مرزا غلام احمد قادیانی مسیح موعود و مہدیٔ معہود علیہ الصلوٰۃ والسلام کا مامور من اللہ ہونا، خدا کی تائید و نصرت ان کے شامل حال ہونا اور ان کے ساتھ خدا کا سچا تعلق ہونا ظاہر فرما دیا ہے۔ مگر وہ راہِ انکار اختیار کئے ہوئے ہیں۔

اِس انکار کا زیادہ تر باعث ان کے علماء ہیں۔ وہ یہ سمجھتے ہیں کہ جب ہمارے اتنے بڑے بڑے علماء، فضلاء مرزا صاحب پر ایمان نہیں لاتے تو ہم کیونکر اُن پر ایمان لے آئیں۔ مگر نہیں جانتے کہ یہ علماء اگر ایمان لے آویں تو اُن کو وہی مصائب و تکالیف برداشت کرنا پڑیں گی کہ جو حق و صداقت کے دلدادوں کو کرنا پڑتی ہیں۔ وہ جانتے ہیں کہ ہماری یہ عزتیں باقی نہیں رہ سکتیں۔ مرزا صاحب پر ایمان لے آنے سے ہماری سوسائٹی میں ہماری وجاہتیں خاک میں مل جاویں گی۔ عوام جن کے ہاتھوں ہمیں روٹی ملتی ہے وہ بند ہو جاوے گی۔ ہماری امارت و ریاست کو مرزا صاحب کی غلامی میں آجانے سے بٹہ لگے گا۔

مگر اے جمہور مسلمانان! غور کیجئے تو! یہ چودھویں صدی کا زمانہ ہے جس میں فسق و فجور کے پھیل جانے، ایمان کے ثریا پر چلے جانے، اسلام کا فقط نام، قرآن کے محض نقوش باقی رہ جانے اور مساجد بظاہر آباد بلکہ نہایت خوشنما بیل بوٹوں، نقش و نگار سے آراستہ مگر ہدایت سے کوری رہ جانے کا اظہار آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم حدیث شریف میں فرما چکے ہیں۔ اِس زمانہ کو آپ اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں۔ ہاں یہی وہ زمانہ ہے جس کے علماء کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم زمین پر موجود تمام مخلوقات جس میں خبیث و رذیل اور مکروہ جانور بھی رہتے ہیں سے بدترین مخلوق قرار دے چکے ہیں، اسی لئے کہ وہ مہدی و مسیح موعود کے قرب کا زمانہ ہوگا۔ اور یہی لوگ اس کے منکر، اس پر کفر کے فتوے اور عوام کو اس پر ایمان لانے سے روکنے کا موجب ہوں گے، وہ دن رات فتنے برپا کرتے رہنے میں مشغول ہوں گے۔

اور خدا کے فرستادہ کی مخالفت کر کے حق کے پھیل جانے میں روک ہوں گے۔
چنانچہ فرمایا ..... "یأتی علی الناس زمانٌ لایبقی من الاسلام
الا اسمہ ولا یبقی من القرآن الا رسمہ مساجدھم عامرة
وھی خرابٌ من الھدیٰ وعلماءھم شرّ من تحت ادیم السماء
منھم تخرج الفتن وفیھم تعود"..... (الحدیث)

اے مسلم بھائیو! یہ علماء یقیناً قیامت کے دن ہرگز آپ کے کام نہ آوینگے۔ تم میں سے ہر شخص یہ جانتا ہے کہ اس کی موت کے وقت کوئی اس کی مدد نہیں کر سکتا۔ اُسے مر کر اپنی ہی قبر میں جانا ہے۔ پس اُس وقت کو خدا کا خوف کرتے ہوئے یاد کرو۔ اور مہدی علیہ السلام کے زمانہ کے ان علماء پر بھروسہ مت رکھو کہ وہ مہدی کے سب سے بڑے دشمن ہیں۔ چنانچہ خود اُمت میں سے بھی متقدمین بزرگ لکھ گئے ہیں کہ:-

"واذا خرج ھذا الامام المھدی فلیس لہ عدوٌّ
مبین الا الفقھاء خاصةً" (فتوحات مکیہ جلد ۳ صفحہ ۳۷۴)

اور "اقتراب الساعة" میں صفحہ ۹۵ پر لکھا ہے :-

"علماء اس کے قتل کے فتوے دیں گے ..... اور یہ تمام نام
کے ہی مسلمان ہوں گے۔"

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا مندرجہ بالا ارشاد اور محی الدین ابن عربیؒ کا ایسا لکھنا آپ کی آنکھیں کھولنے کے لئے کافی ہونا چاہیئے۔ پس سوچو اور غور کرو اور حضرت مرزا غلام احمد قادیانی مدعی دعویٰ مہدویت و مسیحیت و نبوت کے بارہ میں ٹھنڈے دل سے غور کرو۔ ایسا نہ ہو کہ تم اسی خیال میں رہو کہ جبکہ ہمارے علماء مرزا صاحب پر ایمان نہیں لاتے تو ہم کیسے مان لیں۔ اور ادھر موت تمہارے سر پر آن پہنچے اور تم ایمان سے محروم رہ جاؤ۔ کیونکہ علماء و فقہاء ہی مہدی کے سب سے زیادہ اور کھلے دشمن ہوں گے۔

آپ لوگ علماء کے پیچھے نہ جائیں۔ اُن سے پوچھنے کی ضرورت نہیں۔ مرزا صاحب پر ایمان لانے کے لئے اُن سے مشورہ لینے کی حاجت نہیں۔ کیونکہ آج تک

انہوں نے تمہیں کافی روکے رکھا ہے، اور وہ تمہیں اِس ایمانی نعمت سے محروم رکھنے کے درپے ہیں، مگر کس لئے؟ صرف اپنے پیٹ کی خاطر اور اپنی وجاہت کے برقرار رکھنے کے لئے۔

پس آؤ تمہیں ایک آسان طریق بتاتا ہوں کہ حضرت مسیح موعود علیہ السلام کی صداقت پرکھنے کے لئے اِس سے بہتر اور کیا طریق ہو سکتا ہے۔ تمہارے خداوند کریم کے دربار کے دروازہ پر موٹے سنہری حروف میں لکھا ہے اُجیبُ دعوۃ الداعِ اذا دعانِ فلیستجیبوا لی و لیؤمنوا بی لعلھم یرشدون o فرماتا ہے۔ مَیں دُعا کرنے اور پکارنے والے کی دُعا کو سنتا ہوں، اس کا جواب دیتا ہوں، پس چاہیئے کہ میرے بندے مجھ سے جواب مانگیں، مجھ سے ہی دُعا مانگیں؛ اور ایمان رکھتے ہوئے کہ مَیں ان کی دُعاؤں کو سُننے اور جواب دینے والا ہوں۔ وہ مجھ سے دُعا مانگیں۔ نتیجہ کیا ہوگا کہ وہ رُشد وہدایت کا راستہ پا جاویں گے۔ پس وہ خدا جو اپنی مخلوق کو نیکی اور بھلائی پر قائم دیکھنا چاہتا ہے یقیناً وہ ایسے بندے کو جو خلوص دل سے اُس کے دربار میں حاضر ہوگا اور مندرجہ ذیل طریق پر عمل کرے گا وہ ہدایت کا راستہ پا جائے گا۔

بھائیو! آپ کی ہمدردی اور فائدہ کی خاطر حضرت مسیح موعود مرزا غلام احمد قادیانی علیہ السلام کی صداقت پرکھنے کے لئے حضرت مسیح موعود علیہ السلام کا پیش کردہ ایک اصل آپ کے سامنے رکھتا ہوں۔ خدارا ٹھنڈے دل سے غور کریں، کیونکہ اگر حضورؑ اپنے دعاوی میں سچے ہوں (جیسا کہ خدا کی تائیدات ونشانات سے یہ امر واضح ہے) اور آپ لوگوں نے نہ مانا اور انکار کر دیا تو پھر خدا کے ایک فرستادہ کا انکار معمولی چیز نہیں ہوتی۔ بلکہ اس کے متعلق ارشادِ خداوندی ہے کہ "اعدّ للکٰفرین عذاب النار" دوزخ کی جلتی آگ میں داخل ہونا پڑے گا۔ پس سوچیں اور غور کریں۔ حضور علیہ السلام فرماتے ہیں:۔

"اگر اِس عاجز پر شک ہو اور وہ دعویٰ جو اِس عاجز نے کیا ہے اسکی صحت کی نسبت دل میں شبہ ہو تو مَیں ایک صورت رفع شک کی بتاتا

ہوں جس سے ایک طالبِ صادق انشاء اللہ مطمئن ہو سکتا ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ:۔

اوّل توبہ نصوح کر کے رات کے وقت دو رکعت نماز پڑھیں جس کی پہلی رکعت میں سورۃ یٰسین اور دوسری رکعت میں اکیس۲۱ مرتبہ سورۃ اخلاص ہو۔ اور پھر بعد اس کے تین سو مرتبہ درود شریف اور تین سو مرتبہ استغفار پڑھ کر خدا تعالیٰ سے یہ دُعا کریں کہ اے قادر و کریم تو پوشیدہ حالات کو جانتا ہے اور ہم نہیں جانتے۔ اور مقبول اور مردود اور مفتری اور صادق تیری نظر سے پوشیدہ نہیں رہ سکتا۔ پس ہم عاجزی سے تیری جناب میں التجا کرتے ہیں۔ کہ اس شخص کا تیرے نزدیک کہ جو مسیح موعود اور مہدی اور مجدد الوقت ہونے کا دعویٰ کرتا ہے۔ کیا حال ہے۔ کیا صادق ہے یا کاذب۔ اور مقبول ہے یا مردود۔ اپنے فضل سے یہ حال رؤیا یا کشف یا الہام سے ہم پر ظاہر فرما۔ تا اگر مردود ہے تو اس کے قبول کرنے سے ہم گمراہ نہ ہوں اور اگر مقبول ہے اور تیری طرف سے ہے تو اس کے انکار اور اسکی اہانت سے ہم ہلاک نہ ہو جائیں۔ ہمیں ہر ایک فتنہ سے بچا اور ہر ایک قوت تجھکو ہی ہے۔ آمین۔"

حضور فرماتے ہیں:۔

"یہ استخارہ کم از کم دو ہفتے کریں ۔ ۔ ۔ ۔ لیکن اپنے تئیں بکلی خالی النفس کر کے دونو پہلوؤں بغض و محبت سے الگ ہو کر اس سے ہدایت کی روشنی مانگیں۔ کہ وہ ضرور اپنے وعدہ کے موافق اپنی طرف سے روشنی نازل کریگا۔ جس پر نفسانی اوہام کا کوئی دُخان نہیں ہوگا۔ سو اے حق کے طالبو۔ ان مولویوں کی باتوں سے فتنہ میں مت پڑو۔ اٹھو اور کچھ مجاہدہ کر کے اس قوی اور قدیر اور علیم اور ہادی مطلق سے مدد چاہو۔" (نشان آسمانی ص ۴۶ تا ۴۷)

پس اے وہ لوگو! جو اپنے تئیں مسلمان کہلاتے ہو آؤ اور اس نہایت سہل طریق سے حضرت مسیح موعود علیہ السلام کی صداقت کا پتہ لگاؤ، اور خدا کے مومن بندوں میں داخل ہو جاؤ۔ کُفر کرنا بُرا ہے، اس کا نتیجہ اچھا نہیں ہوتا۔

تم پہلے انبیاء کی قوموں کے کفر کرنے پر اُن کے انجام سے بے خبر نہیں ہو۔ آؤ اور خدا کے فضلوں کے وارث بننے والے مومنین میں شامل ہو جاؤ۔ غفلت سے دیر کرنا اچھا نہیں، کیونکہ اجل کا وقت مقرر نہیں۔ تمہیں پتہ نہیں کہ کس وقت اُس کا پیغام آ جائے، اور ایسی حالت میں خدا کے حضور جانا کہ اس کے فرستادہ کے انکار کا ٹیکا اپنے ماتھے پر ہو ہزار خسران و ذلت کا موجب ہے۔ اس مندرجہ بالا طریق کو اختیار کر [illegible] بیرمت ہو۔ تمہیں خوشخبری ہو کہ تم پہلے شخص نہیں ہو گے جو اس راہ کو اختیار کرو گے، بلکہ بہت سے بندگانِ خدا اس راہ پر چل کر خداوند تعالیٰ سے بشارات پا کر حضرت مسیح موعود علیہ السلام کی سچائی اور مامور من اللہ ہونے پر مُہرِ شہادت ثبت کر چکے ہیں۔ اللہ تعالیٰ سے دُعا ہے کہ وہ آپ کے دلوں کو کھول دے اور آپ کو اِس سلسلۂ حقہ میں داخل ہونے کی توفیق بخشے۔ آمین ✦

طبیہ عجائب گھر قادیان کا ایک خاص الخاص مرکب

سونے کی گولیاں (رجسٹرڈ)

یہ نایاب گولیاں کُشتہ سونا۔ کُشتہ چاندی۔ کُشتہ مروارید۔ کُشتہ ابرک سیاہ سوم کھی وغیرہ کُشتہ جات سے تیار ہوتی ہیں۔ پیشاب کی جملہ امراض فاسفیٹ۔ یوریٹ۔ البومن وغیرہ کا قلع قمع کرتی ہیں۔ زائل شدہ طاقت کو بحال کر کے جسم کو فولاد کی طرح مضبوط بنا دیتی ہیں۔ جس نے بھی انہیں استعمال کیا اس کو ان کی تعریف میں رطب اللسان پایا۔ نسوانی امراض۔ مثلاً لیکوریا وغیرہ میں بھی یہ گولیاں یکساں مفید ہیں۔ قیمت ایک روپیہ کی پانچ گولیاں ✦

طبیہ عجائب گھر رجسٹرڈ قادیان۔ دارالامان

اَلَآ اِنَّ نَصْرَ اللّٰہِ

ھُوَ الَّذِیْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَہٗ بِالْھُدٰی وَدِیْنِ الْحَقِّ لِیُظْھِرَہٗ عَلَی الدِّیْنِ کُلِّہٖ

ماھنامہ

ریویو آف ریلیجنز (اردو)

یعنی

دنیا کے مذاہب پر نظر اور اہل مذاہب کا تشحیذ الاذہان

جلد [illegible] | ماہ رجب ۱۳۶۵ھ مطابق ماہ جون ۱۹۴۶ء | عدد ۶

فہرست مضامین

ایڈیٹوریل نوٹس

"فضل عمر" سائنٹیفک ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کا افتتاح۔

قادیان میں فضل عمر سائنٹیفک ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کا افتتاح سلسلہ عالیہ احمدیہ کی روز افزوں ترقی میں ایک نئے باب کا آغاز ہے۔

تاریخ عالم اِس امر پر شاہد ہے کہ تہذیب و تمدن کا مادی پہلو سائنٹیفک علم اور صنعتی دسترس پر مبنی ہے۔ پس جو قومیں اپنی بہتری چاہتی ہوں ان کے لئے ضروری ہے کہ سائنٹیفک اور صنعتی مشاغل میں انہماک پیدا کریں۔ لہٰذا جماعت احمدیہ کے لئے مادی ترقی کے پہلو سے بھی نہایت ضروری تھا کہ جلد از جلد اس میدان کی طرف توجہ کرے علاوہ ازیں سلسلہ عالیہ احمدیہ کا نصب العین یہ ہے کہ اسلامی تعلیمات کی برتری کا اقرار اقوامِ عالم سے کروایا جائے۔ اور چونکہ موجودہ دَورِ تمدن میں اسلام پر حملہ کرنے کے ہر موقعہ پر مخالف سائنس سے مدد لیتا ہے اور اسلامی ممالک کی علمی اور صنعتی پستی کو اسلام کے خلاف دلیل کے طور پر پیش کرتا ہے۔ اس لئے جماعت احمدیہ کے لئے خاص دینی لحاظ سے بھی لازمی ہے کہ اپنے اندر سائنٹیفک علم اور صنعتی دسترس کو فروغ دے تاکہ ایک طرف تو دشمن کے اس اعتراض کا قلع قمع ہو کہ اسلام جہالت، تنگ نظری اور نکما پن پیدا کرتا ہے اور دوسری طرف وہی حربہ جو حریف اب تک اسلام کے خلاف استعمال کرنے کا عادی ہے وہ حفاظتِ اسلام میں کام دینے لگے۔ کیونکہ سائنس نام ہے ان قوانین اور خواص کے باقاعدہ اور مکمل علم کا جو ذاتِ باری تعالےٰ نے مادی اشیاء میں ودیعت کر دیئے ہیں اور جن کا علم انسان کی مادی زندگی کے لئے ضروری اور اس کے لئے موجبِ راحت و آرام ہے۔ اب مذہب چونکہ نام ہے خدا کی دی ہوئی ان تعلیمات کا جو انسان کی روحانی زندگی کی تکمیل کے لئے ضروری ہیں۔ اس لئے عقل کہتی ہے کہ خدا کے پیدا کردہ

تو اس ملاشیاء میں جن پر انسان کی مادی زندگی کا مدار ہے اور خدا کی دی ہوئی ان تعلیمات میں جو انسانی روح کی تکمیل کے لئے ضروری ہیں کوئی دشمنی یا ٹکراؤ نہیں ہو سکتا۔ یہ ایک حقیقت ہے جس کا ادراک تو ہماری عقل کر لیتی ہے مگر اس کا ٹھوس ثبوت دینے سے ہم اُس وقت تک قاصر ہیں جب تک احمدی عالم سائنس پر بھی ویسا ہی عبور نہ رکھتے ہوں جیسا وہ دینی مسائل پر رکھتے ہیں۔

پس قادیان میں سائنٹیفک ریسرچ کا کام شروع کروانے سے امیر المومنین حضرت خلیفۃ المسیح الثانی ایدہ اللہ بنصرہ العزیز کا ایک مقصد یہ ہے کہ سلسلہ کی مادی اور اقتصادی طاقت مضبوط ہو۔ اور دوسری اس سے بھی ارفع غرض یہ ہے کہ اب تک جو بعض کوتاہ بینوں کی خام اندیشی کی وجہ سے یہ خیال رائج رہا کہ مذہب اور سائنس میں ایک دوسرے سے بنیادی ٹکراؤ ہے۔ یہ خیال غلط ہے اور اصل حقیقت یہ ہے کہ مادی علوم اگر وہ صحیح بنیاد پر قائم ہوں تو نہ صرف یہ کہ روحانی صداقتوں سے ٹکراتے نہیں بلکہ سراسر ان کی تائید کرتے ہیں۔

فضل عمر سائنٹیفک ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کا افتتاح حضرت فضل عمر کی اولو العزمی، باریک بینی اور وسعت نظر پر ایک نئی دلیل ہے۔ سلسلہ کی دینی اور دنیوی مقاصد کے پیش نظر سائنٹیفک تحقیق و مطالعہ کا کام نہایت ضروری ہے۔ مگر جیسا کہ سر شانتی سروپ بھٹناگر ڈائرکٹر کونسل آف سائنٹیفک اینڈ انڈسٹریل ریسرچ گورنمنٹ آف انڈیا نے انسٹی ٹیوٹ ہذا کا افتتاح کرتے ہوئے فرمایا۔ یہ کام ایک ایسے صرفِ کثیر کو چاہتا ہے جس کے متحمل بعض اوقات بڑی بڑی حکومتوں کے خزانے بھی آسانی سے نہیں ہو سکتے۔ پس اس سلسلہ میں افرادِ جماعت کو اپنی ذمہ داریاں اچھی طرح ذہن نشین کر لینی چاہئیں۔ تاکہ اس کام کو کما حقہٗ چلانے کے لئے جب بھی روپیہ کی ضرورت ہو اپنے امام کی آواز پر جماعت فوراً جمع کر دے۔

فلسطین میں عربوں سے ناانصافی

جنگِ عظیم اول سے قبل، شام، فلسطین و عراق حکومتِ ترکیہ کے ماتحت تھے۔ مگر جنگ کے دوران میں جبکہ ترک جرمنی کے ساتھ ہو کر برطانیہ اور اس کے حلیفوں کے ساتھ برسرِ پیکار تھے ممالک مندرجہ بالا کے عرب سرداروں نے بعض برطانوی اثرات کی انگیخت سے اور برطانوی

حکومت سے سمجھوتہ کے ماتحت ترکی حکومت کے خلاف ایسے وقت میں بغاوت کر دی جبکہ برطانوی فوجیں عرب ملکوں پر حملہ کر رہی تھیں۔ یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ عرب سرداروں نے جو سمجھوتے برطانوی حکومت سے کئے تھے ان کا نقطۂ مرکزی یہ تھا کہ بعد از جنگ ان ملکوں کو آزاد کر کے ان کے باہمی میثاق و مودت اور اتحاد کی کوئی صورت پیدا کی جائیگی۔

اُن عرب سرداروں میں اُس وقت سب سے زیادہ صاحبِ اثر شریف حسین تھے، جو ترکی حکومت کی طرف سے عرب کے گورنر تھے۔ جب جنگ کا ہنگامہ ختم ہوا تو شریف حسین نے برطانیہ سے پُر زور مطالبہ شروع کیا، کہ جو وعدے عربوں سے کئے گئے تھے اُن کو پورا کیا جائے۔ مگر عین اُسی وقت عجیب اتفاق یہ ہوا کہ ابن سعود والئے نجد نے شریف حسین پر حملہ کر کے ان کو عرب سے نکال دیا اور عراق، شام اور فلسطین بجائے آزاد ہونے کے برطانیہ اور فرانس کے اقتدار میں پھنس کر رہ گئے۔

مگر عربوں کی آزادی کے لئے جدوجہد جاری رہی حتیٰ کہ اب عراق اور شام آزاد حکومتوں کے زمرے میں شمار کئے جاتے ہیں اور سلطان ابن سعود بھی آزاد ہیں، مگر فلسطین کے عربوں کی برطانیہ سے دوستی کا نتیجہ ان کے لئے بلائے بے درماں کا رنگ اختیار کر گیا۔ یعنی برطانیہ نے فلسطین میں یہودیت نوازی اپنی پالیسی بنالی۔ اور اِدھر اُدھر سے یہودیوں کو اکٹھا کر کے انہیں فلسطین میں آباد کرنا شروع کر دیا۔ اس یہودیت نوازی کی وجہ یہ بیان کی جاتی ہے، کہ جنگِ عظیم اوّل کے دوران میں اتحادیوں کو یہودی قوم سے خاص مالی مدد ملی تھی اور اس سے بھی زیادہ مدد انہیں بعض یہودی سائنسدانوں سے پہنچی تھی، جن میں ایک صاحب ڈاکٹر ویزمین نامی بہت مشہور و معروف ہیں، اور برطانوی سرکاری طبقوں میں بہت صاحب اثر ہیں۔ اِن خدمات کے بدلے میں یہودی قوم نے یہ انعام طلب کیا کہ انہیں فلسطین میں دوبارہ آباد ہو جانے کا حق دیا جائے۔

یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ یورپ کے یہودی اُن یہودیوں کی اولاد ہیں جو اپنے ملک کو اُس وقت خیر باد کہہ آئے تھے جب حضرت مسیح کی پیدائش کے قریب رومیوں کے ہاتھ سے فلسطین پر تباہی آئی۔ یہ لوگ تو ملک چھوڑ کر چلے گئے، مگر جو یہودی وہاں آباد رہے ان کا اکثر حصہ ظہورِ اسلام کے بعد مسلمان ہو گیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ فلسطین میں جو یہودیوں کا آبائی ملک تھا اُس قوم کی آبادی کا عملاً خاتمہ ہو گیا۔ ادھر جو یہودی یورپ چلے گئے وہ کسی ایک ملک

میں اکٹھے نہ رہے بلکہ منتشر ہو گئے، اور ان کا تمدن اور ان کے یورپین لوگوں سے تعلقات کچھ اسی قسم کے رہے کہ وہ کسی ملک میں بھی جذب نہ ہو سکے

زمانہ حال میں یورپ کے یہودیوں میں سیاسی اثرات کے ماتحت اور سیاسی اغراض و مقاصد کے لئے فلسطین میں آباد ہونے کی تحریک پیدا ہوئی، اور برطانیہ نے اپنے سیاسی اغراض کے پیش نظر اس کو نوازنا شروع کر دیا۔ ۱۹۱۷ء میں برطانیہ کے ایک وزیر لارڈ بالفور نے یہودیوں کی اس خواہش کے بارے میں سرکاری اعلان کیا، جو تاریخ کی کتابوں میں اعلان بالفور کے نام سے پکارا جاتا ہے۔ اس دستاویز کے مطابق گورنمنٹ برطانیہ کی بنیادی پالیسی فلسطین کے بارہ میں یہ ہے کہ وہ یہودیوں کے اس ملک میں بطور اپنے قومی ملک کے آباد ہونے کو پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھتی ہے" مگر اس کے لئے لازمی شرط یہ ہو گی کہ فلسطین کے پہلے باشندوں کے حقوق پر اسکا کوئی ناگوار اثر نہ پڑے۔

جنگ عظیم اوّل میں چونکہ برطانیہ نے فلسطین کو ترکوں سے فتح کر لیا تھا اس لئے امن قائم ہو جانے کے بعد لیگ آف نیشنز نے یہ ملک برطانیہ ہی کی تحویل میں دے دیا۔ اور برطانوی حکومت اعلانِ بالفور پر عمل پیرا ہو گئی۔ عربوں نے بہت واویلا کیا، کہ جب ایک اجنبی قوم کو ملک میں لا بسایا جائے گا تو ملک کے پہلے باشندوں کے حقوق پر ناگوار اثر پڑنا لازمی ہے۔ مگر برطانوی مدبرین نے ان بے چاروں کی ایک نہ سنی تاہم اگر چند ہزار یا لاکھ دو لاکھ یہودی فلسطین میں نئے آباد ہونے کے بعد یہ سیلاب بند ہو جاتا تو بھی ممکن تھا کہ عرب اس کو گوارا کر لیتے اور نئی آبادی پرانی آبادی میں آہستہ آہستہ سمو جاتی۔ مگر یہودی قوم کا ایک حصہ ایسا ہے جس کے سیاسی ارادے بہت بلند ہیں۔ اس عنصر نے جب برطانوی پالیسی سے مدد پائی تو اس کے ولولے فلسطین کی پرانی آبادی کے حق میں بھیانک اور خوفناک ہو گئے اور اپنی پوشیدہ طاقت و تنظیم اور برطانوی سلطنت کے رعب و دبدبہ کے بل بوتے پر وہ بالکل برہنہ ہو کر دنیا کے سامنے نکل آئے۔

یہودی قوم کا مطالبہ اب یہ ہے کہ فلسطین اس کا ملک ہے اس لئے جتنے بھی یہودی بیرونی ممالک سے نقل مکانی کر کے فلسطین میں آباد ہونا چاہیں انہیں کھلی اجازت ہونی چاہیئے

حتیٰ کہ اگر یہودیوں کی عربوں کے مقابلہ میں اکثریت بھی ہو جائے تو بھی مضائقہ نہیں۔ بلکہ زور اب زیادہ تر اسی بات پر ہے کہ یہودیوں ہی کی اکثریت ہونی چاہیئے۔

اعلان بالفور کا مفہوم ہم نے بہت مختصر بیان کیا ہے، مگر اس مختصر بیان سے بھی یہ امر بالکل عیاں ہے کہ اس پالیسی کے دو پہلو ہیں (۱) فلسطین میں یہودیوں کو آباد کرنا۔ مگر (۲) اس طرح پر کہ عرب باشندوں کے سیاسی اور شہری حقوق پر کوئی ناخوشگوار اثر نہ پڑے۔ اب ظاہر ہے کہ اگر یہودیوں کو کسی معمولی تعداد میں ملک میں آباد کیا جائے تو خیر ورنہ اگر ملک میں ان کے داخلے پر سے پابندیاں اٹھا دی جائیں تا جتنے یہودی چاہیں آ جائیں اور خواہ اکثریت بھی ملک میں ان کی ہو جائے تو یہ ایسی صورت پیدا ہو جاتی ہے جو اعلانِ بالفور کے اس پہلو کے براہِ راست خلاف پڑتی ہے جو عرب حقوق کے تحفظ سے تعلق رکھتا ہے۔ اس بنیادی کمزوری کی وجہ سے اس اعلان کے دو ایسے مقصد ہیں جو ایک دوسرے سے لازمی اور قدرتی تضاد رکھتے ہیں۔ اعلانِ بالفور دورِ حاضرہ میں ایک نہایت ہی مضحکہ خیز اور طفلانہ دستاویز ہے، اور حکومت برطانیہ اُس وقت سے اب تک جو طرزِ عمل فلسطین میں اختیار کئے ہوئے ہے وہ اور بھی مضحکہ خیز ہے اور صرف مضحکہ خیز ہی نہیں بلکہ تمام فساد کی جڑ ہے۔ وہ زیادہ تر یہودیت نوازی کی طرف مائل رہتی ہے۔ مگر "جیسے عالمِ رؤیا میں چشم کور بینا ہو" اسے عربوں کے حقوق کا خفیف اور چلتا ہوا سا خیال بھی کبھی آ جاتا ہے۔

عربوں اور یہودیوں کی کشمکش اِس قضیۂ نامراد کی ابتداء ہی سے چلی آتی ہے، اور اس کا اظہار گالی گلوچ سے نہیں بلکہ عموماً گولی اور بم کے ذریعہ ہوتا ہے، اور دونوں قوموں کے دل ایک دوسرے سے بہت دُور ہو گئے ہیں۔ عربوں نے یہ فیصلہ کر لیا ہے کہ وہ کسی قیمت پر بھی اور یہودیوں کو ملک میں داخل نہ ہونے دیں گے۔ اور یہودیوں نے فیصلہ کیا ہوا ہے کہ وہ فلسطین میں بے دست و پا اقلیت بن کر نہ رہیں گے، بلکہ پُرشوکت اکثریت بن کر۔ اور سب سے زیادہ قابلِ افسوس امر یہ ہے کہ امریکہ بھی یہودیوں کی امداد پر تُلا ہوا ہے۔ کیونکہ ریاست ہائے متحدہ امریکہ میں یہودیوں کو بہت اثر حاصل ہے۔

جنگِ عظیم دوم سے فارغ ہو کر برطانیہ اور امریکہ نے ایک متحدہ کمیشن اس غرض

سے مقرر کیا تھا کہ عرب یہودی قضیہ کے خاتمہ کے لئے کوئی صورت تجویز کرے۔ ابھی چند روز گذرے کہ کمیشن نے اپنی سفارشات دونوں حکومتوں کے سامنے پیش کر دیں جو عرب مفاد کے لئے ایسے سم قاتل کا حکم رکھتی ہیں کہ انہیں معلوم کر کے تمام اسلامی دُنیا میں (خصوصاً عرب ممالک میں) آگ لگ گئی ہے۔ اور چونکہ عرب برطانیہ اور امریکہ کے سامنے عاجزیاں کرتے اور گڑگڑاتے تھک گئے ہیں اس لئے فلسطینی عربوں کے لیڈر جمال حسینی نے رُوسی حکومت سے مدد کی درخواست کی ہے۔ در پردہ نہیں بلکہ برملا۔

یہودی آبادی زن و مرد، بچے بوڑھے پُوری طرح مسلح ہیں۔ رائفل، پستول، بم، تیزاب جو بموں کی ساخت میں استعمال ہوتے ہیں، اور مشین گنیں ان کے پاس عام ہیں۔ دوسری طرف تمام عرب ممالک مثل عراق، سعودی عرب، شام اور مصر وغیرہ اپنی پوری قوت سے فلسطینی عربوں کی مدد کا اعلان کر چکے ہیں۔ گویا اس خونی کھیل کے لئے میدان پوری طرح تیار ہو چکا ہے، اور دُنیا کے خرمنِ امن میں یہ چنگاری بھڑک ہی اُٹھنے کو تھی کہ امریکی حکومت نے کسی قدر دانشمندی سے کام لیتے ہوئے یہ اعلان کر دیا ہے کہ اس کمیٹی کی رپورٹ پر کوئی اقدام کرنے سے پہلے فریقین سے مشورہ اور تبادلہ خیالات ضرور کیا جائے گا۔

مگر اس اعلان کا زیادہ سے زیادہ فائدہ یہ ہے کہ جو شعلہ بھڑکنے لگا تھا اس میں کسی قدر تاخیر واقع ہو گئی ہے۔ اس خوفناک آگ کا خطرہ ختم نہیں ہوا۔

گاندھی جی کے فلسفۂ عدمِ تشدد کی حقیقت

اخبار سٹیٹسمین نئی دہلی مؤرخہ ۲۲ر اپریل ۱۹۴۶ء میں گاندھی جی کے مُنہ سے نکلے ہوئے چند ایسے الفاظ ہماری نظر سے گذرے جو اُن کے فلسفۂ عدمِ تشدد پر سرے سے ہی پانی پھیر دیتے ہیں۔ وہ الفاظ یہ ہیں:-

"اگر ہندوستان میں (ہندو مسلم) فسادات ہو جائیں اور بہت سے لوگ مارے بھی جائیں تو کیا مضائقہ ہے۔ آخر ایک دن تو سب ہی نے مرنا ہے"

اِس سے تو شبہ گذرتا ہے کہ گاندھی جی کا فلسفۂ عدم تشدد حکومتِ برطانیہ سے

اپنے خونی ارادے چھپانے کے لئے محض ایک پردہ تھا، ورنہ آزادی حاصل کرنے کے لئے اپنے وطن کا خون اپنے ہاتھ سے بہانا کوئی بڑی بات نہیں۔ جس کی دلیل یہ ہے کہ آخر مرنا تو سب نے ہے۔ لیکن اگر یہ دلیل صحیح ہے تو بھیانک سے بھیانک اور سفاک سے سفاک قاتل بھی کسی جرم کا مرتکب نہیں۔ کیونکہ جس کو وہ مارتا ہے وہ اگر مارا نہ بھی جاتا تو کسی دن اپنی اجل سے مر جاتا۔

موجودہ نازک دنوں میں اور نہیں تو کم از کم گاندھی جی کے منہ سے اس قسم کے الفاظ کا نکلنا نہایت درجہ افسوسناک امر ہے۔ کیونکہ یہ اتفاقی نہیں ◆

رسالہ "البیان" کے "ختمِ نبوت نمبر" پر ایک نظر

(جناب مولوی عطاء محمد صاحب ریٹائرڈ ورنیکلر ٹیچر قادیان)

ہمارے سامنے اُمتِ مسلمہ ہند امرتسر کے ماہوار رسالہ البیان کا "ختمِ نبوت نمبر" ہے گرچہ اِس رسالہ کا جواب دینا دَین لازم کی طرح ہمارے لئے ضروری نہ تھا۔ کیونکہ اوّل اِس خاص نمبر کی تیاری رسالہ کے ادارہ تحریکی انتقامی سرگرمیوں کی رہینِ منت ہے۔ اِس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ نومبر ۱۹۶۱ء کے اواخر میں ایڈیٹر رسالہ البیان کی خدمت میں راقم سطور ہذا نے چندایک سوالات بغرضِ جواب ارسال کئے۔ جو ماہ مارچ ۱۹۶۲ء کے ریویو میں شائع ہوچکے ہیں۔ ایڈیٹر صاحب نے ان سوالات کے جواب سے خود کو عاجز پاکر چند ایک اور مطالبے کردیئے۔ اور جب اِس طرف سے ان مطالبات کو بھی مشروط طور پر منظور کرلیا گیا تو اب آپ کے لئے گریز کی کوئی راہ باقی نہ رہی۔ بجائے اس کے کہ آپ لاجواب رہنے کی صورت میں ایک صاف گو مسلمان کی طرح اپنے عجز کا اقرار کرلیتے اور ہماری معروضات پر خوفِ خدا سے کام لے کر غور کرتے انہوں نے یہی مناسب سمجھا کہ اپنی پوری قوت سے احمدیت پر حملہ آور ہوں۔ اور اس خواہش کو پورا کرنے کے لئے اِدھر اُدھر سے چندایک لایعنی تحریرات اکٹھی کرکے پورے دو ماہ کی دوڑ دھوپ کے بعد دو ماہ کا اکٹھا رسالہ شائع کردیا۔ اور ظاہر ہے کہ جن تحریرات کا محرک انتقامی جذبہ ہو ان میں حق و صداقت کا پایا جانا اگر ناممکن نہیں تو قریباً محال ضرور ہے۔

دوسرے اگر ایڈیٹر صاحب "البیان" اِس مضمون میں کوئی جدت پیدا کرتے یا وہ حقیقی اشکالات جو اس مسئلہ میں ان کے اپنے علم اور اندازہ فہم کے مطابق پیدا ہوتے پیش کرکے دیانتداری سے ان کے جوابات ہم سے لینا چاہتے تو وہ رسالہ کے شائع ہوتے ہی دوسرے خریداروں کی طرح فی الفور دفتر ریویو میں بھی رسالہ بھیج دیتے۔ مگر معلوم ہوتا ہے کہ ایک طرف انہیں اپنے لاجواب رہنے کا اور دوسری طرف مضمون میں کوئی جدت پیدا نہ کرسکنے کا اس قدر خدشہ تھا کہ باوجود اس کے کہ رسالہ ریویو ان کو باقاعدہ تبادلہ میں پہنچ رہا

تھا اور باوجود اس کے کہ اس رسالہ کے ذریعہ انہوں نے ہمیں خاص طور پر مخاطب کر رکھا تھا۔ یہ رسالہ انہوں نے اُس وقت تک ارسال نہیں فرمایا جب تک اُنہیں بار بار یاد دہانی نہیں کرائی گئی۔ اور پھر رسالہ موصول ہونے کے بعد جب ایڈیٹر صاحب ریویو کی طرف سے بذریعہ رجسٹری خط کے ایڈیٹر صاحب البیان کو لکھا گیا کہ ہم آپ کے رسالہ کا تحقیقی جواب دینا چاہتے ہیں لیکن چونکہ احقاق حق اور ابطال باطل کی بہترین صورت یہی ہے کہ جن لوگوں تک اس رسالہ کے ذریعہ آپ کے خیالات پہنچے ہیں اُن تک ہمارے جوابات بھی اسی رسالہ کے ذریعہ پہنچائے جائیں، تا انہیں حق و باطل میں تمیز کرنے کا موقع مل جائے۔ اس لئے آپ براہ کرم تحریر فرمائیں کہ آپ اپنے رسالہ کے کس قدر صفحات ہمارے جواب کے لئے وقف کر سکتے ہیں۔ تاکہ ان صفحات کے مطابق مضمون تیار کر کے بھیجدیا جائے۔ اور اگر کسی وجہ سے آپ ایسا نہ کر سکیں تو پھر اس سے بھی آسان صورت یہ ہے کہ ہم رسالہ ہذا کا جواب اپنے خرچ پر شائع کر دیتے ہیں۔ آپ اس جواب کو اپنے رسالہ کے ساتھ بطور ضمیمہ شائع کر دیں۔

مگر باوجود اس کے کہ یہ خط مؤرخہ ۲۴ اپریل کو بذریعہ رجسٹری بھیجا گیا تھا آپ کی طرف سے ۱۵ اپریل ۱۹۳۲ء تک کوئی جواب موصول نہیں ہوا۔ اور جو لوگ اپنی مخصوص اغراض کے ماتحت اس قدر رازداری سے کام لے رہے ہوں ان کا مذہب سے جس قدر تعلق ہو سکتا ہے اور مذہب کے نام پر انہیں مخاطب کرنا جس قدر مفید ہو سکتا ہے وہ ہر ایسے انسان پر جو عقل و خرد سے کچھ بھی حصہ رکھتا ہے ظاہر و باہر ہے۔

لیکن چونکہ عوام الناس میں سوچ بچار کا مادہ بھی کم ہوتا ہے اور تعلیم کی کمی کی وجہ سے وہ حق و باطل، اور راست اور ناراست میں فرق کرنے کی اہلیت بھی بہت ہی کم رکھتے ہیں۔ اور یہی وہ طبقہ ہے جو ان لوگوں کی نفسانی خواہشات کا سب سے زیادہ شکار ہوتا ہے۔ اس لئے بامتثال ارشاد خداوندی ولتکن منکم اُمّۃ یدعون الی الخیر ویامرون بالمعروف وینھون عن المنکر و اولٰئک ھم المفلحون۔ ایسے لوگوں کی ہمدردی اور سچی خیرخواہی کے جذبے سے معمور ہو کر ہم نے مناسب سمجھا کہ اس موضوع پر اصولی رنگ میں چند ایک امور پیش کئے جاویں۔ ممکن ہے ہماری یہ کوشش کسی سعید روح کی ہدایت و رہنمائی کا موجب ہو سکے۔

اس مختصر سی تمہید کے بعد اصل رسالہ کے مضامین کا جواب عرض کرنے سے قبل مناسب معلوم

ہو تا ہے کہ تمام نہاد اُمتِ مسلمہ اور رسالہ البیان کے ادارہ تحریر کے ایمانی اور اعتقادی خط و خال کو ذرا نمایاں کر کے دکھلا یا جاوے۔ تا جن لوگوں کو اسلام اور بانیٔ اسلام علیہ الصلوٰۃ والسلام سے کسی قسم کا تعلق بھی باقی ہو، اور اسلام اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت کا ادنیٰ سا شائبہ بھی اُن کے دلوں میں موجود ہو۔ وہ سرسری نگاہ سے ہی دیکھکر معلوم کر سکیں کہ یہ لوگ قرآن کریم، اسلام اور آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے دوست ہیں یا بد ترین دشمن؟ سو واضح ہو کہ اُمتِ مسلمہ ہند امرت سر سے تعلق رکھنے والے تمام لوگ جن میں البیان کا ادارۂ تحریر بھی شامل ہے مولوی عبد اللہ صاحب چکڑالوی کے ہم خیال لوگ ہیں۔ اور مولوی صاحب مذکور ایک آزاد خیال انسان تھے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی حیثیت ایک چٹھی رساں یا چپڑاسی سے زیادہ نہ سمجھتے تھے۔ (نعوذ باللہ من ذالک) بلکہ موجودہ زمانہ میں چپڑاسیوں کو جس قدر اختیارات حاصل ہیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو وہ اتنے اختیارات بھی دینے کے لئے تیار نہ تھے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے وجودِ مطہر و مقدس کو اور حضور کے اعمال کی پیروی کو ضروریاتِ دین میں سے نہ سمجھتے تھے۔ بلکہ تقلیدِ شخصی کو بزرگ پرستی اور انسانی ترقی کی راہ میں بہت بڑی روک سمجھتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ قرآن کریم میں جو احکام وارد ہوئے ہیں ہر شخص اپنی سمجھ بوجھ کے مطابق ان کی خود ہی تشریح کر سکتا ہے اور ان پر عملدرآمد کرنے میں اپنے اندازۂ علم و فہم سے زیادہ کا وہ مکلف نہیں ہے۔ اور اُمتِ مسلمہ ہند اور اس کے متعلقین چونکہ اسی درخت کی شاخیں ہیں اس لئے بہتر ہوگا کہ نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ کے متعلق ان لوگوں کے خیالات ان کی اپنی تحریرات سے پیش کئے جائیں، تا کسی کو یہ وہم نہ گذرے کہ ہم نے مخاصمانہ جذبات سے متاثر ہو کر ان لوگوں کے عقائد کے اظہار میں ناواجب افراط تفریط سے کام لیا ہے ۔

(۱) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق

سوال۔ انبیا گناہ نہیں کر سکتے، کیونکہ وہ اللہ تعالےٰ کے احکام کو عملی جامہ پہناتے ہیں۔ اور چونکہ احکام غلط نہیں ہوتے اس لئے عمل بھی غلط نہیں ہوتا۔[۱] حضور صلعم شفیع المذنبین ہیں اور گنہ گار شفیع نہیں ہو سکتا۔ لہٰذا سورہ فتح میں ذنب کا

[۱] احکام کا صحیح ہونا عمل کے صحیح ہونے کو کس طرح مستلزم ہو گیا۔ (مدیر البیان)

مطلب موقع و محل کے مطابق لیا جائے گا۔ کیونکہ یہ کہنا کہ "ہم تمہیں فتح عظیم عطا کرتے ہیں تاکہ تمہارے گناہ بخشے جائیں" ایک بے ربط مضمون ہے۔ میرے نزدیک صحیح اور مربوط مطلب یہ ہوگا "تحقیق فتح دی ہم نے تجھ کو فتح عظیم تاکہ پورا کرے واسطے تیرے خدا اگلی کمیاں اور پچھلی اور تاکہ تمام کرے نعمت اپنی اوپر تیرے۔ ملخصاً (نیاز علی رسالدار)

جواب۔ آپ فرماتے ہیں "انبیاء گناہ نہیں کر سکتے" اِس پر آپ نے کوئی عقلی یا قرآنی دلیل نہیں دی۔ موسیٰ کلیم اللہ فرماتے ہیں لھم علیّ ذنبٌ (شعراء ۱۴) میں فرعونیوں کا ایک گناہ کر چکا ہوں۔

سورۃ یوسف میں عزیز اپنی بیوی سے کہہ رہا ہے واستغفری لذنبکِ (یوسف ۲۹) اے عورت اپنے قصور (ذنب) کی معافی مانگ۔ اس کے بالکل ساتھ ہی ذنب کے معنی لگے ہوئے ہیں۔ انکِ کنتِ من الخاطئین (۲۹) کیونکہ تو خطا کاروں میں سے ہے۔ (یعنی ذنب خطا کی قسم سے ہے)

یہ لفظ بصیغۂ تذکیر آنحضرت کو مخاطب کر کے دو جگہ سورہ مومن و سورہ محمدؐ میں لائے گئے ہیں۔ واستغفر لذنبکَ (مومن ۵۵) اپنے ذنب کے لئے استغفار کر۔

سورۂ محمدؐ میں اس استغفار اور ذنب کے تحت حضورؐ کے ساتھ عام مومن مرد اور عورتیں مذکور ہیں واستغفر لذنبکَ وللمؤمنین والمؤمنٰت۔ (محمدؐ ۱۹) اے پیغمبر اپنے اور مومن مردوں اور عورتوں کے ذنب کے لئے معافی مانگ۔

غالباً آپ تمام مومنین اور مومنات کو معصوم نہیں مانتے ہوں گے۔ پھر ایک ہی فقرے میں ذنب اور استغفار کے معنی نبی کے لئے تو اور ہوں اور دوسروں کے لئے اور، اس کی بھی کوئی محاورہ قرینہ اور اسلوب اجازت نہیں دیتا۔

آپ کی ایک دلیل یہ ہے کہ قیامت کے دن حضور صلعم شفیع المذنبین ہوں گے

؎ ترجمے میں آپ کا ذ خطاب فراموش کر گئے یعنی تیری کمیاں (مدیر البیان)

اور گنہ گار تو شفیع نہیں ہو سکتا۔ قرآن میں کہاں لکھا ہے کہ گنہ گار شفیع نہیں ہو سکتا۔ اور یہ کہاں لکھا ہے کہ محمد صلعم شفیع المذنبین ہیں۔ ہمارے ارد گرد روایتی کہانیوں نے اتنا احاطہ کر لیا ہے۔ اب ہم ان سے نکلنا دین سے نکل جانا سمجھ رہے ہیں (معاذ اللہ) قرآن نے تو خطا سے منزہ صرف ایک ذات بتائی ہے اور وہ خدا کی ذات ہے۔"

(دیکھو رسالہ البیان ماہ جون ۱۹۴۶ء صفحہ ۲۲-۲۳)

اِس سوال جواب سے یہ بات روزِ روشن کی طرح ثابت ہو گئی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ذنب اور خطا میں بقول ان لوگوں کے عام مومنین اور مومنات کے ساتھ مساوی شریک ہیں۔ اور کہ قرآن کریم میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق ہرگز نہیں لکھا ہوا کہ آپ شفیع ہوں گے۔ اور کہ حضورؐ کے کلمات طیبات کا مجموعہ جو احادیث کے نام سے موسوم ہے ان لوگوں کے نزدیک روایتی کہانیوں سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا۔ اور کہ ان روایتی کہانیوں کو اگر چھوڑ بھی دیا جائے تو دین میں کچھ بھی حرج واقع نہیں ہوتا۔ اور کہ انبیاء کی اتباع ان لوگوں کے نزدیک "بزرگ پرستی" اور انہیں معصوم سمجھنا "اپنے چاؤ سے انہیں دیوتا بنانے" کے مترادف ہے۔ اگرچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق کوئی مسلمان ایسا نہیں جو مذکورہ بالا الفاظ کو سینہ پر پتھر رکھے بغیر سُن سکے۔ مگر اس سے بھی بڑھ کر ان بدقسمت لوگوں نے حضورؐ کے متعلق وہ الفاظ استعمال کئے ہیں جنہیں سُنتے ہی ایک سچے مسلمان نہیں بلکہ ایک کمزور سے کمزور مسلمان کا خون بھی کھولنے لگ جاتا ہے۔ ذرا غور سے سُنیئے۔ البیان ماہ ستمبر ۱۹۴۵ء کے صفحہ ۱ پر "سُنت رسول کے معنی" کے عنوان سے لکھا ہے:-

"حکومتِ الٰہیہ کے نام سے پنجاب میں ایک نئی تحریک برگ و بار پیدا کر رہی ہے۔ مسلمان جیسا کہ وہ ہر نئی تحریک کی مخالفت کے عادی ہیں، اس تحریک کے خلاف بھی جائز ناجائز ہر طرح کی نکتہ چینی کر رہے ہیں۔ بدقسمتی سے بانیٔ تحریک کی ڈاڑھی بہت چھوٹی ہے۔ یعنی مقدار قبضہ سے بھی کم۔ اس پر ہمارے "سُنت پرست" مولوی صاحبان ان کی اس خطا پر بہت چیں بہ جبیں ہو رہے ہیں۔"

تحریک کے بانی نے ان نکتہ چینیوں کو جو جواب دیا ہے وہ بھی اگرچہ سُننے کے قابل ہے لکھا ہے:-

"میں اپنے طرزِ عمل سے اس ذہنیت کو غذا دینا پسند نہیں کرتا جس نے بدعت کو عین سُنت بنا دینے تک نوبت پہنچا دی ہے۔ میرے نزدیک کسی

غیر منصوص چیز کو منصوص کی طرح اور کسی غیر مسنون چیز کو (جو اصطلاح شرعی کے لحاظ سے سُنّت نہ ہو) سُنّت قرار دینا بدعت ہے۔ اور ان خطرناک بدعتوں میں سے ہے جو معلوم و معروف بدعتوں کی بہ نسبت زیادہ تحریف دین کی موجب ہوئی ہیں۔ اسی قبیل سے یہ ڈاڑھی کا معاملہ ہے۔ لوگوں نے غیر منصوص مقدار کو ایسی حیثیت دے دی ہے اور اس پر ایسا اصرار کرتے ہیں جیسا کہ کسی منصوص چیز پر ہونا چاہیئے۔ پھر اس سے زیادہ خطرناک غلطی یہ کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی عادات کو بعینہٖ وہ سُنّت قرار دیتے ہیں جس کے قائم و جاری کرنے کے لئے آپؐ مبعوث ہوئے تھے۔ درآنحالیکہ جو امور آپؐ نے عادۃً کئے ہیں انہیں سُنّت بنا دینا اور تمام دُنیا کے انسانوں سے یہ مطالبہ کرنا کہ وہ سب ان عادات کو اختیار کریں اللہ اور اس کے رسول کا ہرگز یہ منشاء نہ تھا"

لیکن اس پر البیان کے ایڈیٹر کی گوہر افشانی تو اس سے بھی زیادہ قابل ملاحظہ ہے لکھا ہے:-

"اِن لفظوں کی صحت و صداقت پر کوئی حرف نہیں رکھا جا سکتا۔ لیکن بہت کم لوگ ایسے ہوں گے جنہوں نے مسلمانوں کی اس عام گمراہی کی علت معلوم کرنیکی کوشش کی ہو۔ ہمارے خیال میں اس کی حقیقی وجہ وہی شخصیت پرستی کا جذبہ ہے جس نے یہود کو اس بات پر آمادہ کیا کہ وہ عزیر کو اللہ کا بیٹا قرار دیں۔ اور نصاریٰ کو یہ ترغیب دی کہ وہ المسیح ابن اللہ کے عقیدے پر ایمان لائیں۔ شخصیت پرستی کا یہ شیطان مسلمانوں میں بھی حلول کئے بغیر نہ رہ سکا۔ انہوں نے اپنے پیغمبر کو ابن اللہ کے رتبے سے بھی کہیں زیادہ اونچے رتبے کا مستحق سمجھا۔ دوسرے لفظوں میں خدا کا شریک بلکہ عین خدا بنا ڈالا۔ پھر خدا اور رسول میں مشابہت پیدا کرنے کے لئے خدا کے دین کے ساتھ ساتھ پیغمبر کا بھی ایک دین تیار کر ڈالا۔ اللہ نے ایک کتاب نازل کی، تو اس کی ریس میں تیس ہی پاروں کی ایک اور کتاب مثلہ معہٗ کی حیثیت سے رسول کی طرف بھی منسوب کر دی گئی۔ فرض نماز کے ساتھ ساتھ ایک سُنّت نماز کا بھی اضافہ کیا گیا تاکہ رسول کا حکم خدا کے حکم سے پیچھے نہ رہے۔ اور جب یہ سلسلہ چل نکلا تو پھر شاید ہی کوئی فرض ایسا چھوڑا گیا ہو جس کے ساتھ سُنّت کے الگ حقوق

دمقرر کئے گئے ہوں۔ یہاں تک کہ اگر وضو میں چار فرض ہیں تو اس کے ساتھ سنتیں بھی موجود ہیں جن کا ادا کرنا قریب قریب ویسا ہی ضروری سمجھا گیا ہے جیسا کہ فرائض کا۔" (البیان ماہ ستمبر ۱۹۴۹ء ص)

ہمارے ناظرین حیران ہوں گے کہ یہ کون لوگ ہیں جو مسلم کہلا کر اسلام اور بانیٔ اسلام علیہ الصلوٰۃ والسلام کی ذاتِ ستودہ صفات کے متعلق اپنی زبانِ قلم سے یہ گوہر افشانی کر رہے ہیں۔ چونکہ کسی شخص کو کوئی حق نہیں پہنچتا کہ دوسروں کے متعلق خود ہی ظنی فیصلے کرتا پھرے اور ہر شخص کے متعلق وہی فیصلہ عند العقل زیادہ تر قابلِ قبول ہوتا ہے۔ جو وہ خود کرے۔ اس لئے ہم اپنے ناظرین سے ان لوگوں کا انہی کی زبانی تعارف کراتے ہیں۔

رسالہ البیان ماہ جون ۱۹۴۹ء کے ص پر لکھا ہے:۔

"بڑے ہی دکھ کے ساتھ اس تلخ حقیقت کا اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ سچ مچ ہم لوگ کافر ہیں، اس لئے کہ ہم قرآن مجید اور سُنّت انبیاء علیہم السلام کو عملاً ترک کر چکے ہیں اور ہم اللہ کی راہ میں رکاوٹ بنے ہوئے ہیں۔ اس لئے کہ ہماری حالت کو دیکھ کر کوئی شخص بھی اسلام و قرآن کی طرف نہیں آسکتا ہے۔ کتاب میں کشش ہے لیکن کتاب کے داعیوں اور مبلغوں میں کوئی کشش نہیں۔ اگر قرآن کی طرف دعوت دینے والی کوئی جماعت کوئی انجمن قرآن پر عامل بھی ہوتی تو سب سے پہلا اثر یہ ہوتا کہ ہمارے اپنے نوجوان اسلام سے برگشتہ نہ ہوتے۔ اس کے بعد غیر مسلم محقق خود بخود مسلمانوں کے عملی تفوق کو دیکھکر فوج در فوج داخل اسلام ہو جاتے۔ پس ہمارے اس عملی کفر صدٌّ عن سبیل اللہ کا نتیجہ ہے کہ ہمارے اعمال بے نتیجہ ہو رہے ہیں۔ صوم و صلوٰۃ اور حج و زکوٰۃ کے جو نتیجے قرآن نے بتائے اور صحابہ کرام (رضوان اللہ علیہم) نے حاصل کئے۔ ہم ان سے کلیۃً محروم ہیں۔ پھر ہمارے شب و روز کے اعمال اور صدقہ و خیرات برباد نہیں ہو رہے تو کہاں جا رہے ہیں۔ نہ ہمیں کوئی اجتماعی پھل مل رہا ہے اور نہ انفرادی ثمرہ حاصل ہو رہا ہے۔"

تحریر اُمّتِ مسلمہ ہند امرتسر کے واحد ترجمان رسالہ البیان کی اور تصویر البیان کے مائیہ ناز ایڈیٹر اور اُمّتِ مسلمہ کے کرتا دھرتا جناب عرشی صاحب کی کھینچی ہوئی کشیدہ

تصویر ہے جس میں شک وشبہ کی کوئی گنجائش باقی نہیں۔ نہ ہی اس تحریر کو کسی کسر نفسی پر محمول کیا جا سکتا ہے۔ کیونکہ یہ دعویٰ دلائل اور واقعات کی روشنی میں کیا گیا ہے جس سے انکار کی کوئی صورت ممکن نہیں۔ پس ناچار ہم اور ہمارے ناظرین مجبور ہیں کہ اس تصویر کو ان کی اصلی تصویر سمجھیں، اور اس کے متعلق کسی شک وشبہ کو دل میں جگہ نہ دیں۔

(۲) حدیث اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان کے متعلق

سوال (۱) آپ کے نزدیک حدیث کی کیا حیثیت ہے؟

(۲) فآمنوا باللہ ورسولہ کا کیا مفہوم ہے مفصل جواب دیں۔ ملتفعنا۔

(مختار احمد خان متعلم مدرسہ کنز العلوم)

جوابات۔ (۱) حدیث مبلغین قرآن (رضی اللہ عنہم) کے قافلۂ اول کی تاریخ کا وہ مجموعہ ہے جو طویل مدت تک اچھے برے لوگوں کی زبانوں پر رہا۔ اس کے بعد کتابوں میں لایا گیا۔ پھر اس بہت بڑے ڈھیر سے سونے چاندی کے ذرات تلاش کئے گئے۔ آج بھی ان ذرات میں سونے کے ساتھ ساتھ پیتل موجود ہے۔ جس کو بدقسمتی سے سونا سمجھ لیا گیا ہے۔ ہوگا اس پیتل کی بازارِ عالم میں کوئی قیمت نہیں لیکن ہم اسے سونا سمجھے ہوئے اٹھائے پھرتے ہیں۔ یہاں تک کہ اس کے عشق نے ہم میں سے بہتوں کو قطعی خالص سونے (قرآن) سے بھی بے پرواہ کر رکھا ہے۔ حدیث کا جو حصہ قرآن پاک سے موافق ہے میں نے اس کی مفید حیثیت کے اعتراف میں اُسے سونے سے تشبیہ دی ہے۔ ورنہ وحی تو صرف قرآن میں ختم ہو گئی، اس سے باہر جو بھی ہے بشری اقوال ہیں"

(۲) آمنوا باللہ ورسولہ سے وہی مراد ہے جو امنوا باللہ ورسلہ سے ہے۔ یعنی جس طرح ہم تمام رسولوں پر ایمان لانے کے مکلف ہیں اسی طرح ایک رسول پر جس طرح تمام رسولوں کی احادیث کی تلاش نہیں کرتے اسی طرح ایک خاص رسول کی بھی جس طرح تمام رسولوں پر ایمان، قرآن پر ایمان، قرآن پر ایمان لانے سے حاصل ہو سکتا ہے اسی طرح آخری رسول صلعم پر ایمان ایمان بالقرآن میں آجاتا ہے۔ من یطع الرسول فقد اطاع اللہ (ن ۸۰) جس نے رسول کی اطاعت کی اس نے اللہ کی اطاعت کی۔ یہ سخت بدبختی ہے کہ اللہ اور رسول کی اطاعت کو دو الگ اطاعتیں سمجھ

لیا گیا ہے۔ ان الحکم الا للّٰہ۔ حکم تو صرف اللہ کا ہے۔ رسول اس پر عمل کرنیوالے اور کرانے والے ہیں اور بس" (دیکھو رسالہ البیان ماہ جون ۱۹۴۵ء صفحہ ۳۴)

اس اقتباس کا ماحصل سوائے اس کے کچھ نہیں کہ قابلِ عمل وحی صرف قرآن کریم میں ہے احادیث بشری اقوال ہیں اور اللہ کی اطاعت کے لئے رسول کی اطاعت کرنا سخت بدبختی ہے۔ کوئی ان لوگوں سے پوچھے کہ اگر احادیث بشری اقوال ہونے کی وجہ سے ساقط الاعتبار اور ناقابلِ قبول ہیں تو قرآن کریم کے قطعی طور پر کلام الٰہی ہونیکی آپ کے پاس کیا دلیل ہے کیا آپ لوگوں کے سامنے حضرت جبرائیل علیہ السلام نزول فرمایا کرتے تھے؟ اور آپ لوگوں کی موجودگی میں وحی الٰہی نازل ہوا کرتی تھی؟ اور کیا وحی کے الفاظ جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوا کرتے تھے وہ تصدیق کی خاطر آپ لوگوں کو بھی سُنائی دیتے تھے؟ اگر نہیں اور یقیناً نہیں تو پھر قرآنی وحی بھی تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وساطت سے ہی آپ لوگوں تک پہنچی ہے اس میں شک و شبہ کی گنجائش کیوں نہیں؟ کونسی منطقی دلیل اس بات پر قائم ہوسکتی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جو باتیں خدا کی طرف منسوب کرکے بیان کی ہیں وہ تو بلا ریب سو فیصدی یقینی ہیں اور جو اپنی طرف سے بطور تفسیر بیان فرمائی ہیں وہ سو فیصدی غلط اور ناقابلِ اعتبار ہیں۔

پھر ایک بات اور بھی قابلِ غور ہے، اور وہ یہ کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر جو احکام نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ وغیرہ کے نازل ہوتے تھے، ان احکام کو حضورؐ خود بھی سمجھتے اور اُن پر عمل پیرا ہوتے تھے یا نہیں؟ اگر سمجھتے تھے اور ان پر عمل کرنے کے لئے خود بھی مکلّف تھے تو وہ حضورؐ کا عمل قرآنی حکم کی صحیح تعمیل ہوتا تھا یا غلط؟ اگر صحیح تعمیل وہی ہوتی تھی جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کرتے تھے تو ان اعمال میں (اگر آپ لوگ بھی قرآن پر عمل کرنے کے لئے مکلّف ہیں) حضورؐ کی اتباع آپ لوگوں کے لئے کرنا ضروری ہے یا نہیں؟ اگر ضروری ہے تو حضورؐ کے ان اعمال کی تفصیل کا منبع اور مصدر کیا ہے؟ اور اگر حضورؐ کا عمل بھی غلط ہوتا تھا تو خدا کو حضورؐ کے ذریعے قرآن بھیجنے کی کیا مجبوری لاحق ہوگئی تھی؟ کیوں بنا بنایا قرآن اس نے دُنیا کے لوگوں کی تعداد کے مطابق آسمان سے نازل نہ کر دیا؟ یا کیوں سارا قرآن فرداً فرداً ہر شخص پر نازل نہ کر دیا؟ تا ہر شخص یقین کے مرتبہ پر فائز ہو کر شک و شبہ کی تاریکی سے نجات پا جاتا۔

ان سوالات کے جواب سے اُمّتِ مُسلمہ کے ثبوت قیامت تک عُمدہ برآ نہیں ہو سکتے۔
اور جو لوگ ایک صداقت کا دانستہ انکار کر دیتے ہیں، اُن کی سزا یہی ہوتی ہے کہ انہیں تمام صداقتوں سے دست بردار ہونا پڑتا ہے۔ فماذا بعد الحق الا الضلال۔ حق کے بعد (حق کو چھوڑ کر) گمراہی کے سوا اور کیا ہے (یعنی کچھ بھی نہیں)

(۳) نماز کے متعلق

سوال۔ "نماز کا حکم قرآن مجید میں سینکڑوں جگہ ہے لیکن مفصل طریقہ نماز کا کہیں ذکر نہیں۔ فرض نماز کی کتنی رکعتیں ہیں اور اُن میں کیا پڑھنا چاہیئے۔ کیا ہماری موجودہ نماز قرآن کے مطابق ہے؟"

جواب۔" میں آپ کو ایک موٹی سی بات بتاتا ہوں۔ قرآن مجید کے متعلق آپ یہ کبھی گمان نہ کریں کہ جن چیزوں کو وہ انسان کے لئے ضروری سمجھتا ہو اُن کو تشنۂ تفصیل چھوڑ دیگا"

"نماز کی رکعتوں کی تعداد کیا ہونی چاہیئے اور ان میں کیا پڑھنا چاہیئے، بعض لوگوں نے اس طرح کے سوالوں کے جواب قرآن حکیم کی آیتوں سے پیش کرنے کی کوشش کی ہے لیکن ان ساری کوششوں کو تکلف سمجھنا چاہیئے قرآن مجید اپنے عام اسلوب کے مطابق اس قسم کی فروعی باتوں کے بارے میں قطعاً خاموش ہے۔"

"نماز کے بارے میں قرآن مجید میں جس قدر آیتیں موجود ہیں ان سب میں ایک چیز عام ہے۔ یعنی نماز کا مرکزی نقطہ" ذکرِ الٰہی اور تسبیح و دُعا ہے۔ قرآن مجید میں حمد و تسبیح و دُعا کی بے شمار آیتیں ہیں انہیں نمازمیں پڑھ لیجئے سو اس کا مقصد پُورا ہو سکتا ہے۔ مروّجہ نمازوں میں مسلمان اس طرف دھیان نہیں دیتے۔ نماز کے مناسب آیتوں کی قراءت نہیں کرتے۔" (البیان نومبر ۱۹۵۲ء صفحہ ۳۱)

اس اقتباس کا سادہ لفظوں میں مفہوم یہ ہے کہ چونکہ نماز کی رکعات اور اسکی تفاصیل قرآن کریم میں مذکور نہیں ہیں اس لئے یہ سب غیر ضروری چیزیں ہیں۔ کیونکہ اگر ضروری

ہوتیں تو قرآن اُن کی تفصیل بیان کرتا۔ ہر شخص اپنی مرضی سے جس قدر رکعات چاہے پڑھ سکتا ہے۔ اور یہ بھی ضروری نہیں کہ نماز کی موجودہ صورت قائم رکھی جاوے۔ اپنی اپنی پسند اور ضرورت کے مطابق حمد، تسبیح و دُعا کی آیات پڑھ لینے سے یہ مقصد پُورا ہو سکتا ہے اور مسلمانوں کی مروجہ نمازیں قرآن کے مطابق نہیں ہیں، کیونکہ نماز کے مناسب آیات کی وہ قراءت نہیں کرتے۔

(۴) زکوٰۃ کے متعلق

زکوٰۃ کا مصرف اور مقدار

سوال: "کلام اللہ میں نماز کے بعد سب سے زیادہ تاکید زکوٰۃ کی آئی ہے۔ لیکن تفصیل نہیں بتائی گئی، کہ کس قدر ادا کی جاوے اور کیسے ادا کی جاوے۔ کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ یہ فرض کس طرح ادا ہونا چاہیئے؟"

جواب: زکوٰۃ و صدقات کا مصرف قرآن حکیم میں نہایت صراحت کے ساتھ بیان کر دیا گیا ہے۔

الصّدقات للفقرآء والمساكين والعملين عليها والمؤلّفة قلوبهم وفی الرّقاب والغارمين وفی سبيل الله وابن السّبيل فريضةً مّن الله والله عليم حكيم۔ (التوبہ ۶۱)

صدقات یعنی زکوٰۃ و خیرات مفلسوں محتاجوں اور کارکنانِ صدقات کا حق ہے اور ان لوگوں کا جنکی تالیف قلوب منظور ہو۔ اور غلاموں کے آزاد کرانے میں اور قرضداروں کے قرض ادا کرنے میں اور خدا کی راہ میں اور مسافروں کی مدد میں بھی یہ مال خرچ کرنا چاہیئے۔ یہ حقوق خدا کی طرف سے مقرر کر دیئے گئے ہیں اور خدا جاننے والا حکمت والا ہے۔

تفسیر "بیان للنّاس" سے آیت بالا کی تشریح نقل کی جاتی ہے۔

"اللہ تعالےٰ نے صدقات کے حقدار ذیل کے لوگ قرار دیئے ہیں۔

۱۔ فقراء جو گذارے کے سامانوں سے محروم ہوں۔

۲۔ مساکین جن کی آمدنی خرچ سے کم ہو۔

۳۔ وہ محصل جو اموال کا حساب لگانے اور چندہ جمع کرنے پر مقرر ہوں۔

۴۔ وہ قومیں جنہیں کچھ دیکر ان کی دوستی اس لئے حاصل کی جاوے کہ وہ ملک میں بدامنی نہ پھیلائیں۔ اور دوسرے لوگوں کو بھی حملہ کرنے سے روکیں۔ مثلاً سرحدی اور کوہستانی لوگ۔

۵۔ لونڈی غلاموں کو آزاد کرانے کے اخراجات۔

۶۔ وہ لوگ جن پر مصیبتیں پڑ جائیں۔ مثلاً مکان جل جائے یا لوٹا ہو جائے یا مویشی مر جائیں۔ یا نوکری جاتی رہے یا ضعیفی کے سبب کام کاج کی طاقت زائل ہو جائے۔

۷۔ مصارف فی سبیل اللہ مثلاً جبر مذہبی مٹانے اور علم پھیلانے کے اخراجات

۸۔ مسافروں کے لئے سرائیں بنانے، کنوئیں لگوانے، سڑکیں تیار کرانے، درخت لگانے، پل بنانے یا حفاظت کے لئے پہرے کے انتظام کرنے کے مصارف۔"

مقدار زکوٰۃ کے متعلق قرآن پاک نے ہم پر کوئی پابندی نہیں لگائی۔ بلکہ ایک سیدھا سادہ اصول بتا دیا ہے۔ ویسئلونک ماذا ینفقون قل العفو (البقرہ) اے پیغمبر لوگ تم سے پوچھتے ہیں کہ وہ راہِ خدا میں کیا خرچ کریں۔ کہہ دو کہ جو ضرورت سے زیادہ ہو۔

اس حکم قرآنی کے پیشِ نظر زکوٰۃ کے مروجہ نصاب اور شرح زکوٰۃ کی جو حیثیت رہ جاتی ہے اس پر کسی تبصرے کی ضرورت نہیں۔" (البیان نومبر ۱۹۴۵ء صفحہ ۹۲)

(۵) قربانی کے متعلق

سوال:۔ ہندوستان کی مروجہ رسم قربانی کی کیا حقیقت ہے۔ مولویوں کا یہ فتویٰ کہ ہر صاحب نصاب پر قربانی واجب ہے اس کی کیا سند و اصلیت ہے؟

جواب۔ نہ صرف قرآن مجید میں بلکہ حدیث میں بھی اس رواج کی کوئی اصل نہیں۔ جو ہندوستان میں عید اضحیٰ کے موقعہ پر قربانی کی شکل میں مروج ہے قرآن مجید سے صرف اتنی ہی بات ثابت ہے کہ حج کے موقعہ پر کہ اس وقت دنیا

کے گوشے گوشے سے ہزاروں مسلمان بیت اللہ میں جمع ہوتے ہیں جانوروں کو ذبح کیا جائے تاکہ ان کی خوراک کا انتظام ہو سکے۔ اس معاملے میں بھی اعتدال کو چھوڑ کر اسراف کی راہ اختیار کرنا ناجائز ہے یعنی جانوروں کو اصل ضرورت سے زائد کاٹ کر گوشت کو گڑھوں میں دباتے جانا نہایت نامناسب فعل ہے۔ اس پر کسی ثواب کی امید نہ رکھنی چاہیئے۔"

(دیکھو رسالہ البیان ماہ نومبر ۱۹۴۵ء صفحہ ۶ تا ۱۲)

ان ہر دو اقتباسات کا مفہوم بھی ظاہر ہے کہ زکوٰۃ کا نصاب اور اس کی شرح جو اسلام اور مسلمانوں میں رائج ہے وہ خلافِ قرآن ہے۔ اور قربانی کا گوشت صرف اُسی قدر ضروری ہے جو حاجیوں کی خوراک کے لئے کافی ہو سکے۔ اِس ضرورت سے زیادہ جانور ذبح کرنا سراسر اسراف میں داخل ہے اور اس پر ثواب کی امید رکھنا لاحاصل ہے۔

چونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت اس گئے گذرے زمانے میں بھی مسلمانوں کی رگ رگ میں سرایت کئے ہوئے ہے اور دوسرے ارکانِ اسلام مثلاً نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ کے متعلق کمزور سے کمزور مسلمان بھی ان برخود غلط لوگوں کے نظریہ سے متفق نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ یہی وہ اصولی ارکان ہیں جن پر اسلام کا شاندار محل کھڑا ہے۔ اور اگر ان لوگوں کے نظریہ سے اتفاق کر کے اعتقادی اور عملی رنگ میں مسلمان ان ارکان سے ہی دست بردار ہو جائیں تو وہ گویا اپنے ہاتھ سے اسلام کے فلک بوس محل کو خاک میں ملانے والے ہونگے۔ جسے مسلمان اگر مر بھی جائیں تو ہرگز گوارا نہ کریں گے۔ اس لئے ہمیں کامل یقین ہے کہ اپنے دین و ایمان کی سلامتی چاہنے والے لوگ ان "ڈاکوؤں" کے جھانسے میں ہرگز نہ آئینگے البتہ حدیث کے متعلق چونکہ بعض اچھے اچھے پڑھے لکھے آدمیوں کے دلوں میں بھی شکوک و شبہات پیدا ہو جاتے ہیں اس لئے ہم باقی ارکان کو چھوڑ کر صرف حدیث کے متعلق حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کے پاکیزہ کلمات ناظرین کے سامنے پیش کرتے ہیں، تا انہیں معلوم ہو کہ جس چیز کو یہ لوگ "روایات کا چور دروازہ" کہکر مسلمانوں کو یہ مشورہ دے رہے ہیں کہ:۔

"مسلمان اُس وقت تک اِس دام میں گرفتار ہوتے رہیں گے۔ جب تک یہ چور دروازے کھلے رہیں گے۔ دانشمندی کا تقاضا یہی ہے کہ

انہیں اب بھی پلٹ دیا جاوے۔ ورنہ اِس اُمت پر کئی اور ڈاکو انہی دروازوں سے حملہ آور ہوں گے۔ اس کی صفوں میں ایسا انتشار پیدا ہوگا جس کے مُہلک اثرات میں مبالغہ نہیں کیا جا سکتا"

(رسالہ البیان زیرِ نظر ص۳)

اگر مسلمان ان کے اِس مشورہ پر عملدرآمد کر کے اِس "چور دروازہ" کو پاٹ دیں تو دینی طور پر انہیں کس قدر نقصانِ عظیم کا متحمل ہونا پڑے گا۔

حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام اپنی کتاب "شہادۃ القرآن" میں ایک شخص کے سوال کے جواب میں جو اُمتِ مُسلمہ کے اِن مایۂ ناز فرزندوں کی طرح "احادیث کے بیان کو پایۂ اعتبار سے ساقط سمجھتے ہیں اور کہتے ہیں کہ احادیث زمانۂ دراز کے بعد جمع کی گئی ہیں اور اکثر مجموعۂ احاد ہے مفید یقین نہیں ہیں؛ اس لئے وہ مسیح موعود کی خبر کو جو احادیث کے رُو سے ثابت ہے حقیقت مثبتہ خیال نہیں کرتے، اور ایسے اخبار کو جو محض حدیث کی رُو سے بیان کئے جائیں ہیچ اور لغو خیال کرتے ہیں" فرماتے ہیں :-

"صاحب معترض نے کسی سے سُن لیا ہے کہ احادیث اکثر احاد کے مرتبہ پر ہیں۔ اور اس سے بلا توقف یہ نتیجہ پیدا کیا کہ بجز قرآن کریم کے اور جس قدر مسلّماتِ اسلام ہیں وہ سب کے سب بے بُنیاد و مشکوک ہیں جن کو یقین اور قطعیت میں سے کچھ حصہ نہیں۔ لیکن درحقیقت یہ ایک بڑا بھاری دھوکہ ہے جس کا پہلا اثر دین اور ایمان کا تباہ ہونا ہے۔ کیونکہ اگر یہی بات سچ ہو کہ اہلِ اسلام کے پاس بجز قرآن کریم کے جس قدر اور منقولات ہیں وہ تمام ذخیرہ کذب اور جھوٹ اور افتراء اور ظنون اور اوہام کا ہے۔ تو پھر شاید اسلام میں سے کچھ تھوڑا ہی حصہ باقی رہ جائے گا۔ وجہ یہ کہ ہمیں اپنے دین کی تمام تفصیلات احادیث نبویہ کے ذریعے کی ہیں۔ مثلاً یہ نماز جو پنج وقت ہم پڑھتے ہیں گو قرآن مجید سے اس کی فرضیت ثابت ہوتی ہے۔ مگر یہ کہاں ثابت ہوتا ہے کہ صبح کی دو رکعت فرض اور دو رکعت سُنّت ہیں۔ اور پھر ظہر کی چار رکعت فرض اور چار اور دو سُنّت اور مغرب کی تین رکعت فرض اور پھر عشاء کی چار۔ ایسا ہی زکوٰۃ کی تفاصیل معلوم کرنے کے لئے ہم بالکل احادیث کے محتاج

ہیں۔ اسی طرح ہزاروں جزئیات ہیں جو عبادات اور معاملات اور عقود وغیرہ کے متعلق ہیں اور ایسی مشہور ہیں کہ اُن کا لکھنا صرف وقت ضائع کرنا اور بات کو طول دینا ہے۔ علاوہ اس کے اسلامی تاریخ کا مبدا اور منبع یہی احادیث ہی ہیں۔ اگر احادیث کے بیان پر بھروسہ نہ کیا جائے تو پھر ہمیں اس بات کو بھی یقینی طور پر نہیں ماننا چاہیئے کہ درحقیقت حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ اور حضرت عثمانؓ اور حضرت علیؓ رضی اللہ عنہم آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب تھے جنکو بعد وفات آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم اسی ترتیب سے خلافت ملی اور اسی ترتیب سے ان کی موت بھی ہوئی۔ کیونکہ اگر احادیث کے بیان پر اعتبار نہ کیا جائے تو کوئی وجہ نہیں کہ ان بزرگوں کے وجود کو یقینی کہہ سکیں۔ اور اس صورت میں ممکن ہوگا کہ تمام نام فرضی ہی ہوں اور دراصل نہ کوئی ابوبکر گذرا ہو۔ نہ عمر نہ عثمان نہ علی۔ کیونکہ بقول میاں عطاء محمدؐ معترض (اور نیز بقول محمدؐ اقبال صاحب ملتانی مرتب رسالہ زیرِ نظر جو اپنی شامت اعمال کی وجہ سے احادیث کا نام "روایات کا چور دروازہ" رکھتے ہیں) یہ سب احادیث احاد ہیں اور قرآن میں ان ناموں کا کوئی ذکر نہیں۔ پھر بموجب اس اصول کے کیونکر تسلیم کی جائیں۔ ایسا ہی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے والد کا نام عبداللہ اور والدہ کا نام آمنہ اور دادا کا نام عبدالمطلب ہونا اور پھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بیویوں میں سے ایک کا نام خدیجہؓ اور ایک کا نام عائشہؓ اور ایک کا نام حفصہ رضی اللہ عنہن ہونا اور دایہ کا نام حلیمہ ہونا اور غار حرا میں جا کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا عبادت کرنا اور بعض صحابہؓ کا حبشہ کی طرف ہجرت کرنا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا بعد بعثت دس سال تک مکہ میں رہنا اور پھر وہ تمام لڑائیاں ہونا جن کا قرآن کریم میں نام ونشان نہیں اور صرف احادیث سے یہ تمام امور ثابت ہوتے ہیں۔ تو کیا ان تمام واقعات سے اس بناء پر انکار کر دیا جائے کہ احادیث کچھ چیز نہیں۔ اگر یہ سچ ہے تو پھر مسلمانوں کے لئے ممکن نہ ہوگا کہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے پاک سوانح میں سے کچھ بھی بیان کر سکیں۔ دیکھنا چاہیئے کہ ہمارے مولا و آقا کی سوانح کا وہ سلسلہ کیونکر قبل از بعثت مکہ میں زندگی

بسر کی۔ اور پھر کس سال دعوتِ نبوت کی۔ اور کس ترتیب سے لوگ داخلِ اسلام ہوئے۔ اور کفار نے مکہ کے دس سال میں کس کس قسم کی تکلیفیں دیں۔ اور پھر کیونکر اور کس وجہ سے لڑائیاں شروع ہوئیں۔ اور پھر کس قدر لڑائیوں میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بنفسِ نفیس حاضر ہوئے۔ اور آنجناب کے زمانۂ زندگی تک کن کن ممالک تک حکومتِ اسلام پھیل چکی تھی۔ اور شاہانِ وقت کی طرف آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے دعوتِ اسلام کے خط لکھے تھے یا نہیں اور اگر لکھے تھے تو اُن کا کیا نتیجہ ہؤا تھا اور پھر آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد حضرت ابوبکر صدیقؓ کے وقت کیا کیا فتوحاتِ اسلام ہوئیں۔ اور کیا کیا مشکلات پیش آئیں۔ اور حضرت فاروقؓ کے زمانہ میں کن کن ممالک تک فتوحاتِ اسلام ہوئیں۔ یہ تمام امور صرف احادیث اور اقوالِ صحابہؓ کے ذریعہ سے معلوم ہوتے ہیں۔ پھر اگر احادیث کچھ بھی چیز نہیں۔ تو پھر اس زمانہ کے حالات دریافت کرنا نہ صرف ایک امرِ مشکل بلکہ محالات میں سے ہوگا۔ اور اس صورت میں واقعات آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ رضی اللہ عنہم کی نسبت مخالفین کو ہر ایک افتراء کی گنجائش ہوگی۔ اور ہم دشمنوں کو بے جا حملہ کرنے کا بہت سا موقعہ دیں گے (اسلامی صاحب اور ان کے ہم خیال لوگوں کی بلا سے۔ ناقل) اور ہمیں ماننا پڑے گا کہ جو کچھ ان احادیث کے ذریعہ سے واقعات اور سوانح دریافت ہوتے ہیں وہ سب ہیچ اور کالعدم ہیں۔ یہاں تک کہ صحابہؓ کے نام بھی یقینی طور پر ثابت نہیں۔ غرض ایسا خیال کرنا کہ احادیث کے ذریعہ سے کوئی یقینی اور قطعی صداقت ہمیں مل ہی نہیں سکتی۔ گویا اسلام کا بہت سا حصہ اپنے ہاتھ سے نابود کرنا ہے۔ (جو احادیث کا نام چور دروازہ رکھنے والوں کا محبوب مشغلہ ہے۔ ناقل) بلکہ اصل اور صحیح امر یہ ہے کہ جو کچھ احادیث کے ذریعہ سے بیان ہؤا ہے۔ جب تک صحیح اور صاف لفظوں میں قرآن اس کا معارض نہ ہو تب تک اس کو قبول کرنا لازم ہے۔ کیونکہ یہ بات مسلم ہے کہ طبعی امر انسان کے لئے راست گوئی ہے۔ اور انسان جھوٹ کو محض کسی مجبوری کی وجہ سے

اختیار کرتا ہے۔ کیونکہ وہ اس کے لئے ایک غیر طبعی ہے۔ پھر ایسی احادیث جو قابل اعتقادی یا عملی میں اگر اسلام کے مختلف گروہوں کا ایک شعار ٹھہر گئی تھیں ان کی قطعیت اور تواتر کی نسبت کلام کرنا تو درحقیقت جنون اور دیوانگی کا ایک شعبہ ہے۔ مثلاً آج اگر کوئی شخص یہ بحث کرے کہ یہ پنج نمازیں جو مسلمان پنج وقت ادا کرتے ہیں ان کی رکعات کی تعداد ایک شکی امر ہے۔ کیونکہ مثلاً قرآن کریم کی کسی آیت میں یہ مذکور نہیں کہ تم صبح کی دو رکعت پڑھا کرو اور پھر جمعہ کی دو۔ اور عیدین کی بھی دو دو۔ رہی احادیث تو وہ اکثر احاد ہیں جو مفید یقین نہیں۔ تو کیا ایسی بحث کرنے والا حق پر ہوگا۔ اگر احادیث کی نسبت ایسی ہی رائیں قبول کی جائیں تو سب سے پہلے نماز ہی ہاتھ سے جاتی ہے۔ کیونکہ قرآن نے تو نماز پڑھنے کا کوئی نقشہ کھینچکر نہیں دکھلایا۔ صرف یہ نمازیں احادیث کی صحت کے بھروسہ پر پڑھی جاتی ہیں۔ اب اگر مخالف یہی اعتراض کرے کہ قرآن نے نماز کا طریق نہیں سکھلایا اور جس طریق کو مسلمانوں نے اختیار کر رکھا ہے وہ مردود ہے کیونکہ احادیث قابل اعتبار نہیں۔ تو ہم ایسے اصول پر آپ ہی پابند ہونے سے کہ بے شک احادیث کچھ بھی چیز نہیں اس اعتراض کا کیا جواب دے سکتے ہیں۔ بجز اس کے کہ اعتراض کو قبول کرلیں (جیسا کہ اُمّتِ مسلمہ کے رسالہ البیان نے قبول کرلیا ہے۔ ناقل) بلکہ اس صورت میں اسلام کی نماز جنازہ بھی بالکل بیہودہ ہوگی کیونکہ قرآن میں اس بات کا کہیں ذکر نہیں کہ کوئی ایسی نماز بھی ہے کہ جس میں سجدہ اور رکوع نہیں۔ اب سوچ کر دیکھ لو کہ احادیث کے چھوڑنے سے اسلام کا کیا باقی رہ جاتا ہے؟

اور خود یہ بات قلتِ تدبر کا نتیجہ ہے کہ ایسا خیال کرلیا جائے کہ احادیث کا حاصل صرف اس قدر ہے کہ محض ایک یا دو آدمی کے بیان کو معتبر سمجھ کے اسکی روایت کو قول رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم خیال کرلیا جائے۔ بلکہ اصل حقیقت یہ ہے کہ احادیث کا سلسلہ تعامل کے سلسلہ کی ایک فرع اور اطراد بعد الوقوع کے طور پر ہے۔ مثلاً محدثین نے دیکھا کہ کروڑہا آدمی مغرب کے فرض کی تین رکعت پڑھتے ہیں اور فجر کی دو۔ اور معہ ذالک ہر ایک رکعت میں سورۂ فاتحہ ضرور پڑھتے

اور آمین بھی کہتے ہیں۔ گو بالجہر یا بالسر۔ اور قعدہ اخیرہ میں التحیات پڑھتے ہیں اور بعد اس کے درود اور کئی اور دعائیں ملاتے ہیں۔ اور دونوں طرف سلام دیکر نماز سے باہر ہوتے ہیں۔ سو اس طرف عبادت کو دیکھ کر محدثین کو یہ ذوق اور شوق پیدا ہوا کہ تحقیق کے طور پر اس وضع نماز کا سلسلہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچادیں۔ اور احادیث صحیحہ مرفوعہ متصلہ سے اس کو ثابت کریں۔ اب اگرچہ یہ بات سچ ہے کہ انہوں نے ایسے سلسلہ کی بہم رسانی کے لئے یہ کوشش نہیں کی کہ ایک ایک حدیث کے مضمون کے لئے ہزار ہزار یا دو دو ہزار طرق اسناد بہم پہنچادیں۔ مگر کیا یہ بھی سچ ہے کہ اس نماز کی بنیاد ڈالنے والے وہی محدث تھے۔ اور پہلے اس سے دنیا میں نماز نہیں ہوتی تھی۔ اور دنیا نماز سے بالکل بے خبر تھی اور کئی صدیوں کے بعد ... دو حدیثوں پر اعتبار کرنے سے نماز شروع کی گئی۔ پس میں زور سے کہتا ہوں کہ یہ ایک بڑا دھوکہ ہوگا۔ اگر یہ خیال کر لیا جائے گا کہ صرف مدار ثبوت ان رکعات اور نماز خوانی کا ان چند حدیثوں پر تھا جو بنظر ظاہر احاد سے زیادہ معلوم نہیں ہوتیں۔ اگر یہی سچ ہے تو سب سے پہلے فرائض اسلام کے لئے ایک سخت اور لاعلاج غم درپیش ہے۔ جس کی فکر ایک مسلمان کہلانے والے ذی غیرت کو سب سے مقدم ہے۔ مگر یاد رہے کہ ایسا خیال فقط اُن لوگوں کا ہے جنہوں نے کبھی بیدار ہوکر سوانح اور رواجات اور رسوم اور عبادات اسلام کی طرف نظر نہیں کی کہ کیونکر اور کس طریق سے یقینی امور کا ان کو مرتبہ حاصل ہوا۔

سو واضح ہو کہ اس یقین کے بہم پہنچانے کے لئے تعامل قومی کا سلسلہ نہایت تسلی بخش نمونہ ہے۔ مثلاً وہ احادیث جن سے ثابت ہوتا ہے کہ نماز فجر کی اس قدر رکعات اور نماز مغرب کی اس قدر رکعات ہیں۔ اگر فرض کرو کہ ایسی حدیثیں دو یا تین ہیں اور بہرحال احاد سے زیادہ نہیں۔ مگر کیا اس تحقیق اور تفتیش سے پہلے لوگ نماز نہیں پڑھتے تھے۔ اور حدیثوں کی تحقیق اور راویوں کا پتہ ملنے کے بعد پھر نمازیں شروع کرائی گئی تھیں۔ بلکہ کروڑہا انسان اسی طرح نماز پڑھتے تھے۔ اور اگر فرض کے طور پر حدیثوں کے اسنادی سلسلہ کا وجود بھی

نہ ہوتا تاہم اس سلسلۂ تعامل سے قطعی اور یقینی طور پر ثابت تھا کہ نماز کے بارے میں اسلام کی مسلسل تعلیم وقتاً بعد وقتٍ اور قرناً بعد قرنٍ یہی چلی آتی ہے۔ ہاں احادیث کی اسنادِ مرفوعہ متصلہ نے اس سلسلہ کو نورٌ علیٰ نور کر دیا۔ پس اگر اس قاعدہ سے احادیث کو دیکھا جائے تو ان کے اکثر حصّہ کو جس کا معین اور مددگار سلسلۂ تعامل ہے احاد کے نام سے یاد کرنا بڑی غلطی ہوگی۔ اور درحقیقت یہی ایک بھاری غلطی ہے جس نے اس زمانہ کے نیچریوں کو صداقتِ اسلام سے بہت ہی دور ڈال دیا۔ وہ خیال کرتے ہیں کہ گویا اسلام کی وہ تمام سُنن اور رسوم اور عبادات اور سوانح اور تواریخ جن پر حدیثوں کا حوالہ دیا جاتا ہے وہ صرف چند حدیثوں کی بناء پر ہی قائم ہیں۔ حالانکہ یہ ان کی فاش غلطی ہے۔ بلکہ جس تعامل کے سلسلہ کو ہمارے نبی صلعم نے اپنے ہاتھ سے قائم کیا تھا وہ ایسا کروڑہا انسانوں میں پھیل گیا تھا کہ اگر محدثین کا دُنیا میں نام و نشان بھی نہ ہوتا تب بھی اس کو کچھ نقصان نہ تھا۔" (شہادۃ القرآن صفحہ ۳-۴)

اب ایک طرف تو ناظرین خود اُمتِ مُسلمہ کے اِس اقرارِ جُرم کو رکھیں جو وہ خود کر چکے ہیں اور دوسری طرف اسلام اور مُسلمانوں کے متعلق ان کا یہ فتویٰ ملاحظہ فرمائیں:۔

"یہ حقائق ہیں اور یہ واقعات۔ ان کی موجودگی میں یہ دعویٰ کس قدر مضحکہ خیز معلوم ہوگا کہ مُسلمانوں کی تہذیب صرف ٹونٹی والا لوٹا ہے۔ نہیں بلکہ مسلمانوں کی تہذیب ہے دُشنام طرازی۔ اُن کی تہذیب ہے نفاق پروری۔ ان کی تہذیب ہے شرانگیزی۔ ان کی تہذیب ہے سفلہ خوئی۔ ان کی تہذیب ہے ایک دوسرے کی عزت، شہرت اور وقار کا خون کرنا۔ عبادت گاہوں کو الیکشن پروپیگنڈے کے اکھاڑے بنا کر ان میں دھینگا مُشتی کرنا آپس میں لڑنا مرنا اور غیروں کی تفریح و مسرت کا سامان مہیا کرنا۔ ان کے لیڈر ایک دوسرے کے خون کے پیاسے۔ ان کے عوام بیلچوں، کلہاڑیوں اور لاٹھیوں سمیت ایکدوسرے کے دشمن اور ان کے اخبار بہتان و تہمت اور سب و شتم کے پلندے۔ سعدی نے مستعصم باللہ اور عباسیہ کے زوال پر ایک دردناک مرثیہ لکھا تھا۔ آج اگر وہ زندہ ہو جائے تو یہ محسوس کئے بغیر نہ رہے کہ اس کا وہ مرثیہ بہت بہت قبل از وقت

تھا۔ اسلام اور مسلمانوں کی اصل بربادی تو اب مکمل ہوئی ہے۔
اور اس کی نوحہ گری کی بالخصوص شعر ذیل کی صحیح مناسبت تو اب پیدا ہوئی ہے

اے محمدؐ گر قیامت را برآری سر زخاک
سر برآر و ایں قیامت درمیانِ خلق بیں!"

(رسالہ البیان ماہ نومبر ۱۹۴۶ء صفحہ ۶)

اور پھر خدا کا خوف کر کے بتلائیں کہ جب قرآن کریم کی موجودگی میں اسلام اور مسلمان صرف مر گئے ہیں، بلکہ تباہ و برباد ہو گئے ہیں۔ اور اہلِ قرآن، اہلِ قرآن کی رٹ لگانے والے قرآن کریم کی موجودگی میں کافر ہو کر رہ گئے ہیں، اور قرآن کریم اور سُنّتِ انبیاء کو ترک کر کے ان کے فیوض و برکات سے کلیۃً محروم ہو گئے ہیں۔ نہ صرف یہی بلکہ "اپنی قدامت پسندی اور ظلمت پرستی کی وجہ سے ہر روحانی، اخلاقی، معاشرتی اور تمدنی اصلاح کی مخالفت پر تُل" (البیان جون ۱۹۴۵ء صفحہ ۵) جائیں" اور اس مخالفت میں کفر و نفاق کی قسم کے تمام آلات استعمال" کریں" تو کیا اللہ تعالیٰ کا حق نہیں ہے کہ اپنی مخلوق کو ان کے شر سے محفوظ رکھنے کے لئے کسی نبی کو مبعوث فرمائے اور اپنے وعدہ "اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحَافِظُوْنَ" کو یاد کر کے قرآن کریم اور اس کی پاک تعلیموں کی عملی رنگ میں حفاظت فرمائے۔ اور "اِعْلَمُوْا اَنَّ اللّٰهَ يُحْيِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا" کے ازلی ابدی قانون کے مطابق جس طرح سال بسال مُردہ زمین کو آسمانی پانی سے زندہ کرتا ہے اُسی طرح رُوحانی علوم کی بارانِ رحمت سے مُردہ قوموں اور مُردہ دلوں کی زمین کو از سرِ نو زندہ فرمائے اگر ہے اور یقیناً ہے تو پھر ضرورتِ نبوّت ثابت ہے۔

اِن لوگوں کی حالت نہایت ہی قابلِ رحم ہے۔ کیونکہ نہ صرف خود اپنی روحانی موت کے اقراری ہیں، بلکہ طُرّہ اس پر یہ ہے کہ باوجودیکہ یہ لوگ احادیثِ نبویہ کو چور دروازہ کے نام سے پکارتے ہیں اور نہایت خیر خواہی کے رنگ میں مسلمانوں کو جلد سے جلد اس "چور دروازہ" کو پاٹنے کا مشورہ دے رہے ہیں، ختم نبوت کے میدان میں ان کی دلائل سے عاجزی کا یہ عالم ہے کہ اس "چور دروازہ" سے گذرنے کے سوا کوئی چارہ نہیں پاتے۔ گویا اس میدان میں دلائل کے لحاظ سے آپ پر دوہری موت وارد ہو چکی ہے۔ اور پھر اس پر مزید موت یہ ہے کہ عقائد اور اعمال میں جن لوگوں سے آپ کو صدہا اختلافات ہیں

احمدیت کے مقابلہ کے لئے انہیں کے آگے جواب کے لئے ناک رگڑنے پر مجبور ہیں مگر جو لوگ خود مُردہ ہیں اور آپ کی طرح اپنی موت کے اقراری مجرم ہیں۔ وہ آپ کی اس میدان میں کیا امداد کر سکتے ہیں۔ سُنیئے علامہ رشید رضا مصری جن کے لایعنی مقالہ کو آپ محققانہ مضمون قرار دیتے ہیں وہ خود اپنے اور اپنے ہندی اور مصری مسلمان بھائیوں کے متعلق کس حقیقت کا انکشاف کر رہے ہیں۔ علمائے دیوبند نے سید رشید رضا کو سپاسنامہ پیش کرتے ہوئے کہا:۔

"اے سید مکرم! سب سے بڑی مصیبت جو اسلام پر پڑی ہے اور سب سے بڑا حادثہ جس نے مسلمانوں کا ناس کر دیا ہے، فریبی اور دنیادار علماء کی خرابیاں ہیں جو علمائے اسلام کے لئے بمنزلہ دل کے ہیں۔ جب دل نکما اور خراب ہوگیا تو جسم کیونکر سالم رہ سکتا ہے۔ ہم علم کو ارشاد و ہدایت خلق کا وسیلہ نہیں بناتے بلکہ دولت و دنیا کے حصول کا ذریعہ گردانتے ہیں۔ علماء دین پر اگر استقامت کریں تو وہ دین کے ستون اور رہدایت کے ستارے ہیں، اور اگر گمراہی اختیار کریں تو شیطان کے جال اور گمراہی کے نشان ہیں۔"

اس کے جواب میں سید رشید رضا صاحب نے تقریر کرتے ہوئے فرمایا:۔

"خداوند تعالےٰ نے اہل ایمان کے جو اوصاف بیان فرمائے ہیں وہ ہم پر غیر منطبق ہیں۔ مثلاً ولن یجعل اللّٰہ للکٰفرین علی المؤمنین سبیلاً۔ وللّٰہ العزۃ ولرسولہ وللمؤمنین اور وعد اللّٰہ الذین اٰمنوا منکم وعملوا الصّٰلحٰت .... الخ۔ اب غور کرنا چاہیئے کہ جو صفات مومنین کے بیان فرمائے گئے ہیں، کیا ہم ان صفات کے ساتھ متصف ہیں۔ مصر میں بھی مسلمانوں کی وہی حالت ہے جو آپ ہندوستان میں دیکھ رہے ہیں۔"

(رسالہ القاسم جمادی الاوّل ۱۳۳۰ھ)

اس کے بعد مولوی ابوالکلام صاحب آزاد ہیں۔ ۱۹۱۲ء میں آپ کے خیالات کیا تھے سُنیئے:۔

۱۔ "ہم تو خود مسلمانوں کی سب سے بڑی غلطی سمجھتے ہیں کہ ہمیشہ انہوں نے اپنے سامنے دو ہی راستے دیکھے۔ یا گورنمنٹ پر اعتماد اور یا ہندوؤں اور کانگریس کی شرکت۔" (الہلال ۱۲/۱۲ ۲۹)

۲۔ "اور ہمارا عقیدہ ہے کہ جو مسلمان اپنے کسی عمل و اعتقاد کے لئے اس کتاب (قرآن کریم۔ ناقل) کے سوا کسی دوسری جماعت یا تعلیم کو اپنا رہنما بنائے وہ مسلم نہیں۔ بلکہ شرک فی صفات اللہ کی طرح شرک فی صفات القرآن کا مجرم اور اس لئے مشرک ہے۔ اسلام اس سے بہت ارفع و اعلیٰ ہے کہ اس کے پیروؤں کو اپنی پولیٹکل پالیسی قائم کرنے کے لئے ہندوؤں کی پیروی کرنی پڑے۔ مسلمانوں کے لئے اس سے بڑھکر کوئی شرم انگیز سوال نہیں ہو سکتا کہ دوسروں کی پولیٹکل تعلیموں کے آگے جھک کر نیا راستہ پیدا کریں۔" (مضامین آزاد حصہ دوم ۱۹۱۲ء)

۳۔ "آپ فرماتے ہیں کہ پولیٹکل مباحث کو مذہبی رنگ سے الگ کیجئے لیکن اگر ہم الگ کر دیں تو ہمارے پاس باقی کیا رہ جاتا ہے۔ ہم نے تو اپنے پولیٹکل خیالات بھی مذہب ہی سے سیکھے ہیں۔ ہم انہیں مذہب سے کیونکر الگ کر دیں۔ ہمارے عقیدہ میں تو ہر وہ خیال جو قرآن کے سوا اور کسی تعلیم گاہ سے حاصل کیا گیا ہے۔ ایک کفر صریح ہے اور پالیٹکس بھی اسمیں شامل ہے۔"

مولوی ابوالکلام صاحب آزاد کی آج جو حالت ہے وہ کسی سے پوشیدہ نہیں ہے! اور اگر آپ سے پوشیدہ ہے جنہوں نے ان کے خطوط کے ایک دو فقرے البیان کے سرورق پر جلی قلم سے شائع کئے ہیں، تو نومبر ۱۹۴۵ء کا اپنا ہی رسالہ البیان اٹھا کر اس کے صہ۴ پر مندرجہ ذیل سطور پڑھ لیجئے:۔

(۱) کشمیر میں مولانا ابوالکلام آزاد کا دریائی جلوس نکلا تو مسلمانوں نے اس پر پتھروں اور جوتوں کی بارش کی۔ اور ایسے ایسے ناشائستہ مظاہرے کئے جن کی تفصیل پیش کرنے سے قلم عاجز ہے۔"

(۲) "تجھے آتا ہے سر گاندھی کے چرنوں میں جھکا دینا + محمدؐ کی مگر صف میں کھڑا ہونا نہیں آتا
امام ہند بھی ہے عالم قرآن بھی ہے بیشک + مگر ناموس قرآں پر فدا ہونا نہیں آتا

مسلماں کو مسلماں سے لڑانا جانتا ہے تو ٭ مگر حبل المتیں سے آشنا ہونا نہیں آتا
اے ننگ دیں تیرے اعمال میں بخیر خسارا ہے
مسلمانوں کو اب تیری قیادت ناگوارا ہے" صلہ

یہی مولوی صاحب جو آج نہایت بے باکی سے کسی نئے ظہور کو قرآن کے منافی بتلاتے ہیں۔ تذکرہ میں لکھ چکے ہیں:۔

"یہی وہ مقام ہے جو ایک دوسری تقسیم میں مرتبۂ صالحین سے مرتفع ہو کر مرتبۂ شہدا یعنی شاہدین حق تک پہنچتا اور پھر صدیقیت تک پہنچکر انسانیت کبریٰ کے نقطۂ علو و ارتفاع و مرکز دائرۂ نوع و مبداء کمال و ارتقاء بشری یعنی مقامِ نبوت سے ملحق ہو جاتا ہے کہ کائناتِ ارضی اور نوعِ انسانی میں جماعت من انعم اللہ علیھم ان چار قسموں سے باہر نہیں۔ من النبیین والصدیقین والشھداء والصالحین وحسن اولٰئک رفیقاً۔"

تذکرہ صلہ حاشیہ پر لکھا ہے:۔

"اصناف اربعہ من انعم اللہ علیھم کے فیضان و برکات کا سلسلہ از اول نشاء انسانی الیٰ یوم القیامہ قائم و جاری ہے۔"

آج سے چوبیس سال پہلے اپنی تمام تعلیمات کا مرکز قرآن کو بتلانا اور اس کے سوا کسی اور جماعت (ہندوؤں سے) سے اپنے پولیٹکل یا مذہبی خیالات میں راہنمائی حاصل کرنے کا نام کفر صریح اور شرک رکھنا اور آج اسی کانگرس کی انگلیوں پر ناچنا اور اسی کفر صریح اور شرک کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنا لینا مولوی ابوالکلام آزاد ایسے علماء ہی کا کام ہے۔ سچ فرمایا نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے علماءُھم شرّ من تحت ادیم السماء من عندھم تخرج الفتنۃ وفیھم تعود۔ یعنی ان کے علماء بدترین خلائق ہوں گے۔ انہیں سے فتنے نکلیں گے اور انہیں کی طرف لوٹ جائیں گے۔

اس کے بعد آپ کی نگاہِ انتخاب ڈاکٹر اقبال پر پڑی ہے۔ صاحب موصوف اگرچہ بعد وفات بیک جنبشِ قلم دورِ حاضر کے "واحد مصلح اور مجدد"، "رجائیت کے پیغمبر" اور "یقین و عمل کے آخری پیغمبر" تک بنا دیئے گئے ہیں مگر ساری عمر مسلمانوں کی نامسلمانی کا رونا روتے رہے۔ چنانچہ لکھتے ہیں ؎

شور ہے ہوگئے دُنیا سے مسلماں نابود ◆ ہم یہ کہتے ہیں کہ تھے بھی کہیں مسلم موجود
وضع میں تم ہو نصاریٰ تو تمدن میں ہنود ◆ یہ مسلماں ہیں جنہیں دیکھ کے شرمائیں یہود

یوں تو سیّد بھی ہو۔ مرزا بھی ہو افغان بھی ہو
تم سبھی کچھ ہو۔ بتاؤ تو مسلمان بھی ہو

خود اپنے متعلق کہتے ہیں ؎

مسجد تو بنا دی شب بھر میں ایماں کی حرارت والوں نے
من اپنا پُرانا پاپی ہے برسوں میں نمازی بن نہ سکا

جن لوگوں کے لیڈر اِس قسم کے ہوں، ان کی بدقسمتی اور زبوں حالی پر جس قدر بھی نوحہ کیا جائے کم ہے۔ سچ ہے "جیسی رُوح ویسے فرشتے"

اب ہم چیدہ چیدہ اعتراضات کا برعایت اختصار جواب دیتے ہیں۔

(۱) مدیر البیان نے افتتاحیہ میں کسی فرضی احمدی کی فرضی شکست کی کہانی لکھی ہے۔ غالباً یہ تصویر یا تو خود سلمانی صاحب کی اپنی ہے یا عرشی صاحب کی۔ جنہوں نے باوجود حق کو حق تسلیم کر لینے کا وعدہ کرنے کے متواتر چار ماہ سے مُنہ میں گھنگنیاں ڈالی ہوئی ہیں۔ اور ایسے دم بخود ہوئے ہیں کہ گویا ؎ لب از گفتن چناں بستم کہ گوئی۔ دہن بر چہرہ زخمے بود بہ شد کا مصداق ہوگئے ہیں۔ ورنہ احمدی اور مخالف سے ڈر جائے یہ ناممکن ہے ؏

مخالف سے جو ڈر جائے وہ کوئی دوسرا ہوگا

(۲) کسی نبی نے اپنے ماننے والوں کو اپنی طرف منسوب نہیں کیا۔

ج ۱؎۔ قرآن کریم کی رُو سے سب سے پہلے نبی حضرت آدم علیہ السلام تھے۔ آج دُنیا میں جس قدر انسان بستے ہیں وہ ان کی طرف منسوب ہو کر آدمی کہلاتے ہیں اگر اُمتِ مسلمہ کے افراد خود کو آدمی نہیں کہلاتے تو بتلائیں کہ وہ کس کی طرف منسوب ہیں؟

۲؎ قرآن کریم میں لکھا ہے کہ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ لوگوں کو ان کے امام کے نام سے پکاریگا۔ فرمایا یوم ندعوا کل اناس بامامھم۔ پس ثابت ہوا۔ کہ اللہ تعالیٰ نوحؑ کے ماننے والوں کو نوحی اور ابراہیمؑ کے پیروؤں کو ابراہیمی کہہ کے پکاریگا۔ اگر نام رکھنا منع ہے تو قرآن کریم سے ایسی ہی نص پیش کریں۔

۳؎۔ اگر نام رکھنا منع ہے تو اقبال احمد سلمانی، محمد حسین عرشی، غلام جیلانی برق کس

حکم قرآنی کی تعمیل میں رکھے گئے ہیں۔ آپ لوگوں کے ہاں اولاد ہوتی ہے تو اس کا کچھ نام رکھتے ہیں یا نہیں۔ اگر نہیں تو ان کی شناخت اور پکار کا کیا ذریعہ ہے؟

عٹ۔ یہ بھی یاد رہے کہ آپ نے جو مسلمہ نام تجویز کیا ہے یہ تو صفاتی نام ہے، ذاتی نہیں۔ اور چونکہ صفاتی نام ذاتی نام سے زیادہ عام ہوتا ہے، اسمیں خصوصیت پیش نہیں ہوتی اس لئے معرفہ یا علم کا قائم مقام نہیں ہو سکتا۔ اور یہ عمومیت بے شمار اخلاقی خرابیوں کا منبع اور مصدر ہو سکتی ہے۔ فی الحال ہم اسی اجمال پر اکتفا کرتے ہیں۔ اگر آپ نے اس پر اعتراض کیا تو پھر تفصیل بھی انشاء اللہ عرض کی جاویگی۔

عٹ۔ چونکہ آپ لوگوں کو کسی نبی سے کوئی تعلق نہیں۔ اس لئے آپ ان کی طرف منسوب ہونا معیوب خیال کرتے ہیں، ورنہ معمولی عقل و خرد رکھنے والا انسان بھی ادنے تأمل سے معلوم کر سکتا ہے کہ وہی باتوں میں خیر و برکت ہے، یا آدمی کسی کو اپنا لے اور یا کسی کا ہو کر رہے اور جس میں یہ دونوں باتیں نہیں، وہ خلیع الرسن اور رندوں کا شکار ہے۔

عٹ۔ اگر انبیاء کا اپنے متبعین کو اپنی طرف منسوب کرنا منع ہے تو اس پر قرآن کریم کی کوئی نص صریح پیش کریں۔ کیا افراد کے لئے اللہ تعالےٰ کی مخلوق کو اپنی طرف منسوب کرنا جائز ہے؟

(۲۳) مرزا صاحبؑ کی نبوت اکتسابی نبوت ہے۔

ج۔ یہ اعتراض قلتِ تدبّر کا نتیجہ ہے۔ نبوت اللہ تعالیٰ کا بہت بڑا انعام ہے۔ اور ہر انعام وہبی ہی ہوتا ہے۔ اگرچہ وہ وہب اسی جگہ ظاہر ہوتا ہے جہاں کسب ہو۔ اولاد عطیۂ الٰہی ہے اور اس کے لئے میاں بیوی کے باہمی تعلقات ضروری ہیں۔ اور اس کے وہبی ہونے کا قطعی ثبوت یہ ہے کہ کئی جگہ باوجود میاں بیوی کے باہمی تعلقات کے اولاد پیدا نہیں ہوتی۔ اسی طرح نبوت وہبی ہی ہوتی ہے۔ مگر یہ ہرگز نہیں ہو سکتا کہ اللہ تعالےٰ کسی بد اعمال اور فاسق فاجر کو یہ انعام عطا فرما دے۔ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے یہ ہرگز نہیں لکھا کہ مَیں نے کسب سے نبوت حاصل کی ہے بلکہ حضورؑ فرماتے ہیں:۔

"سو مَیں نے محض خدا کے فضل سے نہ اپنے کسی ہُنر سے اِس نعمت سے کامل حصہ پایا ہے۔ جو مجھ سے پہلے نبیوں اور رسولوں اور خدا کے برگزیدوں

کو دی گئی تھی۔ اور میرے لئے اس نعمت کا پانا ممکن نہ تھا اگر میں اپنے سیّد و مولیٰ فخر الانبیاء اور خیر الوریٰ حضرت محمد مصطفےٰ صلے اللہ علیہ وسلم کی راہوں کی پیروی نہ کرتا۔ سو میں نے جو کچھ پایا اس کی پیروی سے پایا۔ اور میں اپنے سچے اور کامل علم سے جانتا ہوں کہ کوئی انسان بجز پیروی اس نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے خدا تک نہیں پہنچ سکتا۔ اور نہ معرفت کاملہ کا حصہ پا سکتا ہے۔"

(حقیقۃ الوحی ص۶۴)

اسی طرح حضور "قادیان کے آریہ اور ہم" میں فرماتے ہیں ؎

وہ پیشوا ہمارا جس سے ہے نور سارا + نام اس کا ہے محمدؐ دلبر مرا یہی ہے

سب پاک ہیں پیمبر اک دوسرے سے بہتر + لیک از خدائے برتر خیر الوریٰ یہی ہے

پہلوں سے خوب تر ہے خوبی میں اک قمر ہے + اس پر ہر اک نظر ہے بدر الدجیٰ یہی ہے

وہ آج شاہِ دیں ہے وہ تاجِ مرسلیں ہے + وہ طیّب و امیں ہے اس کی ثنا یہی ہے

اس نور پر فدا ہوں اس کا ہی میں ہوا ہوں + وہ ہے میں چیز کیا ہوں بس فیصلہ یہی ہے

مگر جو بد قسمت لوگ اس متابعت اور پیروی کو "شخصیت پرستی کا شیطان" سمجھتے ہیں، انہیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تعریف ایک آنکھ نہیں بھاتی اور ہر ہر لفظ ان کے دل پر تیر و سناں کا کام کرتا ہے۔

(۴) اپنے سے پہلے انبیاء کی کھلے لفظوں میں توہین کی ہے عیسیٰ ابن مریم کو گالیاں دی ہیں۔

ج۔ توہینِ انبیاء کا اتہام سراسر افترا اور بہتان ہے۔ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے نہ صرف یہ کہ کسی نبی کی توہین نہیں کی بلکہ اپنے سے پہلے انبیاءؑ کی وہ تعریف و توصیف کی ہے جو تیرہ سو سال کے عرصہ میں انبیاء کرام علیہم السلام کے اس جوہر شناس کے سوا کسی کو نہیں سوجھی۔ ہاں الزام خصم کے طور پر عیسائیوں کو ان کی اس گندہ دہانی کے جواب میں جو انہوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حق میں اپنے خبثِ باطن کی وجہ سے دکھلائی تھوڑی سی تنبیہہ فرمائی ہے "اور وہ بھی ان کے فرضی مسیح کو اور انہیں کے مسلمات کی رُو سے۔ آپ لوگ اگر ایسے ہی غیرت مند ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو عیسائی پادری گندی سے گندی گالیاں بھی دیں تب بھی عیسائیوں کے فرضی یسوع کو کچھ نہیں کہنا چاہیئے تو یہ

عیسائیت کی رنگ آپ کو ہی مبارک رہے۔ آپ سے پہلے بھی آپ کے بھائی بندوں نے (مشرکین مکہ نے) حبشہ میں غریب مسلمانوں کے خلاف نجاشی کے دربار میں توہین مسیح ہی کا حربہ استعمال کرنا چاہا تھا۔ جو خدا کے فضل سے ناکام رہا۔ اسی طرح اب بھی سمجھدار لوگوں کے نزدیک آپ لوگوں کی یہ افترا پردازیاں نکمی اور بیکار ہیں۔

پھر آپ کے بھائی بندوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر بھی یہ الزام لگایا تھا کہ:۔

"قد سفه احلامنا وشتم آبادنا وعاب دیننا وفرق جماعتنا و سب آلهتنا" (سیرت ابن ہشام صفحہ ۱۵)

یعنی یہ ہمارے نوجوانوں کو بے وقوف کہتا ہے۔ ہمارے آباء و اجداد کو گالیاں دیتا ہے ہمارے دین میں عیب نکالتا ہے۔ ہماری جماعت میں تفرقہ ڈالتا ہے اور ہمارے معبودوں کو گالیاں دیتا ہے۔

پس انبیاءؑ کے دشمنوں کا یہ ایک پرانا حربہ ہے جسے وہ ہمیشہ انبیاءؑ کے خلاف استعمال کرتے رہے ہیں۔ یہ بھی آپ کے جھوٹا ہونے کی بین دلیل ہے کہ آپ انبیاءؑ کے دشمنوں کے نقش قدم پر چل رہے ہیں۔ کاش اللہ تعالیٰ آپ کو بصیرت عطا فرمائے اور آپ اپنی عاقبت خراب کرنے سے باز آجائیں۔

(۵) اپنے نہ ماننے والوں کو ذریۃ البغایا کہا ہے۔

ج۔ یہ بھی سراسر دروغ بے فروغ ہے۔ حضرت مسیح موعود علیہ السلام نے یہ لفظ "ہدایت سے دور" کے معنوں میں صرف اُن لوگوں کے حق میں استعمال فرمایا ہے جو اُمت تو رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی کہلاتے ہیں مگر حضورؐ کی فتح کو بھی شکست بتلاتے اور اس طرح عیسائیوں کی ہاں میں ہاں ملا کر عیسائیت کی تقویت کا باعث ہوتے ہیں۔ اور حضورؐ کی روحانی اولاد کے دائرہ سے خود بخود باہر نکل جاتے ہیں۔ شرافت سے مخالفت کرنیوالوں کو حضورؑ نے کبھی ایسے الفاظ کا مخاطب نہیں گردانا۔

(۶) وہ بھلا نبی ہے جسے مراق کا شرف حاصل ہے۔

ج۔ مراق تو ایسی بیماری ہے جو محمود بھی ہوتی ہے اور مذموم بھی۔ اور حضورؑ کی اسّی کے لگ بھگ تصنیفات ہیں جو سب کی سب اس امر پر شاہد ناطق ہیں کہ حضورؑ کا مراق مراق محمود تھا۔ مگر حضورؑ سے پہلے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے متعلق اِنِّی سَقِیْمٌ کے الفاظ

قرآن کریم میں وارد ہیں۔ حضرت ایوب علیہ السلام کے متعلق اِنِّيْ مَسَّنِيَ الشَّيْطٰنُ بِنُصْبٍ وَّعَذَابٍ کے الفاظ مرقوم ہیں۔ حضرت یوسف علیہ السلام سات سال قید رہے حضرت مسیح علیہ السلام کو صلیب دی گئی وغیرہ وغیرہ۔ مگر جب ان تمام امور کے باوجود ان مقدس وجودوں کی عزت وشان میں کوئی فرق نہیں آیا تو حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کی شان میں صرف مراق سے کیا اور کس طرح فرق آسکتا ہے؟

(۷) جہاد کے بجائے ترکِ جہاد کی تلقین کی۔

ج۔ یہ اعتراض بھی سراسر افتراء ہے۔ حضورؑ نے جہاد منسوخ نہیں کیا۔ اصل ناسخ جہاد کے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ جنہوں نے "یضع الحرب" کی پیشگوئی فرمائی۔ اصل بات یہ ہے کہ جہاد ایک مشروط اور وقتی چیز ہے۔ جب تک اس کی شرائط پیدا نہ ہوں جہاد کرنا منع ہے۔ اور چونکہ اس وقت جہاد کی شرائط پوری نہیں ہوتیں اس لئے حضورؑ نے فرمایا ؎

کیوں بھولتے ہو تم یضع الحرب کی خبر ✦ کیا یہ نہیں بخاری میں دیکھو تو کھول کر
فرما چکا ہے سید کونین مصطفےٰؐ ✦ عیسےٰ مسیح جنگوں کا کر دے گا التوا

.. ..

یعنی وہ وقت امن کا ہوگا نہ جنگ کا ✦ بھولیں گے لوگ مشغلہ تیر و تفنگ کا
یہ حکم سن کے بھی جو لڑائی کو جائے گا ✦ وہ کافروں سے سخت ہزیمت اٹھائیگا

اور آپ لوگ باوجود اس کے کہ آپ کی حالت بعینہٖ وہی ہے جو مولانا حالیؔ نے مندرجہ ذیل اشعار میں بیان فرمائی ہے ؎

بنی نوع میں دو طرح کے ہیں انساں ✦ تفاوت ہے حالت میں جن کی نمایاں
کچھ ان میں ہیں راحت طلب اور تن آساں ✦ بدن کے نگہباں بستر کے درباں
نہ محنت پہ مائل نہ قدرت کے قائل
سمجھتے ہیں تینکے کو رستہ میں حائل
اگر ہیں تو انگر تو بیکار ہیں سب ✦ اپاہج ہیں روگی ہیں بیمار ہیں سب
تعیش کے ہاتھوں سے لاچار ہیں سب ✦ تن آسانیوں میں گرفتار ہیں سب
برابر ہے یاں ان کا ہونا نہ ہونا
نہ کچھ جاگنا ان کا بہتر نہ سونا

نہ مسلہ خود ہیں نہ ہیں کچھ تونگر * وہ ہیں ڈھوروں کی طرح قانع اسی پر
کہ کھانے کو ملتا رہے پیٹ بھر کر * نہیں بڑھتے بس اس سے آگے قدم بھر

چھوٹے زیورِ آدمیت سے عاری
معطل ہوئیں قوتیں ان کی ساری

سُنو تم نے یہ جس جماعت کی حالت * تنزل کی بنیاد ہے یہ جماعت
بگڑتی ہیں قومیں اسی کی بدولت * ہوا اس کی ہے مفسدِ ملک وملت

کیا صور وصیدا کو برباد اسی نے
بگاڑا دمشق اور بغداد اسی نے

جہاں ہے زمیں پر نحوست ہے انکی * جدھر ہے زمانہ میں نکبت ہے انکی
مصیبت کا پیغام کثرت ہے انکی * تباہی کا لشکر جماعت ہے انکی

وجود ان کا اصل البلیات ہے یاں
خدا کا غضب انکی بہتات ہے یاں

سب ایسے تن آسان و بیکار و کاہل * تمدن کے حق میں ہیں زہرِ ہلاہل
نہیں ان سے کچھ نوعِ انساں کو حاصل * نہیں ان کی صحبت کہ ہے سمّ قاتل

یہ جب پھیلتے ہیں سمٹتی ہے دولت
یہ جوں جوں کہ بڑھتے ہیں گھٹتی ہے دولت

جہاں بڑھ گئی ان کی تعداد حد سے * ہوئی قوم محسوب سب دام و دد سے
رہا اس کو بہرہ نہ حق کی مدد سے * وہ اب بچ نہیں سکتی نکبت کی زد سے

بچو ایسے شوموں کی پرچھائیوں سے
ڈرو ایسے چپ چاپ یغمائیوں سے

گھروں میں ہر قسم کے عیش و آرام کی زندگی بسر کرتے ہوئے جہاد کے خواب دیکھ رہے ہیں۔ علاوہ ازیں حضرت مرزا صاحبؑ نے اگر جہاد سے منع کیا ہے تو اپنے ماننے والوں کو کیا ہے آپ پر اس ممانعت کا کیا اثر ہو سکتا ہے! بڑی خوشی سے اپنے تمام ہم خیالوں کو ہمراہ لیکر دشمنوں پر حملہ بول دیں۔

(۸) ختم نبوت کی سب سے بڑی دلیل الیوم اکملت لکم دینکم و اتممت

علیکم نعمتی ..... ہے۔ (ص)

ج۔ غلط ہے۔ اس آیت میں کہاں لکھا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد نبی نہ ہوں گے۔ یہ آیت تو اجرائے نبوت کو ثابت کرنیوالی ہے۔ کیونکہ اس میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ میں نے تمہارا دین کامل کر دیا ہے۔ جس کے یہ معنی ہیں کہ کامل دین پر چلکر کامل لوگ بھی پیدا ہوسکیں گے۔ اگر کامل لوگ نہ پیدا ہوسکیں گے تو اکمال دین کا فائدہ کیا ہوا؟ دوسری بات یہ ہے کہ اس آیت میں دین کے کامل ہونے کا ذکر ہے۔ لوگوں کے کامل ہونیکا ذکر تو نہیں۔ اور نبیوں کی بعثت تو اس لئے ہوتی ہے کہ اخلاقی اور روحانی طور پر لوگوں کو کامل کیا جائے۔ اگر قرآن کریم کے بعد بھی لوگ اخلاقی اور روحانی طور پر تعلیم و تعلّم کے محتاج ہیں تو نبوت کی ضرورت ثابت ہے۔ اگر کوئی کالج سامانِ تعلیم اور نصاب کے لحاظ سے مکمل ہو جائے تو ایم۔ اے کے طلباء کے لئے تعلیم کا رستہ کھل جاتا ہے یا بند ہو جاتا ہے؟ اعتراض کرتے ہوئے کچھ عقل و خرد سے بھی کام لیا کریں!۔

اگر انبیاء کے ذریعہ سے ہدایت کا رستہ بند ہو گیا ہے تو پھر اُمتِ مُسلمہ اہل حدیث، دیوبندی، بریلوی، ندوۃ العلماء لکھنؤ، دار المصنفین اعظم گڑھ وغیرہ کی قسم کے اداروں کی جو ہندوستان کے گوشہ گوشہ میں برساتی کیڑوں کی طرح پھیلے ہوئے ہیں، کیا ضرورت ہے؟ شریعت کامل ہو چکی، نبوت ختم ہو چکی، قرآن کریم گھر گھر موجود ہے۔ سب مسلمان ہدایت یافتہ ہیں، پھر ایک دوسرے کو اپنے اپنے عقائد کی تلقین کرنے اور "سادہ لوح مسلمانوں کو بہلا پھسلا کر قرآن حکیم کی ازلی ابدی سچائیوں سے بے وفائی کرنے کی ترغیب دینے" کی کیا ضرورت ہے۔ مگر یاد رہے کہ جب تک قانون شکن لوگ موجود رہیں گے ان کی سرکوبی کے لئے پولیس اور فوج بھی کیل کانٹے سے لیس رہے گی۔

(۹) سید سلیمان صاحب ندوی کے مضمون میں یہ بات نہایت ہی عجیب ہے کہ آپ ایک طرف تو "خاتم النبیین" کی ترکیب کے معنے بیان کرتے ہوئے "نختم علی افواھھم" "ختم اللہ علی قلوبھم" "ختم علی سمعہ و قلبہ" "یسقون من رحیق مختوم" اور "ختامہ مسک" کی بے تعلق آیات پیش کر کے "ختم کرنا" "بند کرنا" کے معنی سمجھا رہے ہیں۔ اور ختم اور خاتمہ اور ختام کی گردان کر رہے ہیں۔ حالانکہ اصل آیت میں ان الفاظ میں سے کوئی لفظ بھی نہیں ہے۔ پھر دوسری بات یہ ہے کہ ان سب آیات میں ختم کیا

علیؑ کا حصہ مذکور ہے۔ مگر آپ یہ نہیں دیکھتے کہ کیا آیت متنازعہ فیہ میں "خاتم الله علی النبیین" لکھا ہوا ہے کہ ایسی مثالیں دے رہے ہیں۔ لیکن دوسری طرف اسی ترکیب کو خود بلا دغدغہ ایک نہیں دو نہیں متواتر تین مرتبہ ایک ہی تصنیف میں استعمال کرتے ہیں۔ اور انہی معنوں میں استعمال کرتے ہیں جن کا رد کرنے کے لئے آپ سیرت النبی جیسی کثیر الاشاعت کتاب میں اپنی دیانت و امانت کا بیدریغ خون کر چکے ہیں۔ سُنیئے آپ حیات شبلی میں جو سید صاحب کی اپنی تصنیف ہے کیا فرماتے ہیں۔

(۱) "ملا نظام الدین کے زمانہ سے تقریباً ڈیڑھ سو سال تک یعنی خاتمۃ العلماء مولانا عبد الحی فرنگی محلی المتوفی ۱۳۰۴ھ تک یہ چشمۂ فیض یکساں جاری رہا۔"

(۲) "سہارنپور میں مولانا احمد علی محدث اور دیوبند میں مولانا محمد قاسم کی بدولت خاتم المحدثین شاہ عبد العزیز مرحوم کا سلسلۂ فیض جاری تھا۔"

(۳) "مولوی لطف الرحمٰن صاحب بردوانی اور خاتمۃ التلامذہ نواب صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمٰن خان وغیرہ سینکڑوں ارباب کمال ہیں۔"

ہمارے خیال میں ایک عالم کے لئے ڈوب مرنے کا مقام ہے کہ اس کی اس قسم کی خیانت لوگوں پر ظاہر ہو جاوے۔ اس سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ ان لوگوں کو نہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے کوئی محبت ہے، نہ دل میں خدا کا خوف ہے، نہ اپنی عاقبت کے تباہ ہونے کا ڈر ہے اور وہ نبوت کو بند کرتے کرتے نہ صرف خود نبی بن بیٹھے ہیں بلکہ اپنے مقابلہ میں خدا تعالےٰ کی بھی کوئی حیثیت نہیں سمجھتے۔ کیونکہ جس ترکیب کو خود ایک معنوں میں بلا تکلف استعمال کرتے ہیں اُن معنوں میں خدا کو بھی وہ ترکیب استعمال کرنے کی اجازت نہیں دیتے۔ حالانکہ اگر یہ ترکیب پہلے عربی زبان میں رائج نہ تھی، اور سب سے پہلے صرف قرآن کریم میں ہی استعمال ہوئی تھی تب بھی خدا تعالےٰ کا حق ان سب سے فائق تر تھا۔ مگر وہ مولوی ہی کیا ہوئے جو اپنے مقابل پر کسی اور کی طاقت کو تسلیم کریں خواہ خدا ہی کیوں نہ ہو۔ کیا اب بھی شر البشر شرار العلماء اور علماء ھم شر من تحت ادیم السماء کی صداقت میں کوئی شک ہے؟

(۱۰) تیس کے قریب جھوٹے نبی پیدا ہوں گے۔

ج:۔ ا۔ حضورؐ نے تیس کی تعداد معین فرما کر اس طرف اشارہ فرمایا کہ سچے نبی بھی ہونگے۔

ورنہ اگر حضورؐ کا یہ مطلب ہوتا کہ سچا نبی کوئی نہ ہوگا تو حضورؐ یہ فرماتے کہ میرے بعد سب جھوٹے نبی ہوں گے۔

۲۔ یہ بات بھی یاد رکھنے کے قابل ہے کہ آج سے پانچ سو سال قبل اس حدیث کی صداقت ظاہر ہو چکی ہے۔ چنانچہ صحیح مسلم کی شرح اکمال الاکمال جلد، صفحہ ۲۵۸ پر لکھا ہے:۔

"ھذا الحدیث قد ظھر صدقہ فانہ لو عُدَّ من تنبأ من زمنہ صلعم الی الآن لبَلَغَ ھذا العدد۔ ویعرف ذٰلک من یطالع التواریخ ولولا الاطالۃ لفعلنا ذٰلک"

یعنی اس حدیث کا صدق ظاہر ہو چکا ہے۔ کیونکہ اگر جھوٹے مدعیانِ نبوت کا جنہوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے وقت سے لیکر اس وقت تک نبوت کا دعویٰ کیا ہے شمار کیا جاوے تو یہ تعداد پوری ہو جاتی ہے۔ اور جو شخص تاریخ کا مطالعہ کرے وہ یہ بات معلوم کر سکتا ہے۔ اور اگر ہمیں بات کے طول پکڑنے کا اندیشہ نہ ہوتا تو ہم ہی شمار کر دیتے۔

چنانچہ نواب صدیق حسن خاں صاحب نے اپنی کتاب حجج الکرامہ میں نام بنام یہ تعداد پوری کر کے دکھا دی ہے۔ (دیکھو صفحہ ۲۳۳)

(۱۱) لانبیّ بعدی خاتم النبیین کی تفسیر ہے۔

ج۔ بعدیت دو طرح کی ہوتی ہے، زمانی اور مکانی۔ یہاں بعدیت زمانی نہیں بلکہ مکانی مراد ہے۔ اور یہ بعد ایسا ہی ہے جیسے قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ فبایّ حدیثٍ بعد اللہ وآیٰتہ یؤمنون ۞ فمن یھدیہ من بعد اللہ افلا تذکرون ۞ (جاثیہ) یعنی اللہ اور اس کی آیتوں کے بعد کس حدیث پر ایمان لاؤ گے۔ پس اس کو اللہ کے بعد کون ہدایت دے سکتا ہے۔ کیا تم نصیحت نہیں پکڑتے۔

ان آیات میں اللہ کے بعد سے یہ مراد نہیں ہو سکتی کہ نعوذ باللہ اللہ تعالیٰ کی وفات کے بعد بلکہ اس "بعد" سے مراد "اللہ کو چھوڑ کر" ہے۔ اور مطلب یہ ہے کہ اللہ اور اس کی آیات کو چھوڑ کر کس حدیث پر ایمان لاؤ گے۔ یا اللہ کو چھوڑ کر کون اسے ہدایت دے سکتا ہے۔

پس "لانبیّ بعدی" کے معنے ہوں گے "مجھے چھوڑ کر کوئی نبی نہیں ہو سکتا" اور یہ معنے خاتم النبیین

کے منافی نہیں۔ کیونکہ اس آیت شریف کے معنی بھی یہی ہیں کہ اب جو شخص بھی نبی ہوگا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی متابعت اور پیروی سے ہوگا۔ حضورؐ کو چھوڑ کر نبوت تو الگ رہی ادنے درجہ نیکیوں کا بھی کسی کو نہیں مل سکتا۔ اللّٰھم صل علی محمد و علی آل محمد وبارک وسلم۔

(۱۲) الا ترضی ان تکون منی بمنزلة ھارون من موسی الا انہ لا نبی بعدی۔

ج۔ ہمیں شاہ صاحب پر دوہرا افسوس آتا ہے کہ وہ اپنی بات کی پیچ میں سیدھی سے سیدھی بات میں بھی ایچا پیچی کا ارتکاب کر دیتے ہیں۔ یہ حدیث حضرت علیؓ کے متعلق ہے اور غزوۂ تبوک پر تشریف لے جانے کے موقعہ پر حضورؐ نے فرمائی ہے۔ چونکہ حضورؐ نے اپنی اور حضرت علیؓ کی مثال حضرت موسیٰؑ اور حضرت ہارونؑ سے دی ہے اور وہ دونوں نبی تھے۔ یہاں لانبی بعدی فرما کر حضورؐ نے صرف یہ سمجھایا ہے کہ حضرت موسیٰؑ کی غیر حاضری میں حضرت ہارونؑ نبی تھے۔ مگر میری غیر حاضری میں آپ (حضرت علیؓ) نبی نہ ہوں گے۔ پس یہ بعدیت حضورؐ کی غزوہ تبوک سے واپسی تک ممتد ہے اور بس۔ اسے خاتم النبیین کے لئے بطور دلیل کے پیش کرنا اپنی علمی بے مائیگی کا ثبوت دینا ہے۔

(۱۳) آپ نے فرمایا بنو اسرائیل کی نگرانی و سیاست انبیاء کرتے تھے۔ ایک نبی جب مرتا تھا تو دوسرا نبی پیدا ہوتا تھا۔ وانہ لا نبی بعدی۔ بہ تحقیق میرے بعد کوئی نبی نہ ہوگا۔

ج۔ یہ حدیث صرف یہ ظاہر کرتی ہے کہ انبیائے بنی اسرائیل میں نبوت و سیاست ایک ہی وجود میں جمع ہو جاتی تھیں۔ جیسے حضرت داؤد علیہ السلام فوت ہوئے تو حضرت سلیمانؑ نبوت اور سلطنت دونوں کے وارث ہوئے۔ مگر حضورؐ فرماتے ہیں کہ میرے بعد سیاست تو ہوگی مگر نبوت نہ ہوگی۔ اور نبوت ہوگی تو سیاست نہ ہوگی یعنی دونوں چیزیں جمع نہ ہوں گی۔ چنانچہ حضورؐ کے بعد خلافت تو ہوئی مگر نبوت کسی کو نہ ملی۔ اور اب حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کو اللہ تعالےٰ نے نبوت عطا فرمائی تو سیاست کے بغیر۔

(۱۴) لو کان بعدی نبی لکان عمر۔ اس حدیث کے متعلق مشکوٰۃ شریف کے حاشیہ پر لکھا ہے کہ اس کی دوسری روایت لو لم ابعث لبعثت یا عمر ہے۔ یعنی اس حدیث کا مطلب یہ ہے کہ اگر میں نبی نہ ہوتا تو حضرت عمرؓ نبی ہو جاتے۔ کیونکہ

آپ کی طبیعت نبوت سے بہت مناسبت رکھتی تھی۔ چنانچہ کئی احکام الٰہی عین آپ کی خواہش اور منشاء کے مطابق نازل ہوئے۔

(۱۵) نبوت کے چھیالیس اجزاء میں سے ایک جزء مومن کا رویائے صالحہ ہے۔

ج۔ اگر یہی بات ہے تو خاتم النبیین کی یہ تعریف غلط ہو گئی کہ نبوت پر مُہر لگ گئی ہے کیونکہ اس سے معلوم ہوا کہ نبوت کے چھیالیسویں حصہ پر مُہر نہیں لگی۔ اور اب کامل نبوت گو باقی نہیں رہی تاہم جزوی نبوت، نبوتِ ناقصہ ضرور موجود ہے۔

اور آپ کا یہ کہنا کہ ایسے لوگوں کے رتبہ کا نام اولیاء اللہ ہوگا۔ تفسیر القول بما لا یرضی بہ قائلہٗ کا مصداق ہے۔ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اسے نبوت کا جزء قرار دیتے ہیں تو آپ کو اس میں تحریف کرنے کا کوئی حق حاصل نہیں ہے۔ رویائے صالحہ اگر جزو نبوت ہے تو وہ جزوی نبوت ہوئی، نبوتِ ناقصہ ہوئی۔ آپ نبوت کے نام سے کیوں چڑتے ہیں۔ کیا آپ نبیوں کے دشمن ہیں؟

(۱۶) إنّ الرسالة والنبوة قد انقطعت فلا رسول بعدی ولا نبی۔

ج۔ اس حدیث کے متعلق علمائے حدیث نے تصریح کر دی ہے کہ مطلق نبوت بند نہیں ہو سکتی کیونکہ اس مبدأ فیض میں بخل ممکن نہیں۔ ہاں شرعی نبوت البتہ منقطع ہو گئی ہے۔ کیونکہ شریعت کامل ہو گئی ہے اور اب کسی نئی شریعت کی ضرورت نہیں۔

نیز اسی کتاب (سیرت النبی) میں اس کے آگے لکھا ہے کہ صحابہؓ نے یہ بات سُنی تو اُنپر یہ بات گراں گذری۔ کیوں؟ اس لئے کہ جو لوگ نبوت کی برکات سے بلا واسطہ فیض پانیوالے تھے وہ نبی کی قدر و منزلت جانتے تھے۔ اس لئے قدرتی طور پر انہیں نبوت کے انقطاع سے تکلیف ہوئی۔ مگر تیرہ سو سال کے بعد مسلمان کہلانے والے ہی نبیوں سے اس طرح ڈرتے ہیں جیسے طوائف الملوکی کے زمانہ میں چوروں اور رہزنوں سے لوگ خائف ہوتے ہیں۔

سید صاحب کا ایک اور تحکم ملاحظہ ہو کہ آپ کے والدین نے آپ کا نام "سلیمان" رکھا ہے جو ایک اولوالعزم پیغمبر کا نام ہے۔ ممکن ہے انہوں نے تفاؤل کے طور پر یہ نام رکھا ہو، مگر کس قدر حیرت کا مقام ہے کہ خدا تعالیٰ کے اختیارات سید صاحب اتنے بھی نہیں سمجھتے کہ وہ کسی انسان میں حقیقی طور پر کسی نبی کی صفات پیدا کر کے اس کا وہی نام

رکھدیے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

سید سلیمان صاحب ندوی کے عقائد کی معجون مرکب کا ایک نمونہ بھی قابل دید ہے کہ ایک طرف آپ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کی مداوت میں "خاتم النبیین" کے یہ معنے کرتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے نبیوں مُہر لگا دی ہے کہ نہ پُرانا نبی باہر آسکتا ہے نہ نیا ان میں داخل ہو سکتا ہے۔ اور دوسری طرف ایک ہی سانس میں علماے اُمت کو (جن میں خود بدولت بھی شامل ہیں) انبیاء کا درجہ بھی دے رہے ہیں۔ ساتھ ساتھ نبوت کو بند بھی کرتے جا رہے ہیں۔ اور بایں ہمہ نزول مسیحؑ کے بھی قائل ہیں۔ جیسا کہ آپ "معارف" ماہ اپریل ۱۹۴۶ء کے صفحہ ۲۴۲ پر لکھتے ہیں:-

"اس کے صاف معنی یہ ہیں کہ اسلام میں آئندہ کسی جدید نبی کی بعثت نہ ہوگی۔ اور یہ فرض جو پہلے انبیاء کے ذریعے ادا ہوتا تھا وہ مسلمانوں کی ایک جماعت (شاید اس سے آپ کی مراد ندوۃ العلماء یا دار المصنفین اعظم گڑھ کے رفقائے کار سے ہوگی) انجام دیگی۔ بعض روایات میں ایک حدیث ہے العلماء ورثۃ الانبیاء یعنی اُمت محمدی کے علماے حق انبیاء کے وارث ہوں گے۔ ظاہر ہے کہ یہ وراثت عہدہ اور منصب میں نہیں ہے کہ یہ سلسلہ خاتم النبیین علیہ الصلوٰۃ والسلام پر ختم ہو چکا۔ مگر نبوت کے فضائل و کمالات سے ان کو حصہ ملے گا۔ اور تبلیغ دین، ہدایتِ خلق، دعوتِ حق، اقامتِ دین، امر بالمعروف، نہی عن المنکر، دفع شبہات اور ردّ بدعات کے کام انجام دیں گے۔"

دوسرے لفظوں میں وہ سب نبی ہوں گے۔ کیونکہ نبیوں کے کام کریں گے مگر نبی نہ کہلائیں گے۔ اس لئے کہ "خاتم النبیین" نبیوں کی آمد میں مانع ہے۔ مگر باوجود اس ممانعت کے حضرت مسیح ناصریؑ کے لئے یہ دروازہ کھلا ہے۔ فرماتے ہیں:-

"بہرحال اس آیت سے ظاہر ہے کہ اہلِ اسلام اور ان کے ساتھ عیسائی بھی قیامت تک دُنیا میں باقی رہنے والے ہیں۔ اور عجب نہیں کہ حق و باطل کے یہ دو حریف قیامت تک باہم کشمکش میں بھی مبتلا رہیں۔ یہاں تک کہ حضرت عیسےٰ علیہ السلام کے نزول سے مسلمانوں کو (قیامت کے بعد نا قل) غلبۂ عام حاصل ہو جائے جیسا کہ نزول مسیحؑ کی حدیثوں کا منشاء ہے۔" (معارف اپریل ۱۹۴۶ء صفحہ ۲۴۲)

ہم اپنے ناظرین کی خدمت میں ان علماء کی جنہیں سید صاحب "نبوت کے فضائل و کمالات" کا حامل بتلاتے اور خود بھی اُن میں شامل ہونے کا فخر رکھتے ہیں، ایسی عکسی تصویر دکھلاتے ہیں جو سید صاحب نے "حیاتِ شبلی" کے آئینہ میں خود کھینچی ہے۔ آپ ایک طرف علامہ شبلی کے متعلق لکھتے ہیں:۔

"اللہ تعالےٰ نے اپنے دین حنیف کی حفاظت کا وعدہ فرمایا ہے۔ اس وعدہ کا پورا ہونا بالکل یقینی ہے۔ لیکن اس کے یقینی ہونے کے یہ معنی نہیں کہ اس کیلئے ظاہری تدابیر کے اختیار کرنے کی ضرورت نہیں۔ بلکہ خود اللہ تعالےٰ اس کی یہ تدبیر بھی فرماتا ہے کہ ہر زمانہ میں اس زمانہ کی ضرورت کے مطابق ایسے اشخاص پیدا فرماتا ہے جو اس ضرورت کو پُورا کر کے دینِ الٰہی کی حفاظت کا کام انجام دیتے ہیں۔ یہاں تک کہ یہ کام کبھی کبھی ایسوں سے بھی لیا جاتا ہے جو اپنے ظاہری اعمال کے لحاظ سے اس کے مستحق بھی نہ تھے" (گویا علامہ شبلی کی تخلیق کی غرض یہ تھی کہ حفاظتِ دین کا کام اُن سے لیا جائے قطع نظر اس سے کہ ان کے ظاہری اعمال اس قابل ہوں یا نہ ہوں۔ کیونکہ "خاتم النبیین" کے بعد ظاہری اعمال کی درستی والا آدمی پیدا نہیں کیا جا سکتا تھا)

اور دوسری طرف ان کے قیام علی گڑھ کی حالت کا نقشہ ان الفاظ میں کھینچتے ہیں:۔

"علی گڑھ جا کر ان کی مذہبی زندگی میں جو انقلاب پیدا ہوا، اس کے متعلق لوگوں کے دلوں میں عجیب عجیب بدگمانیاں ہیں اور عوام بلکہ علماء تک کا خیال ہے کہ وہ علی گڑھ میں جا کر وضع قطع عقایدؔ و اعمال کے لحاظ سے معاذ اللہ بالکل آزاد خیال نیچری ہو گئے تھے" (حیات شبلی ص[illegible])

اور اگرچہ خود سید صاحب کو اقرار ہے کہ:۔

"یہ بالکل سچ ہے کہ علی گڑھ جا کر ان کے مذہبی خیالات میں بہت کچھ وسعت اور آزادی پیدا ہو گئی تھی۔ یہ بھی سچ ہے کہ جس شدت کے ساتھ وہ پہلے پابند تھے۔ علی گڑھ میں وہ اہتمام و تشدد باقی نہیں رہا۔ بلکہ حیدرآباد تک یہی حال رہا۔ اور یہ متکلمین کی ہر قسم کی کتابوں کے مطالعہ کا نتیجہ تھا اور کچھ ماحول کا اثر بھی"

ناظرین غور فرمائیں کہ ایک طرف سید صاحب علامہ شبلی کو دینِ حنیف کی حفاظت سپرد کر رہے ہیں اور دوسری طرف اُن کی یہ تصویر پیش کر رہے ہیں کہ گویا آپ مرغ بادنما

کی طرح ہوا کے رُخ پر اپنا رُخ بدلتے رہتے تھے۔ چنانچہ لکھا ہے کہ ملازمت کے عرصہ میں چونکہ سر سید احمد خان صاحب میں تمام خوبیوں کے ساتھ ایک بڑی کمزوری یہ تھی کہ وہ اپنے ہم نشینوں سے اعتقاد و معتقدات کے سوا کوئی اختلاف رائے برداشت نہ کر سکتے تھے" (ص۲۸۲) اس لئے "اس تصادم سے بچنے کے لئے سر سید کی زندگی بھر مولانا نے عقائد پر کوئی کتاب کیا کوئی رسالہ یا مضمون تک نہیں لکھا" (ص۲۸۵) لیکن باوجود اس کے گو سید صاحب کا خیال ہے کہ یہ "تمام تر خلافِ واقعہ ہے" تاہم آپکو یہ بھی تسلیم ہے کہ "مولانا کی مذہبی زندگی میں مختلف تغیرات پیدا ہوتے رہے" (ص۵۱۱) "عقائد و خیالات کے لحاظ سے وہ عقلیت پسند تھے" (ص۵۱۲) "حشر نشر، جنت اور دوزخ اور واقعات ما بعد الموت کے متعلق جہاں تک ان کی قدیم کلامی تصنیفات سے ظاہر ہوتا ہے وہ اپنی کلامی مشغولیتوں کے زمانہ میں ان چیزوں کو فقط روحانی سمجھتے تھے" (ص۵۱۲) اور اگرچہ "سیرت النبی کے تعلق میں احادیث کے مطالعہ سے ان کے ذہن و عقل کی دُنیا ہی بدل گئی تھی" لیکن بایں ہمہ آپ آخری عمر میں **وجود باری کے متعلق کسی مضبوط عقلی دلیل کے بھی محتاج تھے** "کیونکہ مولانا وجود باری کی ان فلسفیانہ دلیلوں کو جن کو متکلمین نے پیش کیا ہے **اعتراضات و شبہات** سے بری نہیں سمجھتے تھے" گویا جس شخص کو اللہ تعالیٰ نے حفاظتِ دین کے لئے مقرر فرمایا تھا اُسے خدا کے وجود پر بھی حتمی یقین نہ تھا۔ انا للہ و انا الیہ راجعون۔

سہ گر ہمیں مکتب است و ایں مُلّا ٭ کارِ طفلاں تمام خواہد شد

سید صاحب نے علامہ شبلی کے متعلق یہ انکشاف بھی کیا ہے کہ وہ "ابتداءً متعصب حنفی اور متشدد مولوی" تھے۔ ناظرین ان کی حقیقت کا اندازہ بھی فرمائیں۔ سید صاحب نے علامہ شبلی کا ایک خط درج کیا ہے جس میں آپ فرماتے ہیں:-

"جناب من۔ بعض صاحبوں کا خیال ہے کہ اگر ترکوں کی ہمدردی میں قربانی کی بجائے قیمت دی گئی تو اس سے احتمال ہوگا کہ قربانی خود غیر ضروری ہے لیکن یہ صحیح نہیں۔ شریعت میں فرائض کے درجات میں بھی ترتیب ہے اور وقتی ضرورتوں کا خیال رکھا گیا ہے۔ غزوۂ خندق میں مصروف ہونے کی وجہ سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نماز عصر قضا[1] ہوئی۔ تو کیا حجت ہو سکتی ہے کہ نماز

[1] اس عربی دانی پہ اس سلطان القلم کا مقابلہ! ــــ حضرت جس نماز کا وقت ختم ہو جاوے

کا قضا کرنا جائز ہے ترکوں کی اعانت اس وقت فرض عین ہے۔ اس لیئے اس خاص موقع اور ضرورت کے وقت اگر یہ فرض مقدم رکھا گیا تو اس سے آئندہ کے لیے کیا حجت ہو سکتی ہے۔"

یہ تو ہے علامہ شبلی کی تصویر جو ندوۃ العلماء کے قیام کی کوششوں میں سب سے پیش پیش اور دار المصنفین اعظم گڑھ کے بانی مبانی تھے۔ اور ندوۃ العلماء کا حال اس سے بھی زیادہ لائق دید و قابل شنید ہے۔ سید صاحب لکھتے ہیں:۔

"عام علماء زیادہ تر پڑھنے پڑھانے میں مصروف۔ کچھ معمولی معمولی چھوٹی چھوٹی باتوں میں اُلجھے تھے۔ اور خواص تقلید و عدم تقلید۔ قرأت فاتحہ، آمین بالجہر اور رفع یدین کے مسئلوں میں ایسے گتھے تھے کہ مناظرہ مجادلہ اور مجادلہ مقاتلہ بن گیا تھا۔ خدا کے گھر لڑائی کے میدان بن گئے تھے۔ ایک دوسرے کی تفسیق اور تکفیر پر بڑی بڑی مُہریں ہو رہی تھیں۔" (ص ۳۰۲)

ندوۃ العلماء کے قیام کی اغراض مندرجہ ذیل تھیں۔

(۱) علماء کی طاقت کو مجتمع کرنا۔ کیونکہ "وہ یہ بھی چاہتے تھے کہ علماء میں باہم ایسا رشتہ اتحاد ہو۔ اور بہ حیثیت ایک جماعت کے ان کا یہ علمی و مذہبی وقار ہو کہ سارے مسلمان انکی پیروی کو اپنا شعار بنالیں اور ان کو پوری قوم پر پورا اختیار حاصل ہو۔ اور حکومت وقت اس وقت ان کے سامنے سر جُھکا دے گی۔" (ص ۲۵۸)

(۲) تبلیغی مرکز بنانا۔ (۳) "اشاعت اسلام کا مستقل صیغہ قائم کیا جائے۔ تمام اضلاع میں اس کی شاخیں قائم کی جائیں۔" (ص ۵۵۹)

مگر ان اغراض کا جو حشر ہوا وہ سید صاحب کی زبانی حسب ذیل ہے:۔

(۱) "لیکن مسلمانوں میں یہ اتفاق عام پیدا نہ ہو سکا۔" (ص ۵۵۶)

(۲) غور کا مقام ہے کہ یہ تجویزیں ہیں جو عربی تعلیم کی اصلاح اور عربی مدرسوں کی

بقیہ حاشیہ صفحہ ۴۲۵

اور نہ پڑھی جائے وہ فوت ہو جاتی ہے نہ کہ قضا۔ قضا اس وقت ہوتی ہے جب دوسری نماز کے ساتھ پڑھی جاتی ہو۔ اس نظریہ سے مولوی صاحب کا تشدد بھی ظاہر ہے کہ جو چیز شارع نبی کیلئے جائز ہے وہ آپکے لئے ناجائز ہے۔ نبی کا اُسوہ آپ کے لئے کوئی حجت نہیں۔

تعلیم کے لئے آج سے سینتالیس برس پہلے پیش کی گئی تھیں۔ اور سینتالیس برس کے بعد بھی ہم آج بھی اسی وادیٔ تیہہ میں حیران و سرگردان ہیں۔ مدرسۂ فیض عام کی جگہ دار العلوم ندوہ رکھ لیجئے۔ صورت حال کیا بعینہٖ وہی نہیں" (صفحہ ۲)

(۳) "ندوۃ العلماء نے اگرچہ ابتداء ہی سے اشاعت اسلام کو اپنے مقاصد میں داخل کیا تھا۔ تاہم اب تک اس نے عملی طور پر اس کی طرف کوئی خاص توجہ نہیں کی تھی" (صفحہ ۵۵)

(۴) "دو سال ہوئے کہ شاہجہانپور سے ایک خط میرے پاس (علامہ شبلی کے پاس) سفید خاں سوداگر کا آیا تھا کہ شاہجہانپور سے ۸ میل کے فاصلہ پر ایک گاؤں ہے جمال پور۔ وہاں کے رئیس راجپوت جو مسلمان ہیں وہ ہندو ہونا چاہتے ہیں۔ آریہ وہاں پہنچ گئے ہیں۔ آپ جلد آئیے اور مدد کیجئے" (صفحہ ۵۵)

(علامہ شبلی نے کس قدر جلدی توجہ کی وہ اس سے ظاہر ہے کہ دو سال کے بعد آپ نے خط کا صرف ذکر کیا ہے۔) اس پر مولانا شبلی نے ندوہ والوں کو بے نقط سنائیں کہ:-

"اے بے حیاؤ اور اے کم بختو! ڈوب مرو۔ یہ واقعات پیش آئے ہیں۔ ندوہ کو آگ لگا دو اور علی گڑھ کو بھی پھونک دو۔ یہی الفاظ میں نے اُس وقت کہے تھے۔ اور آج بھی کہتا ہوں۔ اس پر ایک شخص بھی راضی نہ ہوا کہ گاؤں میں جائے آخر ان لوگوں نے اعلان کر دیا کہ ہم ہندو ہیں" (صفحہ ۵۵)

دیکھا آپ نے یہ وہ علماء ہیں جنہیں سید صاحب ورثۃ الانبیاء قرار دیتے اور انہیں نبوت کے فضائل و کمالات کا حامل بتلاتے ہیں۔

علامہ شبلی کو مسلّم تھا کہ:-

"اشاعت اسلام کی یہ حالت ہے کہ بیسیوں خطوط اور رپورٹیں آرہی ہیں اور معلوم ہوتا ہے کہ لاکھوں نو مسلم ارتداد کے خطرہ میں ہیں۔ آریوں کی مقامی کمیٹیاں جا بجا دیہات میں قائم ہوتی جاتی ہیں۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا کیا جائے۔ کہاں کہاں واعظ مقرر کئے جائیں۔ کہاں کہاں مکتب قائم ہوں۔ یہ تو سلطنت کا کام ہے" (صفحہ ۶۲)

اور سید صاحب کو بھی اقرار ہے کہ:-

(۱) "مولانا نے اشاعت و تبلیغِ اسلام کے کاموں میں جتنی کوششیں بھی فرمائیں، ان کی تہ میں یہ کمی ہمیشہ محسوس ہوتی رہی" کہ ان کی "حقیقی کامیابی کے لئے خود بانی کی زندگی اور نقطۂ نظر میں جو اصلی تبدیلی چاہیئے تھی وہ ہنوز پوری طرح پیدا نہیں ہوئی تھی۔ اس کے لئے وقت درکار تھا۔ اس کے لئے گرو کل پر جذبۂ رشک سے ہٹ کر خود صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم اور اپنے بزرگانِ دین و ائمۂ ہدیٰ کی نظیریں سامنے رہنی چاہیئے تھیں۔"

(۲) "پھر اس اظہار میں بھی کوئی پردہ نہیں کہ مولانا میں وہ پابندی و اتقا اور مذہبی تواضع و تقدس جو علمائے دین کا خاصہ ہے نہیں تھا۔ اور اس لئے ان علماء کی نگاہوں میں جو ان چیزوں کے دیکھنے کے عادی تھے مولانا کا رنگ کھٹکتا تھا۔" (ص۲۳۵)

(۳) "وہ سیاست کے ہمیشہ دلدادہ رہے۔" (ص۵۸۵)

(۴) "وہ شخصی سلطنت کو مضر سمجھتے تھے اور جمہوریت کے حامی تھے۔ اسی دوران میں کانگرس کا غلغلہ اٹھا تو وہ اس تحریک کے مداحوں میں نکلے۔ ابھی یہ آواز دبنے نہیں پائی تھی کہ ۱۸۹۳ء کے اخیر میں ندوۃ العلماء کی آواز اٹھی اور اس زور سے اٹھی کہ معلوم ہوتا تھا کہ **ہندوستان میں مولویوں کی حکومت قائم ہو جاوے گی**۔ مولانا اس صدا پر لبیک کہنے والوں میں سب سے آگے تھے۔ ان سب باتوں نے مل ملا کر ان کے خلاف بدگمانیوں کا اچھا خاصہ مسالہ اکٹھا کر دیا۔" (ص۲۸۵)

مگر باوجود اس احساسِ کمتری کے جو علامہ شبلی کو اپنے متعلق تھا اور جس کی تصدیق سید صاحب بار بار کرتے جا رہے ہیں۔ باوجود اس کے کہ علامہ شبلی نے "لاکھوں نومسلموں کو ارتداد کے خطرہ میں" چھوڑ کر میدانِ جنگ میں مردانہ وار کودنے کی بجائے اعظم گڑھ کے قلعہ میں پناہ گزین ہو کر نہایت ہی سنگدلی سے یہ اعلان کر دیا کہ "میں نے یہاں اپنا مستقل انتظام کر لیا ہے ہر طرح کا آرام اور پھیلاؤ ہے۔ تعلیم کے کام شروع ہو گئے ہیں۔ کسی طرف سے کوئی رکاوٹ نہیں۔ بالکل **ایک بادشاہت معلوم ہوتی ہے**۔ اور افسوس ہوتا ہے کہ میں نے کیوں اتنے دن پاجیوں میں بسر کئے۔ باغ ہے۔ بنگلہ ہے۔ **حکومت ہے** گریجویٹ ہیں۔ اسکول ہے۔ تعلیمی انجمن ہے۔ اور سب حسبِ خواہ کام کرتے ہیں۔ نہ کہ وہاں **لگان بیاندی**

کے ساتھ غوغو میں مبتلا ہونا۔ دارالمصنفین بھی شروع ہو جاویگا۔" (ص۱۹۹)
سید صاحب کو اصرار ہے کہ ملا کرشبلی اور دارالمصنفین کے رفقائے کار تو وہ علماء ورثة الانبیاء ہیں جنہیں "نبوت کے فضائل و کمالات سے حصّہ" ملا ہوا ہے۔ اور "جو تبلیغ دین، ہدایتِ خلق، دعوتِ حق، اقامتِ دین، امر بالمعروف نہی عن المنکر دفعِ شبہات، ابطالِ مبطلین اور ردِّ بدعات کے کام انجام" دے رہے ہیں۔ لیکن جو شخص ببانگ دہل اعلان کر رہا ہے کہ ؎

(۱) بشنوید اے مُردگاں من زندہ ام ✦ اے شبانِ تیرہ من تابندہ ام
ایں دو چشم من کہ زیبِ ایں سر ✦ بیند آں یارے کہ یارے دلبرم
ایں قدم تا عرشِ حق دارد گذر ✦ وایں دو گوشم را رسد از حق خبر
صد ہزاراں نعمتم بخشیدہ اند ✦ ویں رقم از غیر حق پوشیدہ اند
مے دہم فرعونیاں را ہر زماں ✦ چوں یدِ بیضائے موسیٰ صد نشاں
(۲) اے مزور گر بیائی سوئے ما ✦ واز وفا رخت افگنی در کوئے ما
واز سرِ صدق و صداقت پروری ✦ روزگارے در حضورِ ما بری
عالمے بینی زِ ربّانی نشاں ✦ سوئے رحماں خلق و عالم را کشاں
(۳) علمِ قرآں علم آں طیّب زباں ✦ علم غیب از وحیٔ خلاقِ جہاں
ایں سہ علمم چوں نشاں ہا دادہ اند ✦ ہر سہ ہمچوں شاہداں استادہ اند
آدمی زادے ندارد ہیچ فن ✦ تا درآویزد دریں میداں بمن
حُجّتِ رحماں بر ایشاں شد تمام ✦ یا وہ گوئی ماند در دستِ لئام

اور جس نے مختلف قوموں، مختلف مذہبوں، مختلف بستیوں، مختلف شہروں اور مختلف ممالک کے اخلاقی اور روحانی مُردوں میں زندگی کی ایسی رُوح پھونک دی ہے کہ دشمن سے دشمن انسان بھی یہ اقرار کرنے پر بادلِ ناخواستہ مجبور ہو گئے ہیں کہ:۔

"قادیانی احمدی اعلیٰ ایثار کا اظہار کر رہے ہیں۔ ان کا قریباً ایک سو مبلغ ہیرو ہند کی سرگردگی میں مختلف دیہات میں مورچہ زن ہے۔ ان لوگوں نے نمایاں کام کیا ہے۔ جملہ مبلغین بغیر تنخواہ یا سفر خرچ کے کام کر رہے ہیں"

ہم گو احمدی نہیں، لیکن احمدیوں کے اعلیٰ کام کی تعریف کئے بغیر نہیں رہ سکتے۔ جس اعلیٰ ایثار کا ثبوت جماعت احمدیہ نے دیا ہے اس کا نمونہ سوائے متقدمین کے مشکل سے ملتا ہے۔ ان کا ہر مبلغ امیر ہو یا غریب بغیر مصارفِ سفر و طعام حاصل کئے میدانِ عمل میں گامزن ہے۔ شدت کی گرمی اور اشد لوؤں میں وہ اپنے امیر کی اطاعت میں کام کر رہے ہیں۔"

(زمیندار ۲۹ر جون ۱۹۲۳ء)

(۲) "ہم نے وہ سب کچھ دیکھا جو کہ وہاں (قادیان میں) قابلِ دید تھا چھاپہ خانہ، دفتر ڈاک، دینیات کا مدرسہ، لڑکیوں کا مدرسہ۔ گویا یہ جگہ شہد کی مکھیوں کا ایک چھتہ ہے جو کہ تبلیغِ اسلام کی نشر و اشاعت میں ہمہ تن مشغول ہے نہ صرف ریویو آف ریلیجنز یہاں سے شائع ہوتا ہے بلکہ اور اخبار بھی یہاں سے نکلتے ہیں۔ اور خط و کتابت کا رابطہ لنڈن، پیرس، برلن، شکاگو، سنگاپور اور تمام مشرق ادنیٰ کے ساتھ قائم ہے۔ کاغذات کے طاقچے شاندار مستقبل کے ممکنات سے بھرے پڑے ہیں..... راسخ الاعتقادی کا یہ عالم ہے کہ پہاڑوں کو جنبش دینے والی ہے۔" (ڈاکٹر زویمر چرچ مشنری ریویو لنڈن)

آپ کے نزدیک وہ شخص بمعہ اُس کی فعال جماعت کے گمراہ مدعیٔ اسلام فرقہ ہے۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ۔ "تِلْکَ اِذًا قِسْمَۃٌ ضِیْزٰی"

اگر آپ یہ دعویٰ کرتے کہ علامہ شبلی شاعر تھے، ادیب تھے، اعلیٰ درجہ کے مصنف تھے اور ایسی کتابیں اپنی یادگار چھوڑ گئے ہیں جو عالمگیر شہرت رکھنے والی ہیں اور آپ لوگ ان کے نقشِ قدم پر نہایت کامیابی سے اس سلسلہ کو چلا رہے ہیں تو اگرچہ اپنی تصانیف کی قبولیت کے متعلق علامہ شبلی خود تحریر کر چکے ہیں کہ:۔

"مقبولیت کی وجہ صرف یہ تھی کہ قوم میں عموماً استخواں فروشی اور اسلاف پرستی کی خاصیت موجود ہے۔ اس لئے بزرگوں کی عظمت کی نسبت جو کچھ صحیح یا غلط کہا جاتا ہے خواہ مخواہ کو قبول ہو جاتا ہے۔" (صفحہ ۱۲۹)

تاہم یہ دعویٰ آپ لوگوں کا بہت حد تک قابلِ قبول ہوتا۔ لیکن یہ دعویٰ کہ آپ ختمیہ ورثۃ الانبیاء ہیں کسی صورت میں بھی آپ لوگوں کو زیب نہیں دیتا۔ کیونکہ آپ لوگوں کے اقوال

اور افعال میں زمین و آسمان کا تفاوت ہے۔
پس ہمارا مخلصانہ مشورہ یہی ہے کہ ادنےٰ کو اعلیٰ اور اعلیٰ کو ادنےٰ سمجھنا جو آپ لوگوں کی عادت میں داخل ہے ایسی سخت خطرناک غلطی ہے جس کا مرتکب ہر دو کے فوائد سے محروم رہ کر خسر الدنیا والآخرہ کا مصداق ہو جاتا ہے۔ بللہ آپ ایسی فاش غلطی سے پرہیز کریں۔ قوم کی بیماری سے فائدہ اُٹھا کر استخواں فروشی اور اسلاف پرستی" ہی کو اپنا منتہائے مقصود نہ بنائیں۔ اور جس قدر جلد ممکن ہو سکے اب بھی اپنی عاقبت کی فکر کریں، کہ اللہ تعالیٰ کی رحمت بہت وسیع ہے۔

(۱۷) مرزا صاحب نے خدا تعالےٰ کے آگے فیصلے پیش کئے اور خدا تعالےٰ نے اُن کے خلاف فیصلے دیئے۔

ج۔ اس فیصلہ سے مراد حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کا "مولوی ثناء اللہ صاحب کے ساتھ آخری فیصلہ" ہے۔ چونکہ نہ صرف دوسرے لوگ بلکہ خود مولوی ثناء اللہ صاحب بھی اس معاملہ میں حقیقت کو چھپانے اور عوام الناس کو درغلانے کی کوشش کرتے رہتے ہیں۔ اس لئے اس کے متعلق ہم اپنے ناظرین کی خدمت میں کسی قدر تفصیل سے عرض کرتے ہیں۔

۱۸۹۶ء میں حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے لوگوں کی تکذیب اور تکفیر کے پیشِ نظر اپنی کتاب "انجام آتھم" میں پنجاب اور ہندوستان بھر کے نامی علماء و مشائخ و سجادہ نشینوں کو دعوتِ مباہلہ دیکر الٰہی فیصلہ کی طرف بُلایا۔ چنانچہ حضورؑ فرماتے ہیں:۔

(۱) "چونکہ علمائے پنجاب اور ہندوستان کی طرف سے فتنۂ تکفیر و تکذیب حد سے زیادہ گزر گیا ہے اور نہ فقط علماء بلکہ فقراء اور سجادہ نشین بھی اس عاجز کے کافر و کاذب ٹھہرانے میں مولویوں کی ہاں میں ہاں ملا رہے ہیں اور ایسا ہی ان مولویوں کے اغوا سے ہزارہا ایسے لوگ پائے جاتے ہیں کہ وہ ہمیں نصاریٰ اور یہود و ہنود سے بھی اکفر سمجھتے ہیں۔" (انجام آتھم ص۴۵)

(۲) "سو اب چونکہ تکذیب اور تکفیر ان کی انتہا تک پہنچ گئی۔ اس لئے وقت آگیا کہ خدائے قادر اور علیم اور خبیر کے ہاتھ سے جھوٹے اور سچے میں فرق کیا جاوے۔"

(۳) "اب اے مخالف مولویو اور سجادہ نشینو! یہ نزاع ہم میں اور تم میں حد سے زیادہ بڑھ گئی ہے۔ اور اگرچہ یہ جماعت بہ نسبت تمہاری جماعتوں کے تھوڑی سی اور قلیل ہے اور شاید اس وقت تک چار ہزار پانچ ہزار سے زیادہ نہ ہوگی۔ تاہم یقیناً سمجھو کہ یہ خدا کے ہاتھ کا لگایا ہوا پودہ ہے۔ خدا اس کو ہرگز ضائع نہیں کرے گا اور وہ راضی نہیں ہوگا جب تک کہ اس کو کمال تک نہ پہنچا دے۔ اور وہ اس کی آبپاشی کرے گا اور اس کے گرد احاطہ بنائے گا۔ اور تعجب انگیز ترقیات دے گا۔ کیا تم نے کچھ کم زور لگایا۔ پس اگر یہ انسان کا کام ہوتا تو کبھی کا یہ درخت کاٹا جاتا اور اس کا نام و نشان باقی نہ رہتا۔ اسی نے مجھے حکم دیا ہے تا میں آپ لوگوں کے سامنے مباہلہ کی درخواست پیش کروں۔ تا جو راستی کا دشمن ہے وہ تباہ ہو جاوے۔ اور جو اندھیرے کو پسند کرتا ہے وہ عذاب کے اندھیرے میں پڑے۔"

(۴) "سو اب اٹھو اور مباہلہ کے لئے تیار ہو جاؤ۔ تم سن چکے ہو کہ میرا دعویٰ دو باتوں پر مبنی تھا۔ نصوص قرآنیہ اور حدیثیہ پر۔ دوسرے الہامات الٰہیہ پر۔ سو تم نے نصوص قرآنیہ اور حدیثیہ کو قبول نہ کیا۔ اور خدا کی کلام کو یوں ٹال دیا جیسے کہ کوئی تنکا توڑ کر پھینک دے۔ اب میرے بنائے دعویٰ کا دوسرا شق باقی رہا۔ سو میں اس ذات قادر غیور کی قسم آپ کو دیتا ہوں کہ جس کی قسم کو کوئی ایماندار رد نہیں کر سکتا کہ اب اس دوسری بنا کے تصفیہ کے لئے مجھ سے مباہلہ کر لو۔"

مباہلہ کا یہ چیلنج حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے ہندوستان بھر کے علماء و مشائخ کو دیا۔ اور یہاں تک تحریر فرمایا کہ:۔

"میں یہ بھی شرط کرتا ہوں کہ میری دعا کا اثر صرف اس صورت میں سمجھا جائے کہ جب تمام وہ لوگ جو مباہلہ کے میدان میں بالمقابل آئیں ایک سال تک ان بلاؤں میں سے کسی بلا میں گرفتار ہو جائیں۔ اگر ایک بھی باقی رہا تو میں اپنے تئیں کاذب سمجھوں گا۔ اگرچہ وہ ہزار ہوں یا دو ہزار۔"

اور آخر میں علماء کو غیرت دلاتے ہوئے حضورؑ نے تحریر فرمایا:۔

"گواہ رہ اے زمین اور اے آسمان کہ خدا کی لعنت اُس شخص پر کہ اس رسالہ کے پہنچنے کے بعد نہ مباہلہ میں حاضر ہو اور نہ تکفیر اور توہین چھوڑے اور نہ ٹھٹھا کرنے والوں کی مجلسوں سے الگ ہو۔ اور اے مومنو! برائے خدا تم سب کہو کہ آمین" (انجام آتھم ص۶۷)

جن علماء اور سجادہ نشینوں کو حضور نے اس مباہلہ کے لئے بُلایا۔ ان میں مولوی ثناء اللہ صاحب امرتسری کا نمبر گیارھواں ہے۔ مولوی صاحب کی حیلہ جوئی اور اطلاع فریبی کی ہمیں داد دینی چاہئے کہ باوجود اس کے کہ آیت مباہلہ کی تفسیر کرتے ہوئے آپ تحریر فرما چکے ہیں :-

"اگر آرزو موت کی نہ کریں تو ثابت ہو جائے گا کہ ان کو مذہب سے کوئی تعلق نہیں صرف خواہش نفسانی کے پیچھے چپے ہیں۔ اور ہم ابھی سے کہے دیتے ہیں کہ اپنے کئے ہوئے بد اعمال کی وجہ سے جس کی سزا بھگتنا ان کو بھی یقینی ہے۔ ہرگز کبھی موت کی خواہش نہ کریں گے۔ باوجود اس بد اعمالی اور جسارت کے دعویٰ نجات کیسا بڑا ظلم ہے۔" (تفسیر ثنائی جلد ۱ ص۹)

اور باوجود اس کے کہ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے نہایت ہی غیرت دلانے والے الفاظ تحریر فرمائے تھے۔ مولوی ثناء اللہ صاحب نے اپنی خیریت اسی میں سمجھی کہ اس دعوتِ مباہلہ کے جواب میں دم بخود رہیں اور ایک لفظ بھی منہ سے نہ نکالیں لیکن مباحثہ مُد میں جب دعوتِ مباہلہ کا ذکر آیا تو مولوی صاحب نے اپنے ہم خیالوں میں ذلت و رسوائی سے ڈر کر نہ صرف مباہلہ پر آمادگی کا اظہار کر دیا بلکہ اس کے متعلق ایک دستخطی تحریر بھی دیدی۔ چنانچہ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اپنی کتاب "اعجاز احمدی" میں جس میں مباحثہ مُد کے حالات تحریر فرمائے ہیں مولوی صاحب کی اس تحریر کے متعلق تحریر فرمایا :-

"مولوی ثناء اللہ امرتسری کی دستخطی تحریر میں نے دیکھی ہے جس میں وہ یہ درخواست کرتا ہے کہ میں اس طور کے فیصلہ کے لئے بدل خواہشمند ہوں کہ فریقین یعنی میں اور وہ یہ دعا کریں کہ جو شخص ہم دونوں میں سے جھوٹا ہے وہ سچے کی زندگی میں ہی مر جائے۔" (اعجاز احمدی ص۱۴)

اور اس طریق فیصلہ کو منظور فرماتے ہوئے تحدی فرمائی کہ:۔

"اگر اس چیلنج پر وہ مستعد ہوئے کہ کاذب صادق سے پہلے مر جائے تو ضرور وہ پہلے مریں گے۔" (اعجاز احمدی ص۳)

حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کی یہ دلی خواہش تھی کہ اس طریق پر فیصلہ کرنے کے لئے کوئی مرد میدان بن کر نکلے کیونکہ حضورؑ اربعین میں تحریر فرما چکے تھے:۔

"دُنیا مجھ کو نہیں پہچانتی لیکن وہ مجھے جانتا ہے جس نے مجھے بھیجا ہے۔ یہ ان لوگوں کی غلطی ہے اور سراسر بدقسمتی ہے کہ میری تباہی چاہتے ہیں۔ میں وہ درخت ہوں جس کو مالک حقیقی نے اپنے ہاتھ سے لگایا ہے۔ جو شخص مجھے کاٹنا چاہتا ہے اس کا نتیجہ بجز اس کے کچھ نہیں کہ وہ قارون اور یہودا اسکریوطی اور ابوجہل کے نصیب سے کچھ حصہ لینا چاہتا ہے۔ میں ہر روز اس بات کے لئے چشم پر آب ہوں کہ کوئی میدان میں نکلے اور منہاج نبوت پر مجھ سے فیصلہ کرنا چاہے۔ پھر دیکھے کہ خدا کس کے ساتھ ہے۔ مگر میدان میں نکلنا کسی مخنّث کا کام نہیں۔"

حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کی یہ تحدی مولوی ثناء اللہ صاحب کے خرمن امن و امان پر بجلی ہو کر گری۔ مولوی صاحب کی ساری شیخی کرکری ہو گئی۔ ہر دم موت کا نقشہ آنکھوں کے سامنے رہنے لگا۔ اور شیر خدا کی اس دہاڑ کے بالمقابل عاجزانہ کچلیاں نکال کر اپنی شکست کا بدیں الفاظ اقرار کر لیا:۔

"چونکہ یہ خاکسار نہ واقع میں نہ آپ کی طرح نبی یا رسول یا ابن اللہ یا الہامی ہے اس لئے ایسے مقابلہ کی جرأت نہیں کر سکتا۔" (الہامات مرزا ص۱۱۶)

مگر اس کھلی کھلی شکست کا اعتراف کر کے چونکہ مولوی صاحب امن و چین سے زندگی بسر نہ کر سکتے تھے اس لئے اپنی خفت کو مٹانے اور اپنے سادہ لوح دام افتادہ لوگوں کو بہلانے کے لئے مارچ ۱۹۰۷ء میں مولوی صاحب نے "اہلحدیث" میں لکھا:۔

"مرزائیو! سچے ہو تو آؤ۔ اور اپنے گرو کو ساتھ لاؤ۔ وہی میدان عیدگاہ امرتسر تیار ہے جہاں تم پہلے صوفی عبدالحق غزنوی سے مباہلہ کر کے آسمانی ذلت اُٹھا چکے ہو۔ اور انہیں ہمارے سامنے لاؤ جس نے ہمیں رسالہ

انجام آتھم میں مباہلہ کے لئے دعوت دی ہوئی ہے۔ کیونکہ جب تک پیغمبر جی سے فیصلہ نہ ہو سب اُمت کے لئے کافی نہیں ہو سکتا" (اہلحدیث ۲۹ر مارچ ۱۹۰۷ء)

حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کی تو یہ دلی مراد تھی کہ کوئی مقابل پر آوے۔ لہٰذا حضورؑ نے اس تحدّی کو فوراً قبول فرمالیا۔ چنانچہ اخبار بدر کے ایڈیٹر صاحب نے حضورؑ کے حکم سے یہ اعلان شائع فرمایا:۔

"اس مضمون کے جواب میں مَیں مولوی ثناء اللہ صاحب کو بشارت دیتا ہوں کہ حضرت مرزا صاحبؑ نے ان کے اس چیلنج کو منظور کرلیا ہے"

(بدر ۴ر اپریل ۱۹۰۷ء)

اور اگرچہ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے دعوتِ مباہلہ کو منظور فرماتے ہوئے ارشاد فرمایا تھا کہ یہ مباہلہ حقیقۃ الوحی کے شائع ہونے کے بعد ہو۔ مگر مشیتِ ایزدی کچھ اور تھی۔ حضورؑ نے ۱۵ر اپریل ۱۹۰۷ء کو مولوی صاحب کی دعوتِ مباہلہ کے جواب میں اپنی طرف سے دُعائے مباہلہ شائع فرمادی اور مولوی صاحب کو لکھ دیا کہ:۔

"بالآخر مولوی صاحب سے التماس ہے کہ میرے اس مضمون کو اپنے پرچہ میں چھاپ دیں۔ اور جو چاہیں اس کے نیچے لکھدیں۔ اب فیصلہ خدا کے ہاتھ میں ہے"

اگرچہ اب مولوی ثناء اللہ صاحب لوگوں کو دھوکہ دینے کے لئے وقتاً فوقتاً لکھتے رہتے ہیں کہ حضرت مرزا صاحبؑ کی یہ دُعا یک طرفہ دُعا تھی۔ مگر جب یہ اشتہار حضورؑ نے شائع فرمایا تھا اس وقت مولوی صاحب کو اقرار تھا کہ یہ اشتہار یک طرفہ دُعا نہیں۔ بلکہ مباہلہ ہی کا اشتہار ہے۔ چنانچہ مولوی صاحب لکھتے ہیں:۔

(۱) "کرشن قادیانی نے ۱۵ر اپریل ۱۹۰۷ء کو میرے ساتھ مباہلہ کا اشتہار شائع کیا تھا" (مرقع قادیانی جون ۱۹۰۸ء صفحہ ۱۵)

(۲) "مرزا جی نے میرے ساتھ مباہلہ کا ایک طولانی اشتہار دیا تھا" (مرقع قادیانی دسمبر ۱۹۰۸ء صفحہ ۳)

(۳) وہ اپنے اشتہار مباہلہ ۱۵ر اپریل ۱۹۰۷ء میں چیخ اُٹھا تھا

کہ اہلحدیث نے میری عمارت کو ہلا دیا ہے۔" (اہلحدیث ۱۹ رجون ۱۹۰۸ء)

چونکہ مباہلہ فریقین کی شرکت کے بغیر متحقق نہیں ہو سکتا اور اس کی مثال بالکل ایسی ہی ہے جیسے عدالت میں مقدمہ دائر کیا جاوے۔ ظاہر ہے کہ کوئی عدالت ایسی نہیں جو مدعا علیہ کا جواب دعویٰ اور گواہوں کے بیانات لئے بغیر مقدمہ کا فیصلہ کر دے پس حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اللہ تعالیٰ کی عدالت میں فریقین کے صدق و کذب کا فیصلہ حاصل کرنے کے لئے درخواست دی اور طریق فیصلہ یہ تجویز فرمایا کہ فریقین میں سے جو جھوٹا ہے وہ سچے کی زندگی میں مرجائے۔ اللہ تعالیٰ نے مولوی صاحب سے جواب دعویٰ طلب کیا۔ مولوی صاحب نے کیا بیان دیا بلفظہٖ۔

"آپ اس دعویٰ میں (کہ جھوٹا سچے کی زندگی میں مرجائے) قرآن شریف کے صریح خلاف کہہ رہے ہیں۔ قرآن تو کہتا ہے کہ بدکاروں کو خدا سے مہلت ملتی ہے۔ سنو من کان فی الضلالۃ فلیمدد لہ الرحمٰن مداً۔ (پ ۱۶ ع ۸) اور انما نملی لھم لیزدادوا اثماً (پ ۴ ع ۸) اور ویمدھم فی طغیانھم یعمھون (پ ۱ ع ۲) وغیرہ آیات تمہارے اس دجل کی تکذیب کرتی ہیں۔ اور سنو۔ بل متعنا ھؤلاء وآباءھم حتی طال علیھم العمر (پ ۱۷ ع ۴) جن کے صاف یہی معنی ہیں کہ خدا تعالیٰ جھوٹے۔ دغاباز۔ مفسد اور نافرمان لوگوں کو لمبی عمریں دیا کرتا ہے۔ تاکہ وہ اس مہلت میں اور بھی بُرے کام کرلیں۔ پھر تم کیسے من گھڑت اصول بتلاتے ہو کہ ایسے لوگوں کو بہت عمر نہیں ملتی۔" (اہلحدیث ۲۶ راپریل ۱۹۰۷ء)

گویا مولوی صاحب نے جج کے سامنے طریق فیصلہ یہ پیش کیا کہ فریقین میں سے جو شخص جھوٹا، دغاباز، مفسد اور نافرمان ہے اُسے لمبی عمر دی جائے اور اس پر الٰہی قانون کی دو تین دفعات بطور استشہاد بھی پیش کیں اور نیز مُدعی (حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام) کے دعویٰ پر مندرجہ ذیل جرح کی:۔

(۱) "اس دُعا کی منظوری مجھ سے نہیں لی۔ اور بغیر میری منظوری کے اسے شائع کر دیا۔" (مولوی صاحب کو تسلیم ہے کہ مباہلہ میں فریقین کی شرکت

ضروری ہے ۔)

(۲) "میرا مقابلہ تو آپ سے ہے ۔ اگر میں مر گیا تو میرے مرنے سے اور لوگوں پر کیا حجت ہو سکتی ہے ۔" (گویا آپ چاہتے ہیں کہ آپکو زندہ رکھکر آپ پر حجت پوری کی جائے ۔)

(۳) تمہاری یہ دُعا کسی صورت میں فیصلہ کُن نہیں ہو سکتی ۔ کیونکہ مسلمان تو طاعونی موت کو بموجب حدیث شریف کے ایک قسم کی شہادت جانتے ہیں ۔ پھر وہ کیوں تمہاری دُعا پر بھروسہ کر کے طاعون زدہ کو کاذب جانینگے ۔"

(۴) آپ نے پہلے لکھا تھا کہ خدا کے رسول چونکہ رحیم کریم ہوتے ہیں اور انکی ہر وقت یہ خواہش ہوتی ہے کہ کوئی شخص ہلاکت اور مصیبت میں نہ پڑے ۔ مگر اب کیوں آپ میری ہلاکت کی دُعا کرتے ہیں ۔ مختصر یہ کہ یہ تحریر تمہاری مجھے منظور نہیں اور نہ کوئی دانا اسے منظور کر سکتا ہے ۔"

(اہلحدیث ۲۶ راپریل ۱۹۰۷ء)

(۵) آنحضرت صلعم باوجود سچا نبی ہونے کے مسیلمہ کذاب سے پہلے انتقال ہوئے مسیلمہ باوجود کاذب ہونے کے صادق سے پیچھے مرا ۔"

(مرقع قادیانی اگست ۱۹۰۷ء)

گویا مولوی صاحب نے نہ صرف قانونی دفعات (آیاتِ قرآنیہ) کا حوالہ دیا بلکہ عدالت کو اپنے ایک تیرہ سو سالہ قبل فیصلے کی طرف بھی توجہ دلائی ۔

جج نے (اللہ تعالےٰ نے) مدعا علیہ کا پیش کردہ طریق فیصلہ منظور فرماتے ہوئے فیصلہ فرمایا کہ چونکہ مولوی ثناء اللہ صاحب جھوٹے، دغا باز، مفسد اور نافرمان ہیں اس لئے اپنے قانون مندرجہ قرآن کریم اور اپنے ایک سابق فیصلے کی روشنی میں ہم حکم دیتے ہیں کہ مولوی ثناء اللہ صاحب کو لمبی عمر دی جاوے، تا وہ اس مہلت میں اور بھی بُرے کام کر لیں اور تا وہ زندہ رہ کر مدعی کی صداقت اور اس کے سلسلہ کی روز افزوں ترقی دیکھکر اگر چاہیں تو عبرت بھی حاصل کر سکیں ۔

یہ فیصلہ ۲۶ مئی ۱۹۰۸ء بروز منگل صادر ہو چکا ۔ اور ایسی عدالت سے صادر ہو چکا جسکے فیصلے کے خلاف اپیل نہیں ہو سکتی ۔ ناچار مولوی صاحب کیلئے اب اسکے سوا اور کوئی چارہ کار نہیں رہا کہ

وہ زندگی بھر ایک صادق مامور من اللہ کی تکذیب پر اخفائے حق کے جرم کا اضافہ کرتے رہیں۔ تا آنکہ مُہلت کا زمانہ ختم ہو کر بازپُرس کا وقت آجائے۔

جو لوگ واقعات کی روشنی میں کسی معاملہ کو سمجھنا چاہتے ہیں ان کے لئے ہم نے یہ واقعہ کسی قدر تفصیل سے عرض کر دیا ہے۔ مگر جو لوگ اپنی دیانت و امانت کا خون کر کے دانستہ لوگوں کو دھوکہ دینا اور اپنی عاقبت خراب کرنا چاہتے ہیں ان کا مرض لاعلاج ہے۔

(۱۸) مرزا صاحبؑ کی تحدّی سے کی ہوئی پیشگوئیاں بھی غلط نکلیں کسی ایک رسول و نبی کا نمونہ دکھلاؤ جس کی پیشگوئیاں اس طرح غلط ہوئی ہوں۔

ج۔ اس کا پہلا جواب تو لعنۃ اللہ علی الکاذبین ہے۔ اور دوسرا جواب یہ ہے کہ یہ مدعی سُست گواہ چست والی بات ہے۔ جن لوگوں کے متعلق پیشگوئیاں کی گئی تھیں وہ یا تو ان کی صداقت کے قائل ہیں یا ان کی صداقت پر اپنی ذاتی مُہرِ تصدیق ثبت کر چکے ہیں۔ مگر کچھ غیر متعلق لوگ ابھی تک "میں نہ مانوں، میں نہ مانوں" کی رٹ لگا رہے ہیں۔

ہم ایسے اشخاص سے پُر زور مطالبہ کرتے ہیں کہ کوئی ایسا شخص پیش کریں جس کے متعلق حضورؑ نے کوئی پیشگوئی کی ہو اور وہ پوری نہ ہوئی ہو۔ اور وہ شخص مردِ میدان بن کر خود اس بات کا اعلان کرے کہ میرے متعلق فلاں پیشگوئی مرزا صاحبؑ نے کی تھی جو پُوری نہیں ہوئی۔

قرآن کریم سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت یونس علیہ السلام نے جو پیشگوئی چالیس دن میں عذاب کے آنے کی فرمائی تھی وہ بالکل پوری نہ ہوئی تھی اور آپ اسی وجہ سے شہر چھوڑ کر چلے گئے تھے۔

(۱۹) ختمِ نبوت کے متعلق مرزا صاحبؑ کی بے شمار متضاد تحریروں میں تطابق پیدا کرنے کے لئے مرزائیوں کا واحد حربہ یہی ہے کہ جہاں مرزا صاحبؑ نے نبوت کا دعویٰ کیا ہے وہاں نبوت سے مراد غیر شرعی نبوت لیتے ہیں۔ اور جہاں انکار کیا ہے وہاں شرعی نبوت مراد ہے۔ بہت اچھا ایسا ہی سہی۔ لیکن مجھے ڈر ہے کہ کہیں آپ اس تاویل کو بھی چھوڑ کر بھاگ نہ جائیں۔ سُنیئے جناب مرزا صاحبؑ نہایت زور سے اعلان فرماتے ہیں کہ

وہ صاحبِ شریعت نبی ہیں۔ (ملاحظہ ہو اربعین ۴ صفحہ ۶)

"ماسوا اس کے یہ بھی تو سمجھو کہ شریعت کیا چیز ہے جس نے اپنی وحی کے ذریعہ سے چند امر اور نہی بیان کئے۔ اور اپنی اُمت کے لئے ایک قانون مقرر کیا۔ وہی

صاحب شریعت ہوگیا۔ پس اِس تعریف کے رُو سے بھی ہمارے مخالف ملزم ہیں۔ کیونکہ میری وحی میں امر بھی ہے اور نہی بھی۔ مثلاً یہ الہام قل للمؤمنین .... براہین احمدیہ میں درج ہے۔ اس میں امر بھی ہے اور نہی بھی۔ اور اس پر تئیس برس کی مدّت بھی گذر گئی۔ اور ایسا ہی اب تک میری وحی میں امر بھی ہوتے ہیں اور نہی بھی ...... خدا تعالےٰ نے اپنے نفس پر حرام نہیں کیا کہ تجدید کے طور پر کسی اور مامور کے ذریعے سے یہ احکام صادر کرے کہ جھوٹ نہ بولو۔ جھوٹی گواہی نہ دو۔ زنا نہ کرو۔ خون نہ کرو۔ اور ظاہر ہے ایسا بیان کرنا بیانِ شریعت ہے جو مسیح موعود (مرزا صاحبؑ) کا بھی کام ہے؟"

(نوٹ:۔ آئندہ صفحات میں ناظرین اصل حوالہ ملاحظہ فرمائیں اور دیکھیں کہ جو الفاظ راقم مضمون کے اس بہتانِ عظیم پر ایٹم بم کا حکم رکھتے تھے وہ اس نے بد دیانتی اور دھوکہ دہی سے حذف کر دیئے ہیں)

ج۔ ہم حیران ہیں کہ اِس بہتانِ عظیم کا کیا جواب دیں۔ انسان کے لئے صداقت فطری چیز ہے اور وہ جھوٹ کسی نہ کسی مجبوری کی وجہ سے بولتا ہے۔ مگر اللہ تعالےٰ رحم فرمائے ہمارے مخالفین کی حالت پر جو اپنے اعمال کے نتائج و عواقب سے لاپرواہ ہو کر بلا ضرورت ہی سو فیصدی جھوٹ بولتے ہیں۔ ایسے بے باک لوگوں کے لئے ہماری طرف سے پہلا جواب تو وہی ہے جو قرآن کریم نے دیا ہے۔ یعنی لعنۃ اللّٰہ علی الکاذبین۔ اور دوسرا جواب یہ ہے کہ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے ہرگز ہرگز تشریعی نبوّت کا دعویٰ نہیں فرمایا۔ بلکہ برخلاف اس کے نہایت ہی پُرزور الفاظ میں اعلان فرمایا ہے کہ:۔

(۱) "مَیں مستقل طور پر کوئی شریعت لانے والا نہیں ہوں۔ اور نہ مَیں مستقل طور پر نبی ہوں۔ مگر ان معنوں سے کہ مَیں نے اپنے رسول مقتدا سے باطنی فیوض حاصل کر کے اور اپنے لئے اس کا نام پا کر اس کے واسطے سے خدا کی طرف سے علمِ غیب پایا ہے رسول اور نبی ہوں مگر بغیر کسی جدید شریعت کے۔"

(ایک غلطی کا ازالہ بحوالہ اظہار الحق ص[illegible])

(۲) میری مراد نبوّت سے یہ نہیں کہ مَیں نعوذ باللہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم

کے مقابلہ پر کھڑا ہو کر نبوت کا دعویٰ کرتا ہوں۔ یا کوئی نئی شریعت لایا ہوں۔ صرف مراد میری نبوت سے کثرتِ مکالمہ و مخاطبہ الٰہیہ ہے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع سے حاصل ہے۔" (تتمہ حقیقۃ الوحی ص۶۸)

(۳) "یہ الزام جو میرے ذمہ لگایا جاتا ہے کہ گویا میں ایسی نبوت کا دعویٰ کرتا ہوں جس سے مجھے اسلام سے کچھ تعلق باقی نہیں رہتا۔ اور جس کے یہ معنی ہیں کہ میں مستقل طور پر اپنے تئیں ایسا نبی سمجھتا ہوں کہ قرآن شریف کی پیروی کی کچھ حاجت نہیں رکھتا۔ اور اپنا علیحدہ کلمہ اور علیحدہ قبلہ بناتا ہوں اور شریعتِ اسلام کو منسوخ کی طرح قرار دیتا ہوں اور آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی اقتداء اور متابعت سے باہر جاتا ہوں۔ یہ الزام صحیح نہیں ہے۔ بلکہ ایسا دعویٰ نبوت کا میرے نزدیک کفر ہے۔ اور اور نہ آج سے بلکہ اپنی ہر ایک کتاب میں ہمیشہ میں یہی لکھتا آیا ہوں کہ اس قسم کی نبوت کا مجھے کوئی دعویٰ نہیں۔ اور یہ سراسر میرے پر تہمت ہے۔"

(اخبار عام ۲۶ مئی ۱۹۰۸ء)

پس اِن حوالجات سے یہ بات روزِ روشن کی طرح واضح ہو گئی کہ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے تشریعی نبوت کا ہرگز دعویٰ نہیں فرمایا۔ اور اس کا مزید ثبوت یہ بھی ہے کہ راقم مضمون نے بیہودیانہ خیانت سے کام لیکر وہ الفاظ جو اُس کے اِس دعویٰ کو بیخ وبُن سے اُکھاڑنے والے تھے وہ دانستہ حوالہ میں سے حذف کر دیئے ہیں۔ چنانچہ حضورؑ کے وہ الفاظ حسب ذیل ہیں:۔

"غرض یہ سب خیالات فضول اور کوتہ اندیشیاں ہیں۔ ہمارا ایمان ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم خاتم الانبیاء ہیں اور قرآن ربانی کتابوں کا خاتم ہے۔"

پھر اگر یہ سوال ہو کہ حضورؑ نے یہ الفاظ کیوں تحریر فرمائے جن سے خیانت پیشہ لوگوں کو حضورؑ کی طرف یہ دعویٰ منسوب کرنے کی جرأت ہوئی۔ تو اس کا جواب یہ ہے کہ جس طرح آج خواجہ احمدالدین صاحب نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ اپنی عداوت کو کمال تک پہنچاتے ہوئے نہایت بے باکی سے یہ تحریر کر دیا ہے کہ:۔

"یاد رہے کہ یہ کوئی قاعدہ نہیں ہے کہ ہر مفتری ضرور ہی مارا جائے۔" (البیان ۹۴)

(الفاظ) ظاہر ہے کہ اگر ہر مفتری علی اللہ کا مارا جانا ضروری نہیں ہے تو پھر آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی صداقت پر ان کے پاس کیا دلیل ہے)

اسی طرح حافظ محمد یوسف صاحب ضلعدار نہر نے بموجودگی چند ایک معزز احمدی حضرات "بڑے اصرار سے یہ بیان کیا کہ اگر کوئی نبی یا رسول یا اور کوئی مامور من اللہ ہونے کا جھوٹا دعویٰ کرے اور اس طرح لوگوں کو گمراہ کرنا چاہے تو وہ ایسے افتراء کے ساتھ تیئیس برس تک یا اس سے زیادہ زندہ رہ سکتا ہے۔ یعنی افتراء علی اللہ کے بعد اس قدر عمر پانا اس کی سچائی کی دلیل نہیں ہو سکتی۔ اور بیان کیا کہ ایسے کئی لوگوں کا نام میں نظیراً پیش کر سکتا ہوں جنہوں نے نبی یا رسول یا مامور من اللہ ہونے کا دعویٰ کیا۔ اور تیئیس برس تک یا اس سے زیادہ عرصہ تک لوگوں کو سناتے رہے کہ خدا تعالیٰ کا کلام ہمارے پر نازل ہوتا ہے۔ حالانکہ وہ کاذب تھے" (اربعین ص۳)

اس پر حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے آیت قرآنی لو تقول علینا بعض الاقاویل۔ لاخذنا منہ بالیمین ثم لقطعنا منہ الوتین سے بڑی تحدی کے ساتھ استدلال فرمایا کہ نبوت کا کاذب مدعی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانۂ نبوت کے برابر زمانہ نہیں پا سکتا۔ یعنی دعویٰ کرنے کے بعد ۲۳ سال تک جو حضور کا زمانۂ نبوت ہے۔ ہرگز زندہ نہیں رہ سکتا۔ اور اگر کوئی شخص ایسی نظیر پیش کرے کہ کوئی جھوٹا مدعی باوجود اللہ تعالیٰ کی طرف جھوٹے الہامات منسوب کرنے اور ان کی کھلم کھلا تبلیغ کرنے کے پھر بھی ۲۳ سال تک زندہ رہا ہے تو میں ایسی نظیر پیش کرنے والے کو مبلغ پانچ سو روپیہ انعام دوں گا۔ چنانچہ حضور نے فرمایا:-

"اگر حافظ محمد یوسف صاحب اور ان کے دوسرے ہم مشرب جن کے نام میں نے اس اشتہار میں لکھے ہیں اپنے اس دعویٰ میں صادق ہیں۔ یعنی اگر یہ بات صحیح ہے کہ کوئی شخص نبی یا رسول اور مامور من اللہ ہونے کا دعویٰ کر کے اور کھلے کھلے طور پر خدا کے نام پر کلمات لوگوں کو سنا کر پھر باوجود مفتری ہونے کے برابر تیئیس برس تک جو زمانۂ وحی آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم ہے زندہ رہا ہے تو میں ایسی نظیر پیش کرنے والے کو بعد اس کے جو مجھے میرے ثبوت کے موافق یا قرآن کے ثبوت کے

موافق نبوت دیدے پانچ سو روپیہ نقد دیدوں گا۔ اور اگر ایسے لوگ کئی ہوں تو ان کا اختیار ہوگا کہ روپیہ باہم تقسیم کرلیں" (اربعین ۴ ص۱۱)

اس پر حافظ صاحب اور ان کے ہم مشرب تو چُپ سادھ گئے اور کوئی نظیر پیش نہ کر سکے۔ مگر مخالف علماء نے یہ عذر پیش کر دیا کہ یہ آیت تو شرعی نبیوں کے متعلق ہے۔ آپ چونکہ غیر شرعی نبوت کا دعویٰ کرتے ہیں اس لئے یہ دلیل آپؑ پر چسپاں نہیں ہوسکتی۔ اس پر حضورؑ نے اُن کے عذرات کی تردید کرتے ہوئے فرمایا کہ تمہارا سب سے بڑا عذر کہ صاحب شریعت افتراء کرکے ہلاک ہوتا ہے نہ کہ ہر مدعی، محض فضول اور کوتاہ اندیشی ہے۔ اور بہرحال تمہارے لئے مضر ہے۔ کیونکہ (۱) اس آیت میں تشریعی اور غیر تشریعی نبوت کے مدعی کی ہلاکت کی کوئی تصریح نہیں ہے (۲) اگر تم تشریعی نبوت کی یہ تعریف کرو۔ کہ اس میں اوامر و نواہی ہوں تو یہ تعریف من وجہ مجھ پر بھی صادق آتی ہے۔ (۳) اور اگر شریعت جدیدہ کی آڑ لے کر بچنا چاہو۔ اور یہ کہو کہ نئی شریعت لانے والا نبی ہلاک ہوتا ہے تو پھر قرآن کریم سے ہی دست بردار ہونا پڑتا ہے۔ کیونکہ قرآن کریم کے متعلق خود اللہ تعالےٰ کی گواہی موجود ہے۔ انّ ھٰذا لفی الصُّحف الاولٰی یعنی قرآن کریم کے بعض احکام پہلی شرائع میں موجود ہیں۔ (۴) اور اگر یہ عذر پیش کرو کہ کامل شریعت کا مدعی ہلاک ہوتا ہے تو پھر سنّت۔ حدیث اور اجتہاد کی کوئی گنجائش نہ رہیگی اور ہر بات قرآن کریم سے ثابت کرنی پڑے گی۔

چنانچہ یہ چاروں عذرات لنگ غلط ثابت کرتے ہوئے حضورؑ فرماتے ہیں:۔

"اور اگر کہو کہ صاحب الشریعۃ افتراء کرکے ہلاک ہوتا ہے نہ ہر ایک مفتری۔ تو اوّل تو یہ دعویٰ بے دلیل ہے۔ خدا نے افتراء کے ساتھ شریعت کی کوئی قید نہیں لگائی۔ ماسوا اس کے یہ بھی تو سمجھو کہ شریعت کیا چیز ہے۔ جس نے اپنی وحی کے ذریعہ سے چند امر اور نہی بیان کئے اور اپنی اُمت کے لئے ایک قانون مقرر کیا۔ وہی صاحب الشریعت ہوگیا۔ پس اس تعریف کی رُو سے بھی ہمارے مخالف ملزم ہیں۔ کیونکہ میری وحی میں امر بھی ہیں اور نہی بھی۔ مثلاً یہ الہام قل للمؤمنین یغضوا من ابصارھم ویحفظوا فروجھم ذٰلک ازکیٰ لھم [illegible] میں درج ہوا اور اس میں امر بھی ہے اور نہی بھی۔ اور اس پر ۲۳ برس کی مدت بھی گذر گئی۔ اور ایسا ہی

بلکہ ہیں کہ ادعیہ میں امر بھی ہوتے ہیں اور نہی بھی۔ اور اگر کہو کہ شریعت سے وہ شریعت مراد ہے جس میں نئے احکام ہوں تو یہ باطل ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ اِنَّ ھٰذَا لَفِی الصُّحُفِ الْاُوْلیٰ صُحُفِ اِبْرَاھِیْمَ وَ مُوْسیٰ۔ یعنی قرآنی تعلیم توریت میں بھی موجود ہے۔ اور اگر یہ کہو کہ شریعت وہ ہے جس میں باستیفاء امر اور نہی کا ذکر ہو۔ تو یہ بھی باطل ہے۔ کیونکہ اگر توریت اور قرآن شریف میں باستیفاء احکام شریعت کا ذکر ہوتا تو پھر اجتہاد کی گنجائش نہ رہتی۔ غرض یہ سب خیالات فضول اور کوتہ اندیشیاں ہیں۔ ہمارا ایمان ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم خاتم الانبیاء ہیں اور قرآن ربانی کتابوں کا خاتم ہے۔ تاہم خدا تعالےٰ نے اپنے نفس پر یہ حرام نہیں کیا کہ تجدید کے طور پر کسی اور مامور کے ذریعہ سے یہ احکام صادر کرے کہ جھوٹ نہ بولو۔ جھوٹی گواہی نہ دو۔ زنا نہ کرو۔ خون نہ کرو۔ اور ظاہر ہے کہ ایسا بیان کرنا بیانِ شریعت ہے۔ جو مسیح موعود کا بھی کام ہے۔ پھر وہ دلیل تمہاری کیسی گاؤخورد ہوگئی۔ کہ اگر کوئی شریعت لاوے اور مفتری ہو۔ تو ۲۳ برس تک زندہ نہیں رہ سکتا۔ یاد رکھنا چاہیئے کہ یہ تمام باتیں بیہودہ اور قابلِ شرم ہیں"

(اربعین نمبر ۴ صفحہ ۶-۷)

یہ حقائق پیش کر کے ہم اپنے انصاف پسند اور خدا ترس قارئین کی خدمت میں عرض کرتے ہیں کہ اگر یہ معترضین ایسی "بیہودہ اور قابلِ شرم" حرکات کر کے حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کے متعلق "چاہتے ہیں کہ وہ تباہ ہو۔ اس کا انجام بد ہو۔ اور وہ ان کی آنکھوں کے سامنے ہلاک ہو۔ اور اس کی جماعت متفرق اور نابود ہو۔ تب یہ لوگ ہنسیں اور خوش ہوں۔ اور ان لوگوں کو تمسخر سے دیکھیں۔ جو اس سلسلہ کی حمایت میں تھے۔ اور اپنے دل کو کہیں کہ تجھے مبارک ہو کہ آج تو نے اپنے دشمن کو ہلاک ہوتے دیکھا۔ اور اس کی جماعت کو تتر بتر ہوتے مشاہدہ

ف یہ تمام خط کشیدہ عبارت معترض نے اپنی اغراض فاسدہ کے منافی پاکر حذف کر دی تھی۔

کردیا" (اربعین ۳ صفحہ ۱۹) تو حضورؑ فرماتے ہیں :۔

" یہ ان لوگوں کی غلطی اور سراسر بدقسمتی ہے کہ میری تباہی چاہتے ہیں۔ مَیں وہ درخت ہوں جس کو مالکِ حقیقی نے اپنے ہاتھ سے لگایا ہے۔ جو شخص مجھے کاٹنا چاہتا ہے اس کا نتیجہ بجز اس کے کچھ نہیں کہ وہ قارون اور یہودا اسکریوطی اور ابوجہل کے نصیب سے کچھ حصہ لینا چاہتا ہے" (اربعین ۳ صفحہ ۱۵)

"کیا ان کی یہ مرادیں پوری ہو جاویں گی۔ اور کیا ایسا خوشی کا دن ان پر آئے گا۔ اس کا جواب یہی ہے کہ اگر ان کے امثال پر آیا تھا تو ان پر بھی آئیگا"۔

(اربعین ۳ صفحہ ۱۵)

پس حضورؑ کے دشمنوں کو حضورؑ کے مندرجہ ذیل الفاظ بگوشِ ہوش سُننے چاہئیں :۔

" اے لوگو! تم یقیناً سمجھ لو کہ میرے ساتھ وہ ہاتھ ہے جو اخیر وقت تک مجھ سے وفا کرے گا۔ اگر تمہارے مرد اور تمہاری عورتیں اور تمہارے جوان اور تمہارے بوڑھے اور تمہارے چھوٹے اور تمہارے بڑے سب مل کر میرے ہلاک کرنے کے لئے دُعائیں کریں یہاں تک کہ سجدے کرتے کرتے ناک گل جائیں اور ہاتھ شل ہو جائیں۔ تب بھی خدا ہرگز تمہاری دُعا نہیں سُنے گا۔ اور نہیں رُکے گا جب تک اپنے کام کو پُورا نہ کرلے ......

... خدا کے ماموریں کے آنے کے لئے بھی ایک موسم ہوتے ہیں اور پھر جانے کے لئے بھی ایک موسم۔ پس یقیناً سمجھو کہ مَیں نہ بے موسم آیا ہوں۔ نہ بے موسم جاؤں گا۔ خدا سے مت لڑو۔ یہ تمہارا کام نہیں کہ مجھے تباہ کردو" (اربعین ۳ صفحہ ۱۱)

اللہ تعالیٰ کے فضل اور اس کی دی ہوئی توفیق سے ہم "ختم نبوت نمبر" کے چیدہ چیدہ اور اہم اعتراضات کے جوابات سے فارغ ہونے کے بعد چونکہ ۲۲ر اپریل ۱۹۵۲ء کو عرشی صاحب کی طرف سے خط کا جواب موصول ہوگیا ہے۔ اس لئے ہم ہر دو خطوط بجنسہٖ درج ذیل کرتے ہیں۔ تا ناظرین کو یہ اندازہ لگانے میں آسانی ہو کہ اِس معاملہ میں ان لوگوں کی نیت حق طلبی اور حق گوئی کی ہے یا حیلہ سازی اور بہانہ جوئی کی۔

رجسٹرڈ

بسم اللہ الرحمن الرحیم نحمدہ و نصلی علی رسولہ الکریم وعلی عبدہ المسیح الموعود والمصلح الموعود

مکرمی ایڈیٹر صاحب "البیان"

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

آپ کا "ختم نبوت" نمبر جو نہایت محنت اور جانفشانی سے تیار کیا ہوا ہے۔ دراصل سلسلہ عالیہ احمدیہ کے عقائد کی مخالفت پر مبنی ہے۔ مجھے اس امر کی خوشی ہے کہ آپ اس مسئلہ پر توجہ دے رہے ہیں۔ اور یہ کہ آپ کے قارئین کرام کے لئے یہ سوال جاذب توجہ ہے۔

ازراہ انصاف اور تحقیق حق میں آپ سے درخواست کرتا ہوں۔ کہ آپ کے اس نمبر کا جواب جو سراسر محققانہ رنگ میں ہوگا اور سخت کلامی سے پاک ہوگا اس کو اپنے پرچہ میں شائع کر کے شکریہ کا موقعہ عطا فرماویں۔ اس سے آپ کے قارئین کرام کو دونو طرف کے دلائل سُن کر موازنہ کرنے کا موقعہ ملے گا اور اس لحاظ سے میں سمجھتا ہوں کہ آپ کا ایسا کرنا مفید ہوگا۔

اگر آپ کو یہ صورت منظور ہو۔ تو ازراہ کرم تحریر فرماویں کہ زیادہ سے زیادہ آپ اس امر کے لئے کتنے صفحات ہمیں دے سکتے ہیں۔

اگر اپنے رسالے میں ہمارا جواب آپ کسی وجہ سے شائع نہ کر سکتے ہوں۔ تو دوسری صورت یہ ہوسکتی ہے کہ ہم اپنا جواب بطور ضمیمہ البیان چھپوا کر آپ کے پاس بھیج دیں۔ امید ہے کہ ان دونو صورتوں میں سے ایک آپ ضرور منظور فرمالینگے۔

ایڈیٹر ریویو آف ریلیجنز

THE
"ALBAYAN"

AMRITSAR 20-4-46

مکرمی۔ وعلیکم السلام ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

گرامی نامہ پہنچا۔ میں اس عرصہ میں زیادہ تر سفر ہی میں رہا۔ اس لئے جواب میں تاخیر ہوئی۔ آپ کی توجہ کا شکر گذار ہوں۔ کیا یہ مناسب نہ ہوگا کہ آپ سب سے پہلے میرے سوالات منسلکہ پر توجہ فرمائیں۔ ان کی اشاعت کو دیر ہو چکی ہے۔ میں اور میرے احباب ان کے جوابات کے منتظر ہیں۔ اس کے بعد تفسیر قرآن کے چیلنج کی طرف خلیفہ صاحب محترم

کی توجہ منعطف کرائیں۔ آں جناب نے اپنی تقریروں اور تحریروں میں بڑے زور سے اپنی معجزانہ قرآن دانی کا دعویٰ فرمایا اور ملک بھر کو بلکہ دُنیا بھر کو چیلنج کیا۔ جب آپ کا چیلنج منظور کیا گیا تو آپ قطعاً خاموش ہو گئے۔ آپ ہی فرمائیں ہم اس کا مطلب کیا سمجھوں؟

آپ کے جوابات گذشتہ سلسلے سے تعلق رکھتے ہوں یا تازہ ختم نبوت نمبر سے۔ آپ کے صحیفہ گرامی میں شائع ہوں گے تو ان کی معقولیت و تحقیق ہم کو خود بخود اپنی طرف متوجہ کرے گی۔ ہم ان کو اپنے پرچے میں ملخصاً یا سالماً شائع بھی کریں گے صحیح کو قبول کریں گے اور بصورتِ دیگر جواب بھی دیں گے۔ اِن شاء اللہ

عرشی

مدیر البیان۔ امرتسر

ہم اِس جواب کے جواب الجواب میں اپنا مطالبہ پھر دُہراتے ہیں۔ کہ:۔

(۱) ہمارے موجودہ جوابات کو آپ اپنے رسالہ میں من و عن شائع کر کے جو اعتراض چاہیں کریں۔ ہم انشاء اللہ تعالیٰ اُن کے جوابات دیں گے۔ بشرطیکہ ہمارے جواب الجواب کو بھی آپ اپنے رسالہ میں بغیر کسی تغیر و تبدل کے شائع کرنے کا وعدہ کریں۔

(۲) اس کے بعد یہی مطالبات جو آپ خط کے ذریعہ سے کر رہے ہیں۔ بذریعہ رسالہ البیان کریں۔ نیز وعدہ کریں کہ ان سوالات کے جوابات کو بھی آپ اپنے رسالہ میں شائع کر دیں گے۔

(۳) اگر یہ جوابات بوجہ عدم گنجائش آپ ایک رسالہ میں شائع نہ کر سکیں تو دو تین قسطوں میں شائع کر سکتے ہیں۔ اور اگر یہ بھی نہ ہو سکے تو مارچ ۱۹۳۴ء کے ریویو میں شائع شدہ پانچ سوالات اپنے رسالہ میں شائع کر کے اُن کے جوابات سے ہی خوشوقت کریں۔ اور اگر آپ اس کے لئے بھی تیار نہیں ہیں تو صاف ظاہر ہے کہ آپ کا مطلب چھیڑ خانی کے سوا اور کچھ نہیں۔ اور ایسے لوگوں کو ہم آئندہ مخاطب نہیں کریں گے کیونکہ تضیعِ اوقات اور تضیعِ زر کے سوا اس کا اور کوئی فائدہ نہیں۔

آخر میں ہم اپنے ناظرین کی خدمت میں ایک بار پھر عرض کریں گے کہ "ختم نبوت" کے

ہمارے مندرجہ ذیل اعتراضات ہیں۔ اگر کوئی صاحب اِس موضوع پر کچھ لکھنا چاہیں تو نہیں چاہیئے کہ ہماری ان معروضات کو پیشِ نظر رکھیں۔ اور سب سے اوّل ان کا جواب دیں:۔

(۱) نبوت کا سلسلہ ہرگز بند نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ اس سے مخلوقِ خدا کو بے انتہاء فوائد پہنچے ہیں۔ اور فائدہ مند چیزوں کے متعلق قرآن کریم نے یہ اصل بیان فرمایا ہے کہ فَاَمَّا مَا یَنۡفَعُ النَّاسَ فَیَمۡکُثُ فِی الۡاَرۡضِ۔ کہ جو چیز نافع الناس ہوتی ہے وہ باقی رکھی جاتی ہے۔

(۲) اگر "خاتم النبیین" کے معنی "نبیوں کو بند کرنیوالا" کے ہیں تو یہ آیت تو متنازعہ فیہ ہے۔ ان معنوں کی مؤید قرآن کریم کی کوئی ایک آیت بطور گواہ پیش کریں۔ کیونکہ قرآن اپنی تفسیر آپ کرتا ہے۔

(۳) الیوم اکملت لکم دینکم..... کی آیت پیش کرنا لاحاصل ہے کیونکہ:۔

ا۔ اِس آیت میں دین کی تکمیل کا ذکر ہے۔ یہ ذکر تو نہیں کہ اب آئندہ کے لئے انسان بھی اخلاقی اور روحانی طور پر کامل ہو گئے ہیں۔ انبیاء کی بعثت کی غرض تکمیلِ نفوسِ انسانی ہوتی ہے۔ پس جب نبوت کی ضرورت موجود ہے تو لامحالہ نبوت بھی بند نہیں ہو سکتی۔

ب۔ یہ آیت تو اجرائے نبوت کی مؤید ہے۔ کیونکہ دین کے کامل ہونے کے یہ معنی ہیں کہ کامل دین پر چل کر کامل لوگ بھی پیدا ہو سکیں گے۔ اور اگر نہیں ہو سکیں گے تو کمالِ دین بے فائدہ ہوا۔

(۴) اگر نبوت بند ہو گئی ہے تو قرآن کریم کی رو سے "ختم نبوت" کے فوائد بہ تفصیل بیان کریں۔ یعنی یہ بیان کریں کہ نبیوں کا سلسلہ بند کرنے سے مخلوقِ خدا کو کیا کیا فوائد حاصل ہوسکتے ہیں۔ نیز عقل اور نقل سے اپنے بیان کو مبرہن کریں۔

(۵) جس چیز کے ذریعہ سے مُہر لگائی جاتی ہے۔ وہ اپنے غیر کو بند کرتی ہے۔ یہ نہیں ہوتا کہ خود بھی اس چیز کے ساتھ ہی بند ہو بیٹھے مطلب یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم دوسرے انبیاء کو بند کرنے والے ہیں۔ نہ کہ خود بھی اسی سلسلہ میں شامل ہو کر خاتم بمعنی مختوم ہو گئے ہیں۔

(۶) "خاتم النبیین" اگر آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے لئے مقام مدح میں بولا گیا ہے تو اس کا طبعی تقاضا یہ ہے کہ حضورؐ کے بعد نبی آئیں۔ اور خود کو حضورؐ کا غلام بتلائیں ورنہ خدا تعالٰے پر الزام آئے گا کہ اس نے بے جا حمایت کر کے حضورؐ کو اعلیٰ مراتب عطا فرما دیئے اور بعد کے لئے نبوت کا سلسلہ بند کر دیا۔ ورنہ ممکن تھا کہ بعد میں کوئی نبی ایسا بھی آجاتا جو حضورؐ سے درجہ میں بڑا ہوتا۔ اس اعتراض کو رفع کرنے کی بہترین صورت یہی ہے کہ حضورؐ کے بعد سلسلہ نبوت جاری رہے۔

(۷) اگر "خاتم النبیین" کے معنے ایسے بند کرنے کے ہی ہیں کہ نہ کوئی پرانا نبی باہر نکل سکے نہ نیا اندر داخل ہو سکے۔ تو :-

(۱) اس سے حضرت مسیح ناصری علیہ السلام کی وفات ثابت ہو گئی۔ اس کے نزول کی خبر بے معنی ٹھہری۔

ﻟﮧ اگر خاتم اور ختم اور خاتمہ اور آخر کی آڑ لیکر آپ لوگ نبوت بند کر سکتے ہیں تو پھر کیا (۱) ہجرت بھی ختم ہو گئی ہے۔ کیونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں اطمئن یا عم فانك خاتم المهاجرين في الهجرة كما انا خاتم النبيين في النبوة۔ (کنز العمال جلد ۶ ص۱۷۸) یعنی اے چچا! آپ اطمینان رکھیں کہ ہجرت کے لحاظ سے آپ ویسے ہی خاتم المہاجرین ہیں جیسا کہ میں نبوت کے لحاظ سے خاتم النبیین ہوں۔

(۲) ولایت بھی ختم ہو گئی ہے۔ کیونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے انا خاتم الانبياء وانت يا علي خاتم الاولياء۔ یعنی اے علی! میں خاتم الانبیاء ہوں اور آپ خاتم الاولیاء ہیں۔

(۳) عالم، شاگرد اور محدث بھی ختم ہو گئے ہیں۔ کیونکہ سید سلیمان صاحب ندوی نے "خاتمۃ التلامذہ" اور "خاتم المحدثین" اور "خاتمۃ العلماء" کے الفاظ مولوی حیدر علی صاحب فرنگی محلی۔ شاہ عبدالعزیز اور مولنا حبیب الرحمٰن خان صاحب شروانی کے لئے استعمال کئے ہیں۔

اگر نبوت، ہجرت۔ ولایت ختم ہو گئی ہیں۔ اگر عالم، شاگرد اور محدث بھی ختم ہو گئے

(۳) فرض کرو آپ لوگوں میں سے کوئی صاحب علم میں کمال حاصل کریں۔ اور وہ خاتم العلماء بن جائیں تو کیا وہ ان معنوں کی رُو سے یہ بات پسند کرینگے کہ ان کے بعد قیامت تک اُن کی اولاد علم سے محروم محض رہ جاوے۔ اور سب کے سب جاہل اور کندۂ ناتراش ہی رہیں۔ کیا ایسے انسان کو اس گھر کے لوگ مبارک سمجھیں گے یا منحوس۔ اسی طرح اولاد کے لحاظ سے کوئی صاحب پچھلا تمام ریکارڈ مات کردیں۔ اور خاتم الاولاد ہو جائیں اور آئندہ کے لئے سلسلہ اولاد کا ان کی نسل میں بالکل بند ہو جاوے۔ تو

ہیں۔ تو پھر یہ اُمت خیر الاُمم نہ ہوئی بلکہ شر الاُمم ٹھہری۔ جس میں نہ کوئی نبی ہے نہ مہاجر نہ ولی نہ شاگرد، نہ محدث۔ یہی نہیں بلکہ

(۴) چونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے۔ انی آخر الانبیاء و مسجدی ھٰذا آخر المساجد اس لئے حضورؐ کی مسجد کے بعد جس قدر مساجد بنائی گئی ہیں ان سب کو شہید کر دینا چاہیئے۔ کیونکہ یہ سب ناجائز طور پر بنائی گئی ہیں۔ اور ان میں نماز پڑھنا حرام ہے۔ لیکن کیا کوئی شخص مساجد کے انہدام کی جسارت کر سکتا ہے اور کوئی سلیم غیرت مسلمان ایسے بھی ہیں جو اِس ناپاک فعل کو بطیب خاطر منظور کرنے کے لئے تیار ہو سکتے ہیں؟ ہرگز نہیں۔ تو پھر اگر آخر المساجد کے بعد اس کی تبعیت میں اس قبلہ کی طرف رُخ کرنے والی مساجد تعمیر کرنا جائز ہے۔ تو آخر الانبیاء کے بعد حضورؐ کی تبعیت میں حضورؐ ہی کے دین پر چلانے والے انبیاء کا سلسلہ کس طرح ناجائز ہو سکتا ہے۔ اِس سلسلہ میں انی آخر الانبیاء و انتم خیر الامم کی حدیث پیش کرنا فضول ہوگا۔ کیونکہ اس کے معنے بھی صرف یہ ہیں کہ میرے بعد نئی اُمت بنانیوالا کوئی نبی نہ ہوگا۔ جو شخص بھی نبی ہوگا وہ میرا اُمتی بھی ہوگا۔ یعنی نبی تو ہوں گے پر نہ تو وہ کوئی نئی شریعت لائیں گے، نہ ان کا نیا قبلہ ہوگا، نہ وہ نئی اُمت بنائیں گے۔ بلکہ میرے ہی تابع رہ کر، میرے ہی قبلہ کو اپنا قبلہ بنا کر اور میری ہی شریعت پر عمل کر کے وہ نبی ہوں گے۔ فافھم و تدبرہ

[illegible] صفحہ

فرمائیے اُسے آپ بابرکت وجود خیال کریں گے یا پرلے درجہ کا منحوس۔ امید ہے اسی قدر سے آپ نے سمجھ لیا ہوگا۔ اصل بات یہ ہے کہ بُرائی اپنی ذات میں بُرائی ہوتی ہے اور اس کی شناخت کا سہل ترین طریق یہی ہے کہ انسان اسے اپنی طرف منسوب کرکے دیکھے۔ اگر اُسے بُری محسوس ہو تو اسے یقیناً سمجھنا چاہیئے کہ جو چیز وہ اپنی ذات کے لئے بُری سمجھتا ہے وہ دوسروں کے لئے بھی بُری ہی ہوگی۔ اگر خاتم النبیین کے یہ فرضی معنے اچھے ہوتے تو ہر شخص اُنہیں اپنی طرف فخر سے منسوب کرسکتا۔ مگر جب معمولی لوگ ان معنوں کو اپنی طرف منسوب کرنے سے جھینپتے ہیں تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جیسے عظیم الشان نبی کی طرف ان معنوں کو منسوب کرتے ہوئے تو اُنہیں شرم آنی چاہیئے۔

(۸) اگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد نبوت کا دروازہ بند تھا تو اللہ تعالےٰ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی معرفت حضورؐ کی اُمت سے یہ عہد کیوں لیا کہ آئندہ اگر کوئی نبی آئے تو اس پر ایمان لانا۔

اس اجمال کی تفصیل یہ ہے۔ کہ سورہ آل عمران میں اللہ تعالےٰ فرماتا ہے۔ اذ اخذ اللہ میثاق النبیین لما اٰتیتکم من کتٰب وحکمۃ ثم جاءکم رسولٌ مصدق لما معکم لتومننّ بہ ولتنصرنّہ۔ قال ءاقررتم واخذتم علیٰ ذٰلکم اصری۔ قالوا اقررنا قال فاشھدوا وانا معکم من الشّٰھدین ہ یعنی یاد کرو جب اللہ تعالےٰ نے نبیوں سے پختہ عہد لیا۔ کہ جو کچھ دوں میں تم کو کتاب اور حکمت میں سے۔ پھر آئے تمہارے پاس رسول تصدیق کرنے والا اُس چیز کی جو تمہارے پاس ہے۔ تو ضرور تم ایمان لاؤگے اس پر اور ضرور مدد کروگے اس کی۔ فرمایا کیا اقرار کیا تم نے اور لیا تم نے اس پر بھاری عہد میرا۔ انہوں نے کہا ہم نے اقرار کیا۔ فرمایا تو گواہ رہو تم اور مَیں بھی تمہارے ساتھ گواہوں میں سے ہوں۔

یہ عہد اللہ تعالےٰ نے ہر نبی سے لیا۔ ہر نبی نے آنے والے نبی کے متعلق پیشگوئیاں فرمائیں اور ہر آنے والے نے اپنے سے پہلے نبی کی تصدیق کی۔ یہی عہد اللہ تعالےٰ نے

آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم سے بھی لیا۔ جیساکہ سورہ احزاب میں اس کا ذکر ہے۔
چنانچہ حضورؐ نے اس آنے والے کے متعلق پیشگوئیاں فرمائیں۔ اس کا حلیہ بتایا۔
زمانہ بتایا اور اس کی شناخت بتلائی۔ اب اگر حضورؐ کے بعد کوئی نبی آنے والا
نہ تھا، تو سب سے پہلا سوال یہ ہے کہ حضورؐ سے اللہ تعالےٰ نے یہ عہد کیوں لیا؟

دوسرا سوال یہ ہے کہ آج سے تیرہ سو سال قبل تو لوگوں نے حضورؐ کی سینکڑوں
ہزاروں پیشگوئیاں اور ہزارہا معجزات اپنی آنکھوں کے سامنے پورے ہوتے
دیکھ کر حضورؐ کی صداقت تسلیم کی تھی۔ مگر آج ۱۳ سو سال کے بعد اس زمانہ کے لوگوں
کے لئے حضور پر نورؐ کی صداقت کا بجز اس کے کیا ثبوت ہے کہ اس زمانہ کے متعلق
حضورؐ کی جو پیشگوئیاں ہیں وہ ایک اور ایک دو کی طرح پوری ہو کر لوگوں کے
ازدیاد ایمان کا موجب ہوں۔ مگر افسوس ہے کہ علماء کہلانے والے ہی آج ان روشن
نشانوں سے اعراض کر کے مخلوقِ خدا کو گمراہی کے گڑھے میں دھکیل رہے ہیں۔
انا للہ و انا الیہ راجعون۔

(۹) خاتم النبیین کی آیت آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوئی تھی۔ ہمیں
یہ دیکھنا چاہیئے کہ حضورؐ نے اس آیت کا مفہوم کیا سمجھا تھا۔ نزولِ آیت کے پانچ سال
بعد حضورؐ کے لختِ جگر حضرت ابراہیمؑ کی وفات پر حضورؐ نے فرمایا۔ لوعاش لکان
صدیقاً نبیاً۔ یعنی اگر حضرت ابراہیمؑ زندہ رہتے تو ضرور صادق نبی ہو جاتے۔
اس فقرے میں بھی سید سلیمان صاحب ندوی والا "لَوْ" موجود ہے۔ جو
امر محال کے لئے آتا ہے۔ افسوس سید صاحب نے لَوْ کا دخول امر محال پر تو بتلا
دیا۔ مگر یہ نہ بتلایا کہ اس امر محال میں صرف شرط ہی محال ہوتی ہے جس پر لَوْ
داخل ہوتا ہے۔ اس کی جزا محال نہیں ہوتی۔ چنانچہ اس حدیث میں حضرت ابراہیمؑ
کا زندہ رہنا ہی محال تھا۔ ورنہ نبی ہو جانا کوئی محال نہ تھا۔ جیسے لوکان فیھما
آلھۃ الا اللہ لفسدتا۔ یعنی اگر زمین و آسمان میں اللہ تعالےٰ کے سوا کئی خدا
ہوتے، تو ان میں فساد پڑ جاتا۔ اس میں ایک سے زیادہ خداؤں کا ہونا ہی محال
ہے لیکن اگر ہوں تو پھر فساد کا ہونا محال نہیں ہے۔

(۱۰) آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے بعد قرآن کریم کی سب سے زیادہ سمجھنے والی

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالےٰ عنہا ہیں۔ جن کی گود مبارک میں اور جن کے گھر میں قرآن کریم اترتا تھا۔ وہ لکھا فرماتی ہیں۔ قولوا انہ خاتم الانبیاء ولا تقولوا لا نبی بعدہ۔ یعنی اے لوگو! یہ تو کہو کہ آپ خاتم النبیین ہیں مگر یہ نہ کہو کہ آپ کے بعد نبی کوئی نہیں۔ اور ایک سچے مسلمان کا فرض ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زوجۂ محترمہ کا حکم سن کر اختلاف رائے کی صورت میں بھی انتہائی تذلل اور فروتنی سے فرمانبرداری کے لئے سرِ تسلیم خم کر دے۔ کہ اس کے دین و دنیا کی بہتری اسی پر موقوف ہے۔

وَآخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ

حب الاطہرا

نافع اسقاط حمل کا مجرب علاج

شناخت۔ جن کے گھر حمل گر جاتے ہیں۔ مُردہ بچے پیدا ہوتے ہیں۔ پیدا ہو کر امراض ذیل میں مبتلا ہو کر مرجاتے ہیں۔ سبز پیلے دست۔ قے۔ پسلی کا درد۔ پیچش۔ ام الصبیان (غشی) نمونیا۔ پرچھاواں یا سُوکھا۔ بدن پر پھوڑے پھنسی۔ چھالے نکلنا۔ بدن پر خون کے دھبے پڑنا دیکھنے میں بچہ موٹا تازہ معلوم ہونا۔ بیماری کے معمولی صدمہ سے جان دیدینا۔ بعض بچے ماں کے پیٹ میں ہی زہر یادے کھائے جاتے ہیں۔ جب پیدا ہوتے ہیں تو ان کا کوئی حصہ کھایا ہوا ہوتا ہے۔ مُردہ پیدا ہوتے ہیں۔ یا پیدا ہوتے ہی مرجاتے ہیں۔ اور بعض کی خلقت نامکمل ہوتی ہے۔ یعنی ہاتھ پاؤں یا انگلی۔ناک۔کان۔ہونٹ غرضیکہ کوئی اعضا نامکمل ہوتا ہے جس سے بچہ بد شکل ہو کر والدین کے لئے تمام عمر کا دُکھ ہوتا ہے۔ بعض کے ہاں لڑکیاں ہی پیدا ہونا اور زندہ رہنا مگر لڑکے زندہ نہ رہنا اور اٹھارہ سال سے پہلے ہی فوت ہو جانا۔ وغیرہ اس مرض کو طبیب اٹھرا یا اسقاطِ حمل کہتے ہیں۔ ڈاکٹر مس کیرج کہتی ہیں کہ اس موذی مرض نے کروڑوں خاندان تباہ و برباد کر دیئے اور لاکھوں گھر بے چراغ کر دیئے ہیں جو ننھے بچوں کے مُنہ دیکھنے کو ترستے رہے اور اپنی قیمتی جائدادیں غیروں کے سپرد کر کے دائمی داغ دل پر لے گئے۔ مولا کریم ہر ایک کو اس مرض سے امن میں رکھے۔

خاکسار حکیم نظام جان شاگرد حضرت خلیفۃ اوّلؓ دواخانہ معین الصحت نے استاذی المکرم قبلہ حضرت مولوی نور الدینؓ شاہی طبیب سرکار جموں و کشمیر سے طب سبقاً پڑھی اور حضورؓ کے حکم سے ہی یہ دواخانہ مذکور قائم ہؤا۔ اور اٹھرا کا مجرب ترین علاج حب اٹھرا رجسٹرڈ کا حضورؓ کے ارشاد سے اشتہار دیا۔ تا خلق خدا فائدہ حاصل کرے اور احتیاطاً گورنمنٹ آف انڈیا سے رجسٹرڈ بھی کرالیا ہے تاکہ پبلک کو کسی ملتے جُلتے نام دیکھنے سے دھوکہ نہ لگ جائے۔ (یاد رکھیں) حبِ اٹھرا رجسٹرڈ حضرت مولینا اُستاذی المکرم کا مجرب نسخہ حبِ اٹھرا ہے۔ اِس نسخہ کو نہ کوئی بنا سکتا ہے اور نہ حب اٹھرا رجسٹرڈ فروخت کر سکتا ہے۔ صرف دواخانہ ہذا کے لئے رجسٹرڈ ہے۔ آرڈر دیتے وقت حب اٹھرا رجسٹرڈ اور خاکسار حکیم نظام جان دواخانہ معین الصحت یاد رکھیں +

[illegible] مشہور رجسٹرڈ کے استعمال سے بچہ بفضل خدا ذہین ۔ خوبصورت [illegible]
[illegible] تندرست پیدا ہوتا ہے ۔ [illegible] کے لئے [illegible] ہوتا ہے [illegible]
[illegible] ۔ یکدم منگوانے پر صرف بارہ روپیہ [illegible] محصولڈاک ۔ حمل سے پہلے [illegible] کھلائی جاتی ہیں
[illegible] سے لیکر جب تک بچے دو سال کا نہ ہو جائے ۔ گیارہ تولہ گولیاں خرچ آتی ہیں ۔

حبوب عنبری (رجسٹرڈ) یہ گولیاں عنبر ۔ مشک ۔ عقیق ۔ زعفران و دیگر قیمتی اجزاء سے مرکب ہیں ۔ انکا استعمال ان لوگوں کیلئے ہے
جنکی قوت رجولیت کم ہو چکی ہو ۔ اعصاب سرد پڑ چکے ہوں ۔ دل ٹھنڈا ہو گیا ہو [illegible] گیا ہو ۔
چہرہ بے رونق ۔ حافظہ کمزور ۔ اعضائے رئیسہ سرد پڑ گئے ہوں ۔ کمر درد ہوتا ہو ۔ کام کرنے کو جی نہ چاہتا ہو حبوب عنبری کا استعمال
بجلی کا اثر دکھاتا ہے گئی ہوئی طاقت واپس آجاتی ہے دل میں خوشی اور سرور پیدا ہوتا ہے اعصاب [illegible] طاقتور
ہو جاتے ہیں جسم فربہ چست و چالاک ہو جاتا ہے ۔ گویا ضعیفی کی دشمن ہے جوانی کی محافظ ہے ۔ جاڑے میں [illegible] اور درد [illegible]
حبوب عنبری ایک بار کھانے سے ۴ سال تک مقوی ادویات کھانے سے چھٹی ہوتی ہے قیمت ایکماہ کی خوراک ۔ ۶ گولی [illegible]

المشتہر

حکیم نظام جان شاگرد حضرت خلیفۃ المسیح الاوّلؓ دواخانہ معین الصحت احمدیہ چوک قادیان

محترمہ بیگم شاہنواز ایم ایل اے کا مکتوب گرامی

۴ ۔ لارنس روڈ لاہور

مورخہ ۹ رمئی ۱۹۴۲ء محترم حکیم صاحب ۔ السلام علیکم مزاج شریف ۔ آپکے مجرب سرمہ سے میری آنکھیں بالکل درست ہو گئی ہیں
آپنے ایسی نایاب دوا بنا کر ہم سب کو ممنون احسان کیا ہے ۔ یہ سرمہ نہایت اچھا ہے اور جو بہن بھائی اسے
استعمال کرینگے وہ آپکے ممنون ہونگے ۔ برائے مہربانی دو شیشیاں سرمہ جواہر والا اور ٹھنڈا سرمہ انکی بلدیہ دیکر
بیگم افتخار الدین کو فی الفور ارسال کر دیں ۔ رقیہ جہاں آرا شاہنواز قبل ازیں ایک گرامی نامہ میں انہیں
سرموں کے متعلق محترمہ موصوفہ نے تحریر فرمایا تھا کہ آپ کا سرمہ نہایت مفید ثابت ہوا ہے ۔ میری لڑکی
نے اسے استعمال کیا ہے انکی آنکھیں بالکل درست ہو گئی ہیں ۔ میں آپکو [illegible]
پرتہ دل سے مبارکباد دیتی ہوں ۔ امید ہے کہ یہ چیز **مقبول خاص و عام ہوگی ۔**

ٹھنڈا سرمہ دو روپے شیشی ۔ سرمہ جواہر والا رجسٹرڈ مبلغ دس روپے فی تولہ ۔

ملنے کا پتہ

طبیہ عجائب گھر رجسٹرڈ قادیان [illegible]

لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ

هُوَ الَّذِي أَرْسَلَ رَسُولَهُ بِالْهُدَىٰ وَدِينِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهُ عَلَى الدِّينِ كُلِّهِ

ماہنامہ

ریویو آف ریلیجنز (اردو)

یعنی

دنیا کے مذاہب پر نظر اور اہل مذاہب کا تشحیذ الاذہان

جلد ۳۵ | ماہ شعبان ۱۳۶۵ھ مطابق ماہ جولائی ۱۹۴۶ء | عدد ۷

فہرست مضامین

ایڈیٹوریل نوٹس

احمدیت دُنیا میں کیونکر غالب ہوگی؟

کوئی دو مہینے کی بات ہے کہ راقم الحروف لائل پور سے آرہا تھا۔ ریل گاڑی کا انٹر کلاس کا چھوٹا سا ڈبہ مسافروں سے کھچا کھچ بھرا ہؤا تھا۔ ایک حصہ سفر کا خاموشی میں گذر گیا۔ مگر سانگلہ ہل سے ایک نوجوان اس ڈبہ میں سوار ہؤا جس کو پہلے مسافروں میں سے ایک پہچانتا تھا۔ اِن دونوں میں معمولی اور رسمی سی گفتگو شروع ہوئی جو جلد ہی پنجاب اسمبلی کے گذشتہ انتخابات پر راستے زنی کا رنگ اختیار کر گئی جس میں دوسرے لوگ بھی گرم جوشی سے حصہ لینے لگ گئے۔ مسلم لیگ، یونینسٹ اور موجودہ وزیر اعظم پنجاب کی پالیسی کے حُسن و قبح پر بحث ہونے لگی۔ جو گو مسلمان مسافروں تک محدود تھی، مگر ڈبے کی غیر مسلم سواریاں بھی اُسے پُوری دلچسپی سے سُن رہی تھیں۔ اور اُن کے انداز سے معلوم ہوتا تھا کہ اُن کی اخلاقی تائید اُن لوگوں کے ساتھ ہے جو یونینسٹ پالیسی کی حمایت کر رہے ہیں۔ ضلع ہوشیارپور کے ایک متوسط العمر ذیلدار مسلم لیگی سیاست کی خامیاں بہت شد و مد سے بیان کرتے تھے اور یونینسٹ زاویۂ نگاہ کی پُوری طرح تائید و تصدیق۔

ایک مرحلہ پر اس گفتگو میں مَیں نے بھی حصہ لیا اور ان ذیلدار صاحب کے دریافت کرنے پر مَیں نے بتایا کہ مَیں احمدی ہوں اور قادیان سے میرا تعلق ہے۔ جس پر انہوں نے مسلم لیگ کو چھوڑ کر اپنی ساری توجہ میری طرف بلکہ یوں کہنا چاہیئے کہ سلسلہ احمدیہ کی طرف پھیر دی۔ اعتراض پر اعتراض۔ طنز آمیز گفتگو مگر باتیں اُن کی سطحی اور سفلی تھیں۔ مَیں نے جواب دینے میں قدرے توقف کیا۔ تا ایک طرف تو اُن کی گفتگو کا ناپسندیدہ رنگ لوگوں پر عیاں ہو جاتے۔ اور دوسری طرف کوئی بات اُن کے مُنہ سے ایسی نکلے جو قابلِ التفات ہو۔ جب وہ

مسلمانوں کے تنزل اور سیاسی اور دینی انتشار کا نوحہ کر رہے تھے تو میں نے کہا، کہ رحمت ربی نے نجات کا دروازہ بصورت سلسلہ عالیہ احمدیہ اُن کے لئے کھول دیا ہے اس میں داخل ہونا نہ ہونا اُن کا کام ہے۔ وہ کہنے لگے کہ میں تو کبھی یہ راستہ اختیار نہ کروں گا۔ حتٰی کہ جوش میں اس قسم کا فقرہ بھی کہہ گئے کہ مجھے تو اگر خدا بھی کہے تو نہ مانوں گا۔ مَیں نے کہا خیر یہ تو آپ کی مرضی اور قسمت کی بات ہے مگر ہاں دُنیا کا کثیر حصہ ضرور اس دروازہ میں داخل ہو کر امن پائے گا۔

اس پر وہ بہت برافروختہ ہوئے اور ہنسی ٹھٹے سے اپنے سینے کی آگ کو ٹھنڈا کرتے رہے، لیکن اُن کے مُنہ سے یہ فقرہ بھی نکل گیا کہ یہ محض تمہاری مجنونانہ بڑ ہے جو یہ کہتے ہو کہ ایک دن دُنیا کا کثیر حصہ احمدیت قبول کرلے گا۔ میں نے کہا بڑ نہیں دلائل اور شواہد پر مبنی علی وجہ البصیرت قائم کی ہوئی رائے ہے جس کی صحت اگر آپ غور سے سُننے کے لئے تیار ہوں میں ابھی ثابت کر سکتا ہوں کہنے لگے بہت اچھا ثابت کرو۔

مگر میں نے تمہید کے چند ابتدائی فقرے ہی مُنہ سے نکالے تھے کہ گھبرا کر میری بات کو کاٹنے لگے۔ اب میں نے انہیں مضبوطی سے پکڑ لیا کہ میں اتنا عرصہ آپکی ہر قسم کی پسندیدہ اور ناپسندیدہ بات توجہ اور غور سے سُنتا آرہا ہوں اب انصاف کا تقاضا ہے کہ آپ میری بھی سُنیں۔ اس بات میں تمام ہمراہی افراد نے بھی میری تائید کی اور وہ صاحب ایک حد تک خاموشی سے سُننے پر مجبور ہو گئے۔

میری دلیل یہ تھی کہ بنی نوع انسان کی مشکلات و مصائب کا جو حل مختلف سیاسی فلسفے اور مذہبی تحریکیں پیش کرتی ہیں اسلام کی تعلیم ان سب میں اعلیٰ اور افضل ہے اور جوں جوں لوگ حالاتِ زمانہ کے ہاتھ سے تنگ ہو کر ان مسائل پر ٹھنڈے دل سے غور کرنے لگیں گے اسلام کو قبول کرنے کے سوا چارہ نہ پائیں گے۔ اور احمدیت چونکہ عین اسلام ہے اس لئے احمدیت کا غلبہ لازمی اور یقینی ہے۔ صرف دیر اس بات کی ہے کہ لوگ کب خالی الذہن ہو کر ان اُمور پر سوچنا شروع کرتے ہیں۔ اس دلیل کو جب میں نے پھیلانا شروع کیا اور مثالوں

کے ساتھ واضح کیا تو ہمراہی مسافروں کے لئے گونہ توجہ کا موجب ہوا۔ ذیلدار صاحب اب وہ شور وغوغا نہ کر سکتے تھے، کیونکہ اب دوسرے لوگ سننے کے خواہشمند تھے اور انہیں بات کاٹنے سے روکتے تھے۔

مَیں بات کر ہی رہا تھا کہ گاڑی شیخوپورہ کے سٹیشن پر پہنچ گئی اور حُسنِ اتفاق سے جماعت احمدیہ شیخوپورہ کے تبلیغی سیکرٹری اس ڈبہ میں سوار ہوئے۔ مجھے اُن سے تعارف نہ تھا مگر گاڑی میں سوار ہوتے ہی انہوں نے جان لیا کہ مذہبی گفتگو ہو رہی ہے جس کے ڈورے انہوں نے فوراً سنبھال کر اپنے ہاتھ میں تھام لئے۔ اب مَیں خاموش ہو گیا اور اتفاق کہیئے یا اس بھائی کی زود فہمی اور فراست کہ میری دلیل کا جو حصّہ بیان ہونے کو باقی تھا عَین اُسی کو انہوں نے بیان کرنا شروع کر دیا۔ اور مجھ سے بہت بڑھ چڑھ کر اس مضمون کا حق انہوں نے ادا کیا۔ اب ذیلدار صاحب سمٹ کر اپنی جگہ میں بیٹھ گئے تھے۔ اور احمدی عقائد، احمدی خیالات اور احمدی' مگیں ریل کے اس ڈبہ میں، اور شریف النفس ہندو، سکھ اور مسلمان مسافروں کے کانوں اور دلوں میں گونج رہے تھے۔ کیونکہ جونہی انہیں موقعہ ملا یہ خیالات برق رفتار بادل کی طرح اُس ڈبے میں چھا گئے اور گاڑی لاہور پہنچی تو کوئی خیال اُن کے مقابل پر اُٹھتا نظر نہ آتا تھا۔

یہی حال دُنیا کا ہے۔ احمدیت کے خلاف زہریلی خصلت رکھنے والے معاندین کی شب و روز کی تگ و دو یہ ہے کہ دُنیا احمدیہ عقائد اور احمدی نصب العین پر ٹھنڈے دل سے غور نہ کرنے پائے۔ والغوا فیہ یعنی شور و غوغا، ہنسی مخول، طعن و تشنیع سے صداقت پر پردہ ڈالنے کی کوشش کرنا شیطان کا پُرانا ہتھیار ہے جسے وہ ہر نبی کے مقابلے میں چلاتا رہا ہے اور ہمیشہ ناکام و نامراد رہا ہے۔

اب بھی ازل سے یہی مقدر ہے۔

بار بار فتح

اِسی بات کو ایک دوسری جہت سے دیکھ لیجئے! زمانۂ حال کا مسلمان چاہیئے

کیفر کردار کے سمندر میں ڈوب رہا ہے اس کو بچانے کے لئے رحمتِ خداوندی نے ایک مضبوط رسّہ اس کے ایسا قریب پھینکا ہے کہ اگر یہ چاہے تو بلا کسی تکلیف و مشقت کے فوراً اس کو پکڑ کر سلامتی کے کنارہ پر پہنچ جائے۔ مگر اس کی بدبختی دیکھئے کہ اس خدائی سبیلِ نجات کی طرف متوجہ نہیں ہوتا بلکہ سطحِ آب پر بہنے والے خس و خاشاک پر اس امید میں دیوانہ وار ہاتھ مارتا ہے کہ اس کو پکڑ کر غرقاب ہونے سے بچ جائے۔ بھلا ان تنکوں میں کسی ڈوبتے کو بچانے کی طاقت کہاں! جہاں ان پر ہاتھ پڑا ڈبکیاں کھانے والے سے بھی پہلے یہ خود زیرِ آب ہو جاتے ہیں۔

جب سیدنا حضرت مسیح موعود علیہ السلام نے دعوےٰ کیا تو لوگوں نے اُن کی تکذیب کی اور نہایت فخر اور تمرد سے کہا کہ مسلمانوں کے زوال کا علاج سلاطینِ ٹرکی کریں گے۔ اس کے بعد جو حشر ان سلاطین کا ہوا وہ سب کو معلوم ہے۔ پھر ان لوگوں نے کہا کہ مسلمانوں کی بے دینی اور بداخلاقی کا علاج علماءِ کرام کریں گے۔ اور ان کا یہ کہنا تھا کہ علماء کا اثر و رسوخ مٹی میں ملنا شروع ہو گیا۔ حتّٰی کہ اب مسلمان قوم کے نزدیک مولانا ابوالکلام جیسی ہستیاں اور جمعیۃ العلماءِ ہند اور دیوبند ایسے مقتدر ادارے قوم فروشی کی لعنت میں گرفتار ہیں۔ پھر ایک طبقے نے خیال کیا کہ مسلمانوں کی تنظیم و تقویم احرار اور خاکسار کریں گے۔ مگر ان دونوں گروہوں کی نااہلی بھی قوم پر بہت جلد عیاں ہو گئی۔ مسلمانوں کے ایک معقول طبقہ نے علیگڈھ کالج اور یونیورسٹی کے ساتھ بھی بہت سی امیدیں اور امنگیں وابستہ کر رکھی تھیں۔ مگر جہاں تک حفاظت و تبلیغ دین کا تعلق ہے علیگڈھ کا خانہ بھی بالکل ہی خالی رہا۔ علیگڈھ نے چند مسلمانوں کو بی۔ اے کی ڈگری اور سرکار کے ہاں اچھی نوکری تو دلا دی، مگر ملکانوں کے ارتداد کا طوفان خود علیگڈھ کی دیواروں کے ساتھ ٹکر کھاتا رہا اور کسی پروفیسر کسی عالم کسی طالب علم کسی ادارے کو ادھر توجہ کرنے کی توفیق نصیب نہ ہوئی۔

برخلاف اس کے احمدیت کو دیکھیے۔ ہر اُس میدان میں جہاں اسلام پر

حملہ ہوتا ہے احمدیت حفاظتِ اسلام میں پیش از پیش سعی کرتی نظر آتی ہے۔ تالیف و تصنیف کے ذریعے، اخبارات و رسائل کے ذریعے، مبلغین کے ذریعے۔ شب و روز ایک ہی خیال ہے اور ایک ہی لگن۔ ملکانوں میں شُدھی کی تحریک پھیلی تو اُس کو احمدی مجاہدین نے روکا اور افریقی مسلم علاقوں میں عیسائیت کے دجل کا مقابلہ بھی احمدیت ہی کر رہی ہے اور عیسائیت کے سب سے بڑے قلعہ برطانیہ اور امریکہ پر بھی احمدیت ہی حملہ آور ہو رہی ہے۔

دُنیا میں گو جاہل، بے وقوف اور سطحی لوگوں کی کمی نہیں اور یہ لوگ احمدیت کے خلاف ہر قسم کے حربے استعمال کرتے ہیں۔ مگر دُنیا میں اہلِ نظر بھی ہیں، اور اُنہیں بنی نوعِ انسان کا مستقبل خوفناک اور بھیانک نظر آتا ہے خطرے کا یہ احساس اُنہیں ایک دن احمدیت کی تعلیم کو توجہ سے دیکھنے پر مجبور کر دیگا۔ پس اُسی دن احمدیت کی فتح یقینی ہے۔

ایک سبق آموز واقعہ

صوفی مطیع الرحمٰن صاحب ایم۔اے جو ایک عرصہ سے امریکہ میں انچارج احمدی مبلّغ ہیں بنگال کے رہنے والے ہیں جہاں اُن کا آبائی وطن برہمن بڑیہ کے نواح میں کیست نامی ایک گاؤں ہے۔ صوفی صاحب کے والد بزرگوار اپنے علاقہ میں ایک صاحبِ عزّت بزرگ اور پیر کی حیثیت رکھتے تھے مگر جب انہوں نے احمدیت قبول کر لی تو اپنے پرائے سب دشمن ہو گئے۔ اور اُن کی ایذا دہی سے تنگ آکر اُنہیں وطن تک چھوڑنا پڑا۔

صوفی صاحب کے ایک بڑے بھائی مولوی ظل الرحمان صاحب بنگال میں احمدی مبلّغ کے طور پر کام کر رہے ہیں۔ ان دنوں بنگال کی تبلیغی رپورٹ میں یہ خبر ہم نے بہت خوشی سے پڑھی کہ ابھی حال میں جو احمدیہ کانفرنس بمقام تارونا منعقد ہوئی اُس میں مولوی صاحب کے ایک رشتہ دار شامل ہوئے جنہوں نے احمدیت قبول کی اور بتایا کہ مولوی صاحب کے آبائی وطن

یعنی کہہ سکتے ہیں اُن کے وہ رشتہ دار احمدیت میں شامل ہونے کے لئے تیار بیٹھے ہیں جن کی ایذا دہی کی وجہ سے مولوی صاحب کے والد بزرگوار کو وطن چھوڑنا پڑا تھا۔ چنانچہ مولوی صاحب وہاں جاکر تین روز ٹھہرے جس عرصہ میں اُن کے چودہ رشتہ داروں نے بیعت کی۔ فالحمدللہ علیٰ ذالک۔

اس قسم کے واقعات سلسلہ احمدیہ کی تاریخ میں ایک نہیں کئی ہیں۔ اور حکماء کا قول ہے کہ تنکے اُڑتے دیکھکر دانشمند ہوا کا رُخ معلوم کر لیتے ہیں۔ پس احمدیت کے غلبہ کا وقت ہر لحظہ اور ہر آن قریب سے قریب تر آرہا ہے۔

مُسلم لیگ کی طرف سے وزارتی مشن کی سکیم کے متعلق قبولیت کا اعلان

مسلم لیگ کی طرف سے وزارتی مشن کی سکیم کے بارے میں قبولیت کا اعلان تمام اُن حلقوں میں خوشی اور امید کے ساتھ پڑھا جائے گا ۔ جو ہندوستان کی حقیقی بہبودی کے خواہاں ہیں ۔ مسٹر جناح نے اِس مرحلہ پر حق رہنمائی قابلِ داد رنگ میں ادا کیا ہے۔ اب کانگرس کو بھی چاہیئے کہ اِس سکیم کو منظور کرے ۔ اور اگر ہندوستان کی دونوں سیاسی جماعتیں تہ دل سے اِسے کامیاب بنانے کی کوشش کریں تو ممکن ہے کہ پاکستان اور اکھنڈ ہندوستان کا قضیہ ایک غیر ضروری بحث میں تبدیل ہو کر خود بخود نظر سے اوجھل ہو جائے ۔ جو لوگ اکھنڈ ہندوستان کے قائل ہیں اُن کے لئے اب موقعہ ہے کہ ہندوستان کے مسلمانوں کا اعتماد حاصل کرلیں۔ اگر آئندہ دس سال میں بھی وہ مسلمانوں اور دیگر اقلیتوں کا اعتماد حاصل کرنے میں ناکام رہے تو ہندوستان کا ٹکڑے ٹکڑے ہو جانا لازمی ہے ۔ جب تک اصل مرض دُور نہ ہو یعنی ہمیں ایک دوسرے پر اعتماد نہ پیدا ہو ۔ اکھنڈ ہندوستان کا تصور شاعرانہ خام خیالی سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا۔ اور یہ اعتماد صرف اِسی صورت میں پیدا ہو سکتا ہے کہ ہندو بھائی اب فراخدلی اور وسعتِ قلبی سے کام لیں۔

اِس موقعہ پر ہندوستان کے مسلمانوں کو یہ بات اچھی طرح ذہن نشین کرلینی چاہیئے کہ اپنے تہذیب وتمدن اور مذہب کو ہندوستان میں محفوظ کرلینے کا جو فرض اُن پر لاحق ہے وہ وزارتی سکیم کو منظور کرلینے کے ساتھ پورا نہیں ہوجاتا بلکہ اس کی ادائیگی کی صرف ابتداء ہوئی ہے۔ اب اُن کے لئے موقع ہے کہ اپنے گھر کو صاف ستھرا کرکے محفوظ کرلیں۔ اور اپنی مرضی کے مطابق اس کی تزئین کریں۔ اب اُن کے کام کا زمانہ شروع ہوتا ہے۔ اگر انہوں نے یہ سمجھ لیا کہ کام اُن کا مکمل ہوچکا اور اب انہیں آرام کرنا چاہیئے تو یہ خیال اُن کے لئے ازحد مُہلک ہوگا۔

فلسطین

قضیۂ فلسطین کے سلسلہ میں عرصۂ زیرِ نظر میں ایک اہم واقعہ یہ ظہور پذیر ہوا ہے کہ شاہِ فاروق والئے مصر کی دعوت پر سات عرب مُلکوں کے فرمانرواؤں یا اُن کے نمائندوں کی مجلس ہوئی جس میں متفقہ طور پر قرار پایا کہ فلسطین ایک عرب مُلک ہے اِس میں کسی غیر عرب عنصر کو لاکر بسانے کی اجازت نہیں دی جاسکتی اور یہ کہ اِس معاملہ میں تمام عرب مُلکوں کو چاہیئے کہ یہودی یورش کے پیشِ نظر فلسطینی عربوں کی مقدور بھر پوری مدد کریں۔ گویا عالمِ عرب واسلام فلسطین کے معاملہ میں متفق ویک زبان ہے۔ برطانیہ وامریکہ کو چاہیئے کہ اِن لوگوں کے جذبات سے کھیلنا چھوڑ دے جنہوں نے اُن کا کچھ بگاڑا نہیں بلکہ پچھلے بیس سالوں میں دو مرتبہ نہایت تاریک ایام میں اُن کا مضبوطی اور وفاداری سے ساتھ دیا ہے۔

دوستی کا بدلہ دوست فروشی نہیں ہونا چاہیئے +

عبدالقدیر نیاز

9/6/46

ارشاد اللبیب الی کسر الصلیب

یعنی

شہادۃ القرآن مصنفہ میر سیالکوٹی کا جواب

نمبر ۶

(تسلسل کے لئے ملاحظہ ہو ریویو آف ریلیجنز مئی ۱۹۳۶ء)

(از مولانا تاج الدین صاحب لائلپوری مولوی فاضل)

واقعہ صلیب اور ہمارے مخالفین

واقعہ صلیب کے متعلق ہمارے مخالفین کے عام طور پر دو مسلک ہیں:-

الاوّل۔ یہ کہ حضرت عیسٰے علیہ السلام کو تو خدا تعالےٰ نے آسمان پر اُٹھالیا اور ایک دوسرے شخص کو اُن کا شبیہ اور ہمشکل بنا دیا جسے یہود نے عیسٰے سمجھکر سُولی پر مار دیا۔ اکثر علماء نے یہی خیال پسند کیا ہے۔ لیکن پھر اس میں کئی اختلافات ہیں۔ مثلاً یہ کہ (۱) شبیہ ایک حواری تھا۔ (۲) سب حواری مسیح کے ہمشکل ہو گئے تھے۔ (۳) ایک تھا تو باقی حواریوں کی موجودگی میں اس پر شباہت پڑی۔ (۴) یا علیحدگی میں۔ (۵) مسیح کے ترغیب دینے پر جب وہ حواری اپنی جان فدیۃً من المسیح دینے پر آمادہ ہؤا تو تب خدا نے شبیہ بنایا۔ (۶) یا بغیر اسکے (۷) منافق حواری تھا۔ (۸) یہودی تھا جس نے مسیح کا پتہ دیا۔ (۹) خلیفہ قیصر (۱۰) وہ یہودی جو مسیح کو قتل کرنے کے لئے اندر گیا۔ (۱۱) وہ یہودی جسے یہود نے رقیب مقرر کر رکھا تھا۔ (۱۲) کوئی ایک یہودی تھا۔ (۱۳) صرف مُنہ پر شباہت پڑی یا (۱۴) سارے بدن پر۔ (۱۵) نام کیا تھا۔ (کُتب تفاسیر و کتب غیر احمدی علماء)

علاوہ اس کے کہ یہ اختلاف کثیر" ہی مخالفین کے قلبی اضطراب کی غمازی کر رہا ہے اس پر عقلاً و درایۃً نہایت وزنی اعتراضات ہوتے ہیں اور اسی وجہ سے بعض محقق مفسرین و علمائے اسلام نے اسے ناقابلِ تسلیم قرار دیا ہے جیسا کہ علامہ ابو حیان کا یہ قول گذر چکا ہے۔ "ھٰذا لوثوق مما یدفع الوثوق بشیٔ من ذٰلک۔" اور اکثر المتکلمین بھی اس کے خلاف ہیں۔ (دیکھو تفسیر کبیر جلد ۲ صفحہ ۵۰۲، رُوح البیان، مراح لبید جلد ۱ صفحہ ۱۸۱، الکلام الفصیح) اور امام رازیؒ نے ان میں سے بعض صورتوں کا ذکر کر کے لکھا ہے:۔

"وَھٰذَا الْوُجُوْہُ مُتَعَارِضَۃٌ مُتَدَافِعَۃٌ وَاللّٰہُ اَعْلَمُ بِحَقَائِقِ الْاُمُوْرِ۔" (تفسیر کبیر جلد ۳ صفحہ ۵۰۲)

کہ یہ تمام باتیں باہم متعارض اور ایک دوسرے کو رد کر رہی ہیں اور اصل حقیقت اللہ تعالیٰ ہی جانتا ہے۔ پھر ان اعتراضات کا خلاصہ جو مسلک القائے شبیہ پر پڑتے ہیں امام رازی نے اپنی تفسیر میں دیا ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ اگر یہ جائز سمجھا جائے کہ اللہ تعالیٰ ایک انسان کی شکل دوسرے انسان پر ڈال دیتا ہے تو اس سے سفسطے کا دروازہ کھل جاتا ہے۔ مثلاً ہم زید کو دیکھیں تو ہمیں شبہ ہو جائے گا کہ شاید یہ زید نہ ہو بلکہ زید کی شکل اس پر ڈال دی گئی ہو۔ اور ظاہر ہے کہ اس صورت میں نکاح، طلاق، ملک وغیرہ میں سے کوئی چیز بھی قابلِ وثوق نہ رہے گی۔ پھر اس سے مسئلۂ تواتر بھی مخدوش و مشکوک ہو جاتا ہے۔ کیونکہ اس کی بناء محسوسات اور مشاہدات پر ہے۔ لیکن القائے شبہ کے جواز کی صورت میں محسوسات میں بھی شک واقع ہو جاتا ہے، پس تواتر باطل ہو جائے گا۔ اور اس سے تمام انبیاء کی نبوت اور اُن کے شرائع کا ابطال لازم آتا ہے۔ کیونکہ دیکھنے والے شبہ کر سکتے ہیں یا اب ہمیں شبہ ہو سکتا ہے کہ شاید احکامِ شریعت سنانے والا خود نبی

؎ بقول مولوی ثناء اللہ صاحب "امام رازی کا پایۂ علومِ آلیہ اور عالیہ خصوصاً علمِ تفسیر میں اہلِ علم سے مخفی نہیں۔" (اجتہاد و تقلید صفحہ ۵) منہ

نہ ہو بلکہ اس کا کوئی مشبہ ہو (تفسیر کبیر جلد ۲ صفحہ ۵۰۲) اور ان خدشات کا جو جواب ذکر کیا گیا ہے وہ حد درجہ کمزور ہے۔

الثانی:۔ ان مشکلات سے رہائی حاصل کرنے کے لئے یہ راہ تجویز کی گئی ہے کہ دراصل حضرت عیسٰی علیہ السلام کی شکل کسی پر نہیں ڈالی گئی تھی بلکہ واقعہ صرف یہ تھا کہ جب یہودیوں نے حضرت عیسیٰ کو قتل کرنے کا ارادہ کیا تو اللہ تعالےٰ نے ان کو آسمان پر اٹھالیا۔ اس پر سرداران یہود کو عوام میں فتنہ پیدا ہونے کا خوف ہوا اس لئے انہوں نے ایک آدمی کو پکڑ کر سولی دیدیا اور لوگوں میں یہ مشہور کر دیا کہ ہم نے حضرت عیسیٰ کو سولی دے دیا ہے۔ چنانچہ مولانا سید محمد عرب مکی کا یہی عقیدہ ہے اور یہی قول ہے ابو علی جبائی اور علامہ اشمونی کا۔ اور اسی کے متعلق ابو حیان نے کہا ہے:۔

"وَهٰذَا الْقَوْلُ هُوَ الَّذِيْ يَنْبَغِيْ اَنْ يُعْتَقَدَ"

(بحر محیط جلد ۳ صفحہ ۳۹)

یعنی یہی قول ہے جس پر اعتقاد کیا جا سکتا ہے اور اسی کو مذکورہ بالا اعتراضات کے جواب میں امام رازی نے "كَثِيْرٌ مِّنَ الْمُتَكَلِّمِيْنَ" کی طرف سے ذکر کیا ہے۔

لیکن یہ بھی محض طفل تسلی ہے، ورنہ ظاہر ہے کہ اعتراضات عقلیہ و نقلیہ اس پر بھی وارد ہوتے ہیں۔ مثلاً یہ کہ اس وقت یہود کی خود مختار حکومت نہ تھی کہ جسے چاہتے پکڑ کر قتل کر دیتے اور مشہور کر دیتے کہ ہم نے عیسٰی کو مار دیا ہے۔ بلکہ رومی حکومت برسر اقتدار تھی جو قتل ایسی انتہائی سزا خود باقاعدہ تحقیق کر کے مجرم کو دیتی تھی۔ پھر یہ کہ اس نے شور اور غل کیوں نہ کیا۔ اور کیا اس کے لواحقین یا بیوی بچے بھی نہ تھے کہ وہی اس کی تلاش کرتے۔ نیز یہود کو یہ علم کیسے ہو گیا کہ مسیح آسمان پر چلا گیا ہے۔ یہ خیال کیوں نہ آیا کہ وہ کہیں بھاگ گیا ہے اس کی تلاش کرنا چاہیئے۔ اور اگر انہوں نے آسمان پر جاتے دیکھ لیا تھا تو کیا وجہ ہے کہ حواریوں کو یا کسی اور شخص کو نظر نہ آیا۔ غرضکہ یہ دونوں مسلک خلاف عقل و نقل ہیں۔ اور ان پر دلی اعتقاد وہی کر سکتا ہے

جو "شیوۂ لطیفہ" سے عاری ہو چکا ہو۔ ہاں بزرگانِ سلف میں سے جس کسی نے ایسا خیال ظاہر کیا ہے" وہ اجتہاد کرنے کی وجہ سے عند اللہ ماجور مگر ہم قرآن و حدیث کو مستند بنانے کی وجہ سے ان کی تقلید سے معذور" ہیں لیکن جو لوگ اب حق کھل جانے کے باوجود ہٹ اور ضد پر اڑے بیٹھے ہیں وہ یقیناً پوچھے جائیں گے۔

قارئینِ کرام! رفع مسیح الی السماء اور واقعۂ صلیب کے متعلق یہ مذکورہ بالا خیالات یقیناً قابلِ رد ہیں، کیونکہ" ایک ہی واقعہ کی تفصیل میں ایسے بڑے اختلافات کے ہوتے ہوئے ہم اُن کے بیانات کی ہرگز تصدیق نہیں کر سکتے۔"
(رسالہ کسرِ صلیب مؤلفہ میر سیالکوٹی)

واقعۂ صلیب کے متعلق بعض روایات

جیسا کہ نواب صدیق حسن خاں صاحب نے بھی لکھا ہے کہ "حقیقت یہی ہے کہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی کوئی حدیث اِس قصّے کی تائید میں موجود نہیں (تفسیر فتح البیان جلد ۲ صفحہ ۲۴۲) اور اٹکل کی بناء پر جس کے جی میں جو آیا لکھدیا۔ ہاں کتب تفاسیر میں بعض روایات درج ہیں جن سے اِس لغو خیال کو سہارا دینے کی کوشش کی جاتی ہے۔ اور حقیقت یہ ہے کہ یہ خیال ہی اُن کی پیدائش کا موجب ہوا ہے (سچ ہے الحاجۃ اُمّ الاختراع۔ ضرورت ایجاد کی ماں ہے) اس لئے میں مناسب سمجھتا ہوں کہ اُن کی اصلیت بھی ظاہر کر دوں، تاکہ معاملہ اپنی صحیح شکل کیساتھ سامنے آجائے۔

پہلی روایت

ایک روایت یہ بنائی گئی ہے کہ حضرت عیسٰی علیہ السلام نو یا بارہ یا تیرہ حواریوں کے ساتھ ایک جگہ موجود تھے، کہ یہودی اُنکو پکڑنے کے لئے آگئے۔ تب حضرت عیسٰیؑ نے حواریوں سے کہا کہ تم میں سے کون ہے جو بہشت میں میرے ساتھ ہونا پسند کرے، تاکہ میری شبیہ اُس پر ڈالی جائے اور وہ میری جگہ مقتول و مصلوب ہو جائے۔ تب ان میں سے ایک نوجوان نے جس کا نام سرجس بتایا گیا ہے، اپنے آپ کو پیش کیا۔ پھر حضرت عیسٰیؑ اُوپر چلے گئے اور وہ مصلوب ہوا۔ اِسی روایت کو مولوی محمد بشیر صاحب سہسوانی اور پیر گولڑوی نے پیش کیا ہے۔ لیکن اِس کی لغویت تو اِسی سے ظاہر ہے کہ

جب حضرت عیسٰی کو یہ علم تھا کہ میں آسمان پر چلا جاؤں گا تو پھر اپنے ایک حواری اور مخلص صحابی کو بلا وجہ کیوں مروا دیا، اس سے کونسی غرض اور کونسی دینی مصلحت پوری ہوتی تھی۔ مثلاً آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جب ہجرت کے موقع پر مکہ سے نکلے تو حضرت علیؓ آپ کی جگہ سو گئے، گو اس کی اصل غرض امانتوں کا ادا کرنا تھی مگر اس سے ایک یہ غرض بھی حاصل ہوئی کہ دشمنوں کو یہ پتہ نہ لگ سکا کہ محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم تشریف لے جا چکے ہیں اور اس طرح وہ فوراً ہی آپ کی تلاش میں نہ نکل سکے۔ لیکن کیا حضرت عیسیٰ کو بھی یہ فکر تھا کہ اگر میں اپنا شبیہ بنائے بغیر آسمان پر چلا گیا تو یہودی ظالم آسمان پر بھی پہنچکر مجھے واپس اتار لائینگے اس لئے ایک شخص کو شبیہ بنا کر مروانا پڑا تاکہ یہودی یہی سمجھتے رہیں کہ ہم نے عیسےٰ کو مار دیا ہے اور اس طرح وہ آپ کا پیچھا نہ کریں اور چوتھے آسمان پر جا کر آپ کو گرفتار نہ کر لائیں۔ اور اگر بفرض محال بوجہ بشریت حضرت عیسٰی علیہ السلام کے دل میں یہ تجویز گذری بھی تھی تو قادر و حکیم مطلق خدا نے اس تجویز و تدبیر کو عمل میں لا کر کونسی مصلحت و حکمت ظاہر کرنا ضروری سمجھی؟ آخر خدا کے ہر فعل میں کوئی حکمت ہوتی ہے۔ خدارا سوچنا چاہیئے کہ اس فعل میں کیا حکمت تھی۔ اگر حضرت مسیح کسی حواری کو اپنا شبیہ بنائے بغیر آسمان پر چلے جاتے تو یہودی اُن کا کیا بگاڑ لیتے۔ پس یہ کارروائی سراسر بے معنی اور لغو ہے کہ حضرت عیسٰے خود تو آسمان پر چلے جاتے ہیں مگر جاتے جاتے اپنے ایک حواری کو بلا وجہ مروا جاتے ہیں، اور مرواتے بھی ایسی لعنتی موت ہیں جس سے خود بچتے ہیں۔ کیا ایک نبی کے لئے یہ جائز ہو سکتا ہے کہ وہ اپنی جان بچانے کی خاطر اپنے ایک مخلص مرید کو جنت میں اپنی رفاقت کے وعدے پر لعنتی موت مروا دے۔

دوسری روایت

اس مصیبت سے بچنے کے لئے ایک دوسری روایت اس افسانے کے لئے یہ وضع کی گئی ہے کہ وہ شبیہ حضرت عیسےٰ کا ایک منافق حواری تھا۔ اور تیس روپے لے کر اُسنے حضرت مسیح کا پتہ بتانا چاہا تھا۔ جب حضرت مسیح کے پاس پہنچا تو مسیح تو اوپر اُڑ گئے اور وہ اُن کا ہمشکل ہو گیا، اس سے ایک قدم آگے ترقی کر کے یہ روایت

بنی ہے کہ وہ حواری نہ تھا بلکہ یہودیوں میں سے ایک دشمن تھا۔ جب پکڑنے آیا تو حضرت عیسےٰ علیہ السلام تو اوپر اٹھائے گئے اور وہ آپ کا ہمشکل ہو گیا۔ مگر اس پر بھی وہی اعتراض ہے کہ آخر یہ ضرورت کیوں پیش آئی کہ کوئی اُن کا شبیہ بن کر یہودیوں کے ہاتھ سے ضرور مارا جائے۔ خصوصاً اِس صورت میں کہ جب حضرت مسیح آسمان پر جاچکے تھے۔ سوائے اس کے کہ اِن ہر دو صورتوں میں خدا نے نہ چاہا کہ یہودی ایمان لائیں، بلکہ خود ہی اُن کو یہ ماننے کے لئے مجبور کر دیا کہ واقعی مسیح مصلوب ہو گیا اور اِس طرح یہودیوں کے اِس ایمان کو مضبوط کر دیا کہ واقعی وہ جھوٹا مسیح تھا اور ظاہر ہے کہ اِس صورت میں وہ مسیح کو جھوٹا کہنے میں حق بجانب ٹھہرتے ہیں۔ مزید برآں یہ کہ اِس دشمن یہودی یا منافق حواری نے لعنتی اور ذلت کی موت مرتے دیکھکر یہ شور کیوں نہ کیا کہ مَیں مسیح نہیں ہوں مسیح تو آسمان پر چلا گیا ہے۔ مَیں فلاں شخص ہوں تم تحقیق کر لو۔ آخر یہ تو اُن کو پتہ تھا کہ فلاں منافق حواری مسیح کا پتہ بتانے کے لئے ہمارے ساتھ ہے، یا فلاں ہمارا آدمی (مسیح کا دشمن) اسے پکڑنے کے لئے اندر جارہا ہے وہ ضرور اُس کی بات پر توجہ دیتے۔ اور اس طرح حقیقت کھل جاتی۔ پھر اُن کے بھی حواس معطل اور بیکار ہو گئے کہ وہ بھی نہیں پوچھتے کہ وہ شخص جو پکڑوانے یا پکڑنے گیا تھا وہ کہاں ہے؟ پھر اسے پلاطوس حاکم کے سامنے لایا جاتا ہے وہاں بھی وہ یہی کہتا ہے کہ مَیں مسیح ہوں، اسے کانٹوں کا تاج پہنایا جاتا ہے۔ تمسخر اور استہزا میں اُڑایا جاتا ہے کہ دیکھو یہ مسیح ہے۔ صلیب سے اُتر نہیں سکتا۔ صلیب پر ایلی ایلی لما سبقتنی پکارتا ہے مگر یہ نہیں کہتا کہ یہ ظلم کیوں ہو رہا ہے کہ مجھ مسیح کے دشمن (اس کے پکڑوانے یا پکڑنے والے) کو اس کی جگہ مصلوب کیا جارہا ہے۔

تیسری روایت

جب اِس سے بھی کچھ نہ بنا تو پھر ایک اور روایت وضع ہو گئی کہ یہودیوں نے مسیح کے گھر کا محاصرہ کیا ہوا تھا جب انہوں نے مسیح کو نہ پایا کیونکہ وہ آسمان پر اُڑ چکا تھا تو انہیں یہ خوف دامنگیر ہوا کہ لوگ اب اسے ضرور خدا کا رسول مان لیں گے، اس لئے انہوں نے ایک شخص کو

پکڑکر سُولی دے دیا اور لوگوں کو اس کے قریب نہ آنے دیا کہ کہیں دیکھکر معلوم نہ کرلیں۔ پھر اس کا حلیہ بدل گیا۔ اور اس طرح یہ مشہور ہوگیا کہ مسیح مار دیا گیا ہے مگر اس کہانی پر بعض نئی مشکلات بھی آپڑتی ہیں مثلاً یہ کہ جب مسیح گھر میں نہ ملا تو یہود نے فوراً یہ کس طرح یقین کرلیا کہ وہ ضرور آسمان پر ہی چڑھ گیا ہے کیوں؟ وہ یہ سمجھکر کہ وہ کہیں بھاگ گیا ہے اس کی تلاش نہیں کراتے۔ نیز اپنے میں سے ایک کو راضی کس طرح کرلیا کہ ہم تمہیں سُولی پر مار دیتے ہیں چیخ پکار نہ کرنا اور ہم کہہ دیں گے کہ ہم نے عیسےٰ کو مار دیا ہے۔ اِس قصّہ گو نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ گویا وہاں رُومی گورنمنٹ تھی ہی نہیں۔ یہود جو چاہتے خود ہی کر گزرتے تھے۔ حالانکہ تاریخ دان جانتے ہیں کہ اُس وقت رومی گورنمنٹ ایسی ہی باقاعدہ منظم اور بااختیار گورنمنٹ تھی جیسے آجکل کی مہذب گورنمنٹیں ہیں۔ باقاعدہ محکمے اور عدالتیں قائم تھیں۔ رعایا میں انصاف کرنے کا پُورا انتظام تھا۔ پھر کس طرح ممکن تھا کہ یہود نے جو اس وقت ایسی ہی غلامی کی حالت میں تھے جیسے آجکل ہندوستانی، خود بخود مسیح اور اس کے ساتھیوں کا محاصرہ کئے رکھا اور جب وہ نہ ملا تو پھانسی ایسی انتہائی اور سنگین سزا خود ہی ایک شخص کو دے دی اور وہ بھی عنداللہ وعندالناس بے قصور کو۔ پھر اُس کا پلاطوس کے سامنے پیش ہونا مجمع کا وہاں موجود ہونا خود حضرت مریم اور دیگر حواریوں کا وہاں ہونا ان سب تاریخی اور انجیلی واقعات سے کس طرح آنکھ بند کی جاسکتی ہے۔

ان کے علاوہ اور بھی کئی ایک روایات اور بے سرو پا اقوال ہیں جو مختلف لوگوں کی طرف منسوب ہو کر کتب تفسیر کی زینت بنے ہوئے ہیں۔ مگر وہ اپنے متضاد و متخالف بیانات کی وجہ سے ع

شد پریشاں خواب من از کثرتِ تعبیرہا

کی مجسم تصویر ہیں۔ اور تفاسیر کی اسی قسم کی روایات دیکھکر حضرت امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ نے یہ فیصلہ دیا ہے کہ کتب التفسیر بے اصل محض ہیں۔ لا اصل لہا۔ (اتقان) یہ روایات جیسا کہ ابھی معلوم ہوگا جن کتب میں مندرج ہیں وہ ارباب تحقیق وتنقید کے نزدیک اِس قابل نہیں کہ ان میں مندرجہ احادیث سے کوئی عقیدہ ثابت

اور اُن کے سر سے پانی ٹپکتا تھا تو فرمایا تم میں سے ایسے ہیں کہ میرے اُوپر ایمان لانے کے بعد میرے ساتھ بار بار کفر کریں گے۔ ابن عباسؓ نے کہا کہ پھر حضرت عیسٰےؑ نے فرمایا کہ تم میں سے ایسا کون ہے کہ میرا ہمشکل ہو جانا اختیار کرے کہ میری جگہ قتل کیا جاوے (یعنی یہود حضرت عیسٰےؑ کو قتل کرنا چاہتے تھے تو اُن کی جگہ پر قتل ہو جا دے اور وہ دھوکے میں رہیں) اور وہ میرے درجہ میں ساتھ رہے۔ تو اُن میں کا نوعمر کھڑا ہوا تو حضرت عیسٰےؑ نے اُس سے فرمایا کہ تُو بیٹھ جا۔ پھر حضرت عیسٰےؑ نے وہی بات اُن لوگوں سے کہی تو وہی نوجوان پھر کھڑا ہو گیا تو فرمایا کہ تُو بیٹھ جا۔ تو پھر وہی بات اُن لوگوں سے کہی تو پھر وہی جوان اُٹھ کھڑا ہوا۔ غرض چوتھی مرتبہ حضرت عیسٰےؑ نے فرمایا کہ اِس کام کا تُو ہی ہے تو حضرت عیسٰےؑ کی شباہت اُس پر پڑ گئی اور حضرت عیسٰےؑ کے گھر میں روشندان تھا اُس سے آسمان کی طرف اُٹھائے گئے۔ ابن عباسؓ نے کہا اور یہود کے جاسوس آئے تو انہوں نے اُسی ہمشکل کو پکڑ لیا اور اُسی کو مقتول و مصلوب کیا۔ پھر بعض اشخاص بارہ مرتبہ عیسٰے علیہ السلام سے پھر گئے بعد ایمان کے اور اس کے بعد تین فرقے ہو گئے۔ ایک فرقہ اِس امر کا قائل ہوا کہ ہم میں خدا رہا جب تک چاہا پھر آسمان کی طرف چڑھ گیا۔ اِس فرقہ کو یعقوبیہ کہتے ہیں۔ دوسرے فرقے نے کہا کہ خدا کا بیٹا جب تک چاہا ہم میں رہا۔ بعدۂ خداوند کریم نے اپنی طرف اُسکو اُٹھالیا۔ اِس گروہ کا نام نسطوریہ ہے۔ تیسرے فرقے کا یہ مذہب تھا کہ خدا کا بندہ اور اُس کا رسول ہمارے گروہ میں رہا جب تک خداوند کریم نے چاہا۔ پھر اللہ تعالےٰ نے اپنی طرف اُٹھالیا۔ اِس گروہ کو مسلمان کہتے ہیں۔ پھر دونوں فرقے کافروں کے فرقۂ مسلمہ پہ غالب آئے اور اُس کو قتل کر ڈالا۔ پھر ہمیشہ اسلام معدوم رہا یہاں تک کہ اللہ تعالےٰ نے حضرت محمد مصطفٰے صلے اللہ علیہ وسلم کو مبعوث فرمایا۔"

(شمس الہدایت ص۱ و شفاء للناس ص۹)

یہ اثر تو اس کے الفاظ ہی سے عیاں ہے کہ اسے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی حدیث کی شکل میں نہیں بلکہ صرف ایک صحابی کا قول ظاہر کیا گیا ہے لیکن کتب اصولِ حدیث سے مَس رکھنے والے اصحاب جانتے ہیں کہ ایسے اقوال کا نام "موقوف" اور "اثر" ہوتا ہے۔ جس کے متعلق جمہور محدثین کا یہ فیصلہ ہے کہ یہ حجت نہیں ہے۔ چنانچہ مقدمۂ ترمذی میں ہے۔ هُوَ لَيْسَ بِحُجَّةٍ عَلَى الْأَصَحِّ (صفحہ ۳) اور مولوی ثناء اللہ صاحب لکھتے ہیں "قَوْلُ الصَّحَابِيِّ لَيْسَ بِحُجَّةٍ محدثین کا اصول ہے۔" (اجتہاد و تقلید صفحہ ۷) اور خود "سردار صاحب" کا اپنا مذہب بھی یہی ہے۔ (ملاحظہ ہو اجتہاد و تقلید صفحہ ۵) پھر اپنے رسالہ علم الفقہ صفحہ ۲۲ میں لکھتے ہیں: "یہ بیان صاف دلالت کرتا ہے کہ صحابی کا قول جب مسائلِ شرعیہ میں حجت نہیں، تفسیریہ میں بھی نہیں۔" بلکہ ایک صحابی کا قول کُجا وہ تو "اجماع صحابہ" بھی حجت نہیں مانتے (اجتہاد و تقلید صفحہ ۲۹)

اور جناب استادِ پنجاب مولانا حافظ عبد المنان صاحب محدث وزیر آبادی فرماتے ہیں:۔

"خدا تعالیٰ اور اُس کے رسول پاک صلے اللہ علیہ وسلم کے سوائے نہ تو کسی کا قول حجت ہے اور نہ کسی کی اطاعت واجب۔"

(اجتہاد و تقلید صفحہ ۱)

اسی طرح مولوی محمد بشیر صاحب سہسوانی ثم بھوپالوی نے حضرت ابن عباسؓ کا ایک "اثر" رد کرتے ہوئے لکھا ہے:۔

"حدیث موقوف حجت ہی نہیں چہ جائیکہ قطعی ہو۔" (الحق الصریح صفحہ ۱۰۴)

خود مولوی ابراہیم صاحب لکھتے ہیں:۔

"غیر نبی کا قول و فعل و تقریر، حجت و سند نہیں۔"

(اجتہاد و تقلید صفحہ ۱۰)

پس اگر ہم اِس روایت کے اندرونی اضطراب اور اِس پر معقولی اعتراضات نظر انداز کر دیں اور اس کی سند بھی صحیح تسلیم کر لیں تو بھی زیادہ سے زیادہ یہ "موقوف" یعنی قول صحابی کے درجہ پر رہے گی۔ جو حجج شرعیہ

میں سے نہیں ہے۔ مولوی ثناء اللہ صاحب لکھتے ہیں :۔
"آنحضرتؐ کا فرمودہ حجت شرعی ہوگا اور راوی (صحابی یا بعد والے) کا نہیں" (اہلحدیث جون ۱۹۲۱ء صنا)

پیر مہر علی شاہ صاحب گولڑوی اور مولوی محمد بشیر صاحب بھوپالوی نے اسے "حکماً مرفوع" کہنے کی جسارت کی ہے۔ لاحول ولا قوۃ الا باللہ۔ اور اس کے ثبوت کے لئے یہ حیلہ ڈھونڈا ہے کہ چونکہ یہ قصہ اخبارِ ماضیہ میں سے ہے جس میں اجتہاد کو دخل نہیں اس لئے اس کی اطلاع بدوں آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے کسی صحابی کو نہ ہوسکتی تھی۔ پس یہ روایت مرفوع حدیث کے حکم میں ہے۔ لیکن معلوم ہے کہ **اول** تو "صحابی کا **بطور جزم** ان اُمور کا بیان کرنا جن میں عقل کو دخل نہ ہو اہلحدیث کے نزدیک مرفوع ہوتا ہے۔" (تحذیر الناس صفحہ مؤلفہ مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی) مگر یہ روایت بطور جزم بیان نہیں کی گئی۔ **ثانیاً**۔ یہ اصل صرف ایسے صحابی کے متعلق ہے جو "اسرائیلیات" سے کلیتہً پرہیز کرنے والا ہو۔ (فتح المغیث۔ الحق الصریح صفحہ ۲۲ و نزہۃ النظر فی توضیح نخبۃ الفکر صفحہ) پس جب تک ثابت نہ کر دیا جائے کہ حضرت ابن عباسؓ اہل کتاب سے مطلقاً کوئی بات نہیں لیا کرتے تھے اُس وقت تک محدثین کے اِس اصل سے ہمارے

ف حضرت ابن عباسؓ کے متعلق بعض تفاسیر میں یہ واقعہ مرقوم ہے کہ ایک دفعہ ایک کتابی عالم سے انہوں نے قرآن مجید کی ایک آیت کے معنے خاص اہتمام سے آدمی بھیجکر دریافت کئے تھے اور پھر اُسی کے بتائے ہوئے معنے آپؓ بیان کیا کرتے تھے۔ (تفسیر ابن جریر مصری جلد ۷ صفحہ ۱۲ و صفحہ ۱۹۲ و تفسیر درمنثور) اور ان کے متعلق بعض کی یہ رائے ہے کہ وہ اہلکتاب سے روایت کر لیا کرتے تھے۔ چنانچہ مولوی ثناء اللہ صاحب اپنے اخبار اہلحدیث میں اپنے "جناب فضیلت مآب مولوی عبد السلام صاحب مبارکپوری" کا یہ بیان "بغیر التردید" شائع کر چکے ہیں کہ "ابن عباس اسرائیلیات سے روایت کیا کرتے ہیں" (۶ مئی ۱۹۲۱ء صفحہ ۹)

مخالفین سہارا لینے کا کوئی حق نہیں رکھتے۔

ثالثاً۔ یہ "مرفوع حدیث" تمام ائمہ حدیث کی نظروں سے کس طرح اوجھل

کہا گیا ہے کہ :۔

"چونکہ یہود و نصاریٰ بالاتفاق مسیح کو مقتول بالصلیب مانتے ہیں تو قبل از قتل صحیح و سالم آسمان کی طرف اُٹھایا جانا، جیسا کہ وہ مضمون ہے اس اثر کا، ان کے معتقدات سے ہرگز نہیں ہو سکتا۔"

(سیف چشتیائی صفحہ ۱۷۹)

لیکن پیر سیالکوٹی صاحب تسلیم کر چکے ہیں کہ :۔

"نصاریٰ کے قدیم فرقے یہی اعتقاد رکھتے تھے۔" (شہادۃ القرآن حصہ اول صفحہ ۳۳)

اور اس کے ثبوت میں پادری جارج سیل کے حوالہ سے لکھتے ہیں :۔

"پیغمبر صاحب کے زمانے سے بہت مدت پہلے عیسائیوں کے بہت سے فرقوں کا یہی اعتقاد تھا۔۔۔۔۔۔ چنانچہ کاربا کریشن کا بھی یہی اعتقاد تھا کہ مسیح علیہ السلام مصلوب نہیں ہوئے بلکہ آپ کے حواریوں میں سے ایک شخص جو آپ کا ہمشکل تھا صلیب دیا گیا۔" (شہادۃ القرآن صفحہ ۳۳)

اور صفحہ ۳۵ پر بحوالہ انجیل برنباس لکھتے ہیں :۔

"جب یہودیے یہود حضرت مسیح کو پکڑنے جا رہے تھے آپ تیسرے آسمان پر اٹھا لئے گئے۔ اور آپ کی بجائے یہودہ اسکریوطی صلیب دیا گیا۔ اللہ تعالےٰ نے اس کو یہود کی نظروں میں مسیح کا ایسا ہمشکل کر دیا کہ یہود اس کو پکڑ کر پلاطوس کے پاس لے گئے۔ یہ مشابہت صوری ایسی عجیب تھی کہ اس سے مریم اور حواری بھی بھول گئے۔" (شہادۃ القرآن صفحہ ۳۵)

پس پیر صاحب کا یہ خیال بھی مردود ہو گیا۔ بلکہ وہ خود بھی شاند اپنی اس رائے کا ضعف محسوس کر کے لکھتے ہیں :۔

ہو گئی۔ اگر ملی تو صرف ابن ابی حاتم کو اور ہمارے پیش کی گئی تو صرف کتب تفاسیر سے (جن میں روایات درج کرنے کے لیے کسی بھی اصل، قانون اور احتیاط کی پابندی ضروری نہیں سمجھی گئی۔ بلکہ جو بھی رطب و یابس ملا اُسے "کامل آزادی" کے ساتھ درج کر لیا گیا ہے، آخر یہ کیوں؟ کیا کتب حدیث کا وجود دُنیا میں نہیں

"اور اگر بعض اُن کے قائل اور راوی بھی ہوں اور یہ بھی تسلیم کر لیا جاوے کہ ابن عباسؓ نے انہی سے سُنا ہے تو پھر بھی ابن عباسؓ کا اِس مضمون کو قبول کرنا جو اُن کے بیان بغیر التردید سے پایا جاتا ہے یہ دلیل ہے اِس پر کہ کتاب اللہ کی کسی آیت کے برخلاف نہیں۔"

(سیف چشتیائی ص۱۷۹)

لیکن ظاہر ہے کہ اِس صورت میں یہ اثر مرفوع حکمی ہونے کی حد سے تو نکلا جاتا ہے۔ رہا یہ کہ حضرت ابن عباسؓ نے ان کا یہ بیانِ صحیح قبول کر لیا ہے تو اسکے لئے پیر صاحب کوئی ثبوت مہیا نہیں کر سکے۔ صرف "بغیر التردید بیان کرنے سے قیاس کیا ہے۔ مگر یہ کوئی قاعدہ کُلیہ نہیں ہے کہ جب بھی کوئی انسان کسی دوسرے کی کوئی بات" بغیر التردید" بیان کرے تو لازمی اور ضروری ہے کہ وہ اُسے خود بھی صحیح، معقول اور پسندیدہ سمجھتا ہو۔ چنانچہ مولانا نجم الدین صاحب سیوہاروی حضرت امام شافعیؒ کی ایک روایت کے ذکر میں لکھتے ہیں:-

"پس اِس حدیث کے صرف روایت کر دینے سے امام شافعیؒ پر کوئی الزام نہیں آسکتا۔ ہاں اگر وہ اس کی تصحیح کرتے تو پھر اُن پر بے شک الزام عائد سکتا۔ سو وہ اُن سے ثابت نہیں۔"

(سیرۃ الشافعی اُردو ص۲۲۳)

حالانکہ حدیث مشارٌ الیہ امام شافعیؒ سے "بغیر التردید" مروی ہے۔

دوسرے "بغیر التردید" بیان کرنے سے اگر کچھ قیاس کیا جا سکتا ہے، تو صرف یہ کہ اس راوی کے نزدیک وہ بات درست ہو نہ یہ کہ اس سے واقعتہً

ہے۔

رابعًا:۔ اس کے الفاظ میں جو نکارت اور رکاکت ہے وہ احادیث نبویہؐ اور جوامع الکلم پر عبور رکھنے والے اہلِ مذاق اصحاب سے پوشیدہ نہیں۔

خامسًا:۔ اس کے نفسِ مضمون پر جو عقلی اعتراضات وارد ہوتے ہیں وہ ایک منٹ کے لئے بھی اسے چشمۂ نبوت سے نکلی ہوئی متصور نہیں ہونے دیتے۔ وھٰذا لیس بخفیٍّ علی من لہٗ ادنی تدبّرٍ وبصیرۃٍ۔

اس کی سند کے متعلق کہا گیا ہے کہ صحیح ہے۔ لیکن اول تو اگر یہ بات تسلیم بھی کر لی جائے تو پھر بھی اس سے اس روایت کا صحیح ہونا لازم نہیں آتا" کیونکہ اسناد کی صحت سے متن کی صحت لازم نہیں آتی" (اہلحدیث ۱۵ر جولائی ۱۹۲۱ء) اور مولٰنا سیف بنارسی لکھتے ہیں:۔

"بسا اوقات سند کے تمام راوی ثقہ ہوتے ہیں لیکن متن حدیث

حاشیہ متعلقہ صفحہ ۱۷: اس کا صحیح اور معقول ہونا لازم آتا ہے۔ اور کہ دوسرے سب لوگ بھی اسے ایسا ہی سمجھتے ہیں یا انہیں ایسا سمجھنا چاہیئے۔ اور یہاں تو قول الصحابی لیس بحجۃٍ بھی موجود ہے۔ پس پیر صاحب کا اس قیاس پر قیاس کرنا کہ "یہ دلیل ہے اس پر کہ یہ کتاب اللہ کی کسی آیت کے برخلاف نہیں" سراسر سینہ زوری اور بے اثر ہے۔ ورنہ تمام "اسرائیلیات" کے متعلق یہ ماننا پڑیگا کہ اگر راوی نے انہیں "بغیر التردید" بیان کیا ہو تو وہ کتاب اللہ کی کسی آیت کے برخلاف نہ ہونے کی وجہ سے واجب التسلیم ہیں۔ اور یہ بھی بعید نہیں کہ بعدہٗ کسی راوی تحتانی سے تردیدی کلمہ چھوٹ گیا ہو۔ منہ

لہ حضرت ابن عباسؓ ہی کے ایک اثر ان اللہ خلق سبع ارضین ....الخ کے متعلق یہ کہا گیا ہے۔ منہ

میں اضطراب ہوتا ہے۔ اس صورت میں بھی وہ رتبۂ مقبول سے گر جاتی ہے ...... مقدمہ ابن صلاح میں ہے قد یقال ھٰذا صحیح الاسناد ولا یصح الحدیث یعنی سند صحیح ہوتی ہے لیکن حدیث کا متن صحیح نہیں ہوتا ...... پس ہر سند کی صحت حدیث کی صحت کو مستلزم نہیں ..... فتذکر۔"

(اہلحدیث ۹ رجون ۱۹۲۲ء صفحہ)

اسی طرح مولوی ثناء اللہ صاحب امرتسری رقم فرماتے ہیں :۔

"حدیث صحیح کے لئے ...... شروط صرف یہی نہیں کہ اس کے راوی سب ثقہ ہوں، بلکہ اور بھی ہیں جو کتب اصول حدیث میں مذکور ہیں" (اہلحدیث ۷ اراپریل ۱۹۲۲ء صفحہ)

اور التذنیب لتقعیب التقریب صفحہ پر لکھا ہے :۔

"کَوْنُ الْاِسْنَادِ حَسَنًا اوصحیحًا لَا یُوْجِبُ کَوْنَ الْمَتْنِ کَذٰلِکَ لشذوذٍ او علّۃٍ۔"

کتب احادیث میں مرقوم ہے کہ حضرت ابوہریرہؓ نے حضرت ابن عباسؓ کے سامنے جب یہ مسئلہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کیا کہ آگ پر پکی ہوئی چیز کھا لینے سے وضو ٹوٹ جاتا ہے تو حضرت ابن عباسؓ نے اس کی تردید و تغلیط کی اور فرمایا کیا ہم آگ پر گرم کیا ہوا پانی پی کر وضو کیا کریں۔ (ترمذی و ابن ماجہ باب الوضوء)

حضرت ابوہریرہؓ ضعیف الروایت نہ تھے مگر حضرت ابن عباسؓ نے درائیت کے خلاف پاکر اُن کی مرفوع روایت رد کردی۔ اسی طرح حضرت عائشہ صدیقہؓ کے سامنے جب حضرت ابن عمرؓ کی یہ مرفوع روایت بیان کی گئی۔ اِنَّ الْمَیِّتَ لَیُعَذَّبُ بِبُکَاءِ الْحَیِّ (میت کو اس کے پچھلوں کے رونے کی وجہ سے عذاب دیا جاتا ہے) تو حضرت عائشہ صدیقہؓ نے فرمایا۔ اِنَّکُمْ لتحدثون عن غیر کاذبین ولا مکذبین ولکن السمع یخطئ (مسلم کتاب الجنائز) یعنی تم لوگ نہ خود جھوٹے ہو نہ تمہارے راوی جھوٹے ہیں

لیکن کان غلطی کر جاتا ہے

ایک اور روایت میں ہے اما انہ لم یکذب ولکنہ نسیَ اَوْ اَخطأ۔ کہ ابن عمرؓ نے جھوٹ نہیں بولا۔ ہاں وہ بھول گیا یا خطا کی۔ (مسلم) پس سند صحیح ہے۔ مگر حضرت عائشہ صدیقہؓ کے نزدیک مخالف قرآن ہونے کی وجہ سے روایت مردود ہے۔ ایک ضعیف روایت میں ہے "جس نے عشق کیا اور پاکدامن رہنے کی حالت میں وفات پائی وہ شہید ہوا"۔ حافظ ابن القیم دلائل عقلیہ سے اس کا ابطال کرنے کے بعد لکھتے ہیں۔ فلو کان اسنادُ ھذا الحدیث کالشمس کان غلطاً و وھماً۔ کہ اگر اس حدیث کی سند سورج کی طرح بھی ہوتی تب بھی وہ غلط اور وہم ہوتی (زاد المعاد ص۹ مطبوعہ کانپور)

علامہ شبلی مرحوم لکھتے ہیں :۔

"ثقہ راوی سے بھی مطلب روایت کے سمجھنے یا یاد کرنے میں غلطی کا ہو جانا ممکن ہے۔" (سیرۃ النبی جلد ا ص۷)

ان حوالجات و امثلہ سے ظاہر ہے کہ کسی روایت کے محض صحیح الاسناد ہونے سے اس کا صحیح ہونا لازم نہیں آتا۔ پس جب تک باقی تمام مشکلات بھی حل نہ کر دی جائیں۔ اس وقت تک محض سند صحیح ہونے سے یہ روایت قابلِ احتجاج نہیں ہو سکتی۔

لیکن یہ بھی درست نہیں کہ یہ روایت سند کے لحاظ سے صحت کو پہنچی ہوئی ہے۔ بلکہ اس کے قریباً تمام راوی ایسے ہیں کہ جب یہ کسی سلسلۂ اسناد میں جمع ہو جائیں تو یقیناً وہ پایۂ اعتبار سے ساقط ہو جاتی ہے۔ بلکہ بعض کی روایت تو سلاسلِ مختلفہ میں بھی قابلِ قبول نہیں رہتی۔ چنانچہ اس کا ایک راوی ابو معاویہ ہے۔ جس کے متعلق علامہ ابن حجر عسقلانی لکھتے ہیں :۔

"کان یری الارجاء وکان لیّن القول فیہ و قال یعقوب بن شیبۃ کان من الثقات و لربما دلس و کان یری الارجاء و قال الآجری عن ابی داؤد کان

مُرجِئًا وقال مرة كان رئيس المرجئة بالكوفة و ذكره ابن حبان فى الثقات وقال كان حافظًا متقنًا ولكنه كان مرجئًا خبيثًا وقال ابن سعد كان ثقةً كثير الحديث يدلّس وكان مرجئًا وقال ابوزرعة كان يرى الارجاء قيل له كان يدعو اليه قال نعم"

(تہذیب التہذیب جلد ۹ ص۱۳۹)

خلاصہ یہ کہ ابو معاویہ مُدلّس[1] ہونے کے علاوہ ردّی اور خبیث درجہ کا مرجی بلکہ رئیس المرجئہ[2] اور داعی الی الارجاء بھی تھا۔ اور علامہ ذہبی لکھتے ہیں۔ ثقة ربما دلّس يُقال ان وكيعًا لم يحضر جنازته للارجاءِ وقال ابوداؤد كان مُرجيًا۔ یعنی گو فی ذاتہٖ ثقہ تھا لیکن روایت میں اکثر تدلیس کر جاتا تھا اور

---

[1] اصطلاحِ محدّثین میں مُدلّس اُسے کہتے ہیں جو اُس شخص کا نام جس سے اس نے کوئی حدیث سُنی ہو چھوڑ کر اُس سے اُوپر کے راوی کا نام ایسے طریق پر لے کہ گویا اُس نے اُس اُوپر والے راوی سے اپنے کان سے وہ حدیث سُنی ہے۔ "تارةً يقول احدهم فلانٌ عن فلانٍ يُوهِمُ انه سمع منه ولم يسمع وهذا قبيحٌ" (تلبیس ابلیس مصنفہ ابن جوزی ص۱۱۲ مطبوعہ فاروقی دہلی) مولانا امداد صابری لکھتے ہیں کہ ابن جوزی کے نزدیک راوی میں عیبِ تدلیس سخت قبیح وشنیع ہے" (علامہ سیّد سلیمان ندوی کی قرآنی غلطیاں ص۹۶) منہ

[2] مرجیہ ایک فرقہ ہے جن کا اعتقاد یہ ہے کہ عذاب وعقاب اور مؤاخذہ کسی طرح نہ ہوگا۔ اور ایمان کے ہوتے ہوئے کوئی بھی گناہ ضرر نہ دے سکے گا۔ اور یہ کہ اہلِ نار جہنم میں بلا عذاب رہا کریں گے۔ جیسے مچھلیاں پانی میں رہتی ہیں۔ اِن معتقدات والا انسان روایات میں جس بے احتیاطی کا مرتکب ہو سکتا ہے وہ محتاجِ بیان نہیں۔ اسی لئے عند المحدثین ایسا راوی خصوصاً داعی الی الارجاء معتبر نہیں۔ منہ

مرجی تھا۔ حتیٰ کہ حضرت امام وکیع اس کے جنازہ میں بھی شامل نہیں ہوتے تھے۔
(میزان الاعتدال جلد ۲ صفحہ ۶۶۹)

اور علم الاسناد سے واقف اہلِ علم جانتے ہیں کہ راوی میں تدلیس سخت عیب ہے۔ حتیٰ کہ بعض صورتوں میں مدلّس کی روایت پایۂ اعتبار سے گر جاتی ہے اور اس کا مُعَنْعَنَہ تو ہرگز قابلِ قبول نہیں ہوتا (اور روایت پیش کردہ میں یہی صورت ہے۔) چنانچہ مولوی محمد بشیر صاحب بھوپالوی حضرت ابن عباسؓ ہی کا ایک اثر ردّ کرتے ہوئے اس کے ایک راوی کے متعلق لکھتے ہیں "وہ مدلّس ہے اور عنعنۂ مدلّس کا مقبول نہیں ہے" (الحق الصریح صفحہ ۸ و ۶۳ و ۱۰۵) اور یہاں تو علاوہ علتِ تدلیس کے سخت درجہ کا ارجاء بھی راوی میں موجود ہے جو بجائے خود ایک نہایت ہی شنیع عیب ہے۔ (الحق الصریح صفحہ ۸)

دوسرا راوی اعمش ہے جو طبقۂ خامسہ[1] یعنی صغار التابعین میں سے ہے۔ اور اس کے متعلق علامہ ذہبی نے لکھا ہے:-

"ابن المبارك يقول انما افسد حديث اهل الكوفة ابو اسحاق والاعمش لكم وقال جرير ابن عبد الحميد سمعت مغيرة يقول اهلك اهل الكوفة ابو اسحاق واعمشكم هذا كانه عنى الرواية عمّا جاء والا فالاعمش عدل صادق ..... يحسن الظن بمن يحدثه ويروي عنه ولا يمكننا بان نقطع عليه بانه علم ضعف ذلك الذي يدلسه فان هذا حرام۔ قال على ابن سعيد النسفى سمعت احمد بن حنبل يقول منصور عصبة اهل الكوفة فى حديث الاعمش اضطراب كثير ..... قلت هو يدلس

[1] منهم الذين رأوا الواحد فالاثنين ولم يثبت لبعضهم السماع من الصحابة كالاعمش الذي رأى انسًا يصلى (تقريب التهذيب ص ۳)

وربما یدلس عن ضعیف ولا یدری بہ فمتی قال "نا" فلا
کلام ومتی قال "عن" تطرق الیہ احتمال التدلیس
قال ابن المدینی الاعمش کان کثیر الوھم فی احادیث
ھؤلاء الضعفاء" (میزان الاعتدال جلد ا صفحہ ۴۲۵)

یعنی علامہ ابن المبارک اور مغیرہ نے کہا ہے کہ اہلِ کوفہ کی احادیث اعمش نے خراب کر دی ہیں اور ان کو ہلاک کر دیا ہے۔ ابن حجر کے نزدیک اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ روایت لینے میں نہایت بے احتیاط تھا۔ جو شخص اسے روایت سُناتا اس پر حُسن ظنی کر لیتا اور اس سے روایت کر دیتا۔ وہ مدلّس بھی تھا، یہاں تک کہ ضعیف سے بھی تدلیس کر لیتا تھا۔ اور اسے اس کا پتہ بھی نہ ہوتا۔ پس جب "عن فلان" کہہ کر روایت کرے، تو اس میں تدلیس کا احتمال ہے۔ امام احمدؒ بن حنبلؒ کہتے ہیں کہ اعمش کی حدیث میں "اضطراب کثیر" ہوتا ہے۔ امام ابن مدینی نے کہا ہے کہ ان ضعفاء کی احادیث میں "کثیر الوہم" تھا۔

اور علامہ ابن حجر لکھتے ہیں :-

"روی عن انس ولم یَثْبُتْ لہٗ منہ سماعٌ وعبداللہ ابن ابی اوفیٰ یقول انّہ مُرْسَلٌ وکان فیہ تشیّع۔ وقال ابی لم یسمع من ابی صالح ھو مُدَلِّسٌ عن کلبی وکان مُدَلِّسًا" (تہذیب التہذیب جلد ۴)

بقیہ حاشیہ ۴۹۔ مطبوعہ لکھنؤ) یعنی طبقہ خامسہ ایسے تابعی ہیں کہ ان میں سے بعض نے صرف ایک یا صرف دو صحابی دیکھے ہیں۔ اور بعض نے تو کسی صحابی سے کچھ نہیں سُنا۔ جیسے اعمش ہے کہ اُس نے صرف حضرت انسؓ کو ایک دفعہ نماز پڑھتے دیکھا تھا اور ان سے سماع ثابت نہیں۔ منہ

۵۰ مُرسل اور مدلّس کی روایت کے عدم حجیت کے متعلق مضمون "القول الحسن فی مُرْسَلِ الحَسَن" ملاحظہ ہو۔ (ریویو نمبر ۹ جلد ۳۴) منہ

یعنی اس میں شیعیت تھی۔ وہ مُرسل اور مُدلس تھا۔ حتیٰ کہ کلبی ایسے شخص سے بھی تدلیس کرتا تھا۔ اور راوی مُدلس کا عَن فُلانٍ کہنا تو عند المحدثین بالکل مقبول نہیں۔ عَنْعَنَةُ الْمُدَلِّس غَيْرُ مَقْبُولٍ (مقدمہ شیخ عبد الحق صاحب دہلوی) اور روایت مذکورہ میں یہی صورت ہے۔

تیسرا راوی منھال بن عمرو ہے۔ اس کے متعلق علامہ ذہبی لکھتے ہیں :۔

"ترك الرواية عنه شعبة فيما قيل لانه سمع من بيته صوت غناءٍ قال الحاكم غمزه يحيى بن سعيد وقال الجوزجاني في الضعفاء له سيء المذهب وكذا تكلم فيه ابنُ حزمٍ ولم يحتج بحديث الطويل في فتاني القبر

(میزان الاعتدال جلد ۲ ص۲۱۳)

یعنی شعبہ نے اس سے روایت ترک کر دی تھی جس کی وجہ یہ بیان کی گئی ہے کہ اس کے گھر سے گانے کی آواز اُس نے سُنی تھی۔ حاکم نے کہا ہے کہ یحییٰ ابن سعید نے اس میں طعن کیا ہے۔ جوزجانی نے اسے سیء المذہب (بد مذہب) کہا ہے اسی طرح ابن حزم نے بھی اس میں کلام کیا ہے۔ اور اس کی روایت فتانی قبر کے بارے میں قابلِ احتجاج نہیں سمجھی۔

اور علامہ ابن حجر لکھتے ہیں :۔

"قال عبد الله ابن احمد سمعت ابی یقول ترك شعبة المنهال ابن عمرو على عمد قال ابن ابی حاتم لانه سمع من داره صوت قراءة بالتطريب ۔ قال وهب ابن جرير عن شعبة أتيت منزل المنهال فسمعت منه صوت الطنبور فرجعت ولم اسأله قلت فهلا سألته عسى كان لا يعلم وقال الغلابي كان بن معين يضع من شأن المنهال ابن عمرو قال الجوزجاني سيء المذهب وقد جرى حديثه ۔ وقال ابن ابی خيثمة حدثنا سليمان ابن ابی الشيخ حدثنی محمد ابن عمر الحنفی عن ابراهيم

بن عبید التناسفی قال وقف المغیرۃ صاحب ابراھیم علی یزید ابن ابی زیاد فقال الا تعجب من ھذا الاعمش الاحمق انی نھیتہ ان یروی عن المنھال ابن عمرو وعن عبایۃ ففارقنی علی ان لا یفعل ثم ھو یروی عنھما نشھد تلک باللہ تعالٰی ھل کانت تجوز شھادۃ المنھال علی درھمین قال اللھم لا۔ وقال الحاکم المنھال ابن عمرو غمزہ یحیی القطان وقال ابو الحسن بن القطان کان ابو محمد بن حزم یضعف المنھال ورد من روایتہ حدیث البراء۔"

(تہذیب التہذیب جلد ۱۰ صفحہ ۳۱۹ و صفحہ ۳۲۰)

خلاصہ یہ کہ شعبہ نے منہال کی روایت کو عمداً ترک کر دیا تھا۔ غلابی نے کہا ہے کہ ابن معین نے منہال کو وضیع الشان قرار دیا ہے۔ ابراہیم بن عبید تناسفی نے کہا ہے کہ ایک دفعہ مغیرہ (اس کا شاگرد) یزید بن ابی زیاد کے سامنے کھڑا ہو گیا اور کہا کیا تو اس احمق اعمش پر تعجب نہیں کرتا۔ میں نے اس کو منہال بن عمرو سے روایت کرنے سے منع کیا تھا اور اس نے میرے سامنے وعدہ کیا کہ آئندہ اس سے روایت نہیں کرے گا مگر پھر اس سے روایت کرتا ہے۔ میں تجھے اللہ تعالٰی کی قسم دیتا ہوں کہ کیا منہال کی شہادت دو درہموں پر جائز تھی۔ اس نے کہا [illegible] حاکم نے کہا ہے کہ یحیٰی القطان نے منہال پر طعن کیا ہے۔ ابو الحسن بن القطان نے کہا ہے کہ ابو محمد ابن حزم اس کو ضعیف قرار دیتا تھا۔ اور اس کی روایت حدیث البراء کو اس نے مردود قرار دیا ہے۔

چوتھا راوی سعید ابن جبیر ہے۔ تہذیب میں لکھا ہے:۔

"قال الآجری قلت لابی داؤد سمع سعید بن جبیر من عبد اللہ بن معقل فقال لا انما ھو مرسل وقیل لابی داؤد سمع سعید من عدی بن حاتم قال لا اراہ وسئل ابو زرعۃ سمع ابن جبیر من علی فقال ھو

مُرسل تھے۔ تہذیب جلد ۴ صفحہ ۱۴،۱۳)

یعنی ابوداؤد اور امام ابوزرعہ کے نزدیک سعید ابن جبیر مُرسل روایت بیان کرنے کا عادی تھا جو فنِ روایت میں نقص اور عیب شمار ہوتا ہے۔

پس جب اس روایت کی سند کا یہ حال ہے کہ ان میں سے ایک راوی کی موجودگی بھی اس اثر کو بے اثر بنانے کے لئے کافی ہے کجا یہ کہ تمام رُواۃ کا یہ حال ہو تو پھر کس طرح اس پر اعتبار کیا جا سکتا ہے۔

اور یہ کہنا کہ چونکہ اس اثر کے رُواۃ رجال الشیخین ہیں اس لئے لازماً یہ صحیح ہے درست نہیں۔ کیونکہ اوّل تو اس کے جمیع رُواۃ کے متعلق یہ دعویٰ محتاجِ تحقیق اور ثبوت طلب ہے۔ دوسرے علم الحدیث اور علم الرجال والاسناد سے واقفیت رکھنے والے جانتے ہیں کہ ایک راوی ایک اسناد میں تو قابلِ اعتبار سمجھا جاتا ہے مگر وہی راوی کسی دوسرے سلسلہ میں ساقط الاعتبار قرار پاتا ہے۔ پس ثابت کیا جائے کہ امام بخاریؒ اور امام مسلمؒ نے اسی طریق اور سند کیساتھ کوئی روایت اپنی صحیحین میں درج کی ہے۔ وَدُوْنَہٗ خَرْطُ الْقَتَادِ۔ ورنہ

۵ کیا بخاری اور مسلم کے رجال میں سے کوئی ضعیف اور کمزور یا مجروح راوی نہیں؟ گو یہ الگ بات ہے کہ کسی کمزور راوی کی کوئی روایت بعض دیگر قرائن قویہ کی بناء پر صحیح پا کر وہ اپنی صحیح میں لے آئیں۔ چنانچہ بعض راویوں کے متعلق امام بخاریؒ نے ضعیف ہونے کا ذکر کیا ہے۔ جیسے مقسم مولی ابن عباسؓ سے جماعت کی روایت نقل کرتے ہیں مگر خود کتاب الضعفاء میں اسے ضعیف کہتے ہیں۔

نیز محدثین کے نزدیک قبولِ روایت کے لئے صرف اسی حد تک کافی نہیں کہ اس کے راوی ثقہ اور قابلِ اعتبار ہوں بلکہ ایک نہایت ضروری اصل یہ بھی ہے کہ واقعہ مرویہ جس درجہ کا اہم ہو شہادت بھی اُسی درجہ کی اہم ہونی ضروری ہے۔ مثلاً ایک شخص جو ثقہ ہے ایک ایسا واقعہ بیان کرتا ہے جو عموماً پیش آتا یا پیش آسکتا ہے تو اس کی یہ روایت تسلیم کرلی جائیگی لیکن

محض اس بناء پر کہ ان میں سے کسی راوی کی کوئی روایت امام بخاری یا امام مسلم نے قبول کرلی ہے اس راوی کی ہر روایت واجب القبول نہیں ہوسکتی۔

علاوہ ازیں تفسیر بحر محیط میں مسطور ہے کہ اس واقعہ کے متعلق مختلف روایات ہیں مگر ایک بھی آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم سے ثابت نہیں۔ ولم یثبت عن رسول اللہ فی ذالک شیئ۔ امام رازی کا رجحان بھی یہی مفہوم ہوتا ہے

وہی راوی اگر ایسا واقعہ بیان کرتا ہے جو غیر معمولی، فوق العادت اور تجربۂ عام کے خلاف ہے۔ تو واقعہ چونکہ زیادہ محتاجِ ثبوت ہے اس لئے اب راوی کی معمولی درجہ کی ثقاہت کافی نہیں ہوسکتی بلکہ اس کو معمولی درجہ سے بڑھ کر اور زیادہ عادل، زیادہ محتاط اور زیادہ فہیم و نکتہ دان ہونا چاہیئے۔ چنانچہ امام بیہقی کتاب المدخل میں ابن مہدی کا قول نقل کرتے ہیں۔ کہ جب ہم آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم سے حلال وحرام اور احکام کے متعلق حدیث روایت کرتے ہیں تو سند میں نہایت تشدد کرتے اور راوی خوب پرکھ لیتے ہیں۔ لیکن جب فضائل اور ثواب وعتاب کی حدیثیں آتی ہیں تو ہم سندوں میں سہل انگاری کرتے اور راویوں کے متعلق چشم پوشی کرتے ہیں۔

اذا روینا عن النبی فی الحلال والحرام والاحکام تشددنا فی الاسانید ۔۔۔۔۔۔ وتسامحنا فی الرجال۔ (فتح المغیث، ص ۱۳۰)

اور اسی صفحہ پر امام احمدؒ بن حنبلؒ کا یہ قول درج ہے کہ ابن اسحاق اس درجہ کا آدمی ہے کہ مغازی وغیرہ کی حدیثیں اس سے روایت کی جاسکتی ہیں لیکن جب حلال وحرام کے مسائل آئیں تو ہمیں ایسے مضبوط لوگ درکار ہیں۔ یہ کہکر امام صاحب نے ہاتھوں کی چار انگلیاں بند کرکے دبالیں۔ ابن اسحاق رجل تکتب عنه هذه الاحادیث یعنی المغازی ونحوها واذا جاء الحلال والحرام اردنا قوما هكذا وقبض اصابع یدیه الاربع۔ اور یہی وجہ ہے کہ فقہائے حنفیہ نے خلافِ قیاس روایات کی نسبت یہ دیکھنا ضروری قرار دیا ہے کہ اس کا راوی فقیہ اور مجتہد بھی ہے

کہ قتل شبیہ کا خیال درست نہیں اس لئے "اکثر المتکلمین" کا مذہب اعتراضات القاء الشبہ کے جواب میں سب سے پہلے ذکر کیا ہے۔ اور پھر آخر پر لکھتے ہیں کہ یہ سب امور باہم متخالف ہیں۔ گویا کوئی بھی معتمد علیہ نہیں۔ پھر اس روایت کا اصل ماخذ ابن جریر ہے مگر وہ بھی اس کے مقابلہ میں وہب بن منبہ کا قول صحیح ماننے میں ادھر سے آتی بیانہ۔

مزید برآں یہ کہ حضرت ابن عباسؓ کی طرف اس مضمون کی تین چار روایات منسوب ہیں جن میں باہمی سخت تعارض ہے اور بمطابق اصل اذا تعارضا تساقطا یہ روایت بھی دیگر روایات کی طرح ساقط الاعتبار قرار پاتی ہے۔ نیز تمام وہ آئمہ وعلمائے عظام جن کے نزدیک شبیہ کوئی بھی نہ تھا اس روایت کی عملاً تغلیط و تردید کرتے ہیں۔

اور بحر محیط جلد ۳ صفحہ ۱۹۵ وتفسیر جمل جلد ۱ صفحہ ۲۳۵ میں صاف مرقوم ہے کہ حضرت مسیح کی مشابہت کسی غیر شخص پر پڑنے کا قصہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت نہیں

یا نہیں۔ اگر نہیں تو باوجود ثقہ، عادل اور ضابط ہونے کے اس کی روایت مقبول نہیں ہوگی۔ وان کان صحابیًا کانس و ابی ھریرۃ (نور الانوار والقول الفصیح مؤلفہ مولوی غلام حسن سیالکوٹی)

فن روایت کے اس معقول اصل کی بناء پر مسئلہ القاء الشبہ سے متعلق تمام روایات ایک سیکنڈ کے لئے بھی قابل قبول نہیں ٹھہر سکتیں۔ خواہ ان کے راوی معمولی درجہ کے عدل و ضبط سے متصف ہی کیوں نہ ہوں۔ کیونکہ یہ واقعہ اس درجہ خلاف عقل وقیاس، خلاف مشاہدہ اور خلاف تجربہ ہے کہ اسے صحیح ماننے کیلئے اوّل تو قرآن کریم کی واضح اور صریح شہادت کی ضرورت ہے۔ ورنہ کم ازکم بخاری اور مسلم جیسے معتبر اماموں کی میزان تنقید وتحقیق میں پوری اُترنے والی کوئی مرفوع متصل حدیث مندرجہ صحیح بخاری وصحیح مسلم درکار ہے۔ نہ یہ کہ صحاح ستہ کی دیگر معتبر کتب میں بھی اس مضمون کو کسی مرفوع متصل حدیث کا نشان تک نہیں ملتا۔ فتأمل حق التأمل۔ منہ

کہ اعتماد کیا جاسکے۔ اما ان یلقی شبہہ علی شخص فلم یصح عن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فیعتمد علیہ۔ کیا یہ "مرفوع" روایت ان سب سے مستور رہی؟ مولوی ثناء اللہ صاحب ایک مرتد حواری کو شبیہہ لکھتے ہیں۔ (تفسیر ثنائی جلد ۲ صـ) مولوی ابراہیم صاحب ایک یہودی کو اور مولوی عبد الحق صاحب مفسر تفسیر حقانی ایک مفسد شمعون نامی شخص کو شبیہہ مانتے ہیں (تفسیر حقانی جلد ۳ صـ۱۴۹) پس یہ روایت ان کے نزدیک بھی مردود ٹھہری۔ کیونکہ اس میں مخلص اور جاں نثار حواری پر شباہت مسیح پڑنے کا ذکر ہے۔ علاوہ ازیں حضرت ابن عباسؓ کی طرف منسوب شدہ تفسیر ماننے کے لئے جس احتیاط و حزم اور تحقیق و تنقید کی عند المحققین ضرورت ہے وہ بھی اہل علم سے مخفی نہیں۔ کیونکہ ان کی جلالتِ شان کی وجہ سے ان کی طرف تفسیر قرآن کی روایات بکثرت منسوب ہوگئی ہیں۔ چنانچہ تفسیر اتقان میں مرقوم ہے:۔

"ھٰذہ التفاسیر الطوال الّتی اسندوھا الی ابن عباس غیر مرضیۃ ورواتھا مجاھیل" (اتقان جلد دوم صـ۱۸۸ مطبوعہ مصر ۱۹۲۵ء)

یعنی یہ جو لمبی چوڑی تفاسیر ابن عباسؓ کی طرف لوگوں نے منسوب کردی ہیں یہ سب غلط ہیں اور ان کے راوی مجہول ہیں۔

اور حضرت امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ حضرت ابن عباسؓ سے تفسیر قرآن کی صرف قریباً یکصد روایات ثابت ہیں باقی کچھ ثابت نہیں۔ لم یثبت عن ابن عباس فی التفسیر الا شبیہ بمائۃ حدیث (اتقان مذکور صـ۱۸۹) ان میں سے معتمد علیہ بالخصوص وہ تفسیر ہے جو صحیح بخاری میں مندرج ہے۔ (اتقان و مقدمہ فتح البیان۔ تفسیر فتح الخبیر) اس کے علاوہ بہت کم ثقات سے مروی ہے۔ (فتح الخبیر

(باقی دارد)

دُعائے خلیل اور نویدِ مسیحا

(از جناب شیخ عبدالخالق صاحب وفیسر فضلین کالج قادیان)

توریت کی پہلی کتاب میں خدا اتعالےٰ برحق نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ساتھ وعدہ فرمایا تھا کہ:۔

"ابراہام سے تو یقیناً ایک بڑی زبردست قوم پیدا ہوگی اور زمین کی سب قومیں اس کے وسیلہ سے برکت پائیں گی۔ کیونکہ میں جانتا ہوں کہ وہ اپنے بیٹوں اور گھرانے کو جو اس کے پیچھے رہ جائیں گے وصیت کریگا کہ وہ خداوند کی راہ میں قائم رہ کر عدل اور انصاف کریں۔ تاکہ جو کچھ خداوند نے ابراہام کے حق میں فرمایا ہے اُسے پورا کرے" (پیدائش ۱۸ ۱۸٫۱۹)

۱۔ اوّل برکت۔ خدا کے نزدیک برکت ظاہری سلطنت وافزائش اولاد کے سوائے برکتِ عظیمہ نبوّت ہے۔ پس ابراہیمؑ کے بیٹوں کو نبوّت کا ملنا بموجب وعدہ الٰہی لازمی وضروری ہے۔

۲۔ محولہ بالا آیت میں لفظ بیٹوں آیا ہے۔ اگر صرف اسحاقؑ مراد ہوتا تو لفظ بیٹا چاہیئے تھا۔ مخالف کہتے ہیں کہ اسماعیلؑ بوجہ لونڈی کے بطن سے پیدا ہونیکے حقیقی وارث نہیں ہوسکتا۔ لیکن توریت کہتی ہے کہ لونڈی زادہ وارث ہوسکتا ہے۔ (دیکھو پیدائش ۳۰) اور اس کو علمائے نصاریٰ نے تسلیم کیا ہے (تفسیر پیدائش مصنفہ ریورنڈ کینن سیل ڈی ڈی مترجمہ مسٹر ای جوزف صفحہ ۱۰) اور پیدائش ۳۰ میں راخل نے وہی کچھ کہا ہے جو سارہ نے کہا تھا۔ "دیکھ میری لونڈی بلہاہ حاضر ہے اس کے پاس جا تاکہ میرے لئے اس سے اولاد ہو۔ اور وہ اولاد میری ٹھہرے" اور سارہ نے بھی یہی کہا تھا۔ "اور سارہ نے ابراہام سے کہا کہ دیکھ خداوند نے مجھے تو اولاد سے محروم رکھا ہے سو تو میری لونڈی کے پاس جا۔ شاید اس سے میرا گھر آباد ہو۔ (پیدائش ۱۶) پس ثابت ہوا

کہ حضرت اسماعیل علیہ السلام ابراہیمؑ کے جائز وارث تھے۔ تعجب ہے کہ بنی اسرائیل کے کثیر سبط بلحاظ ولدیت لونڈیوں سے ہیں مگر وہاں کوئی اعتراض نہیں؟

دوسرا امر قابلِ غور یہ ہے کہ اگر اسحاق کی اولاد سے نبوت مخصوص کر دی جائے تو دوسرا وعدہ الٰہی پورا نہیں ہوتا۔ جو یہ ہے کہ "زمین کی ساری قومیں اس کے وسیلہ سے برکت پائیں گی" کیونکہ شریعتِ موسوی صرف اسرائیل کے لئے ہے۔ اور مسیح ناصری صرف اسرائیل کے لئے تھا۔ جیسا کہ ثابت شدہ امر ہے۔ پس جب تک اسمٰعیل کے گھرانے میں نبوت تسلیم نہ کی جائے گی یہ وعدہ الٰہی نامکمل رہے گا۔ کہ دُنیا کی ساری قومیں اس کے وسیلے سے برکت پائیں گی۔

اب دیکھنا اِس امر کا ضروری ہے کہ اسماعیلؑ کے متعلق حضرت ابراہیمؑ نے کیا دُعا کی تھی۔ اور وہ یہ ہے :۔ "اور ابراہام نے خدا سے کہا کہ کاش اسماعیل ہی تیرے حضور جیتا رہے" (پیدائش ۱۷/۱۸)

یہ دُعا قبول ہوئی۔ چنانچہ فرمایا :۔ "اور اسماعیل کے حق میں بھی میں نے تیری سُنی" (پیدائش ۱۷/۲۰)

اب یہ امر ظاہر ہے کہ انبیاءؑ لغو اور ناممکن دُعا نہیں کرتے۔ اور یہ ظاہر ہے کہ اسماعیل علیہ السلام فوت شدہ ہیں۔ پس یہ وعدہ کس طرح پورا ہوا۔ اولاد تو کفار کی بھی زندہ چلی آتی ہے۔ انبیاءؑ کی دائمی زندگی اُن کی آوردہ شرائع ہوا کرتی ہیں۔ چنانچہ عہدِ جدید میں اس کی مثال موجود ہے۔ (یہود اِس مضمون میں مخاطب متصور نہیں ہو سکتے۔ بلکہ صرف نصاریٰ جو اِس وقت ہندوستان میں ہیں) چنانچہ لُوقا ۱۶/۱۹ تا ۳۱ میں ایک تمثیل موجود ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ دو شخص مر گئے ایک دولتمند تھا دوسرا غریب تھا۔ دولتمند عذاب میں گرفتار ہوا۔ مگر غریب ابراہیم کی گود میں گیا۔ معذب دولتمند نے ابراہیم کو کہا۔ حضور کو میرے باپ کے گھر دُنیا میں بھیج تاکہ میرے پانچ بھائیوں کو دُنیا میں جا کر ڈراوے کہ وہ نیک بن جاویں۔ ابراہیم نے کہا "ان کے پاس موسیٰ اور انبیاءؑ تو ہیں اُن کی سُنیں۔ (آیت ۳۰) اب ظاہر ہے کہ موسیٰ اور انبیاءؑ اکٹھے نہ تھے۔ اور نہ ہی زندہ تھے۔ بلکہ صرف موسیٰ اور انبیاءؑ کی تعلیم اور شرائع اور صحائف ہی موجود تھے۔ پس معلوم ہوا کہ صحائف و تعالیم کی موجودگی انبیاءؑ کی زندگی متصور ہوتی ہے۔ لہذا اگر اسمٰعیل کی کوئی

شریعت موجود نہ ہو تو مواعیدِ الٰہیہ پورے نہ ہوئے۔ اور یہ امر بدیہی ہے کہ اسماعیل علیہ السلام کی کوئی شریعت اِس وقت موجود نہیں ہے۔ پس کس طرح خدا کے حضور میں اسمٰعیل جیتا ہے۔ کیونکہ دعا مقبول ہو چکی تھی۔

پس اس کے لئے دُور جانے کی ضرورت نہیں۔ انجیل میں لکھا ہے کہ یسوع ناصری کو جب مسیح ہوگا "تو خداوند خدا اُس کو اُس کے باپ داؤد کا تخت دے گا۔ اور وہ یعقوب کے گھرانے پر ابد تک سلطنت کرے گا۔" (لوقا ۱/۳۲) اور پھر یسوع کا شرعی باپ یوسف ابن داؤد کہلایا۔ (متی ۱/۲۰) لہٰذا اسی طرح اسماعیل علیہ السلام کا ایک بیٹا جس کا نام نامی ہے۔ محمدؐ بن اسماعیل اس دعا کو کامل کرنے والا ٹھہرا۔ اور بائیبل اسکی نبوت کی شاہد ہے۔

اس امر پر غور کرنے سے قبل یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ جس طرح آج اِس زمانہ میں محمد الرسول اللہ کے ابنِ روحانی حضرت احمدؑ رسول کے اعتراضات کی وجہ سے مسیحی بائیبل میں سے آیات نکال رہے ہیں اسی طرح محمدؐ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وجہ سے یہود نے بہت سی پیشگوئیاں عہدِ عتیق میں سے محرف مبدّل کر ڈالیں۔ اور مسیحیوں کا یہ کہنا کہ بائیبل دو مخالف اقوام یہود و نصاریٰ کے پاس ہے۔ اگر کوئی ایک فریق تغیر کرتا تو دوسرا فریق ضرور شور کرتا۔ مگر آج تک کبھی ایسا نہیں ہوا۔ قلتِ تدبر کا نتیجہ ہے۔ یہود ہمیشہ سے تحریف کے عادی ہیں۔ چنانچہ فاضل ڈاکٹر جے پیٹرسن سمائتھ ڈی ڈی اپنی کتاب احسن الاذکار کے صفحہ پر لکھتے ہیں:۔ (مترجمہ ڈاکٹر آئی۔ یو ناصر سول سرجن پنجاب)

"یستن شہید جو قریباً یوحنا کی موت کے وقت پیدا ہوا تھا یہودیوں کو ملزم قرار دیتا ہے۔ کہ انہوں نے اس کے متعلق (مسیح ناصریؑ کے متعلق) یرمیاہ کی ایک پیشگوئی کو کاٹ چھانٹ دیا ہے"

پس حضور سرورِ کائنات سے قبل اور بعد یہود ہمیشہ آپ سے متعلقہ پیشگوئیاں محرف و مبدّل کرتے رہے۔

اور یہود شریعت یعنی توریت و صحف الانبیاء میں تحریف کرنے کے ہمیشہ سے عادی ہیں۔ چنانچہ خود توریت اس پر شاہد ناطق ہے۔ یسعیاہ ۲۴/۵ میں ہے:۔

"زمین اپنے باشندوں سے نجس ہوئی۔ کیونکہ انہوں نے شریعت کو

عدول کیا۔ آئین سے منحرف ہوئے۔ عہدِ ابدی کو توڑا "
ثلاثہ فقرات قریباً مترادف ہیں۔ خود انہی میں تحریف کر دی ہے اور اس جگہ شریعت سے مراد توریت ہے۔

پھر حزقی ایل ۲۶/۲۲ پڑھو لکھا ہے:-

"اس کے کاہنوں نے میری شریعت کو توڑا اور میری مقدس چیزوں کو ناپاک کیا ہے۔ انہوں نے مقدس اور عام میں کچھ فرق نہیں کیا۔ اور نجس و طاہر میں امتیاز کی تعلیم نہیں دی۔ اور میرے سبتوں کو نگاہ میں نہیں رکھا"

یاد رکھنا چاہیئے کہ یسعیاہ کی عبارت کے اصل زبان میں لفظ حالفو آیا ہے جس کے لغوی معنے ہیں "بدل دیا" پھر حزقی ایل کے حوالہ میں اصل زبان کے الفاظ یہی ثابت کرتے ہیں۔ علاوہ ازیں صفنیاہ نبی کی کتاب میں ہے :-

"اس کے کاہنوں نے پاک کو ناپاک ٹھہرایا۔ اور انہوں نے شریعت کو مروڑا ہے"

اصل زبان میں حامسو تورا۔ بدل دینا۔ ایسی بات کہنا جو حقیقت کے خلاف ہو پس صاف ثابت ہوا کہ یہود ہمیشہ تحریف و تبدیل کرتے رہے ہے۔ اور جس طرح آج اس زمانہ حضرت موعود مسیح اقوام عالم کے اعتراضات کی وجہ سے مسیحی قوم کو بائبل کی تبدیلیوں کی ضرورت لاحق ہوئی نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے بعد یہود کو بہت کچھ عہد قدیم میں تغیر و تبدل کرنا پڑا۔ مگر حق آخر حق ہے۔ بایں ہمہ آج تک نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے متعلق پیشگوئیاں موجود ہیں۔ چنانچہ حبقوق نبی کی کتاب میں بھی ایک واضح پیشگوئی موجود ہے۔ بہت کچھ تغیر و تبدل کے بعد بھی نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے متعلق واضح پیشگوئی موجود ہے جو یہ ہے۔ شگایونوت کے سر پر حبقوق نبی کی دعا۔ سب سے پہلے لفظ شگایونوت کے معنے کے متعلق معلوم کرنا چاہیئے۔ یہ زبور ۷ کا لقب ہے۔ اس کے مصدر کے معنے ہیں آوارہ یا پریشان یا عالم وجد کے خیالات کا اجتماع۔

دوسرا لفظ اس مقام میں لفظ "سلاہ" آیا ہے (آیت ۲، ۹) یہودی احادیث میں اس کے دو معنے ہیں "بلند آواز سے گانا۔ حمد الٰہی بلند آواز سے کرنا۔ پھر اس کے معنی مدام ہمیشگی بھی ہیں۔ آج کی تحقیقاتِ علمی کی رو سے اس کے معنے ہیں تازہ یا نئے خیالات کا

آثار ۱۹ء دیکھو تفسیر زبور مصنفہ ریورنڈ کینن بے علی بخش صاحب صفحہ ۹ تا ۱۱)

اب حبقوق کے الفاظ درج ذیل ہیں:۔

"اے خداوند میں نے تیری شہرت سنی اور ڈر گیا۔
اے خداوند اسی زمانہ میں اپنے کام کو بحال کر۔
اسی زمانہ میں اس کو ظاہر کر۔
قہر کے وقت رحم کو یاد فرما۔
خدا تیمان سے آیا۔
اور قدوس کوہِ فاران سے۔ سِلاہ۔
اُس کا جلال آسمان پر چھا گیا۔
اور زمین اُس کی حمد سے معمور ہو گئی۔
اُس کی جگمگاہٹ نور کی مانند تھی۔
اُس کے ہاتھ سے کرنیں نکلتی تھیں۔
اور اس میں اس کی قدرت نہاں تھی۔
وبا اس کے آگے آگے چلتی تھی۔
اور آتشی تیر اُس کے قدموں سے نکلتے تھے۔
وہ کھڑا ہوا اور زمین تھرا گئی۔
اس نے نگاہ کی اور قومیں پراگندہ ہو گئیں۔
ازلی پہاڑ پارہ پارہ ہو گئے۔
قدیم ٹیلے جھک گئے۔
اُس کی راہیں ازلی ہیں۔
میں نے کوشن کے خیموں کو مصیبت میں دیکھا۔
ملک مدیان کے پردے ہل گئے۔"

ناظرین کو چاہیئے کہ آیت ۱۳ تک پڑھیں۔ بخوفِ طوالت ترک کرتا ہوں۔ (حبقوق ۱ تا ۱۳)
یہ ۱۹۲۲ء کا ترجمہ ہے جس میں سخت تحریف ہوئی ہے۔ اس لئے وہ ترجمہ آیت ۲ سے
رکھا جاتا ہے جو مولوی عنایت رسول صاحب چریا کوٹی نے اپنی کتاب بشریٰ کے صفحہ ۹۶ پر

کیلہے۔ وہ عبرانی کے بڑے عالم تھے۔

۳ خداوند جنوب خواہ یمن سے آئے گا اور مقدس کوہ فاران سے اس کا جمال آسمان کو چھپالے گا۔ اس کے جلال سے زمین بھر جائیگی۔

آیت ۴۔ روشنی صبح کی سی ہوگی۔ اسکے ہاتھ میں بجلی ہوگی۔ اسکے دونوں ہاتھوں میں سینگ ہوں گے ذوالقرنین یعنی بہت قوی ہوگا اور اُسکی قوت پردہ اُٹھادیگی۔ اسکے سامنے موت چلیگی یا آگے آگے۔ اور اسکے قدموں سے برق نکلیگی۔ آیت ۵، ۶۔ قائم ہوا اور زمین کو ناپ ڈالا۔ تاکا اور قبائل کو آزاد کیا یخواہ پریشان حیران کیا۔ اور ٹوٹ جائینگے بڑے پہاڑ۔ اور قدیم پہاڑیاں جھک جائینگی یا خسف ہونگے۔ ابدی راہ اسکی ہوگی یا قدیم راہ اسکی ہوگی۔

آیت ۷۔ میں نے مدین یا مدیان کے بتخانہ یا بتوں کو مصیبت میں دیکھا۔ اِس جگہ اصل لفظ آون ہے۔ اصل معنی اسکے بیہودگی ولغو اور بکثرت اطلاق اس کا بت پر ہوتا ہے۔ اور بت خانہ کو بیت آون کہتے ہیں۔

اِسجگہ ساتھ ہی کوش کے لفظ کی تشریح ضروری ہے جو یہ ہے۔ کوش و مصرائیم بن نوح کے بیٹوں میں سے تھے (پیدائش ۱۰) مصرائیم کا آباد کردہ مصر اور کوش کی اولاد سے حبش ونگیا آباد ہے اور کوش نام ایک عربی قوم کا بھی ہے جو سینا پہاڑ کے گرد بستی تھی۔ پھر یہ قوم پھیل کر مدینہ تک پہنچی شعیبؑ پیغمبر اسی قوم سے تھے۔ انہیں کے نام پر مدینہ آباد ہوا جسے یثرب کہتے تھے۔ اور شعیبؑ کا نام تورات میں یثرو ہے۔ واو یا تحتانی سے مبدل ہوگئی۔ چنانچہ موسیٰ علیہ السلام نے اسی قوم سے کوشی عورت کیساتھ شادی کی تھی جس کا ذکر توریت میں موجود ہے۔

مدین وہی مدیان ہے جہاں یثرو یا شعیب رہتے تھے۔ نیز قوم کوش کو بھی مدیان کہتے ہیں۔ یہ قوم ابراہیمؑ کی اولاد میں سے ہے (پیدائش ۲۵) اب صحیح ترجمہ اور ضروری امور کے بعد خلاصہ حبقوق شام میں رہتے تھے۔ ملک عرب جنوب کو واقعہ ہے۔ وہ کہتے ہیں۔ خداوند۔ مالک یعنی استاد آقا خلیفہ۔ نائب دکھن سے آئیگا۔ اور مقدس کوہ فاران سے۔ یہ اگر نبی مکی و مدنی نہیں تو اور کون ہے۔ یہی تھی آوارہ کو مجتمع کرنیوالی ذات۔ وہی ذات تھی تازہ دنیے خیالات کا اعلان کرنیوالی جیساکہ الفاظ تنگا یوتوت وبلاہ سے ظاہر ہوتا ہے۔

دیوتاؤں کی اولاد

مشین نما انسانوں کی قوم

(یہ مضمون ایک دوست نے ایک انگریزی اخبار سے ترجمہ کر کے بھیجا ہے۔ ایڈیٹر)

ہیرن واک لبینسیرام۔ ہم سب جانتے ہیں کہ اِن دو لفظوں کا مطلب ہے حاکم نسل، رہائش کیلئے جگہ۔ یہ جرمن زبان کے الفاظ ہیں۔ لیکن جو جذبہ اِن الفاظ کے معانی کی جڑ ہے وہ جرمن قوم کے تعلیم و تقویم میں آنے سے بہت عرصہ پہلے سے جاپانی قوم کے دماغ پر مسلط چلا آتا تھا اس قسم کے خیالات جب حد سے گذر جائیں تو یہ ایک قسم کی دیوانگی پر منتج ہوتے ہیں۔ اور یہ افراد کا معاملہ نہیں ہے یہ تمام قوم سے تعلق رکھتا ہے۔ اور پھر دوسری اقوام پر اثر انداز ہوتا ہے۔ زمانۂ حال میں دو پوری کی پوری قومیں اس جذبہ کے اثر سے دیوانگی اختیار کر گئیں۔ اور دونوں میں سے جاپانی زیادہ پاگل ہیں اور ان پر پاگل پن کا اثر بہت زیادہ عرصے سے ہے۔

اوّل۔ پہلی خام خیالی کو لیجیے۔ حاکم نسل خام خیالی یا جیسا کہ عام طور پر سُننے میں آتا ہے ہیرن واک خیال، قومی تفاخر کا یہ خیال نٹشے نے جرمنی میں انیسویں صدی کے اواخر میں پیدا کیا اور پھر اسے ترقی دی۔ یہ بات آج سے ساٹھ سال پہلے کی ہے۔ لیکن جاپان میں ان کے اپنے حساب کی رو سے یہ خیال ان کے شہنشاہ جمو نے آج سے اڑھائی ہزار سال پہلے پیدا کیا۔ جمو نے ایک شاہنشاہی فرمان میں حاکو اچیو' کا نعرہ بلند کیا۔ جس کے معنے ہیں دُنیا کے آٹھوں کونے ایک، چھت کے نیچے'۔ اِس امر کے اظہار کی ضرورت نہیں کہ ایک چھت سے مراد مُلک جاپان تھا اور اس سے یہ خیال پیدا ہوا کہ ساری دُنیا جاپان کے زیر نگیں ہو۔

"ایک خواب"

مندرجہ ذیل الفاظ جرنیل اراکی نے اُس وقت لکھے جب وہ ۱۹۳۳ء میں وزیر جنگ تھا۔
"اب یہ خواب کس طرح پُورا ہو۔ ساری دُنیا کو فتح کر کے سارے جہان کو اپنی سلطنت میں شامل کرنا" تاکہ شہنشاہ جمو کی خواہش پُوری ہو اور اپنی امنگ کو بہت کچھ بڑھانا اور ترقی دینا ہماری قومی پالیسی رہی ہے۔ اگر کسی مُلک کی کوششیں ہماری شہنشاہیت کی معاون نہ ہوں تو ہماری جبروت اس پر نازل ہوگی۔ ہمارے شاہنشاہی اخلاق کی تمام دُنیا میں تبلیغ کی جائے گی اور اُنہیں پھیلایا جائے گا۔ لیکن کسی لحاظ سے بھی ساری کوشش اس پر ختم نہ ہوگی۔ جرمنوں نے اپنے منکسرانہ انداز میں کہا "ہم انسانیت سے بالا ہیں" مگر جاپانیوں نے کہا "ہم دیوتا ہیں"۔

پروفیسر ہراٹا شنٹو مذہب کے بہت بڑے عالم نے کہا:-

"اِس حقیقت سے کہ جاپانی قوم دیوتاؤں کی اولاد ہے۔ جاپانیوں کی بہادری اور ذہانت میں دوسرے ممالک کے باشندوں پر بہت بڑی برتری پیدا ہوتی ہے۔ جاپانیوں اور دُنیا کی دوسری قوموں کے درمیان درجہ کے بجائے قسم کا فرق ہے۔ تمام وہ دیوتا جنہوں نے دوسرے ممالک کی تخلیق کی جاپان میں پیدا ہوئے تھے۔"

ٹوکیو سے ایک تازہ نشری تقریر نے جاپانیوں کو اعلاناً بتایا کہ:-

"جاپان ایک ایسی قوم ہے جسے دیوتاؤں نے بنایا۔ جاپان ام الاقوام ہے۔ اور وہ لوگ جو جاپان میں پیدا ہوتے ہیں وہ خدا کی اولاد ہیں۔ ہم دُنیا میں سب سے بڑی قوم ہیں۔"

دوسری علامت رہائشی مکان کی خام خیالی ہے۔ یا جیسا کہ ہم عام طور پر سننے کے عادی ہیں 'لیبنسراُم' کی خام خیالی۔ یہ خام خیالی ایذا دہی کے احساس سے شروع ہوتی ہے۔ غریب آدمی اُن شریر آدمیوں سے مقید کیا جاتا ہے جو سازش سے اس کی آزادی سے نقل و حرکت کو روک دیتے ہیں۔ وہ اسے دائرہ میں لے لینا کہتے ہیں۔ یہ خام خیالی 'حاکم نسل' کی خام خیالی سے مل کر اس خونی خبط کو پیدا کرتی ہے جسے استبداد کہتے ہیں۔

۱۹۴۲ء میں ٹوکیو میں ایک کتاب اشاعت پذیر ہوئی۔ اس کا مصنف پروفیسر

فوجی سادا تھا۔ یہ صاحب دُور دراز ممالک میں سیاحت کر چکے ہیں اور چھ زبانیں روانی سے بول سکتے ہیں لیگ آف نیشنز میں وہ مستقل طور پر جاپان کا نمائندہ تھا۔ اور اب امپیریل رول اسشٹنس ایسوسی ایشن کے محکمہ ریسرچ کا انچارج ہے۔ یہ ایسوسی ایشن جاپان کی قومی فوجی پارٹی کی جان ہے۔ اس لئے اس کے خیالات کلی طور پر سرکاری ہیں۔ ان خیالات پر ذرا توجہ دیں:۔

"جاپان بطور انسانی نسل اور دُنیاوی تہذیب کی اُم القریٰ ہونیکی حیثیت سے ایک مقدس جنگ لڑ رہا ہے۔ تاکہ جنگ میں حصہ لینے والے لوگوں کو ایک ہمہ گیر خاندانی حیثیت میں دوبارہ متحد کر دے۔ اور اس ہمہ گیر خاندان میں ہر ایک قوم اپنا مناسب مقام جاپان کے شہنشاہ کی مملکت میں حاصل کریگا۔"

پھر لکھتا ہے:۔

"یہ مقدس جنگ جلد یا بدیر تمام اقوام کو یہ دُنیاوی صداقت تسلیم کرا دے گی کہ ان کی علیحدہ علیحدہ قومی زندگیاں ایک خاص مرکزی زندگی سے نکلی ہیں جسے سومیرا میکوتو (شہنشاہ) نے اجتماعی صورت دی ہے اور یہ کہ صلح اور میل ملاپ صرف اسی طرح حاصل کئے جا سکتے ہیں کہ ان مختلف اقوام کو سومیرا میکوتو کے ماتحت ایک ایسے فیملی سسٹم میں منظم کیا جائے کیا جائے جو سب پر حاوی ہو"

یہ لیجئے تحریر میں جاپانیوں کی طرف سے سرکاری طور پر ادعا کہ ہم دُنیا کے حکمران ہیں کیونکہ ہمارا حق خدائی حق ہے۔ کیا خود ستائی سے پیدا ہونے والی دیوانگی اس سے اور بڑھ سکتی ہے؟

آئیے۔ اب ذرا جاپانیوں کی مجلسی تنظیم پر نظر ڈالیں۔ ان کا یقین ہے کہ وہ جزائر جن پر جاپان مشتمل ہے چونکہ یہ دیوتاؤں کی اولاد ہیں اس لئے یہ مقدس ہیں۔ ان پر ایک ایسی ہستی کی حکومت ہے جس میں باقی دُنیاوی ہستیوں سے علیحدہ ایک ایسی مقدس مکمل رُوح قیام پذیر ہے جو حقیقتاً دیوتا ہے۔ ہر ایک جاپانی معمولی کسان سے لے کر ایک امیر آدمی تک۔ ایک فقیر سے شاہزادہ تک دیوتاؤں کی اولاد ہے اس لئے ہر ایک شخص اس مقدس جسم کا جسے ہم جاپان کہتے ہیں ایک حصہ ہے۔

اور صحیح طور پر یہی وجہ ہے کہ جاپانی اقتدارئی خطرناک خیالات سے ایسی خوفزدہ ہے

مندرجہ ذیل الفاظ جرنیل اراکی نے اُس وقت لکھے جب وہ ۱۹۳۳ء میں وزیر جنگ تھا۔
"اب یہ خواب کس طرح پُورا ہو۔ ساری دُنیا کو فتح کر کے سارے جہان کو اپنی سلطنت میں شامل کرنا" تاکہ شہنشاہ جمو کی خواہش پُوری ہو اور اپنی امنگ کو بہت کچھ بڑھانا اور ترقی دینا ہماری قومی پالیسی رہی ہے۔ اگر کسی مُلک کی کوششیں ہماری شہنشاہیت کی معاون نہ ہوں تو ہماری جبروت اس پر نازل ہوگی۔ ہمارے شاہنشاہی اخلاق کی تمام دُنیا میں تبلیغ کی جائے گی اور اُنہیں پھیلایا جائے گا۔ لیکن کسی لحاظ سے بھی ساری کوشش اس پر ختم نہ ہوگی۔ جرمنوں نے اپنے منکسرانہ انداز میں کہا" ہم انسانیت سے بالا ہیں"۔ مگر جاپانیوں نے کہا" ہم" دیوتا ہیں"۔

پروفیسر ہیراٹا شنٹو مذہب کے بہت بڑے عالم نے کہا :-

"اِس حقیقت سے کہ جاپانی قوم دیوتاؤں کی اولاد ہے۔ جاپانیوں کی بہادری اور ذہانت میں دوسرے ممالک کے باشندوں پر بہت بڑی برتری پیدا ہوتی ہے۔ جاپانیوں اور دُنیا کی دوسری قوموں کے درمیان درجہ کے بجائے قسم کا فرق ہے۔ تمام وہ دیوتا جنھوں نے دوسرے ممالک کی تخلیق کی جاپان میں پیدا ہوئے تھے"۔

ٹوکیو سے ایک تازہ نشری تقریر نے جاپانیوں کو اعلاناً بتایا کہ :-

"جاپان ایک ایسی قوم ہے جسے دیوتاؤں نے بنایا۔ جاپان ام الاقوام ہے۔ اور وہ لوگ جو جاپان میں پیدا ہوئے ہیں وہ خدا کی اولاد ہیں۔ ہم دُنیا میں سب سے بڑی قوم ہیں"۔

دوسری علامت رہائشی مکان کی خام خیالی ہے۔ یا جیسا کہ ہم عام طور پر سُننے کے عادی ہیں "ایلبنیر ام" کی خام خیالی۔ یہ خام خیالی ایذا دہی کے احساس سے شروع ہوتی ہے۔ غریب آدمی اُن شریر آدمیوں سے مقید کیا جاتا ہے جو سازش سے اس کی آزادی سے نقل و حرکت کو روک دیتے ہیں۔ وہ اسے دائرہ میں لے لینا کہتے ہیں۔ یہ خام خیالی "حاکم نسل" کی خام خیالی سے مل کر اِس خونی خبط کو پیدا کرتی ہے جسے استبداد کہتے ہیں۔

۱۹۴۲ء میں ٹوکیو میں ایک کتاب اشاعت پذیر ہوئی۔ اس کا مصنف پروفیسر

فوجی سالار تھا۔ یہ صاحب دُور دراز ممالک میں سیاحت کر چکے ہیں اور چھ زبانیں روانی سے بول سکتے ہیں۔ لیگ آف نیشنز میں وہ مستقل طور پر جاپان کا نمائندہ تھا۔ اور اب امپیریل رول اسسٹنس ایسوسی ایشن کے محکمہ ریسرچ کا انچارج ہے۔ یہ ایسوسی ایشن جاپان کی قومی فوجی پارٹی کی جان ہے۔ اس لئے اس کے خیالات کلی طور پر سرکاری ہیں۔ ان خیالات پر ذرا توجہ دیں:-

"جاپان بطور انسانی نسل اور دُنیاوی تہذیب کی اُمّ القریٰ ہونے کی حیثیت سے ایک مقدس جنگ لڑ رہا ہے۔ تاکہ جنگ میں حصہ لینے والے لوگوں کو ایک ہمہ گیر خاندانی حیثیت میں دوبارہ متحد کر دے۔ اور اس ہمہ گیر خاندان میں ہر ایک قوم اپنا مناسب مقام جاپان کے شہنشاہ کی مملکت میں حاصل کریگا۔"

پھر لکھتا ہے:-

"یہ مقدس جنگ جلد یا بدیر تمام اقوام کو یہ دُنیاوی صداقت تسلیم کرا دے گی کہ ان کی علیحدہ علیحدہ قومی زندگیاں ایک خاص مرکزی زندگی سے نکلی ہیں جسے سومیرا میکوتو (شہنشاہ) نے اجتماعی صورت دی ہے اور یہ کہ صلح اور میل ملاپ صرف اسی طرح حاصل کئے جا سکتے ہیں کہ ان مختلف اقوام کو سومیرا میکوتو کے ماتحت ایک ایسے فیملی سسٹم میں منظم کیا جائے کیا جائے جو سب پر حاوی ہو۔"

یہ لیجئے تحریر میں جاپانیوں کی طرف سے سرکاری طور پر ادعا کہ ہم دُنیا کے حکمران ہیں کیونکہ ہمارا حق خدائی حق ہے۔ کیا خود ستائی سے پیدا ہونے والی دیوانگی اس سے اور بڑھ سکتی ہے؟

آئیے۔ اب ذرا جاپانیوں کی مجلسی تنظیم پر نظر ڈالیں۔ ان کا یقین ہے کہ وہ جزائر جن پر جاپان مشتمل ہے چونکہ یہ دیوتاؤں کی اولاد ہیں اس لئے یہ مقدس ہیں۔ ان پر ایک ایسی ہستی کی حکومت ہے جس میں باقی دُنیاوی ہستیوں سے علیحدہ ایک ایسی مقدس مکمل رُوح قیام پذیر ہے جو حقیقتاً دیوتا ہے۔ ہر ایک جاپانی معمولی کسان سے لے کر ایک امیر آدمی تک۔ ایک فقیر سے شاہزادہ تک دیوتاؤں کی اولاد ہے اس لئے ہر ایک شخص اس مقدس جسم کا جسے ہم جاپان کہتے ہیں ایک حصہ ہے۔

اور صحیح طور پر یہی وجہ ہے کہ جاپانی اقتدار کی خطرناک خیالات سے ایسی خوفزدہ ہے

کیونکہ ٹھیک جس طرح انسانی جسم میں وہ Cells جو بے قاعدگی سے کام کرتا ہے جسے درحقیقت باغی Cells کہنا چاہیئے ، درد پیدا کرتا ہے یا شائد ایک زخم کا موجب ہوتا ہے یا کسی اور تکلیف کا موجب بن جاتا ہے اسی طرح یہ سمجھا جاتا ہے کہ اگر کوئی جاپانی یعنی اس جسم کا کوئی Cells از خود آزادی سے سوچتا یا عمل کرتا ہے وہ اس مقدس عمارت کے لئے باعث تعلیت ثابت ہوگا۔ یہ قدرتی اور طبعی آمریت ہے جو کہ گذشتہ دو ہزار سال سے جاپانی قوم کی معمولی خصوصیت بنی ہوئی ہے۔ موجودہ وقت میں سارے جاپان میں پولیس ہر ایک فردِ واحد پر ایک چھوٹا سا ٹکڑہ بطور نشان لگا دیتی ہے۔ ہر ایک شخص کا نام اور اس کا پیشہ اس کے مکان پر لازماً لکھا ہونا چاہیئے۔ گھروں کے ہر ایک چھوٹے مجموعہ پر ایک خاص پولیس کا سپاہی اور سراغرساں متعین ہوتے ہیں جو ہر ایک گھر میں جو ان کے علاقہ میں ہے مہینہ میں ایک دفعہ جاتے ہیں۔ علاوہ ازیں، ہر ایک شہر، قصبہ اور گاؤں اور قریہ تقسیم اور تقسیم در تقسیم ہوتا ہے۔ ہر ایک حصہ پر ایک نمبردار ہوتا ہے جو ان تمام اشخاص کے اعمال کا جو اسکے ماتحت ہوں پولیس کے سامنے جواب دہ ہوتا ہے۔ سب سے چھوٹا حصہ پانچ گھروں کا مجموعہ ہوتا ہے۔ اس بدقسمت نمبردار کی کم بختی کا کیا کہنا جس کے مقررہ گھرانے کا کوئی ممبر بدراہ ہو جائے خواہ یہ بدراہی کسی فعل میں ہو یا تقریر یا خیال میں ہو۔

جاپانی خفیہ پولیس

ہر ایک اسکول اور یونیورسٹی کی ہر ایک کلاس میں خفیہ پولیس کے سپاہی ہوتے ہیں۔ یہ لوگ تعلیمی عملہ میں بھی ہوتے ہیں۔ ہر ایک کارخانہ اور تجارتی کاروبار میں ہوتے ہیں لیکن کوئی خفیہ پولیس کا سپاہی دوسرے خفیہ سپاہی کو نہیں جانتا۔

ایک خبطی قوم کی کیس ہسٹری پر ایک طائرانہ نظر ہے۔ وہ قوم جس کا فلسفہ جنرل اراکی کے مندرجہ ذیل الفاظ میں خلاصۃً بیان ہوا ہے۔" اب یہ خیال کس طرح پورا ہو ساری دُنیا کو فتح کر کے سارے جہان کو اپنی سلطنت میں شامل کرنا۔" تا کہ شہنشاہ جموں کی خواہش پوری ہو۔ اور شہنشاہ جموں کی تاریخ سرکاری طور پر چھ سو قبل از مسیح تھی۔

وہ ان ہزارہا ہزار سالوں سے مکمل صبر سے انتظار کرتے رہے ہیں۔ یہ انکا ارادہ اور امید تھی کہ اپنی فتح کو اس جنگ میں مجتمع کر کے ایشیا کے سو کروڑ باشندوں کو منظم کرینگے اور اس طرح ساری دُنیا کو اپنے زیرنگیں کرلیں

بہائیوں کی بے اصولی اور شیوۂ جھوٹ و فریب

(از مولوی صدرالدین صاحب مولوی فاضل دار الواقفین)

بہائی لوگ بہائیت کی تعریف و تحسین میں یوں رطب اللسان ہیں:-

"ظہورِ امر بہائی اس زمانہ کی روح ہے۔ موجودہ صدی کے اعلیٰ خیالات کا جوہر ہے" (نئے دن کا طلوع صٓ)

لیکن اگر واقعات کی رو سے دیکھا جائے تو ہمارے لئے یہ کہنا ہرگز بے جا نہ ہوگا کہ بہائیت موجودہ پُر از دجل و جھوٹ و مکر و فریب زمانہ کی روح ہے اور دروغ اور خدیعت اور دھوکے بازی کے ادنیٰ ترین خیالات کا جوہر ہے۔ کیونکہ ہر خدائی مذہب اور ہر شریف انسان ان مذکورہ بُرے خصائل اور عادات سے اجتناب کرتا ہے۔ مگر بہائی لوگ چھوٹے سے لے کر بڑے تک ان مذکورہ بداخلاقیوں میں ملوث ہیں اور یہ بدعنوانیاں ان کے ذرہ ذرہ میں سرایت کر گئی ہیں۔ جھوٹ بولنا ان کے لئے شیرِ مادر سے بڑھ کر عزیز ہے اور دھوکے دینا ان کی گھٹی میں داخل ہے۔ اور فریب کاری کے یہ شیدائی ہیں۔ ہمارا یہ کہنا بلا ثبوت اور بلا تحقیق نہیں بلکہ ہمارے پاس ان کے ان افعالِ شنیعہ کے بہت سے ثبوت ہیں جن میں سے کچھ "مشتے از خروارے" کے مطابق ذیل میں بیان کئے جاتے ہیں۔

جاننا چاہیئے کہ بہاء اللہ صاحب نے اپنے نہ ماننے والوں کو کافر قرار دیا ہے چنانچہ وہ لکھتے ہیں:-

"والذین کفروا و اشرکوا اولئک غضب اللہ علیھم"

(مبین صٓ)

یعنی جن لوگوں نے کفر کیا اور مشرک بن گئے ان پر اللہ تعالیٰ کا غضب ہوگا۔

ناظرین حیران ہوں گے کہ باوجود اس کے کہ بہاء اللہ صاحب اپنے نہ ماننے والوں کو

کافر بتاتے ہیں اور مشرک قرار دیتے ہیں عبد البہاء صاحب سفید جھوٹ سے کام لیتے ہوئے اور صریحاً دھوکہ دیتے ہوئے لکھتے ہیں :-

"تعالیم جمال مبارک آب رواں نہ حیفے نہ سیفے و نہ تکفیرے و نہ تدمیرے و نہ تضییقے و نہ تعرضے و نہ تکلفے" (مکاتیب عبد البہاء جلد دوم صفحہ ۲۶۲)

یعنی بہاء اللہ کی تعالیم رواں پانی کی طرح ہیں۔ نہ ان میں کوئی ظلم نہ تلوار یعنی لڑائی وغیرہ اور نہ تکفیر اور نہ تدمیر اور نہ کوئی تنگی اور نہ کوئی کسی سے چھیڑ چھاڑ اور نہ ہی کوئی تکلف ہے۔

اس عبارت میں عبد البہاء نے صاف طور پر جھوٹ سے کام لیا ہے۔ کیونکہ اس میں کہا گیا ہے کہ بہاء اللہ کی تعلیم میں کسی کو کافر نہیں کہا جاتا۔ حالانکہ مذکورہ حوالہ میں بہاء اللہ صاحب صاف طور پر اپنے منکروں کو کافر قرار دیتے ہیں۔ کیا عبد البہاء نے اپنے باپ کی کتاب مبین کو نہیں پڑھا تھا کہ اسے اس کے قول کا علم نہ تھا جس وجہ سے اُس نے ایسا لکھدیا؟ نہیں۔ وہ ان سب کتابوں سے خوب واقف تھا لیکن چونکہ اس مذہب کی بُنیاد ہی جھوٹ کے تودۂ ریگ پر رکھی گئی ہے اس لئے اس نے محض دھوکہ دہی کے لئے یہ لکھدیا کہ بہاء اللہ کی تعلیم میں کوئی تکفیر نہیں۔

علاوہ ازیں بہائیوں کے موجودہ زعیم جناب شوقی آفندی صاحب بھی اپنے نانا کی تقلید میں جھوٹ جیسی گندی چیز کو استعمال کر کے بہاء اللہ کی تعلیم پہ پردہ ڈالنے کے لئے اور دھوکہ دہی سے لوگوں کو ساتھ ملانے کے لئے لکھتے ہیں :-

"پہلے ادیان میں دُنیا کو دو حصّوں میں تقسیم کر دیا جاتا تھا (۱) مومن۔ (۲) کافر۔ لیکن آج کوئی فرق نہیں۔ کسی کو ایک دوسرے کو کافر سمجھنے کا حق حاصل نہیں۔" (رسالہ نئے دن کا طلوع صفحہ ۹)

پس جس مذہب کے اکابر کا یہ حال ہے کہ وہ جھوٹ جیسے گند سے بھی پرہیز نہیں کرتے تو اُن کے چھوٹوں کا کیا حال ہوگا۔ وہ تو بلاشبہ زمین و آسمان کے قلابے ملاتے ہوں گے۔ اور یقیناً ہے بھی ایسا ہی۔ کیونکہ بہائیت اپنے بدعقائد کی وجہ سے ایک تودۂ ریگ پر کھڑی ہے۔ جس کی وجہ سے وہ ہر وقت معرض خطر میں ہے اور بہائیوں کو اپنے عقائد پیش کرتے ہوئے شرم آتی ہے۔ اور ہمیشہ

نجالت اُٹھانی پڑتی ہے۔ اس لئے وہ مکر و حیل و جھوٹ سے کام لیتے ہیں تاکہ اِس نجالت سے بچ جائیں مگر پھر بھی وہ نجالت اور شرمندگی کی آماجگاہ بننے سے رُک نہیں سکتے۔
عبد البہاء نے بہائیوں کو کئی مقامات پر عقائد کو لوگوں کے سامنے پیش کرنے سے منع کیا ہے؎ اگر ان کے عقائد واقعی اور حقیقۃً اچھے، اعلیٰ اور اس زمانہ کا جوہر اور رُوح ہیں تو کیا وجہ ہے کہ عبد البہاء نے ان کو پیش کرنے سے منع کیا ہے۔ کیا ان عقائد کا چھپانا اس امر کا بیّن ثبوت نہیں کہ وہ عقائد محض خس و خاشاک کی حیثیت رکھتے ہیں جن کو ہوائیں اِدھر اُدھر اُڑاتی رہتی ہیں اور باعثِ شرم چیز ہیں۔ مگر اس کے برعکس بہائی لوگ جماعت احمدیہ کے عقائد پر ذرا غور کریں۔ کیا کوئی احمدی جو احمدی کہلا کر اپنے عقائد سے روگردانی کرے اور ان پر اپنے ایمان کی بُنیاد نہ رکھے۔ کیا وہ احمدی کہلا سکتا ہے؟ ہرگز نہیں۔ ہر احمدی کا فرض ہے کہ وہ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کے بیان فرمودہ عقائد پر یقین رکھے اور ان کو اسی رنگ میں صحیح طور پر پیش کرے اور ان پر کاربند ہو۔ لیکن بہائی اس زرّیں اصول سے سراسر محروم اور بے نصیب۔
الغرض بہائیت ایک نکمّا اور بے اصل مذہب ہے اور ایسی کشتی ہے جو شکستہ اور کاغذ کی بنی ہوئی ہے اور غرق ہونے سے بچ نہیں سکتی۔ مبارک ہیں وہ لوگ جو احمدیت کی محفوظ و مصئون اور محکم و مضبوط کشتی پر سوار ہوتے ہیں۔ کیونکہ وہ نجات پائیں گے اور اپنی منزل مقصود پر کامیاب و کامران پہنچیں گے۔

؎ ان حوالجات کو کسی آئندہ مضمون میں بیان کیا جائیگا۔

حب اٹھرا جسکے استعمال سے بچہ بفضلِ خدا ذہین۔ خوبصورت مضبوط تندرست۔ اٹھرا کی شکایت سے محفوظ پیدا ہوتا ہے اور والدین کے لئے راحتِ قلب ہوتا ہے قیمت فی تولہ عہ مکمل کورس بیکدم منگوانے پر صرف بارہ روپے علاوہ محصولڈاک حمل سے پہلے ہی کھلائی جاتی ہے شروع حمل سے لیکر جبتک بچہ دو سال کا نہ ہو جائے گیارہ تولہ گولیاں خرچ آتی ہیں +

حبوب عنبری یہ گولیاں جسیر مشک یوتی۔ زعفران اور دیگر قیمتی اجزا سے مرکب ہیں۔ انکا استعمال ان لوگوں کیلئے ہے جنکی قوت رجولیت کم ہو چکی ہو اعصاب سرد پڑ چکے ہوں۔ دل ٹھنڈا ہو گیا ہو سرور مٹ گیا ہو۔ چہرہ بے رونق۔ حافظہ کمزور۔ اعضائے رئیسہ سرد پڑ گئے ہوں۔ کمر درد ہوتا ہو۔ کام کرنیکو جی نہ چاہتا ہو۔ حبوب عنبری کا استعمال بجلی کا اثر دکھاتا ہے گئی ہوئی طاقت واپس آجاتی ہے۔ دل میں خوشی اور سرور پیدا ہوتا ہے۔ اعصاب یعنی پٹھے طاقتور ہو جاتے ہیں جسم فربہ چست اور چالاک ہو جاتا ہے۔ گویا ضعفی کی دشمن ہے جوانی کی محافظ ہے۔ حاجتمند آرڈر روانہ کریں۔ حبوب عنبری ایک بار کھانے سے سال تک مقوی ادویات کھانے سے چھٹی ہوتی ہے۔ قیمت ایک ماہ کی خوراک ۶۰ گولی بیس روپیہ (عنعہ) +

مقوی دانت منجن اگر آپ کے دانت کمزور ہیں۔ مسوڑھوں سے خون یا پیپ آتی ہے منہ سے بدبو آتی ہے۔ دانت ہلتے ہیں۔ گوشت خورہ یا پائیوریا کی بیماری ہے۔ دانت میلے ہیں۔ ان کی وجہ سے معدہ خراب ہے۔ ہاضمہ بگڑ گیا ہے۔ دانتوں میں کیڑا لگ گیا ہے۔ تو ان امراض کے لئے ہمارا تیار کردہ مقوی دانت منجن استعمال کرنے سے بفضلِ خدا تمام شکایات دور ہو جاتی ہیں اور دانت مضبوط ہو کر موتی کی طرح چمکتے ہیں۔ قیمت دو اونس شیشی ایک روپیہ آٹھ آنے (عہ)

حب مسان ایسے بیمار بچے جن کا معدہ۔ جگر۔ انتڑیاں کمزور ہو گئی ہوں اور بچہ سوکھا بخار میں مبتلا ہو چکا ہو۔ بدن ایسا کمزور ہو گیا ہو کہ ہڈیوں پر صرف چمڑا ہی دکھائی دیتا ہو۔ سبز سفید دست آتے ہوں۔ پاخانہ بار بار پیچش سے اور خون آلودہ آتا ہو۔ کانچ نکلتی ہو بخار رہتا ہو۔ عموماً جب بچہ کے دانت۔ کچلیاں۔ ڈاڑھیں نکلتی ہیں تو یہ شکایات پیدا ہوتی ہیں سب یا ان میں سے کوئی پیدا ہو جاتی ہے۔ ایسے وقت حب مسان کا استعمال از حد ضروری ہے۔ بچہ بفضلِ خدا تندرست موٹا تازہ۔ خوبصورت ہو جاتا ہے۔ اگر پہلے سے ہی حب مسان و بچوں کی چونڈی کا استعمال جاری رہے تو ان امراض سے بچہ محفوظ پیدا ہوتا ہے قیمت فی شیشی عہ +

بچوں کی چونڈی یہ ان بیماریوں کا مجرب علاج ہے۔ بدہضمی۔ قے۔ دست۔ سبز دست

ہیں۔ وقت گذرنے سے بیماریاں زیادہ ...

میں دست آتے ہیں۔ صحت بگڑ جاتی ہے۔ لہٰذا آپ اپنے ...

فوراً اطلاع دیویں۔ تاکہ آپ کے بچوں کی محافظ حب مسان ...

کی جاویں۔ خدا کے فضل سے حب اطفال کی طرح یہ دونوں ...

موجودگی ضروری ہے۔ قیمت فی شیشی خورد ۱۲ کلاں ...

حب مفید النساء یہ گولیاں عورتوں کی مشکلکشا ہیں۔ ان کے استعمال سے ... کی بے قاعدگی۔ کم آنا۔ زیادہ آنا۔ نلوں کا درد۔ کولہوں ... سستی۔ چہرہ کی بے رونقی۔ چہرہ کی چھائیاں۔ ہاتھ پاؤں کی جلن۔ اولاد کا نہ ہونا ... دُور ہو جاتے ہیں اور بفضل خدا اولاد کا منہ دیکھنا نصیب ہوتا ہے۔ ...

المشتہر

حکیم نظام جان شاگرد حضرت مولینا نور الدین خلیفۃ المسیح الاول

طبیہ عجائب گھر قادیان کا ایک خاص الخاص ...

سونے کی گولیاں یہ نایاب گولیاں کشتہ سونا کشتہ ... کشتہ ابرک سیاہ سونٹھی وغیرہ کشتہ ... ہیں۔ پیشاب کی جملہ امراض فاسفیٹ۔ یوریٹ۔ البومن ... کا قطع ...

طاقت کو بحال کر کے جسم کو فولاد کی طرح مضبوط بنا دیتی ہیں۔ جس ... کیا ہی کو ان کی تعریف میں طب القسان ...

بھی یہ گولیاں بکمال مفید ہیں۔

قیمت ... گولیاں۔

طبیہ عجائب گھر ...

لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ

هو الذي أرسل رسوله بالهدى ودين الحق ليظهره على الدين كله

ماہنامہ

ریویو آف ریلیجنز (اردو)

قادیان

یعنی

دنیا کے مذاہب پر نظر اور اہلِ مذاہب کا تشحیذ الاذہان

عدد ۸	ماہ رمضان المبارک سنہ ۱۳۶۵ ہجری مطابق ماہ اگست سنہ ۱۹۴۶ء	جلد ۴۵

فہرستِ مضامین!

ایڈیٹوریل نوٹس

یورپ کا پہلا احمدی شہید

جنگ عظیم ثانی سے قبل سیدنا امیر المومنین حضرت خلیفۃ المسیح ایدہ اللہ بنصرہ العزیز نے ایک احمدی مبلغ البانیہ میں بھیجا تھا جہاں تھوڑے ہی عرصہ میں اللہ تعالےٰ نے انکی مساعی کو بارآور فرمایا اور لوگ سلسلہ عالیہ احمدیہ میں داخل ہونا شروع ہو گئے جن میں بعض باحیثیت اور صاحبِ اثر تھے۔ مگر جلد ہی نام نہاد علماء اور جلد باز عوام کی مخالفت ایسا رنگ اختیار کر گئی کہ حکومت نے اُنہیں ملک سے چلے جانیکا حکم دیدیا۔ جس پر وہ سرحد پار پاس کے یوگوسلاویہ علاقہ میں کام کرنے لگ گئے۔

گو تھوڑے ہی عرصہ بعد اُنہیں وہاں سے چلے آنا پڑا مگر خدا کے فضل سے وہاں احمدیت کا بیج اچھی زمین میں بو دیا گیا۔ جو لوگ وہاں احمدی ہوئے اُن میں شریف دوتسا ایک صاحبِ اثر رئیس تھے جو گو باشندہ تو البانیہ کے تھے مگر یوگوسلاویہ پارلیمنٹ میں مسلمانوں کی طرف سے نمائندہ تھے۔ کیونکہ سرحدی علاقہ میں بعض لوگوں کی جائدادیں سرحد کے دونوں طرف ہیں۔

جنگ کے اختتام کے قریب جب بلقان کی ریاستوں پر رُوسی افواج کا قبضہ ہو گیا تو اِن ملکوں کا کمیونسٹ عنصر بہت زور پکڑ گیا اور اُس نے رُوسی اثر اور دبدبہ کی مدد سے کم و بیش رومانیہ۔ بلغاریہ۔ یوگوسلاویہ اور البانیہ وغیرہ کی حکومت اپنے ہاتھ میں لے لی۔

البانیہ میں جیسا کہ احمدی احباب قیاس کر سکتے ہیں ہمارے مخلص دوست شریف دوتسا صاحب نے حتی المقدور کمیونسٹ تحریک اور طرزِ حکومت کی مخالفت کی۔ مگر جونہی ان لوگوں کو ملک پر تصرف حاصل ہوا انہوں نے شریف دوتسا صاحب کو گرفتار کر کے بیوی بچوں سمیت قتل کر دیا۔ اور اس طرح شریف دوتسا صاحب کو یورپ

میں پہلا احمدی شہید ہونے کا شرف حاصل ہوا۔

اس خبر سے گو ساری احمدیہ جماعت کو صدمہ ہے مگر ساتھ ہی خوشی کا مقام ہے کہ اس علاقہ میں احمدیت کی ترقی کے سامان پیدا ہو رہے ہیں۔ شریف دوتسا صاحب کا بڑا لڑکا مبشر احمد خدا کے فضل سے زندہ ہے اور برسرِ پیکار ہے۔ ریاستہائے بلقان کے علاقے وہ علاقے ہیں جہاں سے ترکی سلطنت کا زوال شروع ہوا اور جہاں اہلِ یورپ نے اسلام کے حملے کو روکا۔ اور جماعت احمدیہ پر یہ اللہ تعالیٰ کا فضل ہے کہ باوجود اس کی کمزوری اور بے سروسامانی کے خدائے قدیر و رحیم نے اِس جماعت کے مبلغوں کو ان مقامات پر دعوت اور حفاظتِ اسلام میں سینہ سپر کر دیا ہے جہاں کسی زمانہ میں مسلمانوں کو سیاسی یا تمدنی زک ہوئی۔

ہمارے مبلغ خدا کے فضل سے سپین میں بھی پہنچ گئے ہیں اور سسلی میں بھی جو یہ دونوں ملک ایک زمانہ میں اسلامی تہذیب و ہدایت کا گہوارہ رہ چکے ہیں۔ اور سسلی سے یہ خوشخبری بھی پہنچ چکی ہے کہ وہاں دو جوشیلے اور مخلص نوجوان بیعت کر کے سلسلہ میں داخل ہو چکے ہیں۔ الحمد للہ

ہندوستان کی اخلاقی پستی

جن لوگوں کو شہری یا دیہاتی عوام الناس سے کسی رنگ میں تعلق پڑتا ہے اُن پر یہ امر بخوبی عیاں ہے کہ ہندوستان کی آبادی کا یہ کثیر حصہ اپنی ضروریاتِ زندگی کے لحاظ سے بہت تکلیف میں ہے۔ کپڑا۔ چینی اور تیل اِن چیزوں کا راشن ہے۔ مگر راشننگ کے انتظام میں یہ بدحالی ہے کہ باوجود راشن کارڈ موجود ہونے کے اشیاء مطلوبہ فراہم نہیں ہو سکتیں۔

لیکن چور بازار میں اِن چیزوں کی بابت سُنا ہے کسی وقت بھی کمی نہیں بشرطیکہ چور بازار میں پہنچنے کے طریقے آپ کو معلوم ہوں، اور وہاں خرید و فروخت کا ڈھنگ بھی آپ کو آتا ہو۔ کیونکہ وہاں کا غیر معروف آدمی وہاں سے کوئی چیز مہیا نہیں کر سکتا۔ وہ جس سوداگر یا دکاندار سے بھی جا کر دریافت کرے گا اس کو یہی جواب ملے گا کہ صاحب! کیا کریں دوکان میں مال ہی موجود نہیں بس ہم معذور ہیں قیمت کا کوئی سوال نہیں۔

ایسے وقت میں جب پبلک تکلیف اُٹھا رہی ہو بلکہ بھوک سے مر رہی ہو چور بازار کی گرم بازاری مُلک کی اخلاقی پستی کی ایسی کھُلی علامت ہے جس کا کوئی عقل کا اندھا ہی انکار کرے تو کرے کوئی صاحبِ بصیرت انسان اِس حقیقت سے ناآشنا نہیں ہو سکتا۔ اور حد سے زیادہ تکلیف دہ امر اِس سلسلہ میں یہ ہے کہ چور بازار کی لعنت میں نہ صرف پبلک کا صاحبِ ثروت حصّہ گرفتار ہے بلکہ سرکاری حُکّام بھی الا ماشاء اللہ، اور وہ حُکّام بھی جن کی غرض و غایت ہی چور بازار کو ختم کرنا ہے۔ اور جس مُلک میں رعایا اور حاکم دونوں کی اخلاقی پستی انتہاء کو پہنچ جائے اس کا مستقبل تاریک ہے خواہ کانگریس وغیرہ سیاسی جماعتیں کیسے ہی بلند بانگ دعوے کریں۔

اِس بات کا کوئی سمجھ دار آدمی انکار نہیں کرے گا کہ جہاں تک ایک دیہاتی کسان اور غریب شہری کی ضروریاتِ زندگی اور حقوق کی حفاظت کا سوال ہے ہندوستان کو سوراج مل چکا ہے۔ دیہاتی کسان کو زیادہ تر اپنے نمبردار، ذیلدار وغیرہ سے کام پڑتا ہے یا پٹواری سے۔ گاؤں کے چوکیدار سے اور پولیس کے سپاہی سے۔ اگر کوئی واردات ہو جائے تو تھانے کا مُنشی یا سب انسپکٹر تحقیقات کے لئے آ جائے گا۔ کوئی مقدمہ عدالت میں چل جائے تو وہاں بھی جن لوگوں سے اُسے کام پڑے گا وہ سب ہندوستانی ہوں گے۔ اور انگریزی طرزِ حکومت کچھ اِس انداز پر واقع ہوئی ہے کہ نمبردار، ذیلدار، پٹواری اور پولیس کے سپاہی کے کئے اور لکھے پر دوسرے افسر تو کیا شائد گورنر اور وائسرائے بھی قلم نہیں پھیر سکتے۔

پس یہ کہنا مبالغہ نہیں کہ جہاں تک دیہاتی کسانوں اور شہروں کے غریب باشندوں کا سوال ہے مُلک کو سوراج مل چکا ہے۔ کیونکہ ان بیچاروں کو حکومت کے جن عمّال سے کام پڑتا ہے وہ سب ہندوستانی ہوتے ہیں مگر کیا یہ حقیقت نہیں کہ جوں جوں ہندوستانیوں کو اختیارات زیادہ ملتے جا رہے ہیں رشوت ستانی ترقی کر رہی ہے۔

رشوت عموماً وہی لوگ دیتے ہیں جو اپنے حق سے زیادہ لینے کے خواہشمند

ہونے میں یا جنہیں یہ اندیشہ ہوتا ہے کہ اگر ہم نے حاکم کا "ہاتھ گرم" نہ کیا تو وہ ہمیں ایذا پہنچائے گا اور ہمارے بعض حقوق سے ہمیں محروم کر دے گا۔ اس صورت میں بھی رشوت کی اصل وجہ یہی ہے کہ ایک آدمی (یعنی سرکاری افسر) کے جو حقوق رعیت کے ایک فرد پر واقع ہوتے ہیں وہ ان سے زیادہ لالچ کرتا ہے۔ بدقسمتی سے کوئی محکمہ یا شعبۂ زندگی ایسا نہیں جس میں رشوت اور "سفارش" کی مارا مار نہ ہو۔ اور اگر آپ بازار میں یا منڈی میں خرید و فروخت کے لئے جائیں تو وہاں آپ کو امن کے نارمل زمانے میں رشوت تو بے شک نظر نہیں آئے گی مگر برادران وطن کی اخلاقی پستی کے جس قدر مشاہدے آپ کرنا چاہیں بلا کوشش و تکلف آپ کو مواقع میسر آتے جائیں گے۔

کیونکہ ہندوستان ایک ایسا قسمت کا مارا ملک ہے جس میں آپ خواہ انتہائی قیمت بھی اشیاء کی دینے کو تیار ہوں آپ کو کوئی چیز خالص نہیں مل سکتی۔ دودھ خالص ہندوستان میں نایاب ہے۔ خالص گھی کا تو ذکر ہی نہ کریں۔ دودھ میں پانی اور وہ بھی صاف نہیں عموماً قسما قسم کے جراثیم والا ملا ہوا ہوگا۔ اور گھی میں چربی یا دیگر قسم کی ناقص اور مضر صحت چکنائیاں حتیٰ کہ پنساری اور دوا فروش سے آپ جو ادویہ بھی خرید کر لائیں گے وہ بھی خالص نہ ہوں گی۔ یہ اخلاقی پستی کی انتہا ہے۔

یہاں ایک سوال دل میں پیدا ہوتا ہے جو موجودہ زمانے کی ہوائے آزادی کے پیش نظر تو شاید گردن زدنی ہی قرار دیا جائے مگر ہے وہ ضروری اور دلچسپ۔ جب ملک کی آبادی کا اس قدر معتد بہ حصہ اپنے بھائیوں اور ہمسائیوں کے حقوق غصب کرنے کے لئے اور انہیں تکلیف میں ڈالنے کے لئے ہر آن اور ہر لحظہ تیار رہتا ہے اور اس بارہ میں شب و روز انتہائی کوشش کرتا ہے تو مکمل سوراج ملنے پر کس کے حقوق محفوظ رہ سکیں گے؟

اخلاقی پستی کے ساتھ اگر حکومت کے اختیارات مل جائیں تو اس کے اثرات قوم اور ملک کے لئے بہت مہلک ہوتے

ہیں۔

پس ہندوستان کے بہی خواہوں کو چاہئے کہ اہل ملک کے اخلاقی معیار کو بھی جلد بلند کرنے کی فکر کریں ورنہ ہندوستان کی تباہی ابنائے وطن کے اپنے ہاتھ سے ہو کر رہے گی۔

عرب قوم اور برطانوی سیاست

اخبارات میں جو خبریں آرہی ہیں اُن سے یہی اندیشہ ہوتا ہے، کہ برطانوی سیاست کی چھری فلسطین کے عربوں کے گلے پر چل کر رہیگی۔

یہ عجیب بات ہے کہ برطانوی حکومت تسلیم کرتی ہے کہ فلسطین میں جو یہودی آباد ہیں وہ فوجی لحاظ سے پُوری طرح مسلح ہیں۔ حتیٰ کہ اُن کے پاس توپیں اور مشین گنیں بھی ہیں۔ اور یہ بھی تسلیم کرتی ہے کہ اُن کا ہتھیار رکھنا خلافِ قانون ہے۔ مگر ان قانون شکنوں سے ہتھیار چھیننے کا بندوبست نہیں کرتی۔ شائد یہ کہا جائے کہ یہودیوں نے خاصی قوت پیدا کرلی ہے اور گورنمنٹ اُن سے مرعوب ہوگئی ہے تو یہ گورنمنٹ کے لئے نیک نامی کا موجب نہیں۔ اور اب تو اخبارات میں اس قسم کی خبریں بھی آچکی ہیں۔ فلسطینی یہودیوں کی ہتھیار بندی گورنمنٹ کے علم اور ایک طرح سے اس کے ایما سے ہوئی ہے۔ اور تو اور Statesman میں بھی یہ خبریں آئیں کہ دورانِ جنگ میں جب مشرق وسطیٰ پر دشمن کے حملہ کا خطرہ تھا تو حکومت کو یہودیوں کا مسلح ہوجانا چنداں ناپسند نہ تھا۔ اِس قسم کی باتیں اُن لوگوں کے لئے جو دل سے برطانیہ کے دوست اور بہی خواہ ہیں اور بہی خواہ رہنا چاہتے ہیں نہایت تکلیف دہ ہیں۔

پریس میں اب یہ افواہیں بھی گرم ہیں کہ برطانیہ فلسطین کی افواج کو کمک بھیج رہا ہے۔ بلکہ یہ کمک فلسطین میں پہنچنی بھی شروع ہوگئی ہے۔ اور اگر ان افواہوں میں کوئی صداقت ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ برطانیہ غالباً ایک لاکھ مزید یہودیوں کو مُلک میں داخل کرنے کا فیصلہ کرچکا ہے

جو بہت ہی افسوسناک امر ہوگا۔ اور بہت ممکن ہے کہ کسی ایسے فساد کا پیش خیمہ ثابت ہو جو آخر قابو سے باہر ہو کر کوئی عالمگیر رنگ اختیار کرلے۔

اور مسلمانوں اور عربوں کو یہ بات بھی بھولنی نہیں چاہیئے کہ برطانیہ کے بعض ایسے اخبارات جو پبلک اور حکومت میں اثر کے لحاظ سے اعلیٰ درجے پر ہیں تھوڑے تھوڑے وقفوں کے بعد بار بار اس قسم کے مضامین بعض مقتدر لوگوں کے قلم سے اور اپنے بعض خاص نامہ نگاروں کے قلم سے شائع کرتے رہتے ہیں جو اس بات پر زور دیتے ہیں کہ فلسطین کے دو حصے کرکے ایک یہودیوں کو دے دینا چاہیئے اور ایک عربوں کو۔ اگر آخر کار یہی فیصلہ ہو۔ تو یہودی ممکن ہے اس پر راضی ہو جائیں مگر عرب ہرگز راضی نہ ہوں گے اور نہ ہی انہیں راضی ہونا چاہیئے۔ کیونکہ فلسطین میں یہودی حکومت کا قائم ہو جانا خواہ وہ ملک کے کسی حصہ میں ہو عربوں کے لئے اور عالم اسلام کے لئے ایک مستقل اور دائمی خطرہ اور روگ ہوگا۔

خلیج فارس میں برطانوی جنگی جہاز

جب کہ میں یہ سطور لکھ رہا ہوں پریس میں یہ خبر بھی آچکی ہے کہ برطانوی بیڑے کے تین کروزر قسم کے جنگی جہاز خلیج فارس میں پہنچ چکے ہیں۔ اور وہ آئندہ چند یوم کے لئے عبادان اور خرم شہر کے درمیان سمندر میں چکر لگاتے رہیں گے۔

بادی النظر میں اس خبر کا مطلب یہ ہے۔ جنوبی ایران میں برطانیہ کی پوزیشن یا تجارتی مفاد کو خطرہ پیش آنے کا امکان ہے اور ان جنگی جہازوں کی وہاں موجودگی حفظِ ماتقدم کے طور پر ہے۔ یہ بات اہلِ نظر سے مخفی نہیں کہ ایران میں ایک طرف روس اور دوسری طرف برطانیہ اور امریکہ میں ایک قسم کی سخت رسہ کشی جاری ہے مگر پہلے تو روسی ریشہ دوانیاں شمالی ایران کے علاقوں تک محدود تھیں اور اب جنوب میں بھی اُن کی تاریں

پہنچنے لگی ہیں۔ ابھی چند روز کا ذکر ہے کہ اینگلو ایرانی آئل کمپنی میں کام کرنے والوں نے ہڑتال کر دی جس کے دوران میں فساد بھی ہوا اور خاصا نقصان جان بھی۔ اِس ہڑتال کے پیچھے روسی اثر خیال کیا جاتا ہے۔

ہڑتال قابو سے باہر تو نہیں تھی مگر کروڑوں کا وہاں پہنچنا بتاتا ہے کہ خطرہ کا امکان ابھی دُور نہیں ہوا۔

عبدالقدیر نیاز
مورخہ ۲۲ جولائی

جنات کے متعلق صحیح اسلامی عقیدہ

(اور)

علمائے دار المصنفین اعظم گڑھ

(از جناب ماسٹر عطاء محمد صاحب ریٹائرڈ اورنٹیل ٹیچر قادیان)

"قربِ قیامت کی نشانیوں میں سے یہ ایک بڑی نشانی ہے۔ جو اس حدیث سے معلوم ہوتی ہے جو امام بخاریؒ اپنی صحیح میں عبداللہ بن عمرو بن العاص سے لائے ہیں۔ اور وہ یہ ہے یقبض العلم بقبض العلماء حتّٰی اذا لم یبق عالم اتّخذ النّاس رُؤُسًا جُہالًا فسئلوا فافتوا بغیر علمٍ فضلّوا واَضلّوا۔ یعنے بباعث فوت ہوجانے علماء کے علم فوت ہوجائے گا۔ یہاں تک کہ جب کوئی عالم نہیں ملے گا تو لوگ جاہلوں کو اپنا مقتداء اور سردار قرار دے دیں گے۔ اور مسائلِ دینی کی دریافت کے لئے ان کی طرف رجوع کرینگے۔ تب وہ لوگ بباعثِ جہالت اور عدم ملکۂ استنباطِ مسائل خلافِ طریقِ صدق و ثواب فتویٰ دیں گے۔ پس آپ بھی گمراہ ہوں گے اور دوسروں کو بھی گمراہ کریں گے۔ اور پھر ایک اور حدیث میں ہے کہ اس زمانہ کے فتویٰ دینے والے یعنی مولوی اور محدّث اور فقیہہ ان تمام لوگوں سے بدتر ہونگے جو روئے زمین پر رہتے ہوں گے۔ پھر ایک اور حدیث میں ہے کہ وہ قرآن پڑھیں گے اور قرآن اُن کے حنجروں سے نیچے نہیں اُترے گا یعنے اس پر عمل نہیں کریں گے۔ ایسا ہی اس زمانہ کے مولویوں کے حق میں اور

بھی بہت سی حدیثیں ہیں۔ مگر اس وقت ہم بطور نمونہ صرف اس حدیث کا ثبوت دیتے ہیں جو غلط فتووں کے بارے میں ہم اوپر لکھ چکے ہیں تا ہر ایک کو معلوم ہو کہ آجکل اگر مولویوں کے وجود سے کچھ فائدہ ہے تو صرف اس قدر کہ ان کے یہ چلن دیکھکر قیامت یاد آتی ہے اور قرب قیامت کا پتہ لگتا ہے۔ اور حضرت خاتم الانبیاء صلے اللہ علیہ وسلم کی ایک پیشگوئی کی پوری پوری تصدیق ہم بچشم خود مشاہدہ کرتے ہیں۔"

(آئینہ کمالاتِ اسلام ص۱)

اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ ماہ مئی ۱۹۴۶ء کے رسالہ معارف اعظم گڑھ میں ایک صاحب محمد اکبر صاحب کیمبل پور کا ایک استفسار شائع ہوا ہے جو انھوں نے سیرت النبیؐ جلد چہارم ص۲۰۱ تا ص۲۰۳ کی بعض عبارات کی بنا پر کیا ہے اور علمائے دار المصنفین اعظم گڑھ سے سوال کیا ہے کہ اس بارہ میں دین اسلام میں کیا حکم ہے۔ چنانچہ صاحب موصوف کا وہ استفسار ہم انہیں کے الفاظ میں درج ذیل کرتے ہیں۔

"جنات کے متعلق اسلام کا عقیدہ

جناب محمد اکبر صاحب

ارشد منزل کیمبل پور ضلع اٹک

سیرت النبی جلد چہارم کا مطالعہ کر رہا تھا۔ جن اور شیاطین اور بھوت پلید کی نسبت عرب کے عجیب عجیب اعتقاد ص ۲۰۱ تا ۲۰۳ پر نظر سے گزرے کہ وہ سب کو ایک ہی جنس سمجھتے تھے۔ گو اختلافِ صورت اور اشغال کی وجہ سے ان کے نام الگ الگ پڑ گئے تھے۔ آپ نے تحریر فرمایا ہے کہ جن یا اس کی دوسری جنسوں میں سے کوئی انسانوں کو اس طرح اٹھا کر لیجاتی کہ پھر اس کا پتہ ہی نہ لگتا۔ اور کسی طرح کوئی شخص واپس آجاتا تو ان کی نسبت [illegible] باتیں کرتا۔ جیسے خرافہ کا واقعہ ص ۲۰۳۔ ان سے تعلقات [illegible] قائم کر لیتے۔ جیسے تابط شرا اور ابو البلاد طہوی۔ ص ۲۰۳۔ (۲) اور بعض اشخاص نے ان سے شادی بیاہ بھی کیا۔ جیسے عمرو ابن یربوع ص۲۰۱

اور یقیناً ملکۂ یمن سعلاۃ ہی کے پیٹ سے تھی۔ ص ۲۰۲۔
نمبر ۱ (یعنی انسان کو اٹھانا معلوم جگہ و مقام پر فوراً لے آنا لے جانا)
نمبر ۲ (جن یا اس کی دوسری قسم سے تعلقات و مراسم کر لینا اور ان کے ذریعے غائب کی خبریں معلوم کرنا) اب بھی مسلمان مانتے اور یقین رکھتے ہیں۔ اور کہتے ہیں کہ دین اسلام سے ایسا ثابت ہے۔ اس تحریر کے بعد مجھے آپ سے دریافت کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی۔ کہ ان عرب کے عجیب عجیب اعتقاد کے متعلق دین اسلام میں کیا حکم ہے۔ کیونکہ یہ یا اسی قسم کے اعتقاد ہمارے علاقہ کے اکثر بلکہ سوائے چند آدمیوں کے باقی تمام لوگ رکھتے ہیں جس قسم کے اعتقاد زمانۂ جاہلیت کے عرب رکھتے تھے۔ براہ نوازش اس کو اچھی طرح دلائل سے واضح فرما کر مشکور فرما دیں۔ اللہ تبارک و تعالیٰ آپ کو اجر عظیم عطا فرمائیں گے۔" (رسالہ معارف ماہ مئی ۱۹۴۶ء صفحہ ۳۶۸-۳۶۹)

اس استفسار کے جواب میں علمائے دار المصنفین اعظم گڑھ نے جو گل فشانی فرمائی ہے قبل اس کے کہ اُسے ناظرین کی خدمت میں پیش کیا جائے ہم مناسب سمجھتے ہیں کہ ہر دو سوالات کے صحیح اور تحقیقی جوابات از روئے قرآن کریم حضرت مرزا بشیر الدین محمود احمد خلیفۃ المسیح الثانی و امام جماعت احمدیہ قادیان (جنکے ہم پلہ آج روئے زمین پر قرآنی علوم کا بلا مبالغہ کوئی ماہر نہیں) کی شہرۂ آفاق تفسیر بنام تفسیر کبیر جلد سوم سے پیش کر کے سائل صاحب کی خدمت میں بکمال ادب گزارش کریں کہ اگر وہ احمدیت کے نقطۂ نگاہ سے شدید اختلاف بھی رکھتے ہیں تو بھی بامتثال ارشادِ نبوی اُنظر الیٰ ما قال ولا تنظر الیٰ من قال (یہ دیکھو کہ کیا کہا ہے۔ یہ نہ دیکھو کہ کس نے کہا ہے۔) اس تفسیر کو کم از کم سائل ہونے کی حیثیت سے صحیح جواب کے حصول کی خاطر بغور و تعمق ملاحظہ فرمائیں۔ انشاء اللہ العزیز نہ صرف یہ کہ قرآن کریم کی ایک بیش بہا اور نادر تفسیر آپ کے ہاتھ آ جائے گی بلکہ قرآنی علوم و معارف کا ایک وسیع دروازہ آپ اپنے سامنے کھلا پائیں گے۔ واللہ الموفق لکل خیرٍ وکمالٍ وبیدہٖ ازمۃ الآمالی والاعمال۔

حضور وَالْجَآنَّ خَلَقْنٰهُ مِنْ قَبْلُ مِنْ نَّارِ السَّمُوْمِ ۝ (حجر آیت ۲۶)
کی تفسیر فرماتے ہوئے اپنی تفسیر مذکور الصدر میں فرماتے ہیں:۔

(لفظ جَآنّ کے متعلق حضور نے جو نادر لغوی تحقیق فرمائی ہے! وہ طوالت کے خوف سے نظر انداز کر دی گئی ہے۔ شائقین اصل کتاب کی طرف رجوع فرمائیں۔ ناقل)

"مسلمانوں کا عام عقیدہ یہ ہے۔ کہ نظر نہ آنے والی ارواح تین قسم کی ہیں (۱) فرشتے۔ جو سب نیک ہیں۔ بعض کے خیال میں ان میں سے بعض بد بھی ہو جاتے ہیں۔ جیسے کہ شیطان کہ وہ پہلے فرشتہ تھا۔ یا ہاروت ماروت۔ (۲) شیطان کہ وہ سب بُرے ہوتے ہیں۔ (۳) جن کہ وہ نیک بھی ہوتے ہیں اور بد بھی۔ جو جن بد ہوتے ہیں وہ لوگوں پر قبضہ کر لیتے ہیں اور بعض تدابیر سے جنوں پر قبضہ بھی کیا جا سکتا ہے اور اُن سے کام بھی لیا جا سکتا ہے۔

قرآن کریم میں جہاں تک الفاظ کا تعلق ہے فرشتوں، شیطانوں اور جنوں تینوں کا ذکر ہے۔ اور یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ جن نیک بھی ہوتے ہیں اور بد بھی۔ جیسا کہ سورۃ جن میں آتا ہے مِنَّا الصّٰلِحُوْنَ وَمِنَّا دُوْنَ ذٰلِكَ (جن ع ۲) یعنی جنوں نے ایک دوسرے سے کہا کہ ہم میں سے نیک بھی ہیں اور بُرے بھی۔ اور یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ جن انسانوں کے تابع بھی ہو جاتے ہیں۔ اور اُن کے کام کرتے ہیں۔ جیسے حضرت سلیمان علیہ السلام کے بارہ میں آتا ہے مِنَ الْجِنِّ مَنْ يَّعْمَلُ بَيْنَ يَدَيْهِ بِاِذْنِ رَبِّهٖ (سبا ع ۲) یعنے جنوں میں سے بھی کچھ افراد حضرت سلیمانؑ کے حکم کے ماتحت اور اللہ تعالےٰ کی اجازت سے اُن کے کام کیا کرتے تھے۔ یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ جن حضرت موسےٰؑ پر بھی ایمان لائے تھے۔ اور رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم پر بھی ایمان لائے۔ (جن ع ۱)

احادیث میں بھی جنوں کا ذکر ہے۔ لکھا ہے کہ جنوں کا ایک قافلہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم سے ملنے کے لئے آیا (مسلم ج اول باب الجہر بالقراءۃ فی الصبح۔) اور یہ بھی آتا ہے کہ ہڈی گوبر وغیرہ جنوں کی غذا ہے۔ اس لئے ان سے استنجا

وغیرہ نہیں کرنا چاہیئے (ترمذی ج اول ابواب الطہارت - ابوداؤد کتاب الطہارت) علامہ محمد طاہر سندھی مؤلف مجمع البحار لکھتے ہیں کہ امام ابو حنیفہؒ کا یہ مذہب تھا کہ نیک جنات صرف عذاب سے نجات پائیں گے جنت میں نہیں جائیں گے لیکن امام مالکؒ اور امام بخاریؒ کا یہ مذہب تھا کہ وہ جنت میں بھی جائیں گے اور انہیں ثواب ملے گا۔ مجمع البحار میں ہی ابن العربی کا قول نقل کیا ہے کہ سب مسلمانوں کا یہ مسلّمہ مسئلہ ہے کہ جن کھاتے پیتے اور نکاح کرتے ہیں۔ (مجمع البحار ج ا زیر لفظ جن)

میرے نزدیک جن کا لفظ قرآن کریم اور احادیث میں کئی معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ اور یہ مختلف استعمال جن کے مختلف معنوں پر مبنی ہیں۔ یعنی "مخفی ہونے والا" یا "مخفی کرنے والا"۔ ان معنوں کے رُو سے مختلف اشیاء یا ارواح یا انسان جو عام طور پر نظروں سے اوجھل رہتے ہیں۔ یا وہ اشیاء یا ارواح یا انسان جو دوسری اشیاء پر پردہ ڈالتے ہیں جن کہلاتے ہیں۔ اور چونکہ یہ فعل مختلف وجودوں سے ظاہر ہوتا ہے اس لئے مختلف چیزوں یا ہستیوں کا نام اسلامی اصطلاح میں جن رکھا گیا ہے۔ قرآن کریم میں جنات کا ذکر مندرجہ ذیل مقامات پر آتا ہے۔ (۱) سورۂ حجر کی زیر تفسیر آیت کہ اس میں جنات کی پیدائش کا ذکر ہے۔ کہ وہ نارِ سموم سے پیدا ہوئے۔ (۲) سورۂ رحمٰن ع میں فرماتا ہے۔ وخلق الجانّ من مارج من نار۔ جنوں کو ہم نے ایک لپٹیں مارنے والے آگ کے شعلے سے پیدا کیا ہے۔ (۳) ابلیس کی نسبت بھی آتا ہے۔ خلقتنی من نارٍ وخلقتہٗ من طینٍ (اعراف ع ۲ ع ۱۴) تُو نے مجھے تو آگ سے پیدا کیا ہے اور آدم کو پانی ملی ہوئی مٹی سے۔ (۴) پھر ابلیس کی نسبت یہ بھی آتا ہے۔ کان من الجنّ ففسق عن امر ربہٖ (کہف ع ۷)۔ وہ جنوں میں سے تھا۔ پھر وہ اللہ تعالیٰ کی اطاعت سے نکل گیا۔ معلوم ہوا کہ ابلیس کی ناری طینت اس کے جنوں میں سے ہونے کی وجہ سے تھی۔ (۵) جن شہوانی قوتیں بھی رکھتے ہیں۔ چنانچہ سورۂ رحمٰن میں جنت کی حوروں کی نسبت فرماتا ہے کہ لم یطمثھنّ انس

قبلھم ولا جآن (ع ۳) ان کو نہ انسانوں نہ جنوں نے اس سے پہلے کبھی چھوا ہوگا۔ (۶) سورۃ رحمٰن میں ایک یوم حساب کا ذکر ہے۔ اس کے ذکر میں فرماتا ہے۔ فیومئذٍ لا یسئال عن ذنبہ انسٌ ولا جآنٌ۔ اس دن انسانوں یا جنوں سے اُن کے گناہوں کے بارہ میں پوچھا نہ جائے گا بلکہ اُن کے گناہوں کی وجہ سے ایک عام تباہی اُن پر لائی جائے گی۔ (۷) جن اللہ تعالےٰ کی عبادت کے لئے پیدا کئے گئے ہیں۔ فرماتا ہے مَا خلقتُ الجن والانس الا لیعبدون (ذاریات ع ۳)۔ (۸) مشرک لوگ اللہ تعالیٰ اور جنات کے درمیان رشتہ داری بتاتے ہیں وجعلوا بینہ وبین الجنۃ نسبًا (صافات ع ۵)۔ (۹) مشرک لوگ جنوں کو خدا تعالےٰ کا شریک بتاتے ہیں وجعلوا اللہ شرکآء الجن وخلقھم وخرقوا لہٗ بنین وبنات بغیر علمٍ (انعام ع ۱۲) انہوں نے جنوں میں سے اللہ تعالےٰ کے شریک تجویز کئے ہوئے ہیں۔ حالانکہ اللہ نے ان کو پیدا کیا ہے۔ اور بغیر کسی علم کے انہوں نے اللہ کے لئے لڑکے اور لڑکیاں اپنے خیالوں میں بنا رکھی ہیں۔ اسی طرح آتا ہے بل کانوا یعبدون الجن (سبا ع ۵) قیامت کے دن جب اللہ تعالےٰ فرشتوں سے پوچھے گا کہ کیا مشرک انسان تم کو پوجتے تھے؟ تو وہ کہیں گے کہ نہیں بلکہ یہ جنوں کو پوجتے تھے۔ (۱۰) جنوں میں سے ایک گروہ لوگوں کو گمراہ بھی کرتا ہے۔ الذی یوسوس فی صدور الناس من الجنۃ والناس (سورۃ والناس) نیز وقال الذین کفروا ربنا ارنا الذین اضلنا من الجن والانس نجعلھما تحت اقدامنا لیکونا من الاسفلین (حٰم سجدہ ع ۴) اور کفار کہیں گے۔ اے ہمارے رب! ہمیں ذرا وہ جن اور انسان جنہوں نے ہمیں گمراہ کیا تھا دکھا تو سہی کہ ہم انہیں اپنے قدموں تلے روندیں۔ تاکہ وہ ذلیل ترین وجود ہو جائیں۔ نیز فرمایا۔ وکذٰلک جعلنا لکل نبیٍ عدوًا شیٰطین الانس والجن یوحی بعضھم الیٰ بعضٍ زخرف القول غرورًا (انعام ع ۱۴) اور اسی طرح ہم نے ہر نبی کے دشمن

بنتے ہیں۔ جن شیطان بھی اور انسان شیطان بھی ۔ وہ ایک دوسرے کو دھوکہ دینے کے لئے جھوٹی باتیں سُناتے رہتے ہیں۔ نیز فرمایا۔ یامعشر الجنّ قد استکثرتم من الانس (انعام ع ۱۵) اے جنّوں کی جماعت تم نے بہت سے انسانوں کو خراب کیا ہے (۱۱) جن دوزخ میں بھی جائینگے فرماتا ہے قال ادخلوا فی اُمَمٍ قد خلت من قبلکم من الجنّ والانس فی النار (اعراف ع ۴) یعنی جب فرشتے کفار کی جان نکالتے ہیں تو اُن سے کہتے ہیں تم سے پہلے جو جن اور انسان فوت ہو چکے ہیں اُن کے ساتھ تم بھی دوزخ میں داخل ہو جاؤ۔ نیز فرمایا اولٰئک الذین حقّ علیھم القول فی اُمَمٍ قد خلت من قبلھم من الجنّ والانس انھم کانوا خٰسرین (احقاف ع ۲) یعنی یہ کفار بھی ان گروہوں میں جا شامل ہوں گے جو جنّوں اور انسانوں میں سے پہلے گذر چکے ہیں ۔ اور جن پر اللہ تعالےٰ کی حجت پُوری ہو چکی ہے ۔ اور وہ عذاب کے مستحق قرار پا چکے ہیں ۔ یہ سب لوگ گھاٹا پانے والے ہو گئے یہی الفاظ حقّ سے لے کر خٰسرین تک سورۃ حٰم سجدہ ع ۳ میں بھی مذکور ہیں۔ نیز فرماتا ہے۔ ولقد ذرأنا لجھنّم کثیرًا من الجنّ والانس لھم قلوبٌ لا یفقھون بھا ولھم اعینٌ لا یبصرون بھا ولھم آذانٌ لا یسمعون بھا (اعراف ع ۲۲) اور ہم نے بہت سے جنّوں اور انسانوں کو دوزخ کے لئے پیدا کیا ہے ۔ اور یہ وہ ہیں کہ جن کو دل دیئے گئے مگر انہوں نے ان سے سمجھنے میں کام نہ لیا ۔ انہیں آنکھیں دی گئیں مگر انہوں نے اُن سے دیکھا نہیں ۔ انھیں کان تو دیئے گئے مگر انہوں نے اُن سے سُنا نہیں ۔ (۱۲) بعض انسان بعض جنّوں کی پناہ میں رہتے ہیں اور اسی وجہ سے جن مغرور ہو جاتے ہیں ۔ وانّہٗ کان رجالٌ من الانس یعوذون برجالٍ من الجنّ فزادوھم رھقًا (جن ع ۱) یعنی حقیقت یہ ہے کہ کچھ مرد انسانوں میں سے جنّوں کے مَردوں کی پناہ لیتے تھے ۔ اس طرح انہوں نے جنّوں کو اور بھی ظلم اور گناہ میں بڑھا دیا ۔ (۱۳) جن انسانوں

کا کام بھی کرتے ہیں۔ چنانچہ حضرت سلیمانؑ کے ماتحت وہ کام کرتے تھے۔ فرماتا ہے وحُشِرَ لسلیمٰن جنودہٗ من الجنِّ والانس (نمل ع۲) سلیمان کے حکم کو پورا کرنے کے لئے جنوں اور انسانوں کے لشکر جمع کئے گئے۔ نیز فرماتا ہے ومن الجن من یعمل بین یدیہ باذن ربّہ (سبا ع۲) اور جنوں میں سے بھی ایک جماعت ان کی نگرانی میں اللہ تعالےٰ کے حکم سے کام میں لگی ہوئی تھی۔ نیز فرمایا۔ قال عفریتٌ من الجنِّ انا اٰتیک بہٖ قبل ان تقوم من مّقامک (نمل ع۳) اور جنوں میں سے ایک نہایت سمجھدار کارگزار جن نے کہا کہ میں آپکی مطلوبہ شئے (ملکہ سبا کا ساتخت) آپ کے اس مقام سے کوچ کرنے سے پہلے حاضر کر سکتا ہوں۔ (۱۴) جن قرآن کی مثال نہیں بنا سکتے۔ فرماتا ہے۔ قُل لئن اجتمعتِ الانس والجن علیٰ ان یاتوا بمثل ھٰذا القراٰن لا یاتون بمثلہ ولو کان بعضھم لبعض ظھیرا (بنی اسرائیل ع۱۰) تو کہدے کہ اگر انسان اور جن مل کر بھی اس قرآن کی مثل بنانا چاہیں تو نہیں بنا سکتے۔ خواہ وہ دونوں مل کر ایک دوسرے کی مدد بھی کیوں نہ کریں۔ (۱۵) جن محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی مجلس میں آئے اور قرآن سُنا۔ فرماتا ہے واذ صرفنا الیک نفرًا من الجنِّ یستمعون القراٰن فلمّا حضروہ قالوا انصتوا فلمّا قضی ولّوا الیٰ قومھم منذرین (احقاف ع۴) اور جبکہ ہم جنوں کی ایک جماعت کو تحریک کرکے تیرے پاس لائے تاکہ وہ قرآن سُنیں۔ پھر جب وہ قرآن سُنانے کی مجلس میں حاضر ہوئے تو انہوں نے ایک دوسرے سے کہا۔ خاموش ہوکر قرآن سنو۔ پھر جب قرآن کی تلاوت ختم ہوئی تو وہ اپنی قوم کی طرف چلے گئے۔ تاکہ وہ انہیں ہوشیار کریں۔ سورۂ جن میں بھی بیان فرمایا ہے۔ اُوحِیَ اِلَیَّ انہ استمع نفرٌ من الجنِّ فقالوا انّا سمعنا قراٰنًا عجبًا (جن ع۱) میری طرف وحی کی گئی ہے کہ کچھ جنوں نے قرآن سُنا تو اپنی قوم کو جاکر کہا کہ ہم نے ایک عجیب (پُر حکمت) کلام سنا ہے

(۱۶) جنات آپ پر ایمان لائے۔ چنانچہ اوپر کی آیت کے بعد ہی ان جنوں کا قول بیان کیا ہے کہ فَاٰمَنَّا بِہٖ۔ ہم اس کلام پر ایمان لے آئے ہیں۔

یہ وہ مضامین ہیں جو جنات کے متعلق آئے ہیں۔ میرے نزدیک اِن سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ جن قرآن کریم میں کئی چیزوں کا نام رکھا گیا ہے۔

(۱) جن بعض ارواح خبیثہ کا نام رکھا گیا ہے جو شیطانی خیالات کے لئے اُسی طرح محرک ہوتی ہیں جس طرح کہ ملائکہ نیک تحریکوں کے محرک ہوتے ہیں۔ گویا وہ شیطان جو بدی کا محرک ہے وہ اس کے اظلال اور مددگار ہیں۔ یہ مضمون سورۃ الناس کی آیت سے نکلتا ہے۔ جیسا کہ فرمایا۔ اَلَّذِي يُوَسْوِسُ فِي صُدُوْرِ النَّاسِ مِنَ الْجِنَّةِ وَالنَّاسِ۔

(۲) اُن خیالی وجودوں کا نام جن رکھا گیا ہے جن کی کافر لوگ پوجا کرتے تھے۔ ان وجودوں کی تصدیق نہیں کی بلکہ صرف یہ بتایا ہے کہ کفار بعض ایسے وجود فرض کرتے ہیں اور اُن کی پوجا کرتے ہیں۔ اور انکی یہ غلطی ہے۔ اس کے یہ معنی نہیں کہ اللہ تعالیٰ اُن کے اس عقیدہ کی کہ واقعہ میں ایسے جن ہوتے ہیں تصدیق کرتا ہے بلکہ صرف اُن کا عقیدہ بیان کرتا ہے کہ وہ ایسے وجود مانتے ہیں اور اُن کی پوجا کرتے ہیں۔ اس کا ثبوت سورہ انعام کی آیت وَجَعَلُوْا لِلّٰهِ شُرَكَاءَ الْجِنَّ وَخَلَقَهُمْ وَخَرَقُوْا لَهٗ بَنِيْنَ وَبَنٰتٍۢ بِغَيْرِ عِلْمٍ یعنے مشرک لوگ جنوں کو اللہ تعالیٰ کا شریک قرار دیتے ہیں حالانکہ اُس نے اُنھیں پیدا کیا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کے بیٹے اور بیٹیاں بغیر علم کے تجویز کرتے ہیں۔ اس پر یہ اعتراض ہو سکتا ہے کہ خلقھم سے تو معلوم ہوتا ہے کہ ایسے جنوں کا وجود ہے۔ اور انہیں اللہ تعالیٰ نے پیدا کیا ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ خلقھم حال جعلوا کی ضمیر کا ہے نہ کہ جنوں کا۔ اور مراد یہ ہے کہ باوجود اس کے کہ اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کو پیدا کیا ہے۔ یہ کہتے ہیں کہ جن اللہ تعالیٰ کے شریک کار ہیں۔ اس کا ثبوت کہ لوگ جس قسم کے جن مانتے ہیں

اُن کا وجود خیالی ہے۔ سورہ سبا کی آیت سے وضاحت سے ملتا ہے۔ فرماتا ہے یوم یحشرھم جمیعًا ثم یقول للملٰئکۃ اھٰؤلاءِ اِیّاکُم کانوا یعبدُون o قالوا سبحٰنک انت ولیُّنا من دونھم بل کانوا یعبدون الجنّ اکثرھم بھم مؤمنون o (عٓ) یعنے یاد کرو جب اللہ تعالےٰ سب انسانوں کو جمع کرے گا۔ پھر ملائکہ سے کہے گا کیا یہ لوگ تمہاری عبادت کرتے تھے؛ وہ جواب میں کہیں گے کہ تو پاک ہے اور تُو ہی ہمارا دوست ہے۔ ان سے ہمارا کوئی بھی تعلق نہیں یہ بات غلط ہے کہ یہ ہماری عبادت کرتے تھے۔ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ یہ جنوں کی پرستش کرتے تھے اور ان میں سے اکثر ان پر ایمان لاتے تھے۔

سوال یہ ہے کہ اگر انسان جنوں کی پرستش نہیں کرتے تو اللہ تعالےٰ نے ملائکہ سے پُوچھا کیوں؟ اللہ تعالےٰ کی ہستی تو عالم الغیب ہے۔ یہ کس طرح ہو سکتا ہے کہ کوئی مشرک بھی فرشتوں کی عبادت نہ کرتا ہو اور اللہ تعالےٰ فرشتوں سے پُوچھے کہ کیا یہ تمہاری پُوجا کیا کرتے تھے؟ نیز اگر یہ تسلیم کیا جائے کہ کسی جہت سے بھی نہیں کہا جا سکتا کہ لوگ فرشتوں کو اُلوہیت کا درجہ دیتے ہیں تو پھر اللہ تعالےٰ کا فرشتوں سے جواب طلب کرنا ظلم بن جاتا ہے لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ خود قرآن کریم فرماتا ہے۔ فاستفتھم اَلِرَبِّک البنات ولھم البنون ام خلقنا الملٰئکۃ اِناثًا وّھم شٰھدون (صافات عٓ) یعنے اُن سے پُوچھ کہ تمہارے تو بیٹے ہیں اور اللہ تعالےٰ کی بیٹیاں ہیں۔ کیا اللہ تعالےٰ نے جب فرشتوں کو مؤنث بنا کر پیدا کیا تھا تو یہ لوگ اُس وقت موجود تھے؟ اِس آیت سے ظاہر ہے کہ فرشتوں کو مشرک اللہ تعالےٰ کی بیٹیاں کہتے تھے۔ اور یہ ظاہر ہے کہ خدا کی بیٹی بھی خدا ہی قرار پائے گی اور قابلِ پرستش سمجھی جائے گی۔ جیسے حضرت عیسےٰ کو خدا تعالےٰ کا بیٹا کہا جاتا ہے۔ اور قابلِ پرستش سمجھا جاتا ہے۔ چنانچہ سورہ نحل عٓ میں اللہ تعالےٰ نے مشرکوں کے شرک کے ذکر میں بیان فرمایا ہے۔ و یجعلون لِلّٰہِ البنات سُبحانَہٗ۔ اور یہ لوگ اس طرح بھی شرک

کرتے ہیں کہ اللہ تعالےٰ کی بیٹیاں قرار دیتے ہیں۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ ایسے نقص سے پاک ہے۔

خلاصہ یہ کہ اگر مشرک ملائکہ کو خدا تعالےٰ کی بیٹیاں قرار دیتے تھے۔ اور اگر کسی کو خدا تعالےٰ کی بیٹی یا بیٹا قرار دینا شرک ہے تو پھر ملائکہ کس طرح کہتے ہیں کہ الٰہی یہ لوگ ہماری پوجا نہیں کرتے تھے۔ اِن حالات میں اللہ تعالےٰ پر سے اعتراض اُٹھ کر فرشتوں پر جا پڑتا ہے۔ مگر غور کیا جائے تو اُن پر بھی اعتراض نہیں پڑتا۔ کیونکہ اللہ تعالےٰ کا سوال ظاہر پر تھا اور ملائکہ کا جواب باطن کو مدنظر رکھکر ہے۔ مشرک ظاہر میں تو یہی کہتے ہیں۔ کہ ملائکہ اللہ تعالےٰ کی بیٹیاں ہیں اور ان کو خوش کرنا بھی ان کے لئے ضروری ہے۔ لیکن حقیقت تو یہی ہے کہ نہ وہ ملائکہ کو جانیں نہ اُن کی طاقتوں کو۔ یونہی ملائکہ کا ذکر بڑوں سے سنکر ایک خیالی وجود انہوں نے اپنے ذہن میں بنا لئے۔ اور خیال کیا کہ یہ ملائکہ ہیں اور اللہ کی بیٹیاں ہیں۔ حالانکہ وہ وجود محض خیالی تھے۔ نہ ملائکہ والے صفات اُن میں تھے نہ کام تھے۔ پس درحقیقت ان کی عبادت ملائکہ کے لئے نہ تھی۔ بلکہ چند خیالی اور نظر نہ آنے والے وجودوں کیلئے تھی جنہیں عربی زبان میں جِنّ کہہ سکتے ہیں۔

پس ملائکہ نے جو جواب دیا ہے وہ بھی درست ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ الٰہی ہماری انہوں نے کیا پوجا کرنی تھی ہم تو تیرے بندے اور تیری حفاظت میں ہیں۔ یہ تو چند ایسے وجودوں کی پرستش کرتے تھے جو محض خیالی اور غیرمرئی تھے اگر اس قسم کے جنوں کا وجود ہوتا جس قسم کا عوام کہتے ہیں تو پھر فرشتوں کا یہ قول کہ وہ جنوں کی پرستش کرتے تھے جھوٹ ہو جاتا ہے۔ کیونکہ مشرک یقیناً ملائکہ کو بنات اللہ قرار دے کر اُن کی پرستش کرتے تھے۔ اور اسی صورت میں اس پرستش کو جنوں کی پرستش کہا جا سکتا ہے جبکہ جنّ کے معنے خیالی اور بناوٹی وجود کے لئے جائیں۔ اگر کہا جائے کہ وہ جنوں کی بھی پرستش کرتے تھے تو گو یہ درست ہے کہ بعض وجودوں کی مشرک جنّ کے نام سے بھی پرستش کرتے تھے مگر یہاں وہ مراد نہیں ہو سکتی۔ کیونکہ جنوں کی پرستش سے ملائکہ کی پرستش

کی نفی تو نہیں ہوجاتی۔ مشرک تو ہزاروں قسم کے بُت بناتا ہے۔ انسان کو بھی خدا کہتا ہے۔ سورج چاند کو بھی۔ دریاؤں کو بھی۔ ملائکہ کو بھی۔ اپنے مزعومہ جنوں کو بھی۔ پس جنوں کی پرستش کرنے کی وجہ سے ملائکہ کو یہ حق پیدا نہیں ہوتا کہ وہ اپنی پرستش کا انکار کریں۔ یہ حق اُنہیں تبھی پیدا ہوتا ہے جبکہ وہ پرستش جو اُن کے نام سے کی جاتی تھی کسی دلیل کی بنا پر کسی خیالی وجود کی طرف منسوب کی جاسکے۔ اور یہی انہوں نے کہا ہے۔ پس جن سے مراد اِس آیت میں خیالی اور ذہنی وجود کے ہیں۔ جن کا نام کفار نے ملائکہ رکھ لیا تھا مگر فی الواقعہ وہ ملائکہ نہ تھے۔

(۲) جن چونکہ مخفی وجود کو کہتے ہیں اس لئے جن کا لفظ قرآن کریم میں عرب اور دوسری اقوام کے محاورہ کے مطابق ان اقوام کے لئے بھی بولا جاتا ہے جو شمالی علاقوں اور سرد ممالک میں رہتی تھیں۔ چونکہ لوگ بوجہ شدت سردی کے ان کے ممالک کی طرف سفر نہیں کرتے تھے اور وہ گرمی کی وجہ سے ادھر نہ آتے تھے۔ نیز چونکہ سرد علاقوں میں رہنے کی وجہ سے وہ زیادہ سفید رنگ والے اور شراب کے استعمال کی وجہ سے زیادہ سُرخ ہوتے تھے ایشیا کے لوگ اُنہیں کوئی الگ قسم کی مخلوق سمجھتے تھے۔ اور اُنہیں جن اور پریاں کہتے تھے۔ یہ اُن کا عام نام تھا۔ چنانچہ جیسا کہ میں اُوپر لکھ آیا ہوں یہود کا یہ عقیدہ تھا کہ جن شمالی علاقہ میں رہتے ہیں۔ چنانچہ بشر کی ابی الیعذر نے اپنی کتاب میں یہی لکھا ہے کہ جن زیادہ تر دُنیا کے شمالی علاقوں میں رہتے ہیں۔ ہندو قوم نے بھی اپنے شمال میں ہی جنوں کا مقام تجویز کیا ہے۔ چنانچہ جیسا کہ حوالہ گذر چکا ہو ہندوؤں کے نزدیک گندھروا لوگوں کا علاقہ ہندوستان کے شمال مغرب میں تھا۔ اور ٹیکسلا شہر جو علاقہ ہزارہ میں تھا اُسے وہ گندھروا کے علاقہ کا شہر کہتے تھے۔ اور دریائے سندھ کے شمال کے علاقہ کو اُن کا مسکن قرار دیتے تھے۔ یعنی ہزارہ، افغانستان وغیرہ کو مسلمانوں میں جو قصے کہانیاں مشہور ہیں اُن میں بھی جنات کا مسکن کوہ قاف اور اُس کے پار کا علاقہ سمجھا جاتا ہے پس یہ بات ظاہر ہے کہ شمالی علاقوں کے سُرخ و سفید لوگ جو تمدنی حالات کے

کے ماتحت قریباً ایشیا سے بالکل الگ ہو گئے تھے۔ اور بہت کم ادھر آتے تھے۔ اور مذہب اور طور طریق کے لحاظ سے بھی الگ تھے۔ ایشیا کے رہنے والوں کے نزدیک جو اس وقت تمدن کے حامل تھے جن تھے۔ کیا بلحاظ اپنی شکلوں کے اور کیا بلحاظ ایشیا سے دور رہنے کے (شائد ہندوؤں نے نہ صرف شمال مغربی علاقہ کے ساکنوں کی ظاہری شکل کی وجہ سے بلکہ ان کی قوت اور طاقت کی وجہ سے کہ وہ ہمیشہ ہندوستان پر حملہ کرتے رہتے تھے اُن کو جنّ قرار دیا) اسی محاورہ کے مطابق قرآن کریم میں بھی سورۂ رحمٰن میں ان شمالی لوگوں کو یعنی یورپ کے باشندوں کو جنّ کہا ہے۔ اِس سورۃ میں آخری زمانہ کے تغیّرات کا ذکر ہے اور بتایا گیا ہے کہ اس وقت دو مشرق اور دو مغرب ہو جائیں گے۔ یعنی امریکہ کی دریافت سے دو علاقے مشرق اور دو مغرب کہلانے لگیں گے۔ اسی طرح نہر سویز کے ذریعے دو سمندروں کے ملنے اور بڑے بڑے جہازوں کے چلنے کی خبر دی گئی ہے۔ اسی طرح بتایا گیا ہے کہ اس وقت سائنس کی ترقی کے ساتھ لوگ آسمانی بادشاہت کو فتح کرنے کے خیال میں مشغول ہوں گے۔ اور سمجھیں گے کہ وہ جلد کائنات کا راز دریافت کرنے والے ہیں۔ اس وقت آسمان سے آگ گریگی۔ اور بم گریں گے۔ اور سُرخ روشنیاں آسمان پر چھوڑی جائیں گی۔ اور آخر کفر اور شرک کو تباہ کر کے اسلام کو غلبہ دیا جائے گا۔

اِس مضمون کے سلسلہ میں جنّ و انس کو بھی مخاطب کیا گیا ہے۔ اور جنّ سے مراد وہی شمالی علاقوں کے لوگ یعنی یورپین مراد ہیں اور بتایا ہے کہ اس زمانہ میں یورپ اور ایشیا کے لوگ باہم مل جاویں گے۔ اور سائنس کی بڑی ترقی ہو گی۔ مگر بے دینی کی وجہ سے اللہ تعالیٰ عذاب نازل کرے گا۔ اور پھر اسلام کو قائم کرے گا۔ ثقلان اور جنّ اور الناس سے مراد ڈیما کریسی اور ڈکٹیٹروں کی حکومت بھی ہو سکتی ہے۔ کیونکہ جنّ کے معنے عربی لغت میں اکثریت کے بھی ہیں۔ اور الناس کے معنے خاص

آدمیوں کے بھی ہو سکتے ہیں۔ پس جن سے مراد ڈیما کریسی اور الناس سے مراد وہ لوگ ہیں جو اپنے آپکو خاص قرار دے کر حکومت کو اپنے ہاتھ میں رکھتے ہیں۔ ثقل کے معنے اعلیٰ اور محفوظ شئے کے ہوتے ہیں۔ جیسے رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے قرآن کریم اور اپنی اولاد کو ثقلان قرار دیا ہے۔ پس اَلثَّقَلَانِ سے مراد یہ دونوں گروہ ہیں جو اس وقت ساری دُنیا پر غالب ہوں گے۔ بعض ڈیما کریسی کے نام پر دُنیا کو مغلوب کریں گے۔ اور بعض فاشزم اور ناززم کے نام پر دُنیا کو سمیٹنا چاہیں گے۔ اور اپنے آپ کو سب دُنیا سے بہتر قرار دیں گے۔

(۳) اس کے علاوہ قرآن کریم میں غیر قوموں اور غیر مذاہب کے لوگوں کے لئے بھی جن کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں۔ مثلاً حضرت سلیمانؑ کے ذکر میں جہاں جنوں کا ذکر ہے اس سے مراد غیر قوموں کے لوگ ہی ہیں۔ چنانچہ اللہ تعالےٰ ان جنوں کی نسبت فرماتا ہے کہ یعملون لہٗ مایشاء من محاریب وتماثیل وجفانٍ کالجواب وقدورٍ راسیاتٍ (سبا ع۲) وہ جن حضرت سلیمانؑ کے لئے دربار کا کمرہ۔ مسجد کا محراب اور محل بناتے تھے۔ اور مجسمے اور بڑے بڑے حوض جو کنوؤں کی طرح تھے اور بہت بڑی بڑی دیگیں تیار کرتے تھے۔ اب ہم بائیبل میں دیکھتے ہیں کہ یہ کام حضرت سلیمانؑ کے لئے کس نے کئے ہیں۔ تو ہمیں ۲ تواریخ باب ۲ میں لکھا ملتا ہے کہ جب حضرت سلیمانؑ نے بڑی عبادت گاہ تعمیر کرنے کا ارادہ کیا تو آپؑ نے صُور کے بادشاہ کو خط لکھا کہ اپنے انجینئروں میں سے میرے پاس ایک انجینئر بھجواؤ" جو سونے اور روپے اور پیتل اور لوہے اور ارغوانی اور قرمزی اور آسمانی رنگوں کے کاموں میں ہوشیار اور نقاشی میں دانشمند ہو" اسی طرح لکھا۔ کہ وہاں کی لکڑی بھجواؤ۔ اور میں لکڑی کاٹنے والوں کو اس اس قدر مزدوری دوں گا۔ آیت ۱۰۔ پھر آیت ۱۴ میں صُور کے بادشاہ کا جواب ہے۔ کہ اُس نے حضرت سلیمانؑ کے کہنے پر ایک انجینئر حورام ابی نامی بھجوایا اور کہا کہ یہ سب فنون کا ماہر ہے۔ اور لکھا کہ

لکڑی کاٹنے پر میں نے آدمی لگا دیئے ہیں۔ ان کی مزدوری بھجوا دیں۔ (آیت ۱۵) یہ تو غیر ملکی انجینئر کا ذکر ہے۔ جو مزدور لگائے گئے ان کا ذکر یوں آتا ہے "اور سلیمان نے اسرائیل کے ملک میں سارے پردیسیوں کو گنوایا۔ بعد اس گننے کے جو اس کے باپ داؤد نے گنوایا تھا اور وے ایک لاکھ ترپن ہزار چھ سو ٹھہرے۔ اور اس نے اُن میں سے ستر ہزار کو بار برداری پر اور اسی ہزار کو پہاڑ کے توڑنے پر مقرر کیا۔ اور اُن پر تین ہزار اور چھ سو مقرر کئے کہ اُن لوگوں سے کام لیویں" (آیت ۱۷، ۱۸) ان آیات سے ظاہر ہے کہ مزدوری پر بھی غیر قوموں کے لوگ مقرر کئے گئے تھے۔

اب جو کام اس صور کے انجینئر نے کیا وہ بائیبل میں یہ لکھا ہے کہ اُس نے ایک بہت بڑا ہال عبادت کے لئے بنایا (محاریب) اور بڑے ہال کے اندر فرشتوں کے مجسمے دیواروں کے اندر کھود کر بنائے۔ اور اسی طرح بڑے ہال میں بھی دو فرشتوں کے مجسمے تراش کر بنائے۔ (تماثیل) (۲ تواریخ باب ۳ آیت ۷، ۱۰ تا ۱۳) اور پھر باب ۴ آیت ۲، ۶ میں بتایا ہے کہ ایک بڑا حوض بنایا جو دھاتوں سے ڈھالا ہوا تھا۔ اور اس کے علاوہ دس چھوٹے حوض بنائے (جفان کالجواب) پھر اسی باب کی آیت ۱۶ میں لکھا ہے کہ حورام انجینئر نے جو باہر سے آیا تھا" اور ایک بحر (لفظی معنے سمندر، مراد بڑا حوض) اور اس کے نیچے بارہ بیل اور دیگیں اور پھاوڑے اور کانٹے اور سب ظروف۔ جو حورام ابی نے سلیمان بادشاہ کی خاطر خداوند کے گھر کے لئے بنائے صاف پیتل دھات کے تھے"۔ اس ایک آیت میں دیگوں (قدور راسیات) حوضوں اور مجسموں کا ذکر اکٹھا آگیا ہے۔

غرض وہ سب اشیاء جن کا ذکر اس آیت میں آیا ہے حضرت سلیمان حورام ابی سے جو ایک غیر ملکی انجینئر تھا اور غیر ملکی مزدوروں سے بنوائی تھیں پس جن سے مراد محض غیر ملکی اور غیر قوم کے لوگ ہیں۔ جنکو حضرت

سلیمانؑ کے ساتھ کوئی دلچسپی نہ تھی۔ صرف رعب خداداد کی وجہ سے وہ آپؑ کے تصرف کے نیچے آئے ہوئے تھے۔ اور آپؑ کا کام کرتے تھے۔ جب آپؑ فوت ہو گئے تو کچھ مدت تک تو آپؑ کی حکومت کا رعب اُن لوگوں کے دلوں پر رہا۔ جب آپؑ کے لڑکے نے بعض نالائقیوں کی وجہ سے اس رعب کو ضائع کر دیا تو وہ لوگ پچھتائے کہ خواہ مخواہ ان کیلئے لکڑیاں ڈھونے اور دوسرے ذلیل کاموں میں ہم کیوں لگے رہے اور یہ ذلّت برداشت کی۔ اگر یہ حکومت اتنی جلدی فنا ہو جانی تھی تو ہم مقابلہ جاری رکھتے۔

(۴) چوتھا استعمال جِنّ کے لفظ کا قرآن کریم میں اُن لوگوں کے متعلق ہے۔ جو حضرت آدمؑ کے زمانہ میں دُنیا پر بستے تھے۔ اور جن میں سے نکل کر حضرت آدم علیہ السلام نے ایک نیا نظام قائم کیا تھا۔ چونکہ آدمؑ نظام کا قائم کرنے والا پہلا شخص تھا۔ اس سے پہلے لوگ نظام کی قدر کو نہ جانتے تھے۔ اور جانوروں کی طرح الگ الگ درختوں کی جڑوں میں یا غاروں میں رہتے تھے۔ اور جنگلی درندوں کی وجہ سے سطح زمین پر آسانی سے چل پھر نہیں سکتے تھے۔ ان کا نام ان کی حالت کے مطابق جِنّ رکھا گیا ہے۔ یہ وہی لوگ ہیں جن کو آجکل کے مؤرخ Cave men کہتے ہیں۔ یعنی کھوہوں اور غاروں میں رہنے والے لوگ جو سطح زمین پر بُود و باش نہ کرتے تھے۔ جب انسانی دماغ نے ترقی کی اور انسان الہام کی نعمت کو قبول کرنے کے قابل ہو گیا تو اللہ تعالےٰ نے ایک شخص کو جسے اُس نے آدم کا خطاب دیا۔ کیونکہ وہ سطح زمین پر رہنے کے قابل ہو گیا تھا۔ اور انسان کا خطاب دیا کیونکہ وہ ایک طرف اللہ تعالےٰ کی محبت کے قابل ہو گیا تھا تو دوسری طرف بنی نوع کے ساتھ ہمدردی کرنے اور اُن کے لئے قربانی کرنے کے قابل تھا اپنے الہام کے لئے چُنا (دیکھو تفصیلی دلائل کے لئے میری کتاب سیرِ رُوحانی جلد اوّل) جنہوں نے اس کے نظام کو قبول کیا اور اسکے ساتھ مل گئے اور باہر نکل کر مکان وغیرہ بنانے لگے اور تمدّنی قوانین کی پابندی کو

منظور کرلیا۔ وہ آدمی کہلائے۔

لیکن جنہوں نے وحشت کی زندگی کو ترک کرنے سے انکار کر دیا اور غاروں کی زندگی کو حریت قرار دیا۔ ان کا نام ان کے طرز رہائش کی وجہ سے جن قرار پایا۔ پس جن بشری ترقی کے دور کے اس حصہ کے افراد کا نام ہے جو تمدن سے عاری تھے۔ اور نظام کو قبول کرنے کے ناقابل تھے۔ اور آدمی بشری ترقی کے دور کے اس حصہ کا نام ہے جس میں ایک جماعت نے مل کر اپنے اور ایک دوسرے کے ساتھ تعاون کرنے اور ایک نظام کی پابندی کرنے کا اقرار کیا۔ آئندہ کے لئے یہ دو نام ان صفات کے ساتھ وابستہ ہو گئے۔ اور جو لوگ نظام کے باغی ہوں ان کا نام جنوں کی ذریت رکھا گیا۔ اور جو نظام کے تابع ہوں ان کا نام آدم کی ذریت رکھا گیا۔ اب یہ دونوں نام صفاتی ہیں جس کی وجہ سے کبھی جنوں کی اولاد اصلاح کر کے آدمی ہو جاتی ہے اور کبھی آدمیوں یعنے پابندِ نظام لوگوں کی اولاد گندی اور نظام شکن ہو کر جن بن جاتی ہے۔

اب رہا رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے زمانہ کا سوال کہ اُس وقت جو جن ایمان لائے تھے وہ کیسی مخلوق تھی؟ سو اس کے متعلق قرآن کریم سے ثابت ہے کہ وہ یہودی تھے۔ کیونکہ وہ موسیٰ کی کتاب کا اور اس پر ایمان لانے کا ذکر کرتے ہیں۔ پس معلوم ہوا کہ وہ یہودی لوگ تھے۔ اللہ تعالیٰ نے انکو جن اس لئے کہا ہے کہ وہ باہر کے لوگ تھے۔ اور رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم سے مخفی ملے تھے۔ بعض احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ نصیبین کے رہنے والے تھے۔ اور رات کے وقت رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم سے ملے تھے۔ (بخاری کتاب مناقب الانصار و مسلم جزو اول) واپس جا کر جو واقعہ اُن کے اور اُن کی قوم کے درمیان گزرا اللہ تعالیٰ نے اس کا ذکر قرآن کریم میں فرمایا ہے معلوم ہوتا ہے کہ عرب لوگوں کی مخالفت کی وجہ سے انہوں نے چھپ کر رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی زیارت کی۔ اور آپ سے قرآن سنا۔ جب واپس ہوئے تو دلوں نے گواہی دی کہ آپ سچے ہیں۔ اور اپنی قوم میں تبلیغ شروع کر دی۔

اس امر کا ثبوت کہ یہ جن انسان تھے مندرجہ ذیل ہے۔

اوّل یہ کہ وہ پوشیدہ ملے۔ اگر وہ جن تھے تو ان کو پوشیدہ اور رات کو ملنے کی کیا ضرورت تھی۔ علی الاعلان ملتے تو کوئی ان کا کیا بگاڑ سکتا تھا۔ اور جنوں کی جو شان بیان کی جاتی ہے اس کے لحاظ سے انہیں دیکھ بھی کون سکتا تھا۔

دوم۔ قرآن کریم میں اللہ تعالےٰ فرماتا ہے۔ لتؤمنوا باللّٰہ و رسولہٖ و تعزّروہ و توقّروہ (فتح ع ۹) یعنی مومنو! ہم نے یہ رسول اسلئے بھیجا ہے کہ تم اس کی مدد اور نصرت کرو۔ اور اس کی عزت دُنیا میں قائم کرو۔ اگر جنات ایمان لائے تھے تو وہ کس رنگ میں رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی مدد کرتے تھے۔ کہتے ہیں کہ جن لوگوں کے سروں پر چڑھ جاتے ہیں اور قسم قسم کے پھل لاکر دیتے ہیں۔ یہ کیسے مومن تھے کہ محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم پر ظلم پر ظلم ٹوٹا لیکن کافر جنوں نے تو حضرت سلیمانؑ کے لئے قلعے تیار کیئے اور ہر ذلیل سے ذلیل کام ان کی خاطر کیا! یہ مومن ایسے طوطا چشم تھے کہ ابوجہل وغیرہ کبھی کو انہوں نے سزا نہ دی۔ اور پھر یہ جن لوگوں کو تو بے موسم کے پھل لاکر دیے دیتے ہیں مگر محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم پر ایمان لاکر انہیں یہ توفیق بھی نہ ملی کہ جب غزوۂ خندق کے موقعہ پر آپ پر اور دوسرے مسلمانوں پر فاقے پر فاقے آرہے تھے اور آپؐ اور آپؐ کے صحابہؓ گویا پیٹوں پر پتھر باندھے پھر رہے تھے۔ یہ لوگ آپؐ کے لئے اور آپؐ کے صحابہؓ کے لئے جَو کی روٹیاں ہی لا دیتے۔ یہ تو ایمان کی علامت نہیں اوّل درجہ کی شقاوت کی علامت ہے۔ لیکن قرآن کریم تو فرماتا ہے کہ وہ ایماندار مخلص تھے۔ پس ظاہر ہے کہ نہ ان جنوں کو جن کا ذکر سورۂ جن میں ہے طاقت ہے کہ کسی کے سر پر چڑھیں اور انسانوں پر قبضہ کرسکیں یا انہیں ستا سکیں۔ اور نہ ان میں کسی کو کچھ لاکر دینے کی طاقت ہے۔ ایسے جن صرف وہمی لوگوں کے دماغ میں ہیں قرآن کریم ایسے جنوں کو تسلیم نہیں کرتا۔ اس نے تو جو جن پیش کئے ہیں انہی اقسام کے ہیں جو میں نے بیان کئے ہیں۔ اور ان اقسام میں سے جو جنات رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لائے وہ یہودی تھے جنہوں نے کلام سُنا

اپنے گھروں کو چلے گئے اور آخر ایمان لانے کا فیصلہ کیا۔ اور اپنی قوم کو پیغام پہنچا دیا۔ عرب سے ہزاروں میل دُور کے بسنے والے تھے۔ بعد میں نہیں کہا جا سکتا کہ انہیں رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے متعلق کوئی خبر ملی بھی یا نہیں ملی۔ اِس وجہ سے وہ اسلامی جنگوں میں عملاً کوئی حصّہ نہ لے سکے۔

تیسرا ثبوت اِس امر کا کہ یہ جن انسان تھے یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ رسولوں کے متعلق فرماتا ہے کہ وہ من انفسھم اور منھم ہوتے ہیں۔ یعنی جنکی طرف آتے ہیں اُنہی کی قوم کے ہوتے ہیں۔ چنانچہ فرماتا ہے یوم نبعث فی کُلِّ اُمّۃٍ شھیداً علیھم مِّن انفسھم وجئنا بک شھیداً علیٰ ھٰؤلآءِ (النحل ع ۱۲) یعنی قیامت کے دن ہر اُمت کا رسول جو اُنہی میں سے ہوگا بطور گواہ لایا جائے گا۔ اور محمدؐ رسول اللہ کو امتِ محمدیہ اور اس زمانہ کے لوگوں پر بطور گواہ بھیجا جائے گا۔ اگر جن بھی کوئی ایسی قوم ہے جو ایمان لائی ہے تو اس پر گواہی کون دیگا؟ موسیٰ تو جن نہیں کہ ان جنوں کے متعلق اُن سے پُوچھا جائے گا جو اُن پر ایمان لائے تھے۔ اسی طرح رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم انسان تھے وہ جنوں سے من انفسھم کی نسبت نہیں رکھتے۔ پس آپؐ جنوں کے متعلق شہید نہیں ہوسکتے۔ من انفسھم سے مراد پہلے انبیاء کی نسبت سے ان کی اقوام ہیں۔ اور رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی نسبت سے آپؐ کے زمانہ کے بعد کے سب انسان۔ پس جن اگر انسانوں جیسی کوئی مکلف مخلوق ہے تو وہ یونہی رہ جاتے ہیں۔ نہ ثواب کے مستحق نہ عذاب کے۔

چوتھا ثبوت اِس دعویٰ کی تائید میں یہ ہے کہ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ یٰمعشر الجن والانس الم یاتکم رسلٌ منکم یقصّون علیکم اٰیٰتی وینذرونکم لقاء یومکم ھٰذا (انعام ع ۱۶) یعنی اے جنوں اور انسانوں کی جماعتو! کیا تمہارے پاس تمہاری قوموں میں سے رسول نہیں آئے تھے جو تم کو میرے نشانات پڑھ کر سُناتے تھے۔ اور آج کے دن کے دیکھنے سے تم کو ہوشیار کرتے تھے۔ اِس آیت میں صاف لکھا ہے کہ

جنوں کی طرف اُن کی قوم کے نبی آئے اور انسانوں کی طرف انسان نبی۔ اب اگر جن کوئی دوسری مخلوق ہے تو اِس آیت کے ماتحت نہ تو موسیٰؑ ان کے نبی ہو سکتے ہیں۔ نہ نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم۔ کیونکہ جنوں کی طرف اِس آیت کے ماتحت جن نبی ہی آئے تھے۔ ہاں اگر جنوں سے انسانوں کا کوئی گروہ مراد ہو تو پھر بے شک وہ موسیٰؑ اور آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے مومن ہو سکتے ہیں۔

پانچواں ثبوت اِس امر کا کہ عوام میں جو جن مشہور ہیں ان کا کوئی وجود نہیں اور یہ کہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم پر جو جن ایمان لائے تھے وہ انسان ہی تھے یہ ہے کہ اللہ تعالےٰ جہنم کی نسبت فرماتا ہے فاتقوا النار التی وقودھا الناس والحجارۃ (بقرہ ع ۳) دوزخ میں یا تو انسان ہوں گے یا پھر پتھر وغیرہ آگ کو بھڑکانے والے سامان ہوں گے۔ اگر جن کوئی مکلف مخلوق ہے تو یوں چاہیئے تھا۔ وقودھا الناس و الجن والحجارۃ۔ پس جہاں قرآن کریم نے جن قوم کو دوزخی کہا بھی ہے وہاں انسان جن مراد ہیں نہ کوئی غیر مخلوق۔

چھٹا ثبوت ان مومن جنوں کے **انسان ہونے کا** یہ ہے کہ مسند احمد بن حنبلؒ میں آتا ہے کہ قال (رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم) لھم لقد اعطیت اللیلۃ خمسًا ما اعطیھن احد قبلی اما انا فارسلت الی الناس کلھم عامۃ وکان من قبلی انما یرسل الی قومہ (جلد دوم ص ۲۲۲) یعنی رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے نماز تہجد پڑھ کر جو پہرہ دار آپؐ کے پیچھے نماز میں شامل ہو گئے تھے اُن سے فرمایا کہ آج پانچ خصوصیتیں مجھے ایسی عطا کی گئی ہیں کہ اس سے پہلے کسی کو یہ خصوصیتیں نہیں ملیں۔ ایک تو یہ کہ مَیں سب اقوام کی طرف بلا استثنا مبعوث کیا گیا ہوں۔ اور جو مجھ سے پہلے نبی گذرے ہیں وہ صرف اپنی قوم کی طرف مبعوث ہوتے تھے (آگے بقیہ چار خصوصیتیں بیان کی گئی ہیں۔) یہ بھی یاد رہے کہ اس رات کو پانچ خصوصیتیں جمع کر کے آپؐ کو بتائی گئی تھیں۔ ورنہ بعض خصوصیات مثلاً یہی جو اوپر بیان ہوئی ہے شروع زمانہ اسلام سے ہی آپؐ کو مل چکی

تھیں۔ اِس حدیث کے ہوتے ہوئے کون کہہ سکتا ہے کہ یہ جن جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لائے کوئی اور مخلوق تھی۔ کیونکہ قرآن کریم صاف بتلاتا ہے کہ وہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے مؤمنوں میں سے تھے۔ اگر وہ بنی اسرائیل میں سے نہ تھے تو ان کا موسیٰ پر ایمان لانا جائز ہی کس طرح ہو سکتا ہے۔

اگر اعتراض ہو کہ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ کما ارسلنا الیٰ فرعون رسولاً (مزمل ع۱) موسیٰ فرعون کی طرف بھی مبعوث تھے۔ حالانکہ فرعون بنی اسرائیل میں سے نہ تھا۔ تو اس کا جواب یہ ہے کہ قوم سے مراد کبھی نسلی قوم ہوتی ہے اور کبھی ملکی۔ جیسے ہندوستان میں مختلف اقوام بستی تھیں۔ ان میں جو نبی آتا تھا وہ ہندوستانی قوم کی طرف مبعوث ہوتا تھا نہ کہ برہمن یا راجپوت کی طرف۔ کیونکہ ایک جگہ رہنے والی اقوام کو سہولت کے لئے ایک قوم شمار کر لیا جاتا ہے۔ پس فرعون کے ساتھ اور اُس کی قوم کے ساتھ چونکہ حضرت موسیٰ حکومت اور ریاست اور قانون اور تمدن کے ذریعے سے بندھے ہوئے تھے ان کو تو ایک قوم سمجھ لیا گیا مگر جنوں کو حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کیا نسبت تھی۔ حکومت کے لحاظ سے یا سیاستاً کے لحاظ سے یا قانون کے لحاظ سے یا تمدن کے لحاظ سے کہ ان کو بھی موسےٰ علیہ السلام پر ایمان لانے کا حکم دیا گیا۔ اگر کہو کہ حضرت موسیٰ مبعوث تو بنی اسرائیل یا ان کے ساتھ رہنے والی قوم کی طرف ہی ہوئے تھے مگر جنّ اپنے طور پر ان پر ایمان لے آئے تھے۔ تو یہ بھی درست نہیں ہے حضرت مسیح علیہ السلام کا ایک واقعہ انجیل میں بیان ہوا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے دوسری اقوام کو اپنی جماعت میں شامل ہونے کی اجازت تک نہ دی۔ بلکہ جب اُن سے ایک غیر قوم کے آدمی نے تبلیغ کرنے کے لئے کہا تو آپ نے فرمایا کہ "لڑکوں کی روٹی لیکر کتوں کو ڈال دینی اچھی نہیں۔" (متی باب۱۵ آیت ۲۶) پس یہ بھی درست نہیں کہ وہ اپنی مرضی سے ایمان لے آئے تھے۔ کیونکہ اگر جن کوئی مکلّف قوم ہے تو اس کے لئے صرف اُسی نبی پر ایمان لانا فرض ہے جو من انفسھم ہو۔ موسیٰ علیہ السلام پر ایمان

لانا اُن کے لئے جائز نہ تھا۔ غرض قرآن کریم کی آیات اور مذکورہ حدیث کے رُو سے کم سے کم رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم سے پہلے جنّوں کے لئے الگ نبی مبعوث ہونے ضروری تھے جو خود اُن میں سے ہوتے۔ نیز جنّوں کی مختلف قوموں کی طرف الگ الگ نبی مبعوث ہونے ضروری تھے۔

ساتواں ثبوت ان جنّات کے انسان ہونے کا یہ ہے کہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کا دعویٰ اللہ تعالےٰ قرآن کریم میں یہ فرماتا ہے۔ کہ یٰایھا النّاس انّی رسول اللہ الیکم جمیعًا (اعراف غ) اس جگہ جنّوں کو رسالت میں شامل نہیں کیا۔ اگر جنّ بھی کوئی علیحدہ قوم ہے اور اس کے لئے بھی آپ پر ایمان لانا ضروری تھا یا جائز ہی تھا۔ تو یوں فرمانا چاہیئے تھا۔ یٰایھا النّاس والجنّ انّی رسول اللہ الیکم جمیعًا۔ مگر یہ تو قرآن کریم میں کہیں بھی نہیں آیا۔ پس جو جنّ آپ پر ایمان لائے وہ قرآنی تشریح کے ماتحت انسانوں ہی میں سے تھے۔ اور اسی وجہ سے آپ پر ایمان لانے کے مکلّف تھے۔ ایک اور آیت اس مضمون کے بارہ میں اس سے بھی واضح ہے۔ اور وہ سورۃ سبا کی آیت وما ارسلنٰک الّا کآفّۃً للنّاس (ع) کافۃ۔ کفّ سے نکلا ہے۔ جس کے اصل معنے جمع کرنے اور روکنے کے ہیں۔ پس آیت کے معنے یہ ہوئے کہ اے محمّد! صلے اللہ علیہ وسلم ہم نے تجھے صرف اِس لئے مبعوث کیا ہے کہ تُو انسانوں کو جمع کرے اور کسی انسان کو اپنی تبلیغ سے باہر نہ رہنے دے۔ اب دیکھو اللہ تعالےٰ تو فرماتا ہے کہ تجھے صرف انسانوں کو جمع کرنے کے لئے بھیجا ہے۔ اور بعض لوگ خیال کرتے ہیں کہ انسانوں کے سوا کوئی اور مخلوق بھی ہے اور وہ بھی محمّد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانیکی مکلّف ہے۔ پس حقیقت یہ ہے کہ جس طرح انسانوں میں سے کوئی آپ کی دعوت سے باہر نہیں۔ انسانوں کے سوا کوئی مخلوق آپ پر ایمان لانے کے لئے مکلّف بھی نہیں۔ اس وجہ سے جن مومن جنّوں کا ذکر قرآن کریم میں کیا گیا ہے وہ انسان ہی تھے کوئی اور مخلوق نہ تھے۔

خلاصۂ کلام یہ کہ قرآن کریم میں جن کئی معنوں میں استعمال ہؤا ہے۔ (۱) جن وہ تمام مخفی مخلوق - جو غیر مرئی شیطان کی قسم سے ہے۔ یہ مخلوق اسی طرح بدی کی تحریک کرتی ہے جس طرح ملائکہ نیکی کی تحریک کرتے ہیں۔ ہاں یہ فرق ہے کہ ملائکہ کی تحریک وسیع ہوتی ہے اور ان کی تحریک محدود ہوتی ہے یعنی ان کو زور انہیں پر حاصل ہوتا ہے جو خود اپنی مرضی سے بدخیالات کی طرف جھک جائیں۔ انہیں شیاطین بھی کہتے ہیں۔ (۲) جن سے مراد قرآن کریم میں Cave man بھی ہے۔ یعنی انسان کے قابلِ الہام ہونے سے پہلے جو بشر زیرِ زمین رہا کرتے تھے اور کسی نظام کے پابند نہ تھے۔ ہاں آئندہ کیلئے قرآن کریم نے یہ اصطلاح قرار دے لی کہ جو لوگ اطاعت کا مادہ رکھتے ہیں ان کا نام انسان رکھا۔ اور جو لوگ ناری طبیعت کے ہیں اور اطاعت سے گریز کرتے ہیں ان کا نام جن رکھا۔ (۳) شمالی علاقوں کے وہ لوگ یعنے یورپ وغیرہ کے جو ایشیا کے لوگوں سے میل ملاپ نہ رکھتے تھے۔ اور جن کے لئے آخری زمانہ میں حیرت انگیز دُنیوی ترقی اور مذہب سے بغاوت مقدر تھی ان کا ذکر سورۂ رحمٰن میں کیا ہے۔ (۴) غیر مذاہب کے لوگوں کو اور اجنبیوں کو جنہیں بعض اقوام جیسے ہندو اور یہود کوئی نئی مخلوق سمجھتے تھے ان کو عام محاورہ کے مطابق جن کے نام سے موسوم کیا ہے۔ جیسے حضرت سلیمانؑ کے جن یا رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانے والے لوگ۔

میرے نزدیک دوزخ میں جانے والے جن جنات کا ذکر آتا ہے اُن سے مراد یا تو وہی ناری طبیعت والے لوگ ہیں جو اطاعت سے باہر رہتے ہیں اور کسی مذہب یا تعلیم کو قبول نہیں کرتے۔ اور انسان دوزخیوں سے مراد وہ کفار ہیں جو کسی نہ کسی مذہب سے اپنے آپکو وابستہ کرتے ہیں یا پھر اقوام شمال مغرب کو جن قرار دیا ہے۔ اور جنوبی دُنیا اور مشرق کے لوگوں کو انس قرار دیا ہے۔ جیسا کہ عُرفِ عام میں یہ لوگ ان ناموں سے مشہور تھے۔ یہ جو فرمایا کہ والجانّ خلقنٰہ من قبل من نار السموم۔ اس سے

مراد یہ ہے کہ یہ لوگ جنکو ہم جن کہتے ہیں ان کی طبیعت میں ناری مادہ تھا۔ جیسے جلد اشتعال میں آجاتے تھے۔ اور اطاعت برداشت نہیں کرسکتے تھے حضرت آدمؑ سے پہلے بشر کی حالت یہی تھی۔ حضرت آدمؑ پہلے انسان تھے جنھوں نے اخلاقی اور تمدنی کمال حاصل کیا۔ اس وجہ سے الہام جس کا تعلق تمدن اور اخلاق سے ہے سب سے پہلے آپ ہی پر نازل ہوا۔ پس جو لوگ اس تمدن اور نظام میں شامل ہوئے انہوں نے گویا اپنے نفسوں کو مار دیا اور اللہ تعالےٰ کی اطاعت کا نقش اپنے دلوں پر کندہ کروالیا۔ پس وہ طینی کہلائے۔ کیونکہ طین نقش قبول کرتی ہے اور جن لوگوں نے نظام میں آنے کی نسبت انفرادی آزادی کو مقدم رکھا اور کسی کی اطاعت کا جُوا گردن پر رکھنے سے انکار کیا وہ ناری کہلائے یعنی جس طرح آگ کا شعلہ قابو میں نہیں آتا اسی طرح وہ بے قابو ہو گئے۔ اور بوجہ زمین کے اندر رہنے کے وہ جن بھی کہلائے۔

اگر کوئی کہے کہ اللہ تعالےٰ تو فرماتا ہے خلقنہٗ من نارِ السموم۔ جنوں کو آگ سے بنایا۔ پھر تم کس طرح کہتے ہو کہ اس سے مراد ناری طبیعت ہے؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ اللہ تعالےٰ نے قرآن کریم میں دوسری جگہ فرمایا ہے خُلِقَ الانسان من عجلٍ (انبیاءع) جسکے لفظی معنے ہیں۔ انسان کو (اللہ تعالےٰ نے) جلدی سے پیدا کیا۔ محقق مفسرین لکھتے ہیں کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ انسان کی طبیعت میں عجلت اور جلد بازی ہے۔ یہ نہیں کہ جلدی نام کسی مادہ کا ہے جس سے انسان کو بنایا گیا ہے اور وہ لکھتے ہیں کہ یہ عربی کا عام محاورہ ہے کہ جو شئے کسی کی طبیعت میں داخل ہو۔ اس کے بارہ میں کہتے ہیں کہ وہ اس سے پیدا کیا گیا ہے۔ ایک دوسری جگہ اللہ تعالےٰ فرماتا ہے۔ اللّٰہ الّذی خلقکم من ضُعفٍ (رومع) یعنے خدا تعالےٰ وہ ہے جس نے تم کو اِس حالت میں پیدا کیا ہے کہ تمہاری طبیعت میں کمزوری ہوتی ہے۔ یعنی پیدائش کے وقت بچہ کمزور ہوتا ہے اور دوسرے کی امداد کا محتاج ہوتا ہے۔ اِس آیت کے بھی یہ معنے نہیں کہ ضُعف کوئی

مٹی یا ملکی کی قسم کی چیز ہے ۔ جس سے خدا تعالیٰ نے انسان کو بنایا ہے ۔

یہ تعلیق ختم کرنے سے پہلے

میں یہ بھی بتا دینا چاہتا ہوں کہ کئی پرانے بزرگ کم سے کم میرے اس خیال میں میرے ساتھ شریک ہیں کہ وہ جن کوئی نہیں ہوتے جو انسانوں سے آ کر لیں ۔ اور ان پر سوار ہو جائیں ۔ اور ان سے مختلف کام لیں ۔ چنانچہ علامہ ابن حیان اپنی تفسیر بحر محیط کی جلد پانچ ص۴۵۲ پر لکھتے ہیں کہ جبائی کا قول ہے کہ یہ آیت (الا عبادك منهم المخلصين) جو آیت زیر تفسیر کے چند آیات بعد ہی ہے ان لوگوں کے دعووں کو رد کر دیتی ہے جن کا یہ خیال ہے کہ شیطان اور جنوں کے لئے یہ ممکن ہے کہ انسانوں پر غلبہ پالیں ۔ اور ان کی عقلوں کو خراب کر دیں ۔ جیسا کہ عام لوگوں کا عقیدہ ہے ۔ اور بعض دفعہ عوام ان امور کو جادوگروں کی طرف بھی منسوب کرتے ہیں ۔ اور یہ سب دعوے اللہ تعالیٰ کی نص صریح کے خلاف ہیں ۔ اگر کہا جائے کہ بعض بزرگوں نے جنوں کا ذکر کیا ہے تو اس کا جواب یہ ہے کہ یہ روحانی نظارے ہیں اور عالم مثال میں ایسی باتیں نظر آ جاتی ہیں ۔ انہوں نے کشف سے بعض امور دیکھے اور چونکہ عوام میں جنات کا عقیدہ تھا اور قرآن کریم میں بھی لفظ جن کا استعمال ہوا ہے انہوں نے ان مثالی وجودوں کو اصلی وجود سمجھ لیا ۔

میرا اپنا ذاتی تجربہ اس بارہ میں یہ ہے کہ کئی مختلف وقتوں میں لوگوں نے مجھے ایسے خطوط لکھے ہیں کہ جنات ان کے گھر میں آتے اور فساد کرتے ہیں ۔ میں نے ہمیشہ اپنے خرچ پر اس مکان کا تجربہ کرنا چاہا لیکن ہمیشہ ہی یا تو یہ جواب ملا کہ اب ان کی آمد بند ہو گئی ہے یا یہ کہ آپ کا خط ملنے یا آپ کا آدمی آنے کی برکت سے وہ بھاگ گئے ہیں ۔ میرا اپنا خیال ہے کہ جو کچھ ان لوگوں نے دیکھا ایک اعصابی کرشمہ تھا ۔ میرے خط یا پیغام سے چونکہ انہیں تسلی ہوئی وہ حالت بدل گئی ۔

اگر اس تفسیر کے پڑھنے والوں میں سے کسی صاحب کو اس مخلوق کا تجربہ ہوا ور وہ مجھے لکھیں تو میں اپنے خرچ پر اب بھی تجربہ کرانے کو

تیار ہوں۔ ورنہ جو کچھ میں متعدد قرآنی دلائل سے سمجھا ہوں یہی ہے کہ عوام الناس میں جو جن مشہور ہیں اور جن کی نسبت کہا جاتا ہے کہ وہ انسانوں سے تعلق رکھتے اور ان کو چیزیں لاکر دیتے ہیں یہ محض خیال اور وہم ہے یا مداریوں کے تماشے ہیں جن کے اندرونی بھید کے نہ جاننے کی وجہ سے لوگوں نے ان کو جنات کی طرف منسوب کر دیا ہے۔ اِس علم کا بھی مَیں نے مطالعہ کیا ہے اور بہت سی باتیں ان ہتھکنڈے کرنیوالوں کی جانتا ہوں۔ ہاں یہ مَیں مانتا ہوں کہ ممکن ہے پہلے انسان ناری وجود ہوا اور زمانہ کے تغیرات سے بدلتے بدلتے ارتقاء کے ماتحت طینی وجود ہو گیا ہو۔ یعنی اُس کی بناوٹ کی بُنیاد زمینی پیداوار پر آگئی ہو۔ اور ایسے وجود جو سب سے پہلے تیار ہوئے اُن کا سردار آدمؑ ہو۔ یہ کوئی بعید بات نہیں۔ علم جیالوجی سے یہ امر ثابت ہے کہ دُنیا میں مٹی کا چھلکا بعد میں بنا ہے۔ پہلے دُنیا ایک گرم آگ کا کُرہ تھی۔ سو ارتقاء کے لحاظ سے اگر طینی ابتداء سے پہلے انسان کی ابتداء ناری وجود سے تسلیم کی جاوے تو مستبعد نہیں۔ مگر یہ اُمور تخمینی ہیں ان کو یقین سے بیان نہیں کیا جا سکتا۔ اس لئے مَیں نے اس کے متعلق زیادہ نہیں لکھا۔"

(تفسیر کبیر جلد سوم ص۵۵۴ تا ص۵۶۷)

سائل صاحب نے دو باتوں کے متعلق سوال کیا تھا کہ "اُن کے متعلق دین اسلام میں کیا حکم ہے" یعنی "نمبر ۱ (یعنی انسان کو اٹھا نا معلوم جگہ و مقام پر فوراً لے آنا لے جانا) اور نمبر ۲ (جن یا اس کی دوسری قسم سے تعلقات و مراسم کر لینا اور ان کے ذریعے غائب کی خبریں معلوم کرنا")

جہاں تک پہلے سوال کا تعلق ہے اُوپر کے اقتباس میں اس کا مکمل جواب آچکا ہے اب ہم دوسرے سوال کے جواب سے متعلق صحیح اسلامی اعتقاد اسی تفسیر سے پیش کرتے ہیں۔ چنانچہ حضور فرماتے ہیں:۔

(۱) پہلی بات کہ شیطان آسمان سے باتیں سُن سکتے ہیں۔ قرآن کریم کی مندرجہ ذیل آیات کے خلاف ہے۔ سورۃ طُور میں ہے۔ امر لھم سُلّمٌ

یستمعون فیہ فلیات مستمعھم بسلطٰنٍ مبین(ع۲) یعنی کیا آسمان کی بات سُننے کے لیئے ان کے پاس کوئی سیڑھی ہے جس کے ذریعے سے یہ آسمان پر جاکر خدا تعالےٰ کی بات سُن لیتے ہیں۔ یعنے ایسا ہرگز نہیں۔ اگران میں سے کوئی اِس امر کا مدعی ہے تو وہ سامنے آئے اور اپنی دلیل پیش کرے۔ اس آیت سے صاف ظاہر ہے کہ آسمان پر جاکر بات سُننا تو الگ رہا وہاں تک جانے کی قابلیت بھی کفار اور اُن کے مددگاروں میں تسلیم نہیں کی گئی۔ اگر یہ درست ہوتا کہ جن ایک دوسرے پر چڑھ کر آسمان تک جا پہنچتے تھے تو کیا کفار رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ جواب نہ دیتے کہ ایک طرف آپ اس امر کے قائل ہیں کہ جن ایک دوسرے پر چڑھ کر آسمان تک جا پہنچتے ہیں اور دوسری طرف آپ یہ کہتے ہیں کہ آسمان تک جانے کی اُن کے پاس کونسی سیڑھی موجود ہے۔ (۲) سورہ شعراء میں ہے وما تنزّلت بہ الشّیٰطین وماینبغی لھم وما یستطیعون انّھم عن السّمع لمعزولون (ع۱۱) یعنے کفار کا یہ الزام کہ اس شخص پر شیطان کلام نازل کرتا ہے درست نہیں۔ کیونکہ (ا) اس کا اپنا چال چلن ایسا اعلیٰ اور پاکیزہ ہے کہ ایسے آدمیوں سے شیطان کو کوئی تعلق ہو ہی نہیں سکتا۔ (ب) جو تعلیم اس پر نازل ہوئی ہے وہ ایسی مطہر اور پاک ہے کہ ناپاک شیطان اِس تعلیم کو اُتار ہی نہیں سکتا۔ کس طرح ممکن ہے کہ شیطان خود اپنے خلاف تعلیم اُتارے۔ (ج) اِس میں آسمانی علوم ہیں اور شیطان آسمانی علوم کے سُننے کی طاقت بھی نہیں رکھتے۔ کیونکہ خدا تعالےٰ نے انہیں آسمان کی باتیں سُننے سے محروم کیا ہوا ہے ان زبردست قرآنی دلائل کی موجودگی میں یہ خیال کیونکر کیا جا سکتا ہے کہ شیطان آسمان کی باتیں سُن لیتے ہیں۔

دوسرا دعویٰ ان روایات میں یہ کیا گیا ہے کہ شیطانوں یا جنوں کو بعض غیبی اُمور بھی معلوم ہو جاتے تھے اور وہ زبردستی اخبار غیبیہ کو اُچک لیتے تھے۔ یہ دعویٰ بھی مندرجہ ذیل آیاتِ قرآنیہ سے بالبداہت

غلط ثابت ہوتا ہے۔

۱۔ فقل انّما الغیبُ للّٰہِ فانتظروا انّی معکم مّن المنتظرین (یونس ع۲) غیب کا علم صرف اللہ تعالےٰ کو ہے (اگر وہ غیب تم کو ملے گا تو تم سچے اور مجھے ملے گا تو میں سچا) پس آؤ! دونوں خدائی فیصلہ کا انتظار کریں۔ اس آیت کے ہوتے ہوئے کس طرح کہا جا سکتا ہے کہ قرآن کریم کے رُو سے جنات غیب کا علم آسمان سے اُچک لیتے تھے۔

۲۔ سورہ طور میں ہے اعندھم الغیبُ فھم یکتبون ع۲) کیا ان کے پاس غیب معلوم کرنے کا کوئی ذریعہ ہے جس سے غیب معلوم کرکے وہ لکھ لیتے ہیں۔ یعنی ایسا ہرگز نہیں ہے۔

۳۔ یہی آیت سورہ قلم میں بھی ہے۔

۴۔ سورہ سبا میں ہے۔ وقد کفروا بہٖ من قبل ویقذفون بالغیب من مّکانٍ بعید وحیل بینھم وبین مایشتھون کما فُعِلَ باشیاعھم من قبل انھم کانوا فی شکٍّ مّریب (ع۶) یعنے یہ لوگ تیرا انکار شروع سے کرتے چلے آئے ہیں۔ اور غیب کے اُمور کے دریافت کرنے کے لئے دُور سے بیٹھے ہوئے ڈھکوسلے مارتے رہے ہیں مگر کامیاب نہیں ہوسکے۔ اُن کی غیب دانی کی خواہش کے راستہ میں اللہ تعالےٰ نے روکیں پیدا کر رکھی ہیں۔ جس طرح ان لوگوں کی خواہش کو پُورا کرنے میں جو ان سے پہلے گذر چکے ہیں روکیں پیدا کر رکھی تھیں۔ اور یہ لوگ شک میں پڑے ہوئے ہیں (ایسے لوگوں کو غیب بل ہی کب سکتا ہے۔ یعنی غیب تو اُس قلب پر نازل ہوتا ہے جو ہر قسم کے شک و شبہ سے بالا ہو اور یقین اور ایمان کے اعلیٰ مقام پر پہنچ چکا ہو۔) اس آیت بھی ظاہر ہے کہ وہ آسمان پر نہ جاتے تھے بلکہ دُور بیٹھے ڈھکوسلے مارا کرتے تھے۔

۵۔ وکذٰلک جعلنا لکلّ نبیٍّ عدوًّا شیٰطین الانس والجنّ یُوحی بعضھم الیٰ بعضٍ زخرف القول غرورًا۔ ولو

شآء ربك ما فعلوه فذرھم وما یفترون (انعام ع۱۴) یعنے جس طرح تیرے زمانہ میں ہو رہا ہے۔ اسی طرح ہم نے ہر نبی کے زمانہ میں انسان شیطانوں اور جن شیطانوں کو چھوڑ رکھا تھا کہ وہ ایک دوسرے کو دھوکہ دینے کے لئے جھوٹی باتیں سُناتے تھے۔ اور اگر تیرا رب چاہتا تو وہ یہ بھی نہ کر سکتے۔ (مگر اس کی مشیئت یہی ہے۔ اس لئے تُو انہیں ان کے حال پر چھوڑ دے اور ان کے افتراؤں کی طرف توجہ ہی نہ کر۔

اس آیت سے ظاہر ہے کہ انبیاء کے دشمن جنّ و انس ایک دوسرے کو غیب کی باتیں نہیں بتاتے بلکہ جھوٹ بتاتے ہیں۔ آیت کے آخر میں بھی یہ نہیں کہا کہ یہ آسمان کی باتیں سُنتے ہیں تو ان سے الگ رہ بلکہ یہ فرمایا ہے کہ یہ افترا کرتے ہیں اس لئے تُو ان سے الگ رہ۔ اس افترا کا جواب اللہ تعالےٰ ہی دے گا۔

۶۔ عالم الغیب فلا یُظھر علیٰ غیبہٖ احدًا الّا من ارتضیٰ من رسولٍ فانہ یسلكُ من بین یدیہ ومن خلفہٖ رصدًا لیعلم ان قد ابلغوا رسالاتِ ربّھم واحاط بما لدیھم واحصیٰ کلّ شیءٍ عددًا ٥ (جن ع۲) یعنی اللہ تعالےٰ غیب کا جاننے والا ہے اور وہ اپنے غیب کو سوائے اپنے رسولوں کے جو اس کے منتخب ہوتے ہیں اور کسی پر ظاہر نہیں کرتا۔ پھر یہ بھی حقیقت ہے کہ اس رسول کے آگے اور پیچھے نگران اور پہرہ دار چلتے ہیں تاکہ اسے یہ علم بھی حاصل ہو جائے کہ ان رسولوں نے اپنے رب کی بات لوگوں تک پہنچا دی ہے۔ اور اس کے تمام امور کا وہ احاطہ کئے رکھتا ہے۔ اور ہر ایک چیز کی تعداد بھی اس کے پاس محفوظ رہتی ہے۔ یعنے کمیت اور کیفیت دونوں کا ریکارڈ اس کے پاس ہوتا ہے کسی چیز میں کمی بیشی کا ہونا ممکن نہیں۔

یہ آیت کس وضاحت سے مذکورہ بالا تفاسیر کو باطل کرتی ہے۔ فرماتا ہے نہ صرف یہ کہ غیب کا علم اللہ تعالےٰ کو ہے بلکہ اس غیب کا پہلا اظہار صرف رسولوں پر ہوتا ہے۔ رسول بھی وہ جن کو اللہ تعالےٰ خود منتخب فرماتا

ہے نہ بندوں کے پہنچنے ہوئے رسول۔ پھر فرماتا ہے کہ جب تک وہ کلام رسول تک پہنچ نہ جائے ہم اس کی حفاظت کرتے ہیں تا اس میں کوئی دوسرا دخل نہ دے سکے۔ جب رسولوں تک وہ کلام پہنچ جاتا ہے تو پھر بھی اللہ تعالیٰ حفاظت نہیں چھوڑتا بلکہ حفاظت کرتا رہتا ہے یہاں تک کہ وہ رسول اس کلام کو بندوں تک پہنچا دیں۔ اور اس طرح مکمل طور پر پہنچا دیں کہ اس کی کمیت اور کیفیت دونوں میں کوئی فرق نہ آئے۔

گویا جب تک رسول لوگوں تک خدا تعالیٰ کا کلام پہنچا نہ دیں اُس وقت تک شیطان کو اس کلام کے متعلق کوئی علم ہی نہیں ہو سکتا۔ ہاں جب وہ انسانوں میں پھیل جاتا ہے تو جیسا کہ دوسری آیات سے ثابت ہے شیطان اس کلام کے بارہ میں شرارتیں شروع کرتا ہے۔ مگر پھر بھی وہ ناکام رہتا ہے۔ غرض اس آیت سے ثابت ہے کہ شیطان کا کلامِ الٰہی کو اُچکنے کا کام کلام الٰہی کے اعلان کے بعد شروع ہوتا ہے۔ اور اس بارہ میں سماء الدنیا سے مراد نبی کی مجلس ہے نہ کہ وہ فضا یا جو جو ہمیں اپنے سروں کے اُوپر نظر آتا ہے۔

۷۔ یہ تو عام آیات تھیں۔ ایک آیت خاص جنوں کے متعلق بھی ہے جس سے ظاہر ہے کہ نہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے وقت میں نہ اس سے پہلے کبھی بھی جنوں کو غیب کا علم حاصل ہوا ہے۔ نہ پورا نہ ادھورا اور وہ آیت یہ ہے۔ فلما قضینا علیہ الموت ما دلھم علیٰ موتہٖ الا دآبۃ الارض تاکل منسأتہ فلما خر تبینت الجن ان لو کانوا [illegible] العذاب المھین

[illegible] کی تو اُن کی موت [illegible] کہ دابۃ الارض نے [illegible] جب وہ گر گئے تو جنوں [illegible] علم ہوتا تو وہ اس [illegible]

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے زمانہ میں بھی جنوں کو غیب کا علم حاصل نہ تھا۔ اگر وہ آسمان پر سے سُنا کرتے ہوتے تو انہیں حضرت سلیمانؑ کی وفات کا علم کیوں حاصل نہ ہوتا۔ یہ ظاہر ہے کہ حضرت سلیمانؑ چونکہ نبی تھے اُن کی وفات کی خبر ضرور الہاماً اور خاص اہتمام سے فرشتوں پر نازل ہوئی ہوگی، کیونکہ نبی کی بعثت اور موت دونوں اہم امور ہوتے ہیں۔

تیسرا دعویٰ ان تفاسیر میں یہ کیا گیا ہے کہ جنوں کو بلکہ ابلیس کو رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی بعثت کا علم آسمانی شہب کے بعد ہوا ہے اور وہ بھی جبکہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو باجماعت نماز پڑھتے ہوئے انہوں نے دیکھا۔

جیسا کہ تاریخوں سے ثابت ہے رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے نماز باجماعت پبلک میں کئی سال بعد شروع کی ہے۔ پس اگر یہ معنے درست ہیں تو اس کے یہ معنے ہوں گے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے کئی سال بعد تک ابلیس کو یہ معلوم ہی نہ تھا کہ کوئی رسول مبعوث ہوا ہے۔ حالانکہ یہ صریح تعلیم قرآن کے خلاف ہے اور واقعہ کے خلاف ہے۔ نبی کے دعویٰ کے ساتھ ہی شیطان کے گھر میں ماتم پڑ جاتا ہے اور اُسی وقت سب شیطان خواہ شیاطین الانس ہوں خواہ شیاطین الجن ہوں اُسکی اور اُس کی جماعت کی مخالفت شروع کر دیتے ہیں۔ پس یہ کہنا کہ کئی سال تک ابلیس کو اور دوسرے شیاطین کو اس کا علم ہی نہ تھا کہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم مبعوث ہو چکے ہیں سُنّتِ الٰہیہ کا ردّ ہے اور واقعات کے خلاف۔ اگر شیطان کو آپؐ کی بعثت کا علم نہ تھا تو مکہ میں مخالفت کا طوفانِ بے تمیزی کہاں سے اُٹھ رہا تھا۔ ابلیس کے کوئی بھی معنی کرو اس کا ... کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے ناواقف رہنا خلافِ عقل، خلافِ ... اور خلافِ سُنّتِ الٰہیہ ہے۔ قرآن کریم صاف فرماتا ہے۔ کذٰلک ... لکل نبیٍّ عدوًّا شیٰطین الانس والجنّ یوحی ... الیٰ بعضٍ زخرف القول غرورًا (انعام ع۱۴) جن سے

ظاہر ہے کہ اللہ تعالےٰ خود شیاطین الانس والجن کو نبیوں کی بعثت کا علم مناسب ذرائع سے دیدیتا ہے۔ اور وہ نبی کی بعثت کے معاً بعد اس کی مخالفت شروع کر دیتے ہیں اور ایک دوسرے کی مدد شروع کر دیتے ہیں۔ پھر ابلیس یا اس کے چیلوں کا اس خبر سے ناواقف رہنا کیا معنے رکھتا ہے۔

اِس جگہ ایک سوال رہ جاتا ہے کہ جب غیب کا علم آسمان سے لینا یا آسمان سے خبروں کا سُننا جنوں کے لئے ناممکن ہے تو پھر حدیثوں میں جو آتا ہے کہ جن ایک دوسرے پر چڑھ کر آسمان کی خبر سُنتے ہیں اس کا کیا مطلب ہوا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ اِس سے مراد انبیاءؑ کی باتوں کو سُننا ہے۔ اور ایک دوسرے پر چڑھ کر سُننے سے یہ مراد ہے کہ ائمۃ الکفر تو خود انبیاءؑ کی مجالس میں حاضر نہیں ہوتے۔ اور براہِ راست اپنے دلوں کے شکوک کو دُور نہیں کرواتے۔ بلکہ ہمیشہ کئی واسطوں اور بزعم خود ہوشیاری سے اُن کی تبلیغ اور تعلیم کو معلوم کرتے ہیں۔ پھر چونکہ اوّل تو اُن کی اپنی نیت خراب ہوتی ہے۔ دوسرے وہ سُنی سُنائی باتوں پر اپنی مخالفت کی بُنیاد رکھتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اس قدر جھوٹ اُنکے بیان میں مل جاتا ہے کہ ایک بات سچی ہو تو سَو جھُوٹی ہوتی ہیں۔

اور یہ جو حدیث میں آتا ہے کہ کبھی شیطان لوگوں تک بات پہنچا دیتے ہیں اور پھر شہاب اُن پر گرتا ہے۔ اور کبھی بات پہنچانے سے پہلے شہاب اُن پر گر جاتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ بعض لوگ نبیوں پر گستاخی کرنے کے جُرم میں فوراً پکڑے جاتے ہیں۔ اور بعض کو حکمت الٰہی لمبی مہلت دیدیتی ہے۔ اور وہ لوگوں کو خوب بھڑکاتے رہتے ہیں یہانتک کہ ایک دن شہاب ان کو بھی آکر پکڑ لیتا ہے۔ (ص ۵۲۵ تا ص ۵۲۸)

"بعض لوگ کہتے ہیں کہ قرآن کریم میں اِلَّا من استرق السمع یا اِلَّا من خطف الخطفۃ فرما کر خود ہی فرما دیا ہے کہ شیطان کچھ سُن لیتا ہے یا اُچک لیتا ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ اِلَّا اللہ تعالےٰ کے

فعل کے بارہ میں نہیں بلکہ شیطان کے بارہ میں ہے۔ اگر اللہ تعالیٰ یہ فرماتا کہ ہم اپنے کلام کی حفاظت کرتے ہیں سوائے کچھ تھوڑے سے کلام کے جو ہم شیطان کو دیدیتے ہیں۔ تب تو یہ جواب صحیح ہوتا کہ خدا تعالیٰ کی طاقت پر اعتراض نہیں۔ کیونکہ وہ اپنی مرضی سے دیتا ہے لیکن عبارت یوں نہیں۔ عبارت تو یہ ہے کہ خدا تعالیٰ تو حفاظت کرتا ہے لیکن شیطان اُچک لے جاتا ہے۔ اور یہ معنی نہ صرف نبی اور کلام الٰہی کی شان کے خلاف ہیں بلکہ ان سے تو نعوذ باللہ من ذالک اللہ تعالیٰ کی بے بسی اور بے کسی بھی ظاہر ہوتی ہے۔ اگر یہ معنے درست ہوں تو چاہیئے کہ جب کوئی نجومی حساب لگائے اور کوئی زائچہ تجویز کرے اسی وقت شہب آسمان سے گرنے لگیں۔ مگر یہ نہیں ہوتا۔ پس واقعات ان معنوں کو رد کر رہے ہیں۔ رات دن ہزاروں نجومی، کاہن، رمال، جفار، جوتشی، پنڈت، سٹرالومر، سٹرالوجر ان کاموں میں مشغول ہیں۔ اور غیب کی خبریں معلوم کرنے کی کوشش میں لگے ہوئے ہیں۔ اگر ان لوگوں کا تعلق شیطان سے ہے۔ اور شیطان آسمان سے اُچک کر انہیں خبریں بتاتے ہیں تو رات دن شہب کی بارش ہوتی رہنی چاہیئے۔ اگر یہ کہا جائے کہ شہب اسی وقت گرتے ہیں جبکہ شیاطین باتیں سُنیں تو اس کے یہ معنی ہونگے کہ نبیوں کے زمانہ میں شیاطین زیادہ باتیں سُنتے ہیں اور اُچک کر لے جاتے ہیں۔ حالانکہ نبی کا زمانہ تو زیادہ محفوظ زمانہ ہوتا ہے۔ اور رہونا چاہیئے۔ پھر سوال یہ ہے کہ یہ امتیاز کیونکر کیا جائے کہ نبی کے زمانہ میں تو نجومی شیطانوں سے خبریں سُنکر لوگوں کو سناتے ہیں اور دوسرے زمانہ میں صرف حساب لگا کر سنا دیتے ہیں۔ کیونکہ دونوں قسم کی خبروں میں کوئی فرق کرنا پڑیگا۔ یا تو یہ کہنا ہوگا کہ نبی کے زمانہ میں نجومیوں کی باتیں زیادہ سچی ہوتی ہیں جو بالبداہت غلط ہے یا پھر ماننا پڑیگا کہ ہر زمانہ میں ہی نجومی شیطانوں سے باتیں پوچھکر آگے لوگوں کو سناتے ہیں۔ اور جو شخص ستاروں کا تھوڑا سا علم بھی جانتا ہو وہ بتا سکتا ہے کہ یہ خلاف عقل بات ہے۔ علم نجوم درمل وغیرہ گو لغو اور فضول ہیں مگر حسابی اصول پر قائم ہیں جنات کا اس معاملہ میں کوئی بھی دخل نہیں ہے۔۔۔۔ خلاصہ یہ کہ

اِن آیات میں (ولقد جعلنا فی السماء بروجًا وزیّنّٰھا للنّٰظرین٥ وحفظنٰھا من کلّ شیطٰن الرّجیم٥ اِلّا مَنِ استرق السّمع فاتبعہٗ شھابٌ مبینٌ٥ جن کی حضور تفسیر فرما رہے ہیں۔ ناقل) کلام الٰہی کی حفاظت کا ذکر ہے۔ اور اللہ تعالےٰ فرماتا ہے کہ نبی پر کلام کے نازل ہونے تک کوئی اسے معلوم نہیں کر سکتا۔ جب وہ نازل ہو جاتا ہے تو پھر شیاطین الانس والجن اسے مختلف ذرائع سے اُچک کر اس میں جھوٹ بنا کر لوگوں میں پھیلاتے ہیں اور نبی کے خلاف اُنہیں اُکساتے ہیں۔ یہ ظاہر ہے کہ ایسے ہی موقع پر جھوٹ ملانے کا فائدہ ہو سکتا ہے۔ ورنہ جن آسمان سے غیب سُنیں تو وہ پاگل ہیں کہ اس میں جھوٹ ملا کر اپنی عزت کھوئیں۔ ہاں نبی کے کلام میں اُس کے دشمن جھوٹ ملاتے ہیں تاکہ لوگوں کو جوش دلائیں اور اُن کے خلاف اُکسائیں۔ کوئی صحیح حوالہ لیا اُس کے غلط معنے کئے۔ یا ایک ٹکڑہ لیا اور سیاق سباق سے الگ کر کے اس کے مضمون سے لوگوں کو جوش دلایا (جیسے آجکل حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کے مخالف کرتے ہیں۔ ناقل) یہ نبیوں کے دشمنوں کا روز مرّہ کا مشغلہ ہے۔ اور یہی وہ اُچکنا ہے جسے اللہ تعالےٰ کی مشیت نے جائز رکھا ہے اور اس سے نبی کے مشن کی حفاظت نہیں کی۔ بلکہ فرماتا ہے کہ ہم دشمنوں کو خود اس کا موقع دیتے ہیں جیسے خود فرمایا کذٰلک جعلنا لکلّ نبیٍّ عدوًّا شیٰطین الانس والجنّ یوحی بعضھم الٰی بعضٍ زخرف القول غرورًا۔ (انعام ع ۱۴) اور فرماتا ہے کذٰلک جعلنا فی کلّ قریۃٍ اکابر مجرمیھا لیمکروا فیھا (انعام ع ۱۵) اور اسی طرح ہم نے ہر نبی کی بستی میں اس کے بڑے مجرموں کو ایسا ہی بنا دیا ہے (اس کا ذکر پہلی آیت میں آیا ہے کہ شیطان اپنے دوستوں کو الہام کرتے اور نبی کے خلاف جھگڑنے کے لئے اُکساتے ہیں) اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ نبی کے خلاف خوب تدبیریں کرتے ہیں۔ غرض جہاں کلام الٰہی کو اللہ تعالےٰ کی طرف سے یہ حفاظت حاصل ہے کہ اس میں کوئی ظاہری یا باطنی دشمن تبدیلی نہیں

گو ممکن ہے وہاں اللہ تعالےٰ نے شیطانی لوگوں کو اپنی مصلحت سے اس امر کی اجازت دے رکھی ہے کہ اس کلام کے غلط معنے لوگوں میں پھیلائیں۔ یا نبی کی وحی کے متعلق جھوٹ بول بول کر لوگوں کو جوش دلائیں لیکن جب وہ ایسا کر چکتے ہیں تو پھر ان پر آسمان سے شہاب گرتا ہے اور نبی کے ذریعہ سے اُن کے فریب کا پردہ چاک کر دیا جاتا ہے۔ یہ وہ استثناء ہے۔ کہ اس سے نہ خدا تعالےٰ کی طاقت پر حرف آتا ہے۔ نہ دین مخدوش ہوتا ہے۔ کیونکہ اس قسم کی شرارت کو اللہ تعالےٰ نے خود ہی مستثنیٰ کر دیا ہوا ہے۔ نیز اس قسم کی شرارت سے دین میں کچھ حرج نہیں آتا۔ وہ اپنی جگہ محفوظ رہتا ہے۔ یہ جھوٹی باتیں صرف دشمنوں میں پھیلائی جاتی ہیں اور دشمن کی چند روزہ خوشی کا باعث ہوتی ہیں۔

یہ بھی یاد رکھنا چاہیئے کہ قرآن کریم سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ کلام الٰہی کے خلاف اس قسم کی شرارتیں کرنے والے دو قسم کے لوگ ہوتے ہیں۔ ایک اندرونی دشمن یعنی منافق اور ایک بیرونی دشمن۔ اس کا ثبوت اس امر سے ملتا ہے کہ سورۃ حجر اور سورۃ ملک میں تو شیطان رجیم کی طرف اس فعل کو منسوب کیا گیا ہے اور سورۃ صافات میں شیطان مارد کی طرف۔ اور لغت میں جہاں رجیم کے معنے دھتکارے ہوئے دُور رکھے گئے کے ہیں۔ مارد کے معنے باغی کے ہیں۔ پس سورۃ حجر اور سورۃ ملک میں ان دشمنانِ دین کا ذکر ہے جو کفار میں سے ہوں۔ یعنی جن کو ظاہر میں بھی اسلام کے قریب آنے کی توفیق نہ ملی ہو۔ بلکہ وہ اس سے دُور رکھے گئے ہوں اور بتایا ہے کہ ان کے حملوں سے اللہ تعالےٰ قرآن کریم کی حفاظت کرے گا۔ اور سورۃ صافات میں یہ بتایا ہے کہ بعض لوگ مسلمان کہلاتے ہوئے بھی نادانستہ یا شرارتاً قرآنی مطالب کو بگاڑ کر پیش کرنے کی کوشش کریں گے وہ شیطان مارد ہوں گے۔ یعنے ظاہر میں تو مسلمان کہلائیں گے لیکن درحقیقت اسلام کے دانستہ یا نادانستہ باغی ہوں گے۔ انکے فساد کو بھی اللہ تعالےٰ دُور کریگا۔ یہ آئندہ کے لئے پیشگوئی ہے اور بتایا

ہے کہ جب بھی مسلمان قرآنی مطالب کے سمجھنے سے قاصر ہو جائیں گے اور اس کے مطالب کو بگاڑ دیں گے۔ اللہ تعالیٰ مامور مبعوث کرکے اُن کے شر اور فتنہ سے قرآن کریم کو محفوظ کر لے گا۔ فتبارک اللہ احسن الخالقین۔" (تفسیر کبیر صفحہ ۵۳۹ / ۵۴۱)

اگرچہ اس تفسیر کو پڑھ لینے کے بعد ہر عقلمند انسان اِس اقرار کے لئے اپنے تئیں مجبور پائے گا کہ مسئلہ کا کوئی پہلو تشنۂ تکمیل نہیں رہا۔ لہٰذا کسی اور تحریر کے دیکھنے کی بھی چنداں ضرورت باقی نہیں رہی۔ تاہم بفحوائے ؎

گر نبودے در مقابل روئے مکروہ و سیاہ — کس چہ دانستے جمالِ شاہدِ گلفام را
گر نیفتادے بخصمے کار در جنگ و نبرد — کے شدے جوہر عیاں شمشیر خوں آشام را
روشنی را قدر از تاریکی است و تیرگی — وز جہالت ہاست عز و قدر عقلِ تام را

ناظرین ان مدعیانِ علم و فضل کی کج مج لسانی اور ژولیدہ بیانی بھی ملاحظہ فرمائیں جو اپنے تئیں حدیث ورثۃ العلماء کا مصداق گردانتے اور اپنے سوا باقی سارے جہان کو جادۂ استقامت سے منحرف مانتے ہیں۔ کیونکہ مقابلہ کے بغیر کسی چیز کے حسن و قبح پر بخوبی اطلاع پانا ممکن نہیں۔

مولوی سید ریاست علی صاحب سائل کے استفسارات کے جواب میں رسالہ معارف اعظم گڑھ ماہ مئی ۱۹۴۳ء میں فرماتے ہیں:۔

معارف "سیرۃ النبی میں عرب کی اوہام پرستی کے ضمن میں "جن شیاطین اور بھوت پلید" کا جو ذکر آیا ہے اس کا یہ مقصود نہیں کہ ان کے وجود ہی سرے سے انکار کیا جاوے۔ اسلام کی تعلیمات کے رُو سے جنوں کے وجود سے انکار کرنا ایک ملحدانہ فعل ہوگا۔ قرآن مجید کی آیتیں اور احادیث کی روایتیں ان کے وجود کو ثابت کرتی ہیں۔ لیکن انکے متعلق تفصیلی معلومات میں علیحدہ رائیں رکھنے کا اختیار حاصل ہے۔ چنانچہ عہدِ سلف سے دورِ حاضر تک کے علمائے اسلام کے مختلف گروہوں نے اپنے خیال اور عقیدہ کے مطابق ان کے متعلق تفصیلات کی تعبیرات میں ایکدوسرے

سے جداگانہ رائیں اختیار کی ہیں۔ لفظ جن جنی کی جمع ہے جیسے رومی کی جمع روم آتی ہے سلف کا بیان ہے کہ جن ذی شعور اجسام ہیں اوران کے اجسام کا غالب حصہ ناری ہے۔ اللہ تعالےٰ فرماتا ہے۔ وخلق الجانّ من مّارجٍ مّن نارٍ (رحمٰن ع ۱) اور جنات کو خالص آگ سے پیدا کیا۔ پھر سلف میں ممتاز اکابر اس عقیدہ پر تھے کہ ان میں اپنی اصلی شکلوں سے مختلف اشکال میں متشکل ہوجانے کی صلاحیت پائی جاتی ہے اوروہ اپنی اختیار کردہ شکلوں میں انبیائے کرام اور خاصانِ اُمّت کے سامنے ظاہر ہوسکتے ہیں۔ اور یہ مخلوق ناری فطرۃً اعمال شاقہ انجام دینے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ دوسری طرف اسلام کے حکماء کا ایک گروہ ہے۔ وہ جنات کے وجود کو تو تسلیم کرتا ہے لیکن ان کو ایسے اجسام ہوائیہ مانتا ہے جن میں شکلیں بدلنے کی کوئی صلاحیت موجود نہیں ہے۔ نیز ایک گروہ فلاسفۂ قدیم کے مذہب پر ہے۔ یہ لوگ انہیں اجسام کی بجائے ایسے جواہر مانتے ہیں جو بذاتہٖ قائم ہیں اور اپنی ماہیت میں اعراض کی طرح مختلف نوعیت رکھتے ہیں۔ پھر ان کے خیال کے مطابق ان میں بعض ارباب خیر ہیں اور بعض اشرار۔

اسی طرح بعض گروہوں کا خیال تھا کہ انسانی روحیں کالبد خاکی سے جُدا ہوکر اگر وہ سعید ہیں تو ملائکہ کی صف میں اگر شریر ہیں تو شیاطین کے گروہ میں داخل ہوجاتی ہیں۔ اور یہی پلید روحیں "بھوت اور پلید" سے موسوم ہوسکتی ہیں۔ لیکن جمہور علمائے اہل سُنّت نے ان راویوں کی کُلّیتہً تردید کی ہے۔ علمائے سلف اسی رائے پر ہیں کہ جنات اپنا وجود ذاتی رکھتے ہیں۔ اور وہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں آپ کی خدمت میں آیا کرتے تھے۔ چنانچہ قرآن مجید میں ہے۔ واذ صرفنا الیک نفراً مّن الجنّ یستمعون القرآن فلمّا حضروہُ قالوا انصتوا فلمّا قُضِیَ ولّوا الی قومھم منذرین (احقاف ع ۴) اور جبکہ جنات کی ایک جماعت کو ہم تمہاری طرف لے آئے جو قرآن سُننے لگے تھے۔ پھر جب وہ لوگ قرآن کے پاس آ پہنچے تو کہنے لگے کہ خاموش رہو۔ اور جب

قرآن پڑھا جا چکا تو وہ لوگ اپنی قوم کے پاس خبر پہنچانے کے لئے واپس گئے۔

مفسرین نے اس آیت کی تفسیر میں متعدد صحیح حدیثیں نقل کی ہیں۔ یہ روایتیں بعض حیثیتوں سے ایک دوسرے کے مخالف بھی دکھائی دیتی ہیں۔ لیکن ان میں تطبیق اس روایت سے ہو جاتی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں جن کے وفود چھ مرتبہ آئے۔ اور ان روایتوں میں جو ذکر آیا ہے وہ ایک دوسرے سے مختلف موقع کے واقعات ہیں۔ ان روایتوں سے مجموعی طور پر یہ معلوم ہوتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جنوں سے کلام فرمایا۔ ان کی دعوت پر ان کی قوم کے پاس تشریف لے گئے۔ بعض موقعہ پر آپ نے ان کو بلایا۔ قرآن سنایا اور جو نہ آسکے ان تک انکے ذریعہ سے اپنا پیام پہنچایا۔ اسی سلسلہ میں صحیح مسلم، ترمذی اور ابوداؤد وغیرہ میں حضرت عبداللہ بن مسعود سے ایک روایت مروی ہے جس میں آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ اتانی داعی الجن فاتیتہم فقرات علیہم القرآن فانطلق بنا فارانا آثارھم وآثار نیرانھم۔

(روح المعانی جلد ۲۶ ص۲)

معنے۔ میرے پاس جن کا پیامبر آیا۔ میں ان لوگوں کے پاس آیا اور میں نے اُن کو قرآن سُنایا۔ پھر ہمارے ساتھ تشریف لے گئے۔ اور ہمیں اُن کے آثار اور اُن کے چولھوں کے نشان دکھائے۔

علمائے سلف میں سے جو لوگ جنوں سے مکالمہ اور رویت کے قائل ہیں وہ حضرت عبداللہ بن مسعود اور حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہما وغیرہ کی مندرجہ بالا روایتوں سے استدلال کرتے ہیں۔ لیکن جنہوں نے دوسرا پہلو اختیار کیا ہے اور جن میں جماعت معتزلہ پیش پیش ہے وہ حضرت عبداللہ بن عباسؓ کی ایک دوسری روایت سے استدلال کرتے ہیں۔ حضرت عبداللہ ابن عباسؓ کی یہ روایت صحیحین میں موجود ہے۔ وہ فرماتے ہیں)۔ ما قرأ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم علی الجن وما رأھم وانما

انطلق في طائفة من الصحابة - رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے نہ جنوں کے سامنے قرآن پڑھا - اور نہ ان کو دیکھا - البتہ صحابہ کی ایک جماعت کے ساتھ تشریف لے گئے۔

لیکن کہا جاتا ہے کہ حضرت عبداللہ ابن عباس کا یہ انکار مطلق انکار نہیں ہے۔ بلکہ وہ خاص طور پر اس واقعہ کی تردید کرتے ہیں کہ صبح کی نماز میں اس نے خاص موقعہ پر آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے اجنہ کو قرآن سُنایا تھا۔ پھر علامہ ابن تیمیہ کا خیال ہے کہ حضرت ابن عباسؓ تک حضرت عبداللہ بن مسعودؓ اور حضرت ابو ہریرہؓ کی وہ روایتیں نہیں پہنچ سکیں جن کا ذکر اوپر آیا ہے۔ علاوہ ازیں وہ واقعہ جس کا تذکرہ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ وغیرہ فرماتے ہیں ہجرت سے تین سال پہلے کا ہے اور اس زمانہ میں حضرت عبداللہ بن عباسؓ سن بلوغ کو نہ پہنچے تھے۔ اس لئے تنہا یہ روایت ان سب روایتوں کے رد کے لئے کافی نہیں ہے (روح المعانی جلد ۲۹ صفحہ ۸۴)

اس لئے علمائے سلف خصوصاً اکابر اہل سنت اسی عقیدہ پر قائم تھے کہ حیات روحانی رکھنے والے لوگ تین قسم کے ہیں۔ ان میں سے نیکو کار ملائکہ ہیں۔ اشرار شیاطین اور کچھ درمیانی ہیں۔ اخیار و اشرار دونوں ہیں اور آیت یا معشر الجن میں انہی اوسط درجہ کے اخیار و اشرار سے خطاب کیا گیا ہے (روح المعانی جلد ۲۲ صفحہ ۔۔) اور جس طرح انسانوں کے لئے اُن کے اعمال کے مطابق عذاب و ثواب مقدر ہے اسی طرح اجنہ کو احتساب کے بعد عذاب و ثواب دیا جائے گا۔ چنانچہ قرآن مجید میں کہا گیا ہے ولقد ذرأنا لجھنّم کثیراً من الجنّ والانس ۔ اعراف ع ۲۲ (روح المعانی جلد ۹ صفحہ ۱۔۔) اور ہم نے ایسے بہت سے جنات اور انسان دوزخ کے لئے پیدا کئے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ انسان اپنے عام حالات کے لحاظ سے ملائکہ اور جنات کو دیکھ سکنے کی استعداد نہیں رکھتا۔ شیطان کے متعلق تو اللہ تعالےٰ بتصریح فرماتا ہے۔ انّہٗ یراکم ھو وقبیلہٗ من حیث لا ترونھم (اعراف ع ۲) وہ اور اس کے ذریات تم کو اس طور سے دیکھتے ہیں کہ تم اُن کو نہیں دیکھتے اس لئے

اگر انسان کی قوتِ بصارت موجوداتِ عالم میں سے کسی وجود کو عمومی طور پر دیکھنے کی صلاحیت نہیں رکھتی تو یہ کوئی بعید از عقل نہیں۔ پھر جیسے ہم مادی ذرائع و آلات سے نہ دیکھ سکنے والے اجزا کا مشاہدہ کر لیتے ہیں اُسی طرح اگر روحانی کشف اور غیر مادی ذرائع سے اگر بعض خاصانِ اُمت کے لئے اُن کا دیکھنا یا اُن سے مکالمہ کرنا ثابت ہو تو عقلاً اس کے ماننے سے بھی انکار کرنا صحیح نہ ہوگا۔ پھر جنات میں شکل بدلنے کی استعداد کا پایا جانا بھی کوئی محالِ عقلی نہیں ہے۔ پانی بھاپ میں متشکل ہو سکتا ہے، بھاپ پانی کی شکل میں آسکتا ہے۔ صرف فرق یہ ہے کہ یہ تبدیلی سردی اور گرمی کے سبب سے پانی کے اختیار اور خواہش کے بغیر عمل میں آتی ہے اور جنات اپنے اختیار اور استعداد سے اپنے میں تبدیلی پیدا کر لے سکتے ہیں اس لئے کہ اللہ تعالٰے نے انہیں ان عناصر پر زیادہ قدرت عطا کی ہے جن سے اُن کی ترکیب عمل میں آئی ہے۔ بخلاف انسانوں کے کہ انکی ترکیب جن عناصر سے ہوتی ہے اُن میں ذاتی تغیر و تبدّل کرنیکی استعداد نہیں رکھی گئی بلکہ اُن کے قبضہ و قدرت میں اپنی ذات کی ہیئتِ ترکیبی میں تبدیلی پیدا کرنیکی بجائے دیگر موجوداتِ عالم کی ہیئتِ ترکیبی میں تغیر و تبدّل کر کے اشیاء کی تعمیر و تخلیق کی قوت ودیعت کی گئی ہے۔ اور یہ انسانوں کو غیر معمولی شرف حاصل ہے اس لئے اگر جنّ و شیاطین اپنی ہیئت بدل کر کبھی انسانی یا حیوانی رُوپ میں آجائیں یا کسی اور صورت میں وہ اپنے کو تبدیل کرلیں تو وہ انسانوں کو اُس رُوپ میں نظر آسکتے ہیں۔ لیکن یہ خیال شریف میں رہے کہ یہ ساری تفصیلات نظری ہیں۔ انکا تعلق کسی عقیدہ سے نہیں۔ اگر کوئی مسلمان ان کے دیکھنے کا قائل نہیں تو اسکو دینی حیثیت سے اسکے ماننے پر مجبور نہیں کیا جا سکتا۔ ورنہ اگر کوئی مسلمان انکے نظر آنے کو یقین کرتا ہے تو یہ سمجھا جائیگا کہ وہ ان خرافات کا بھی قائل ہے جو عرب میں پہلے ہوئے تھے یا آج بھی ہماری مجلسی زندگی میں اُنکے قصّے کہے سُنے جاتے ہیں۔ دینی حیثیت سے انکے وجود کو جیسے کہ

نہ کہ تفاصیل میں جو ان صرف ماننا کافی ہے - اور یہی اس مسئلہ میں اعتدال کی راہ ہے۔ " والسلام " سہا"
(رسالہ معارف ماہ مئی سنہ ۱۹۴۶ء ص ۲۹۸ تا ص ۲۷۳)

ہمارے قارئین کرام نے ملاحظہ فرمایا ہوگا کہ سائل کے استفسار کے جواب میں سید ریاست علی صاحب نے بقول مولانا حالی مرحوم ؎

کوئی مسئلہ پوچھنے ان سے جائے ۔۔۔ تو گردن پہ بارِ گراں لے کے آئے
اگر بد نصیبی سے شک اس میں لائے ۔۔۔ تو قطعی خطاب اہلِ دوزخ کا پائے
اگر اعتراض اُس کی نکلا زباں سے
تو آنا سلامت ہے دشواریاں سے
کبھی وہ گلے کی رگیں ہیں پھلاتے ۔۔۔ کبھی جھاگ پر جھاگ ہیں منہ پہ لاتے
کبھی خوک اور سگ ہیں اس کو بناتے ۔۔۔ کبھی مارنے کو عصا ہیں اٹھاتے
ستوں چشم بد دور ہیں آپ دیں کے
نمونہ ہیں خلقِ رسولِ امیں کے

سب سے پہلے تو یہ ارشاد فرمایا ہے کہ " اسلام کی رُو سے جنوں کے وجود سے انکار کرنا ایک ملحدانہ فعل ہوگا" اور پھر جنات کے متعلق اسلامی عقیدہ اور اسلامی تعلیم بیان کرنے کے لئے صرف اس قدر تکلیف گوارا فرمائی ہے کہ لائبریری میں سے کتاب روح المعانی اٹھا کر اس میں سے چند ایک حوالجات کا ترجمہ کر دیا ہے اور اُلٹی سیدھی روایات کے پیچ میں ڈال کر مسئلہ کو صاف کرنے کی بجائے اُسے ایسا گورکھ دھندا بنا کر چھوڑ دیا ہے جس سے غریب سائل بجائے تسلی پانے اور کوئی علمی فائدہ اُٹھانے کے اور بھی متذبذب ہو جائے مولانا حالی مرحوم کے اِس قول کی حرف بحرف تصدیق کر دی ہے ؎

جہاں مختلف ہوں روایات باہم ۔۔۔ کبھی ہوں نہ سیدھی روایت سے خوش ہم
جسے عقل رکھے نہ ہرگز مسلّم ۔۔۔ اُسے ہر روایت سے سمجھیں مقدم
سب اس میں گرفتار چھوٹے بڑے ہیں
سمجھ پر ہماری یہ پتھر پڑے ہیں

ظاہر ہے کہ حقیقی اور صحیح علم وہ ہوتا ہے جس کی بنیاد مقدمات یقینیہ پر ہو۔ اور جس کا حصول جلب نفع یا دفع ضرر کا موجب ہوسکے۔ کیونکہ یہی دو چیزیں علم کی علت غائی اور انسان کی جسمانی، اخلاقی اور روحانی ترقی کے لئے بمنزلہ اصول کے ہیں۔ لیکن سید ریاست علی صاحب کی طرح ایک طرف یہ کہنا کہ "سلف میں ممتاز اکابر اس عقیدہ پر تھے کہ ان میں اپنی اصلی شکلوں سے مختلف اشکال میں متشکل ہونے کی صلاحیت پائی جاتی ہے"

اور دوسری طرف یہ کہنا کہ "اسلام کے حکماء کا ایک گروہ ہے کہ وہ جنات کے وجود کو تسلیم کرتا ہے۔ لیکن ان کو ایسے اجسام ہوائیہ مانتا ہے جن میں شکلیں بدلنے کی کوئی صلاحیت موجود نہیں ہے"

ایک سانس میں انہیں اجسام بتلانا اور دوسرے میں انہیں ایسے جواہر ظاہر کرنا جو بذاتہ قائم ہیں۔ ایک طرف انہیں غیر مرئی وجود تسلیم کرنا اور دوسری طرف ان کے مرئی آثار اور چولھوں تک کے آثار دکھلانا۔ جنات کے باشکال مختلفہ متشکل ہونے کو پانی کے بھاپ اور بھاپ کے پانی میں تبدیل ہونے کے مشابہ قرار دینا۔ لیکن مختلف اشکال میں متشکل ہونے کی علت غائی اور اس پر جو فوائد مترتب ہوتے ہیں وہ نہ بتلانا۔ حالانکہ پانی کے مختلف اشکال تبدیل کرنے کے فوائد ایسے بدیہی ہیں جنہیں ایک کم سن اور کم فہم لڑکا بھی بیان کرسکتا ہے۔ علم نہیں بلکہ پراگندہ خیالی ہے جس کا ارتکاب وہی لوگ کرتے ہیں جن کی نسبت اللہ تعالے فرماتا ہے۔

لهم قلوبٌ لا يفقهون بها ولهم اذان لا يسمعون بها ولهم اعينٌ لا يبصرون بها۔ یعنی جو دل رکھتے ہوئے اس سے سمجھنے کا کام نہیں لیتے۔ اور کان رکھتے ہوئے نہیں سنتے اور آنکھیں رکھتے ہوئے نہیں دیکھتے۔ اور ہمیشہ اندھوں کی طرح دوسروں کے سہارے کے محتاج ہوتے ہیں۔

اور اس پر طرّہ یہ ہے کہ آپ اخیر میں یہ بھی فرماتے ہیں کہ "یہ ساری تفصیلات نظری ہیں۔ ان کا تعلق کسی عقیدہ سے نہیں"۔ ۔ ۔ ۔ دینی حیثیت سے ان کے وجود کو جیسے کہ وہ اپنی اصل میں ہوں صرف ماننا کافی ہے۔ اور یہی اس مسئلہ میں [illegible]

کی راہ ہے "

ناظرین خیال فرمائیں کہ جس چیز کا تعلق کسی عقیدہ سے نہیں اس کے نہ ماننے سے انسان ملحد (بے دین) کیسے ہو سکتا ہے۔ اور کیا کسی چیز کو اس طرح ماننا کہ نہ اس سے کسی نفع کی امید ہو سکے نہ ضرر کا اندیشہ ایک لغو فعل نہیں ہے؟ اور نیز کیا اس سے اس چیز کا عدم و وجود برابر نہیں ٹھہر جاتا۔ اور جب اس چیز کا عدم و وجود برابر ہو گیا تو پھر اس کا ماننا اور اس کے متعلق اعتقاد رکھنا یعنی چہ؟۔ مولوی صاحب کو شاید معلوم نہیں کہ تفصیلات میں جا کر ہی کسی چیز کی حقیقت واقعیہ کا پتہ چلتا ہے۔ کونسا مذہب ہے جس میں خدا کا تخیل نہیں۔ مگر تفصیلات میں آکر خدا کی ذات اور صفات دونوں میں اس قدر اختلاف عظیم پیدا ہو جاتا ہے کہ اصل حقیقت مشتبہ ہو کر رہ جاتی ہے۔

مسلمانوں ہی کو لے لیں۔ خدا تعالےٰ کی صفات کی تفصیلات میں ان کے درمیان کس قدر اختلاف پایا جاتا ہے۔ حالانکہ دُنیا کے پردے پر اسلام ہی ایک ایسا مذہب ہے جس میں خدا تعالےٰ کی ذات اور صفات کے متعلق تفصیلی تعلیم میں کوئی ٹکراؤ پیدا نہیں ہوتا۔ مگر آج مسلمان ہی ایک طرف تو خدا تعالےٰ کو سمیع مانتے ہیں۔ یعنی اپنے بندوں کی دُعائیں سُننے والا۔ دوسری طرف جب اُن سے پُوچھا جاوے کہ وہ بول بھی سکتا ہے یا نہیں۔ تو نہایت سادگی سے اُسے صفت تکلم سے محروم قرار دے دیتے ہیں۔ حالانکہ سُننے کا یقینی ثبوت بولنا ہی ہے۔ اور اگر وہ بولتا نہیں تو اس بات کا کیا ثبوت ہے کہ وہ سُنتا بھی ہے۔

چنانچہ ہماری عملی زندگی کا تجربہ بھی یہی ہے کہ بہرے کے لئے گونگا ہونا ضروری نہیں مگر گونگے کے لئے بہرہ ہونا لازمی ہے۔ پس معلوم ہُوا کہ اگر خدا سُنتا ہے تو بولتا بھی ضرور ہے۔ اور اگر وہ بولتا نہیں تو سُنتا بھی نہیں۔ کیونکہ سُننے کا یقینی ثبوت بولنے کے سوا اور کوئی نہیں۔ پس کسی چیز کی اصل حقیقت تفصیلات میں جانے سے ہی کھلتی ہے۔ اور اصل حقیقت کھلنے پر ہی اس کی قدر و قیمت بھی معلوم ہوتی ہے۔ مگر جو شخص یہ کہے کہ فلاں چیز کو مانو تو سہی مگر اُس کے متعلق تفصیلات میں نہ جاؤ۔ یقیناً وہ نہ صرف خود کورانہ تقلید کا دلدادہ ہے بلکہ

لوگوں کو بھی کورانہ تقلید کی دعوت دیتا ہے۔ اور ایسے لوگوں کے متعلق یہی فیصلہ ہے کہ وَمَن كَانَ فِي هَٰذِهِ أَعْمَىٰ فَهُوَ فِي الْآخِرَةِ أَعْمَىٰ وَأَضَلُّ سَبِيلًا

ہم مولوی سید ریاست علی صاحب کی خدمت میں بھی خصوصیت سے عرض کریں گے کہ اگر آں مکرم کی رسائی اِن حقائق و معارف تک نہیں تو یہ کوئی قابلِ اعتراض بات نہیں ہے کیونکہ ؎

ہر کارے و ہر مردے ، ہر مردے و ہر کارے

پس آپ تحصیلِ علوم قرآنی کے لئے ان لوگوں کی طرف رجوع فرمائیں جنہیں اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل سے ان علوم سے بہرۂ وافر عطا فرمایا ہے ؎

ایں سعادت بزورِ بازو نیست تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

جب فوق کل ذی علم علیم کی نص صریح موجود ہے تو انسان کی سعادت اسی میں ہے کہ اپنی کمتری کا احساس کرکے نہ صرف ازدیادِ علم کے لئے بارگاہِ ایزدی میں دُعا کرتا رہے بلکہ عملی رنگ میں بھی حصولِ علم کے لئے کوشاں رہے ؎

وکل العلم فی القرآن لکن تقاصر منہ افہام الرجال

آخر میں ہم سیرت ابن ہشام سے ایک حوالہ درج کرتے ہیں جس سے اِس نظریے کی حرف بحرف تصدیق ہوتی ہے جو حضرت خلیفۃ المسیح الثانی ایدہ اللہ بنصرہ العزیز نے جنّوں کے متعلق قرآن کریم اور احادیث کے متعدد شواہد کی بنا پر ظاہر فرمایا ہے۔ چنانچہ لکھا ہے:۔

قال ثم ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم انصرف من الطائف راجعًا الی مکۃ حین یئس من خیر ثقیف حتی اذا کان بنخلۃ قام من جوف اللیل یصلی فمر به النفر من الجن الذین ذکرھم اللہ تبارک وتعالیٰ وھم فیما ذکر لی سبعۃ نفر من جن اھل نصیبین۔ فاستمعوا له فلما فرغ من صلاته ولّوا الی قومھم منذرین قد آمنوا واجابوا الی ما

الی ما سمعوا خفقق الله خبرهم علیه صلی الله علیه وسلم"

یعنی جب آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم طائف کے سفر سے مایوس ہو کر لوٹے اور نخلہ کے مقام پر ٹھہرے۔ تو حضور صلے اللہ علیہ وسلم رات کے وقت تہجد کیلئے بیدار ہوئے۔ اور حضور نماز پڑھ رہے تھے کہ نصیبین کے جنوں کا ایک قافلہ جو سات افراد پر مشتمل تھا قرآن سُننے کے لئے حضور کی خدمت اقدس میں حاضر ہوا اور بیعت کرنے کے بعد اپنی قوم کی طرف واپس لوٹ گیا۔

(سیرت ابن ہشام صفحہ ۲۵۵)

وَاٰخِرُ دَعْوٰنَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ

جناب چوہدری نصر اللہ خان صاحب ایڈووکیٹ
ممبر پنجاب لیجسلیٹو اسمبلی
کا مکتوب گرامی

۱۹۳۸-۶-۱۸

مکرمی منیجر صاحب طبیہ عجائب گھر

السلام علیکم۔ آپ کا سرمہ جواہر والا اور ٹھنڈا سرمہ دونوں میں استعمال کر رہا ہوں یہ سرمے بلا مبالغہ بالکل بے ضرر اور بے حد مفید ہیں۔ جس طرح آنکھیں قدرت کا ایک خاص نعمت ہیں اسی طرح آپ کے یہ سرمے آنکھوں کے لئے خاص نعمت ہیں۔ اس نادر ایجاد کیلئے یقیناً آپ مستحق مبارکباد ہیں۔ خاکسار نصر اللہ خان ایم ایل اے۔

نرخ سرمہ جواہر قیمت فی شیشی پانچ روپے (دس روپے تولہ) ٹھنڈا سرمہ فی شیشی دو روپے۔

ملنے کا پتہ

منیجر طبیہ عجائب گھر رجسٹرڈ قادیان دارالامان

مقوی دانت منجن

اگر آپ کے دانت کمزور ہیں۔ مسوڑھوں سے خون [illegible] منہ سے بدبو آتی ہے۔ دانت ہلتے ہیں۔ گوشت خورہ [illegible] ہے۔ دانت [illegible] ہیں۔ انکی وجہ سے معدہ خراب ہے۔ ہاضمہ بگڑ گیا ہے۔ دانتوں [illegible] ہے تو ان امراض کے لئے ہمارا تیار کردہ مقوی دانت منجن استعمال کرنے سے بفضل خدا تمام شکایات دور ہو جاتی ہیں اور دانت مضبوط ہو کر موتیوں کی طرح چمکتے ہیں۔ قیمت دس تولہ شیشی ایک روپیہ آٹھ آنے (عمہ)

حب مسان

ایسے بیمار بچے جن کا معدہ۔ جگر۔ انتڑیاں کمزور ہو گئی ہوں اور بچے سوکھا بجار میں مبتلا ہو چکا ہو۔ بدن ایسا کمزور ہو گیا ہو کہ ہڈیوں پر صرف چمڑا ہی دکھائی دیتا ہو۔ سبز سفید دست آتے ہوں۔ پاخانہ بار بار پیچش سے اور خون آلودہ آتا ہو۔ کھانسی نکلتی ہو بخار رہتا ہو۔ عموماً جب بچے کے دانت۔ کچلیاں۔ داڑھیں نکلتی ہیں تو یہ شکایات پیدا ہوتی ہیں۔ سب یا ان میں سے کوئی پیدا ہو جاتی ہے۔ ایسے وقت حب مسان کا استعمال از حد ضروری ہے۔ بچے بفضل خدا تندرست۔ موٹا تازہ۔ خوبصورت ہو جاتا ہے۔ اگر پہلے ہی حب مسان و چونڈی کا استعمال جاری رہے تو ان امراض سے بچے محفوظ پیدا ہوتا ہے۔ قیمت فی شیشی عمہ

بچوں کی چونڈی

یہ ان بیماریوں کا مجرب علاج ہے۔ [illegible]۔ قے۔ دست سبز دست لیسدار پاخانے۔ زکام۔ نزلہ۔ کھانسی۔ [illegible] نیند سے رو کر اٹھنا۔ دانت نکلتے وقت یہ بیماریاں زیادہ حملہ کرتی ہیں۔ معدہ خراب ہو جاتا ہے اور سبز دست آتے ہیں۔ صحت بگڑ جاتی ہے۔ لہذا آپ اپنے بچوں کی صحت کی نگرانی کرتے ہوئے فوراً اطلاع دیویں۔ تاکہ آپ کے بچوں کی محافظ حب مسان و چونڈی دونوں روانہ کی جائیں۔ خدا کے فضل سے حب اٹھرا کی طرح یہ دونوں اکسیر صفت ہیں اور ہر گھر میں انکی موجودگی ضروری ہے۔ قیمت فی شیشی خورد ۱۲ر کلاں عمہ

حب مفید النساء

یہ گولیاں عورتوں کی مشکل کشا ہیں۔ ان کے استعمال [illegible] بے قاعدگی۔ کم آنا۔ زیادہ آنا۔ خون کا درد کو [illegible] [illegible] کی جھائیاں۔ ہاتھ پاؤں [illegible] [illegible]

لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ

هو الذي ارسل رسوله بالهدى ودين الحق ليظهره على الدين كله

ماہنامہ

ریویو آف ریلیجنز (اردو)

یعنی

دنیا کے مذاہب پر نظر اور اہل مذاہب کا تشحیذ الاذہان

جلد ۴۵	ماہ شوال ۱۳۶۵ھ مطابق ماہ ستمبر ۱۹۴۶ء	عدد ۹

فہرست مضامین

ظلمات کے وجود میں خدائی رحم کے نظارے

(از جناب (ڈاکٹر) شاہ نواز خان صاحب)

[نوٹ:- اِس مضمون میں ظلمات کا لفظ وسیع معنوں میں استعمال کیا گیا ہے اور اِس سے مراد تاریکی کے فرزند یعنی موذی اشیاء مثلاً سانپ، بچھو، نحل درندے وغیرہ۔ ہلاک کرنے والے عناصر مثلاً برق (بجلی) رعد (کڑک) زلازل وغیرہ۔ اتفاقی حوادث۔ امراض۔ دُکھ درد۔ جراثیم، زہر وغیرہ۔ اور بظاہر بے فائدہ اشیاء حشرات الارض وغیرہ ہے۔]

دہریوں کا ایک مشہور اعتراض صفاتِ رحمت پر۔

دہریوں کی طرف سے صفات باری تعالےٰ پر کئی طرح کے اعتراضات ہوتے رہتے ہیں جن میں سے ایک مشہور اور وزنی اعتراض یہ ہے۔ کہ اگر اللہ تعالےٰ کوئی رحیم کریم اور حکیم ہستی ہے تو اُس نے ظلمات یعنی موذی اشیاء، ہلاک کرنے والے عناصر، جراثیم، امراض، دُکھ درد وغیرہ کو کیوں پیدا کیا ہے۔ نیز اُس نے بعض بے فائدہ اشیاء کیوں بنائی ہیں۔ جو کہ عبث فعل ہے اور حکیم ہستی کی طرف منسوب نہیں ہو سکتا۔ اِس کے ساتھ ہی یہ سوال بھی پیدا ہوتا ہے کہ بچوں کو کیوں تکلیف ہوتی ہے۔ حالانکہ وہ بالکل معصوم ہوتے ہیں۔ پھر بچے پیدائشی نقص لے کر کیوں پیدا ہوتے ہیں۔ حالانکہ اُن کا ولادت میں کوئی دخل نہیں ہوتا۔ دہریوں کے نزدیک تو چونکہ اندھی نیچر قانونِ قدرت کو چلا رہی ہے اس لئے ان پر تو یہ اعتراض نہیں پڑتے مگر ہم لوگ چونکہ خدا تعالےٰ کو خالق، رحمان اور رحیم ہستی مانتے ہیں اس لئے ان کا حق ہے کہ وہ ہم سے ظلمات کی پیدائش میں صفتِ رحمانیت کا ثبوت مانگیں۔ ورنہ نعوذ باللہ ہم کو اللہ تعالےٰ کی طرف ظلم، حماقت وغیرہ عیوب منسوب کرنے ہوں گے۔ اور حق تو یہ ہے کہ یہ اعتراض صرف دہریوں کو ہی نہیں سوجھتا بلکہ بعض خدا

کو ماننے والوں کے دلوں میں بھی یہ سوال ضرور کھٹکتا ہے۔ مگر وہ اس کا تسلی بخش جواب نہ پا کر فطرت کی اس آواز کو دبانے کی کوشش کرتے رہتے ہیں۔ اس لئے ضروری ہے کہ ذرا وضاحت سے قرآن کریم اور اس کی اس تشریح کی روشنی میں جو اس زمانہ کے مامور اور مرسل حضرت مسیح موعود علیہ السلام نے اور آپ کے بعد آپ کے خلفاء نے کی ہے۔ اس سوال کا کافی اور شافی جواب دیا جائے۔ تا دہریوں کا مُنہ بند ہو اور ماننے والوں کا ایمان بڑھ کر اُن کے دلوں کو اطمینان حاصل ہو۔ واللہ الموفق۔

۱۔ دیگر مذاہب والوں نے بھی اِس سوال کو حل کرنے کی کوشش کی ہے مگر بجائے کوئی تسلی بخش اور معقول جواب دینے کے انہوں نے تناسخ وغیرہ عقیدے ایجاد کر کے کئی پیچیدگیاں پیدا کر دی ہیں۔

۲۔ بعض نے تو ایک کی بجائے دو خدا تجویز کر کے اپنی طرف سے اس عقیدہ کو حل کر لیا ہے۔ مثلاً پارسی لوگ یعنی زرتشتی مذہب والوں کا عقیدہ ہے کہ مفید اشیاء (نور) کا خدا الگ ہے اور موذی اشیاء (ظلمات) کا خدا اَور ہے اور دونوں میں جنگ ہوتی رہتی ہے گویا وہ خدا کے ساتھ عدل (یعنی شرک) میں مبتلا ہو گئے۔

۳۔ مسلمانوں نے بھی اِس تصادم کو دُور کرنے کے لئے کئی ایک تاویلیں کی ہیں۔ مثلاً یہ کہا جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ صرف رحمان اور رحیم ہی نہیں بلکہ وہ شدید العقاب بھی ہے اس لئے موذی اشیاء کا وجود بھی ضروری ہے۔

۴۔ پھر یہ بھی ہے کہ اِنسان اِس دُنیا میں ہمیشہ رہنے کے لئے نہیں پیدا کیا گیا۔ آخر اس نے دارالجزاء میں مزید ترقیات کے لئے مرنا بھی تھا۔ اور یہ موذی اشیاء (امراض وغیرہ) موت کا ذریعہ حضرت عزرائیل کے آلاتِ ہلاکت ہیں۔

۵۔ کامل الوہیت کے لئے ضروری ہے کہ رحمت اور غضب دونوں قسم کی صفات کا اظہار خالقِ حقیقی کی طرف سے ہو۔ یعنی جمال اور جلال دونوں کا مظاہرہ ضروری تھا۔ نور یعنی مفید اشیاء اللہ تعالیٰ کی جمالی اور ظلمات (موذی اشیاء) اس کی جلالی صفات کے ماتحت ہیں۔ انسانی فطرت چونکہ ادنیٰ حالت میں ڈر کی محتاج ہے اس لئے صفاتِ غضبیہ کا اظہار بھی ضروری تھا۔ مگر یہ صفات رحمتی وسعت کل شيء کے تابع ہیں۔

۶۔ دُنیا میں مصائب اور دُکھ درد کا وجود اس لئے بھی ہے کہ اس طرح انسان پر اپنی بے بسی ظاہر ہوا اور وہ اپنے خالق کی طرف متوجہ ہوتا رہے۔ اس کے علاوہ موذی اشیاء کا جو انسان کی دشمن ہیں' ایک فائدہ یہ ہے کہ اس طرح انسان کی عقل تیز ہوتی رہتی ہے کیونکہ اس کو ان کا مقابلہ کرنے اور ضرر سے بچنے کے لئے نئے نئے ذرائع سے کام لینا پڑتا ہے جو تمدنی اور دماغی ترقی میں ممد ہوتا ہے۔

۷۔ نعمت کی قدر اُس وقت ہوتی ہے جب وہ چھن جائے یا اس کے خلاف حالات موجود ہوں۔ اور ہر وقت اس سے محروم ہو جانے کا خطرہ لگا رہے۔ پس دُنیا میں سکھ اور آرام کے ساتھ دُکھ درد کا سلسلہ بھی ضروری تھا۔ تا انسان کو اللہ تعالیٰ کے انعامات کی قدر ہوتی رہے اور وہ اپنے مولا کا شکر گزار بندہ بنا رہے۔ وغیرہ وغیرہ۔

صحیح اصولی جواب

مگر اس اعتراض کا حقیقی اور اصولی جواب وہی ہے جو کہ قرآن کریم سے استدلال کر کے امیر المومنین حضرت خلیفۃ المسیح الثانی ایدہ اللہ نے اپنی مایۂ ناز تصنیف "احمدیت یا حقیقی اسلام" میں دیا ہے۔ چنانچہ قرآن کریم فرماتا ہے:۔

الحمد للہ الذی خلق السمٰوٰت والارض وجعل الظلمٰت والنور ثم الذین کفروا بربھم یعدلون (الانعام ع۱)

ترجمہ:۔ "سب تعریفیں اللہ تعالیٰ کے لئے ہیں جس نے آسمان اور زمین کو پیدا کیا اور جس نے ہر قسم کے نور اور ظلمات کو بھی بنایا ہے۔ اس کے باوجود جو حق کا انکار کرنے والے ہیں وہ اپنے رب کے ساتھ عدل (شرک) کرنے لگ گئے ہیں۔" یعنی تمام وہ اشیاء جو موذی ہیں اور جن کو "تاریکی کے فرزند" کہا جاتا ہے۔ مثلاً درندے، سانپ، بچھو، زہر، تکلیف امراض وغیرہ۔ یہ سب اللہ تعالیٰ کی ہی مخلوق ہیں۔ اور ان کی پیدائش سے اس کی صفاتِ رحمت پر کوئی اعتراض نہیں پڑ سکتا۔ بلکہ اسکے برخلاف ان کا وجود اس کے رحم کا ثبوت اور حمد کا موجب ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر ان اشیاء (ظلمات) کی حقیقت اور ان کی پیدائش کی اصل غرض کو سمجھا جائے تو اس سے بجائے اللہ تعالیٰ کی صفتِ رحمانیت پر حرف آنے کے اُلٹی اس کی حمد ثابت ہوتی ہے مگر نادان لوگ جو حقائق اشیاء سے ناواقف ہیں خیال کرتے ہیں کہ ظلمات کا وجود

چونکہ صفتِ رحمانیت کے منافی ہے اس لئے شاید ان کا خالق کوئی اور وجود ہے۔ اور اس طرح وہ شرک میں مبتلا ہو رہے ہیں۔

دیکھو کس لطیف پیرایہ میں اسلام نے صداقت کو منکشف کرکے اُن اشیاء کی پیدائش کی اصل غرض کو واضح کیا ہے جو بادی النظر میں مضر معلوم ہوتی ہیں۔ وہ فرماتا ہے کہ اُن تمام اشیاء کی پیدائش کی اصل اور حقیقی غرض انسان کو فائدہ پہنچانا ہے کہ ضرر۔ اس لئے انسان کو اللہ تعالےٰ کی حمد بیان کرنی اور شکریہ ادا کرنا چاہیئے نہ کہ اعتراض اب اِس لطیف استدلال اور نئے نظریہ کی روشنی میں آؤ ذرا ہم موذی اشیاء کے وجود کی اصل غرض اور اُن کے بعض فوائد پر جواب تک معلوم ہو چکے ہیں غور کرکے دیکھیں کہ کس طرح اسلام نے اِس پیچیدہ معمہ کو حل کرکے اصل اعتراض کی کایا ہی پلٹ دی ہے۔

موذی اشیاء کے بعض فوائد

(۱) سمّیات یعنی افیون، کچلہ، سنکھیا وغیرہ اِس میں کوئی شک نہیں کہ سینکڑوں لوگ افیون، کچلہ سنکھیا وغیرہ کھا کر ہلاک ہو جاتے ہیں۔ مگر کیا آپ نے کبھی غور کیا ہے کہ کتنے مریض ان زہروں کی برکت سے طبیبوں کے ذریعے موت کے پنجے سے چھڑائے جاتے ہیں یہ افیون ہی کی برکت ہے کہ موجودہ جنگ میں لاکھوں زخمیوں کو شاک (SHOCK) سے نجات دلائی۔ پھر افیون ہی ہے جس میں اللہ تعالےٰ نے اپنی صفتِ رحمانیت کے ماتحت مارفیا پیدا کیا اور اس میں درد کو دُور کرنے کی تاثیر رکھی۔ اور اب اس کی برکت سے لاکھوں قولنج، درد جگر، درد گردہ، شکستہ ہڈیوں، اُترے ہوئے جوڑوں، جلے ہوئے اعضا، دردِ قلب اور ورم میں مبتلا مریض آرام کی نیند سوتے ہیں۔ یہی حال کچلہ اور سنکھیا کا ہے۔ یہ بھی طب میں سینکڑوں امراض میں استعمال ہوتے ہیں اور لاکھوں مریض ہر سال شفا پاتے ہیں۔ کچلہ قلب، اعصاب اور امعاء کی بیسیوں امراض میں دیا جاتا ہے۔ یہ اعلیٰ قسم کا ٹانک اور مقوی باہ بھی ہے۔ شرابی کا نشہ اُتارنے میں اکسیر کا حکم رکھتا ہے۔ سنکھیا پُرانے ملیریا میں بھی مفید ہے۔ چنانچہ جب کونین فیل

ہو جائے تو یہی دیا جاتا ہے۔ اسی طرح سنکھیا امراض خبیثہ خصوصاً آتشک کے لئے اکسیر ہے۔ غرضیکہ اور کئی امراض میں جن میں سمیات کا استعمال کیا جاتا ہے جس کی تفصیل کی یہاں گنجائش نہیں، لاکھوں کروڑوں انسان ان کی برکت سے شفا پاتے ہیں اور خدا تعالےٰ کا شکر ادا کرتے اور حمد بیان کرتے ہیں۔ پس اگر اپنی حماقت یا لاعلمی سے کبھی کبھار کوئی شخص زہر کھا کر مر جائے تو اس سے اللہ تعالےٰ کی صفتِ رحمت پر اعتراض نہیں ہو سکتا۔

(۲) سانپ، بچھو وغیرہ کے فوائد

مانا کہ سانپ کے ڈسے ہوئے ہزاروں لوگ مر جاتے اور بچھو کے ڈنک مارے ہوئے بھی کئی لوگ دکھ درد میں مبتلا رہتے ہیں۔ مگر ان کی بھی پیدائش کی اصل حقیقت پر اگر قرآن کریم کی روشنی میں غور کیا جائے تو معلوم ہو جاتا ہے کہ یہ مخلوق انسان کو دُکھ دینے کے لئے نہیں پیدا کی گئی بلکہ یہ انسانی ارتقاء کے دَوروں کی ابتدائی کڑیاں ہیں جن میں سے زمین گذری ہے۔ اور اُس زمانہ کی یادگار ہیں۔ جب کہ زمین پر ان رینگنے والوں کی ہی کثرت تھی۔ اور یہ انسان کے بے دام خادم اشرف المخلوقات وجود یعنی "آدم" کی آمد سے قبل فضا کو صاف کرنے اور زمین کو نرم کرنے اور اس پر "جھاڑو" دینے میں مصروف تھے۔ اور جب یہ اپنی پیدائش کی اصل غرض کو پورا کر چکے تو ان کا وجود آہستہ آہستہ کم ہونا شروع ہو گیا۔ مگر اللہ تعالےٰ نے ان کو بالکل مٹنے بھی نہیں دیا۔ تا کہ اوّل، انسان کو یاد رہے کہ کس ادنیٰ حالت اور تمدن سے اس نے ترقی کی ہے۔ اور کن خطرناک دَوروں میں سے گذر کر اس نے ارتقاء کی ابتدائی کڑیوں کو مکمل کیا ہے۔ اور دوسرے اس لئے کہ یہ مخلوق اب بھی بیماری وغیرہ میں انسان کی خدمت کر سکے یعنی

؎ اسلام مسئلۂ ارتقاءِ حیوانی کا اِس رنگ میں قائل نہیں جس میں ڈارون اور اُن کے ساتھیوں نے اسے پیش کیا ہے۔ مگر یہ حقیقت ہے کہ انسان نے جو شروع سے انسان ہی تھا ادنےٰ حالت سے اعلیٰ کی طرف ارتقائی ترقی ضرور کی ہے۔ یہ ارتقاء ہر مخلوق میں ہوا ہے مگر اس طرح نہیں کہ ایک جنس سے دوسری جنس نکلی ہو۔ بلکہ ہر جنس کا ارتقاء الگ الگ تھا۔ جیسا کہ قرآن کریم سے ثابت ہے۔ منہ

علاج میں کام آسکے۔

چنانچہ سانپ کا زہر اب باقاعدہ طور پر ڈاکٹری میں استعمال ہونا شروع ہو گیا ہے
بمبئی میں ایک بہت بڑی لیبارٹری ہے جو SNAKE VENOM تیار کرتی ہے۔
بعض امراض مثلاً مرگی، جوڑوں کے درد، دمہ ...... وغیرہ کے لئے اس زہر کے
ٹیکے لگائے جاتے ہیں۔ پھر ایک خاص قسم کا سانپ جس کا زہر انسانی خون کو منجمد کر کے
فوراً ہلاک کر دیتا ہے۔ اس کے زہر سے ایک خاص مرض (HAEMO-PHILIA) کا
جس میں معمولی زخم سے بھی خون بند نہیں ہوتا اور انسان جریانِ خون سے ہلاک ہو جاتا
ہے علاج کیا جا رہا ہے۔ گویا خون کو گاڑھا کر دینے والا سانپ کا زہر جو زید کے لئے
مہلک تھا وہی بکر کے لئے جس کو haemophilia کا مرض تھا تریاق اور رحمت
بن گیا۔ الحمد للہ۔ اور امید ہے کہ جوں جوں علم حقائق الاشیاء میں ترقی ہوگی اور
امراض میں بھی یہ زہر استعمال ہونے لگیں گے۔

بچھو وغیرہ کے زہر میں بھی کئی فوائد ہوں گے مگر افسوس ابھی تک ان کی طرف
محققین کی توجہ نہیں ہوئی۔ جب ریسرچ شروع ہو گئی تو دنیا دیکھ لیگی ہر ایک رینگنے والا
جانور انسان کے لئے رحمت کا فرشتہ بن کر دنیا میں پھر رہا ہے نہ کہ عزرائیل کا آلہ ایذا
اور موت۔ اور ان کی پیدائش نہ صرف اللہ تعالیٰ کی صفتِ رحمانیت کے منافی نہیں
بلکہ الٹا اس کی حمد ثابت کرتی ہے۔

(س) حشرات الارض نحل، مچھر، مکھی وغیرہ کے فوائد۔

اسی طرح حشرات الارض یعنی شہد کی مکھی، مچھر اور گھریلو مکھی وغیرہ بھی تو بعض دفعہ انسان کے لئے دکھ درد کا موجب ہوتے ہیں اور امراض پھیلاتے ہیں مگر ان کی
پیدائش کی حقیقت پر بھی اگر باریک غور کیا جائے تو ثابت ہو جاتا ہے کہ یہ مخلوق
بھی مفید ہی ہے۔ اور اس کی موجودگی اللہ تعالیٰ کی صفتِ رحمانیت کو باطل نہیں
کرتی بلکہ اس کو ثابت کر کے حمد کے قابل بنا دیتی ہے۔ مثلاً نحل (شہد کی مکھی) کے
ڈنک سے ایک خاص زہر نکالا جاتا ہے جس کو BEE-TOXIN کہتے ہیں۔ اس زہر کا
ٹیکہ کرتے اور مرہم بنا کر مالش بھی کرتے ہیں۔ اس کا استعمال خاص کر RHEUMATISM

دکھنٹھیا، اور جوڑوں کے درد وغیرہ میں مفید ثابت ہوا ہے جس کے لیے مریض کو شہد کی مکھی کے ڈنک لگوائے جاتے ہیں۔

(۴) مچھر سے علاج برسات میں رات کو مچھر سب کو تنگ کرتے ہیں اور بعض اقسام ملیریا بھی پھیلاتی ہیں۔ جس سے ہزاروں لوگ بخار میں مبتلا ہو کر فوت بھی ہو جاتے ہیں۔ مگر یہی مچھر ہیں کہ مصنوعی طور پر اُن کے پیٹ میں ملیریا کے جرم پال کر انسان کو بعض دیگر امراض میں لڑائے جاتے ہیں تاکہ اس کو شفا ہو چنانچہ ایک خطرناک اعصابی مرض G. P. I. والے مریض کو مچھر سے کٹوا کر مصنوعی طور پر ملیریا بخار چڑھایا جاتا ہے تاکہ اس کو اِس موذی مرض سے نجات ملے۔ پس اللہ تعالیٰ نے مچھر کو اس لئے نہیں پیدا کیا کہ وہ ملیریا پھیلا کر انسانوں کو ہلاک کرے بلکہ اس کو کسی اَور اہم اور مفید غرض کے لیئے پیدا کیا گیا ہے جس کا ابھی انسان کو علم نہیں ہوا۔ اللہ ان کا دائرۂ عمل بستیوں سے باہر نشیب والی مرطوب جگہوں اور دلدلوں میں ہے۔ انسان اگر حفظانِ صحت کے اصول کی خلاف ورزی کر کے اُن کے دائرۂ عمل میں داخل ہو کر بیمار ہوتا ہے تو یہ اس کا اپنا فعل ہے جس کی ذمہ داری اُس کے سر پر ہے۔ اللہ تعالیٰ کی صفتِ رحمانیت پر اس سے حرف نہیں آسکتا۔ بلکہ وہ تو رحم کر کے آئے دن ملیریا کے علاج کے لئے نئی نئی ادویہ ایجاد کراتا رہتا ہے جس کے لیے ہم کو اُس محسن حقیقی کا شکریہ ادا کرتے ہوئے اس کی حمد بیان کرنی چاہیئے۔

مکھی کے فوائد مکھی بھی برسات کے دنوں میں خصوصاً بہت دق کرتی ہے۔ اور کئی امراض ہیضہ، محرقہ، اسہال، پیچش وغیرہ بھی پھیلاتی ہے۔ اور مکھی کے بچے (کیڑے) بھی کوڑے کے ڈھیروں، باسی کھانوں اور زخموں میں پڑ جاتے ہیں۔ جن کو دیکھ کر گھن آتی ہے۔ مگر ان سب بے لطفیوں اور تکالیف کے باوجود مکھی اور اس کے بچے بھی کسی مفید غرض کے لئے برسات میں نازل کئے جاتے ہیں۔ اوّل مکھی اور کیڑے قدرت کے خادم ہیں جو کہ غلاظت وغیرہ کو کھانے کے لئے جو برسات میں خصوصیت سے زیادہ متعفن ہو جاتی ہے پیدا کئے جاتے ہیں۔ پھر مکھی اگر کسی متکبر انسان کے چہرہ پر بار بار بیٹھ کر اور اس کی کوشش کے باوجود وہاں سے نہ ہٹ کر اگر اس کے غرور کو نہ توڑ سکے تو اتنا فائدہ تو ضرور ہو جاتا ہے کہ برسات میں

جب انسان پر سستی اور کسل طاری رہتا ہے اس کی ورزش ہی ہو جاتی ہے۔

مگر انسان کھانے کو ڈھانپ کر رکھے۔ باورچی خانہ اور پاخانوں کی صفائی کا خیال رکھے تو مکھی کے ضرر سے بہت حد تک بچ سکتا ہے۔ اور اب تو D.D.T. کی ایجاد مکھی کو نیست و نابود کر رہی ہے۔

(۶) مکھی کے کیڑوں سے علاج مکھی کے بچے (کیڑے) بھی بہت مفید ہیں بیشک زخموں کے اندر ان کو رینگتے اور پلتے دیکھ کر گھن آتی ہے اور نازک طبائع پر یہ منظر ناگوار ہو جاتا ہے۔ مگر کیا آپ کو معلوم ہے کہ یہی کیڑے زخم کو صاف کر رہے ہوتے ہیں۔ چنانچہ پچھلی جنگ عظیم میں کئی زخمی سپاہی جن کے گھاؤ بہت گہرے تھے مگر ان کو طبی امداد جلد نہ پہنچ سکی۔ ان کے زخموں کو جب دیکھا گیا تو معلوم ہوا کہ وہ کیڑوں سے بھرے پڑے ہیں۔ مگر جب ان کو ہٹا کر زخم کی تہ پر نظر ڈالی تو اس میں بجائے پیپ اور گند کے سرخ رنگ کا "انگور" پیدا ہو رہا تھا۔ یہ قدرت کا کام تھا جو حقیر مکھی کے بچوں سے لیا گیا۔ اب اس جنگ میں تو باقاعدہ مکھی کے کیڑوں سے گندے زخموں کا علاج کیا جا رہا ہے۔ اس فن کو MAGGOT — THERAPY کہتے ہیں۔

ایسے حیرت انگیز قدرت کے کام دیکھ کر بھی کیا کوئی کہہ سکتا ہے کہ اللہ تعالےٰ نے مکھیوں کو بے فائدہ یا انسان کو دکھ دینے کے لئے پیدا کیا ہے۔ ہرگز نہیں۔ بلکہ ادنیٰ فکر سے کام لینے والا انسان بھی یہ دیکھ کر پکار اٹھتا ہے کہ الحمد للہ رب العٰلمین۔ ما خلقت ھٰذا باطلاً۔

(۷) تپ دق کے جراثیم کا فائدہ تپ دق یا سل کا مرض بھی دنیا میں بہت سی تکلیف، دکھ درد اور ہلاکت کا باعث ہے۔ ہزاروں نوجوان مرد اور عورتیں ہر سال اس موذی مرض کا شکار ہو جاتے ہیں۔ اور یہ ایسا خطرناک مرض ہے کہ جس گھر میں ایک دفعہ داخل ہو جائے سارے کنبہ کو ہی تباہ کر کے دم لیتا ہے۔ مگر اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ یہی ٹی بی (T.B. یعنی تپ دق کا جرم) دنیا میں بہت سی رحمتوں اور برکتوں کا موجب بھی ہے اور یہی اس کی پیدائش کی اصل غرض تھی نہ کہ لوگوں کی جوانا مرگ۔ اس اجمال

کی تفصیل یہ ہے کہ دُنیا میں لاکھوں بڑے بڑے ذکی، فہیم اور قابل انسان ہیں اور ہزاروں بڑے بڑے ریفارمر، موجد، سیاح، ریسرچ ورکرز، سیاست دان، پولیٹکل لیڈر وغیرہ جو ہو چکے ہیں یا موجود ہیں۔ ان سب کی ذہانت، فہم، قابلیت اور دماغی جوہر کا باعث یہ تپ دق کا مہلک جرم ہی ہے۔ تحقیقات سے معلوم ہوا ہے کہ یہ سب لوگ تپ دق کا اثر بچپن میں لے کر مرض کو دبانے میں کامیاب ہو چکے ہوتے ہیں۔ چنانچہ اکثر ذکی لوگوں کی وفات کے بعد جب اُن کے پھیپھڑوں کو کاٹ کر معائنہ کیا گیا تو ان میں مندمل شدہ تپ دق کے زخم کے آثار [illegible] گو زندگی میں وہ تپ دق کا شکار نہ ہوئے تھے یا خفیف حملہ ہو کر بچ گئے تھے۔

پس اللہ تعالےٰ نے T.B. کو اس لئے نہیں پیدا کیا کہ وہ انسانوں کو ہلاک کرے بلکہ اس کی پیدائش کی اول حقیقی اور اصلی غرض یہ تھی کہ دُنیا میں اس کی برکت سے مایۂ ناز اور قابلِ فخر ہستیاں پیدا ہوں اور دُنیا روحانی اور مادی دونوں لحاظ سے ترقی کرے۔ اگر کوئی شخص اپنی بے اعتدالیوں، بدپرہیزیوں یا لاعلمی کی وجہ سے اپنے جسم کو کمزور کر کے اس مفید جرم کو بلکہ انسان کے دوست کو مضر اور اپنا دشمن بنا لیتا ہے تو یہ اُس کا اپنا فعل ہے اس سے اللہ تعالےٰ کے رحم پر کوئی حرف نہیں آسکتا۔ بلکہ وہ تو حمد کے قابل ہے جس نے اس میں شفا کی صفت بھی رکھی ہے۔ چنانچہ ٹیوبرکیولین (TUBERCULIN.) جو کہ T.B. کا جوہر ہے۔ کئی امراض میں دی جاتی ہے۔ مثلاً دمہ، جوڑوں کا درد، چھلے کا بخار وغیرہ۔ اور خود مرض سل کا علاج سل کے جرم سے ہی کیا جاتا ہے۔

(۸) آفاتِ سماوی برق رعد اور زلازل

آفاتِ سماوی مثلاً برق (بجلی) رعد (کڑک) اور زلازل (بھونچال) بھی دُنیا میں کافی تباہی کا باعث ہوتے ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ بارش رحمت اور برکت کا موجب ہے لیکن اس کے ساتھ بجلی جو چمکتی ہے اور صاعقہ جو گرتی ہے اس سے کئی جانیں تلف ہو جاتی ہیں۔ اور جائیدادوں اور اموال کو آگ لگ کر لاکھوں روپوں کا نقصان ہو جاتا ہے۔ بجلی کی چمک سے رحم مادر میں بچوں کو اور ایسا ہی بعض پودوں کو نقصان پہنچنے کا خطرہ ہوتا ہے مگر ان سب

تباہیوں کے باوجود برق کا وجود ہی کئی لحاظ سے مفید، رحمت کا موجب، اور حمد کا باعث ہے۔ بجلی انسان اور اس کے اموال کو ہلاک تو کبھی کبھی کرتی ہے مگر یاد رہے کہ وہ انسان کی زندگی کے لئے وہ مفید کام ہر لحظہ کر رہی ہوتی ہے جو باریک اور غیر مرئی ہونے کی وجہ سے انسان کو نظر نہیں آتا۔ اس لئے وہ کبھی کبھی نقصان کو دیکھ کر جو نمایاں اور محسوس صورت میں ہوتا ہے پکار اُٹھتا ہے کہ یہ کیا ظلم ہو رہا ہے۔ واضح ہو کہ یہ برق ہی کی برکت ہے کہ ہم پر بادلوں سے مینہ برسایا جاتا ہے اگر بجلی نہ ہوتی تو سحاب کے باریک دُخانی ذرات کبھی بھی آبی صورت اختیار نہ کرتے۔ یعنی بخارات جو گیس کی شکل میں ہوتے ہیں ان کے ذرات میں بجلی کی رو پیدا کر کے آپس میں ملا کرنمی پیدا کی جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جتنی زیادہ بجلی چمکے اتنے ہی بادل زیادہ برستے ہیں۔ پھر برق کا ایک اور فائدہ یہ ہے کہ اس سے ہوا کے اندر جو باریک گرد و غبار اور دھواں وغیرہ ہوتے ہیں ان کو آپس میں ملا کر بوجھل کر کے نیچے گرا دیا جاتا ہے اور اس طرح فضا گرد و غبار سے پاک ہو جاتی ہے۔ بڑے بڑے صنعتی شہروں میں بھی بجلی کے ذریعے کارخانوں کے دھوئیں سے ہوا کو اسی اصول پر صاف کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ اس کے علاوہ بجلی اس لحاظ سے بھی رحمت اور حمد کا موجب ہے کہ اس کے شراروں سے لاکھوں جراثیم کو جو کئی مہلک امراض پیدا کر سکتے ہیں ہلاک کر کے وباؤں کو دور کیا جاتا ہے۔ اسی طرح فضا میں ملی ہوئی کئی زہریلی گیسوں کو بھی برق بے ضرر بنا دیتی ہے۔ پھر برق کی چمک سے فضا میں OZONE (اوزون) بھی پیدا کی جاتی ہے جو صحت کے لئے مفید اور ضروری ہے۔ غرضیکہ اسی طرح کے کئی مفید کام ہیں جو برق غیر محسوس طور پر کرتی رہتی ہے۔ جن کی برکت سے انسان کئی طرح کے ضرر، وباؤں اور امراض سے بچ جاتا ہے۔ اسی واسطے اللہ تعالیٰ نے اپنے کلام حکیم میں بھی فرما دیا تھا۔ کہ "ھو الذی یریکم البرق خوفاً وطمعاً وینشئ السحاب الثقال۔ یعنی اللہ وہ ذات پاک ہے جو تم پر بجلی نازل کرتا ہے جس میں نقصان ہے مگر تمہارے فائدہ کے پہلو بھی ہیں۔ اور پیدا کرتا ہے بوجھل بادل" فائدہ (طمع) زیادہ ہے اور نقصان (خوف) کم۔ مگر خوف کو مقدم اس لئے کیا ہے کہ نقصان موٹی اور نمایاں شے تھی۔ اور طمع (فائدہ) باریک اور غیر محسوس تھا۔

(۹) رعد کے فوائد

رعد (کڑک) بھی بہت ہیبت ناک شے ہے جس کی خوفناک آواز سے انسان خوف کے مارے کانپ اٹھتا ہے اور بعض دفعہ نازک اندام لوگوں کے کان کے پردے بھی دھماکے سے پھٹ جاتے ہیں۔ بعض کمزور بچے کڑک سے فوت بھی ہو جاتے ہیں۔ پس کڑک بھی اپنی زبردست لہروں (Vibrations) کی وجہ سے کم مہلک نہیں۔ مگر اس کے باوجود کڑک مینہ اور رحمت کا باعث بھی ہے۔

کیونکہ یہ رعد کی ہی برکت ہے کہ اس کی تیز رفتار لہروں سے کئی جرمز جو فضا میں پائے جاتے ہیں اور برق کی آگ سے کسی طرح بچ جائیں ہلاک کیا جاتا ہے۔ چنانچہ تجربہ سے معلوم کیا گیا ہے کہ اگر کسی چھوٹے کیڑے کے پاس آواز کی تیز لہریں پیدا کی جائیں تو وہ مر جاتا ہے۔

ممکن ہے کہ کڑک میں اور بھی فوائد ہوں جن کا ابھی تک ہم کو علم نہیں ہو سکا۔ پس ثابت ہوا کہ کڑک بھی انسان کی خادم اور اس کے لئے نافع وجود ہے جس کے لئے ہم کو اپنے خالق حقیقی کا شکریہ ادا کرنا اور حمد بیان کرنی چاہیئے۔ نہ کہ نادانی سے اعتراض۔ قرآن کریم فرماتا ہے وَيُسَبِّحُ الرَّعْدُ بِحَمْدِهٖ کہ رعد بھی پکار پکار کر کہہ رہا ہے کہ میرا وجود بھی میرے خالق کی حمد کا موجب ہے۔ پس تم میرے شور کو دیکھ کر اس کی سبوحیت پر اعتراض نہ کرنا۔ کیونکہ میں خود تم کو فائدہ پہنچا کر اس کی پاکیزگی کا ثبوت دے رہی ہوں یعنی عملی تسبیح کر رہی ہوں۔

(۱۰) زلازل کے فوائد

بلاشبہ دنیا میں زلزلوں سے بھی بہت ہلاکت ہو رہی ہے۔ ایک سیکنڈ کے اندر اندر ہزاروں لاکھوں قیمتی جانیں ہلاک ہو جاتیں اور کروڑوں روپیہ کے اموال تباہ ہو جاتے ہیں۔ اور یہ عجیب بات ہے کہ انبیاء علیہم السلام جو دنیا کے لئے رحمت اور برکت بن کر آتے ہیں ان کے زمانہ میں خصوصیت سے زلزلوں کے ذریعے تباہی زیادہ ہوتی ہے جس سے اللہ تعالیٰ کی صفت رحم بادی النظر میں مشتبہ ہو جاتی ہے۔ لیکن اگر زلزلوں کی تاریخ اور ان کی ہستی کے اصل مقصد اور ان کی پیدائش کے حقیقی مدعا کو مدنظر رکھا جائے تو روز روشن کی طرح واضح ہو جاتا ہے کہ یہ موذی اور مہلک زلازل بھی انسان کے لئے بہت مفید ہیں اور اللہ تعالیٰ کی حمد کا موجب ہیں۔ یہ زلازل کی ہی برکت ہے کہ دنیا آج اپنی موجودہ شکل میں انسان کے لئے مفید بنی ہوئی ہے یعنی رہائش کے قابل ہموار اور پرسکون ہے۔ اس کے علاوہ زمین کی [illegible]

زلازل کی وجہ سے ہی ہے۔ واضح ہو کہ کرۂ ارض اوائل میں جب سورج سے الگ ہوا تو یہ آگ کا گولہ تھا۔ جو تیزی سے حرکت کر رہا تھا۔ پھر زبردست دھماکوں اور زلزلوں کے ذریعہ زمین نے اپنی اندرونی حرارت کو منتشر کیا۔ بخارات بنے جن سے بارشیں ہوئیں۔ اور زمین کے اندر وادیاں، پہاڑ، دریا، ندی، نالے، سمندر وغیرہ بن گئے۔ اور زمین ٹھنڈی اور پُرسکون ہو کر انسان کی رہائش کے قابل ہوئی۔ پس یہ زلازل اللہ تعالیٰ نے اس لئے نہیں بنائے کہ وہ ہم کو ہلاک کریں بلکہ اس لئے بنائے تھے کہ وہ انسان کی خدمت کریں۔ پھر اب بھی زلازل انسان کو خاموش اور غیر محسوس طور پر نفع پہنچانے میں لگے ہوئے ہیں جو انسان کو نظر نہیں آتے۔ اس لئے جب کبھی زلزلہ محسوس طور پر آتا ہے تو وہ پکار اُٹھتا ہے کہ یہ مہلک وجود ہے۔ حالانکہ یہ زلزلوں کی اس مسلسل خاموشی اور غیر مرئی خدمت کا ہی نتیجہ ہے کہ زمین کی زرخیزی قائم رہتی ہے اور اس کے قیام کی صورت بنی رہتی ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ انبیاء علیہم السلام کے زمانہ میں جو کہ دُنیا کے لئے سراسر رحمت ہوتے ہیں زلزلے کثرت سے آتے ہیں۔ نہ اس لئے کہ دُنیا ہلاک ہو بلکہ اس لئے کہ اس کے قیام کی صورت پیدا ہو۔ اور اس کی عمر کو لمبا کیا جائے۔

زلازل سلسلہ پر دُنیا کا قیام

واضح ہو کہ زمین پر ہلکے۔ غیر محسوس زلزلے قریباً ہر روز آتے رہتے ہیں جو کسی طرح کا نقصان نہیں پہنچاتے۔ بلکہ جھٹکا تک محسوس نہیں ہوتا۔ البتہ آلۂ مقیاس الزلازل (SEISMOGRAPH) ان کو محسوس کر کے ہم کو بتاتا رہتا ہے۔ چنانچہ ریکارڈ سے پتہ چلتا ہے۔ کہ ہر سال کم و بیش ۸۰۰ زلزلے زمین پر آتے ہیں جو خاموشی سے اپنا مفید کام کرتے رہتے ہیں۔ مگر دُنیا کو زیر و زبر کر دینے والا زلزلہ تو اوسطاً ۵-۱۰ سال میں ایک بھی نہیں آتا۔ جس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ زلازل کی اصل غرض مفید ہے۔ یہ زلزلے زمین کے ذرات میں باریک لہریں پیدا کر کے نچلے طبقات کو اُوپر لاتے رہتے ہیں جس سے زمین کی سطح کا وہ حصہ جو بار بار کی کھیتی باڑی سے کمزور ہو چکا ہوتا ہے نیچے چلا جاتا ہے اور نچلا حصہ جو بوجہ تازہ اور معدنی اجزاء سے لبریز ہونے کے زرخیز ہوتا ہے اُوپر آجاتا ہے اور اس طرح زمین کی طاقت کو از سرِ نو تازہ کر کے دُنیا کی عمر لمبی کی جاتی ہے۔ اب بتاؤ کیا آپ کو پسند ہے کہ یہ چھوٹے زلازل کا سلسلہ بند ہو کر ساری دُنیا پر فاقوں کی

نوبت آجائے یا یہ بہتر ہے کہ یہ سلسلہ جاری رہے۔ اور کبھی کبھی اللہ تعالیٰ کی باریک حکمتوں کے ماتحت مہلک زلزلہ بھی آجائے۔ کیونکہ سوال قانون کا ہے اور اعتراض بھی قانون پر کرنا ہوگا۔ اللہ تعالیٰ نے زلازل کا سلسلہ قانونِ طبعی کے ماتحت انسان کی بہتری کے لئے اپنی صفتِ رحیمیت کے ماتحت جاری کیا ہوا ہے۔ اور اگر کبھی کبھار اس طبعی قانون کی زد میں کوئی شہر یا بستی آجائے تو اس سے قانون کو بُرا نہیں کہا جاسکے گا۔ ہاں یہ الگ سوال ہے کہ کسی خاص بستی کو ہلاکت کے لئے کیوں چُنا جاتا ہے یا بیگناہوں کو اس کا بدلہ کس طرح ملیگا۔ اِن سب کا کافی اور شافی جواب بھی قرآن کریم نے دیا ہے۔ مگر اِس جگہ اِس بحث کی گنجائش نہیں۔

پس زلازل کا نفع چونکہ بہت زیادہ اور عالمگیر ہے اور نقصان نسبتاً کم کبھی کبھار اور محدود ہے اس لئے ہم بالوثوق کہہ سکتے ہیں کہ زلازل کا سلسلہ اللہ تعالیٰ کی حمد کا موجب ہے۔ اور ہم کو اس کی تسبیح بیان کرنی چاہیئے نہ کہ نادانی سے اعتراض۔

"بے فایدہ" اشیا کے بعض باریک فوائد!

دہریوں کا صفتِ حکیم پر اعتراض

دہریوں کا ایک اور اعتراض یہ ہے کہ تمہارے خدا نے بعض اشیا اور انسانی جسم کے بعض اعضا بے فائدہ اور عبث بنائے ہیں جس سے وہ حکیم ہستی نہیں کہلاسکتا۔ مثلاً دُنیا میں لاکھوں ٹن پیداوار (نباتاتی اور حیوانی) ضائع ہوجاتی ہے۔ مچھلیوں اور مینڈکوں کے کروڑوں انڈے ضائع چلے جاتے ہیں۔ پہاڑ کی چوٹیوں پر بُوٹیاں ہر سال اُگ کر فنا ہوجاتی ہیں جہاں کوئی اُن کو دیکھنے والا بھی نہیں ہوتا۔ خود جسمِ انسانی میں بعض ایسے اعضا ہیں جو نہ صرف بالکل بے فائدہ اور محض اس کی ارتقائی پیدائش کی یادگار ہیں بلکہ وہ کئی امراض کا موجب بھی ہورہے ہیں جس سے بعض دفعہ ہلاکت بھی ہوجاتی ہے۔ مثلاً اپنڈکس ہے یا لوزتین (ٹانسل) ہیں۔ غرضیکہ اس طرح کے کئی واقعات ہیں جو ثابت کرتے ہیں کہ اس کارخانۂ عالم کا چلانے والا کوئی علیم و خبیر اور حکیم خدا نہیں بلکہ اندھی نیچر ہے جس کے اندازے غلط ہوکر نامذ اشیاء بیج رہتی ہیں

اس کے برخلاف ہمارا قرآن یہ تعلیم دیتا ہے کہ اس دُنیا کا خالق اللہ تعالےٰ ہے جو حکیم ہے اور دُنیا میں کوئی شے بھی بے فائدہ یا زائد نہیں۔ ہر شے انسان کے فائدہ کیلئے ہے اور اندازہ کے مطابق نازل کی جاتی ہے۔ جیسے فرمایا ان من شیء الا عندنا خزائنه وما ننزله الا بقدر معلوم۔ پھر فرماتا ہے۔ خلق لکم ما فی الارض جمیعًا۔ کہ ہم نے ہر اُس شے کو جو زمین پر ہے تمہارے ہی فائدے کے لئے پیدا کیا ہے۔ لکم کا لام یہاں پر لام نافعیہ ہے۔ جس کے معنے نفع دینے کے ہیں۔ اگر کہا جائے کہ اس بات کا ثبوت کیا ہے کہ ہر شے انسان کے نفع کے لئے ہے۔ تو اس کا جواب یہ ہے کہ یہ انسان کا کام ہے کہ کوشش کر کے ہر شے کا نفع معلوم کرے۔ اگر اس کو بعض اشیا کا نفع معلوم نہیں ہو سکا تو اس کے معنے یہ نہیں کہ وہ بے فائدہ ہیں کیونکہ عدم علم سے عدم وجود شے لازم نہیں آتا۔ چنانچہ جوں جوں ترقی ہو رہی ہے بعض بظاہر بے فائدہ اشیا کے فوائد بھی معلوم ہو رہے ہیں۔ جو کہ پہلے بالکل حقیر بے فائدہ اور زائد بلکہ مضر خیال کی جاتی ہیں۔ جیسا کہ ذیل کی تشریح سے واضح ہو گا۔

دوسری عالمگیر جنگ (۱۹۳۹-۴۵ء) کی عظیم ترین رحمت اور برکت

پینی سیلین (PENICILLIN.)

(۱) پھپھوندی (ڈُلّی) کے فوائد پینی سیلین جنگِ عظیم نمبر ۲ کی سب سے بڑھ کر مفید ایجاد ہے۔ جس نے ماڈرن سرجری کی کایا ہی پلٹ دی ہے۔ یہ اس ایجاد کی ہی برکت ہے کہ توپوں بموں اور مشین گنوں سے پھٹے ہوئے زخمی اور جلے ہوئے سپاہی آجکل ایک دو ہفتہ کے قلیل عرصہ میں چلنے پھرنے کے قابل ہو جاتے ہیں جو پچھلی جنگ میں ۲-۳ ماہ سے زائد بستر پر کراہتے رہتے تھے۔ اور کئی زخموں کے زہر سے فوت ہو جاتے یا ہمیشہ کے لئے ناکارہ ہو جاتے تھے۔ مگر جانتے ہو پینی سیلین کیا چیز ہے اور کس طرح حاصل کی جاتی ہے۔ اس کا اصل کوئی قیمتی چیز نہیں بلکہ نہایت ہی معمولی، حقیر اور عام شے ہے جو ہر جگہ نمودار ہوتی ہے۔ اور کئی دفعہ کوڑے میں پھینک دی جاتی اور

حرارت سے مسل دی جاتی ہے۔ یہ وہ پھپھوندی ہے جس کو پنجابی میں اُلّی کہتے ہیں۔ جو برسات کے موسم میں عموماً باسی روٹی یا چمڑے کی اشیاء پرانے بوٹوں سوٹ کیسوں وغیرہ پر نمودار ہو جاتا ہے۔ جس کو انگریزی میں F U N G U S کہتے ہیں۔ یہی فنگس فیملی پینی سیلین کی ماں ہے۔ جس کے پیٹ میں یہ قیمتی جوہر صدیوں تک پوشیدہ رہا اور آخر فلوری (F L O R E Y) اور فلیمنگ نے میکائیل کی تحریک سے جو اُن کے دماغ پر اللہ تعالےٰ نے مخلوق پر رحم کر کے نازل کی اس کو تیار کر کے یہ ابر رحمت، یہ انمول موتی اور تریاق دُنیا کو پیش کیا۔ یہ ہمارے خالق کا ہم پر بے نظیر احسان ہے جو کہ اس نے ہم پر کیا۔ اور جس سے اس کے پاک کلام کی تصدیق بھی ہو گئی کہ ہر شے انسان کے فائدے کے لئے بنائی گئی ہے۔

نوٹ:- پینی سیلین گو اکثر جراثیم کو آناً فاناً ہلاک کر دیتی تھی مگر بعض جراثیم اس کے دائرۂ ہلاکت سے بھی باہر رہ جاتے تھے۔ مگر اب معلوم ہوا ہے کہ امریکہ میں ایک نئی دوائی STREPTO-MYCIN ایجاد ہو رہی ہے جو پینی سیلین کی اس کمی کو پورا کر دیگی۔ یہ نئی دوائی بھی فنگس فیملی کا ہی جوہر ہے۔ الحمد للہ

ٹانسل (لوزتین) (TONSILS) اور اپنڈکس کے فوائد

(۲) جسمِ انسانی کے زائد اعضاء

کہا جاتا ہے کہ انسانی جسم کے اندر بعض زائد اعضاء رکھ دیئے گئے ہیں جو نہ صرف بے فائدہ ہیں بلکہ بیماری کر کے دُکھ درد اور بعض دفعہ موت کا موجب ہوتے رہتے ہیں۔ مثلاً اپنڈکس۔ لوزتین وغیرہ۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ اعضاء امراض کا موجب ضرور ہیں۔ مگر اس کا مطلب یہ نہیں کہ یہ زائد یا بے فائدہ ہیں۔ یوں تو امراض کا موجب انسان کا ہر عضو ہے۔ کیا انسانی آنکھ، ناک، کان وغیرہ دُکھ درد کا موجب نہیں ہیں؟ تو کیا وہ سب بے فائدہ اور زائد ہیں اور ان کو نکلوا دینا چاہیئے؟ ہرگز نہیں۔ اسی طرح اپنڈکس اور لوزتین وغیرہ کی پیدائش بھی انسان کے فائدہ کے لئے ہے نہ کہ دُکھ دینے کے لئے۔ یہ الگ بات ہے کہ کسی وجہ سے یہ امراض میں مبتلا بھی ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ تجربہ سے معلوم ہوا ہے کہ اپنڈکس بھی بالکل بے فائدہ یا زائد نہیں ہے بلکہ

بھی فوائد ہیں۔ گو وہ بہت باریک ہیں لیکن ضرر چونکہ نمایاں ہے اس لئے لوگوں کو اعتراض سوجھتا ہے۔ پس یہ کہنا غلط ہے کہ اپنڈکس کٹوا دینے کے بعد یا لوزتین نکلوا دینے کے بعد کوئی خاص ضرر نہیں پیدا ہوتا یا انسان کسی خیر سے محروم نہیں ہو جاتا۔ کیونکہ تجربہ سے معلوم ہوا ہے کہ جن لوگوں کے اپنڈکس نکال دیئے گئے۔ گو ان کو عارضی طور پر آرام ضرور ہو گیا مگر اُن کے ہاضمہ میں اور چستی وغیرہ میں فرق ضرور پڑ گیا تھا۔ اسی طرح لوزتین نکال دینے کے بعد بعض بچوں کے (خصوصاً جن کا مزاج خنازیری ہو) گلے میں گلٹیاں یعنی کنٹھ مالا ہو جاتا ہے۔ جو کہ بعض دفعہ دق کا پیش خیمہ ہو جاتا ہے۔ کیونکہ لوزتین قدرت کا ایک عجیب فلٹر ہے جو ہر قسم کے جراثیم اور غلاظت وغیرہ کو جو مُنہ کے راستے پیٹ یا سینے میں داخل ہونا چاہیں روک لیتا ہے۔ چنانچہ غلاظت خور جانوروں سُؤر وغیرہ میں دیکھا گیا ہے کہ اُن کے گلے میں لوزتین بہت بڑے اور گول چکر کی صورت میں ہوتے ہیں جن میں سے فلٹر ہو کر غذا اندر جاتی ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ دوسرے قیمتی اعضاء کی طرح لوزتین اور اپنڈکس کو بھی بیماری کی وجہ سے بعض دفعہ نکالنا ضروری ہوتا ہے مگر صرف اس لئے کہ یہ زائد اور بے فائدہ ہیں فیشن کے طور پر ان کو کٹواتے چلے جانا جیسا کہ انگلستان وغیرہ ممالک میں رواج ہو رہا ہے (گویا یہ بھی ختنہ ہے جو صحت کے لئے ضروری ہے۔) سخت حماقت اور جہالت کا خیال ہے۔ جس سے زندہ اور دانشمند قوم کو بچنا چاہیئے۔ اور ان نام نہاد مہذب اقوام کی تقلید کو چھوڑ کر قرآن کریم کی روشنی میں ہر بات کو دیکھنا چاہیئے۔ کیونکہ ہم کو اللہ کا کلام اور اس کے پاک رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا اُسوہ حسنہ کافی ہے۔

کان کی میل، پیشاب، پاخانہ، بلغم وغیرہ کے فوائد

(۴۳) جسم انسانی کے فضلات

انسان کو احسن تقویم پر پیدا کیا گیا ہے اس لئے کہ اس کے تمام اعضاء ضروری اور مفید ہیں۔ اور نہ صرف اعضاء مفید ہیں بلکہ جسم کے فضلات اور رطوبتیں جو ردی اور مضر سمجھی جاتی ہیں ان کے اندر بھی فوائد ہیں۔ چنانچہ کان کی میل جو ایک بے حقیقت اور حقیر شے ہے اس کا بھی استعمال آنکھ کی بعض بیماریوں میں کیا گیا ہے۔ پھر کیا کان کی میل کا یہ کوئی کم

فائدہ ہے کہ اِس سے کان میں کُھجلی ہوتی ہے اور انسان جب کان کو کُھجاتا ہے تو اس طرح بالواسطہ کان کے پردہ کی مالش بھی ہوجاتی ہے۔ جو اُس کو چُست رکھنے کے لئے ضروری ہے۔

(۴) پیشاب بھی ایک نجس اور ردی شئے ہے۔ مگر کیا آپ کو معلوم ہے کہ تازہ پیشاب بہترین انٹی سپٹک اور زخموں کے لئے مفید لوشن ہے۔ چنانچہ ختنے کا زخم جو بہت کم خراب ہوتا ہے اور جلدی مندمل ہوجاتا ہے اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ اس کو تازہ پیشاب لگتا رہتا ہے جو کہ مضر نہیں بلکہ مفید ہے۔ دیہاتی لوگوں کو جب کوئی زخم آجائے تو وہ اس پر گرم گرم پیشاب کر دیتے ہیں جو دانائی ہے۔ بعض مُلکوں میں مُرغوں کی لڑائی میں جب اُن کی کلغی کو زخم آئے تو پیشاب لگاتے ہیں۔ اس کے علاوہ حاملہ کا پیشاب بھی بہت مفید ہے اور اس کا انیمہ (حقنہ) جوان کنواری لڑکیوں کی بعض اندرونی امراض کا علاج ہے۔ آجکل حاملہ گھوڑیوں کے سیرم (SERUM.) سے بعض مخصوص صنفی ہارمون (HORMONE) نکالے جاتے ہیں جن کے ٹیکے بانجھ پن اور رحم کی دیگر امراض کے لئے مفید ثابت ہو رہے ہیں۔ یہی جوہر حاملہ کے پیشاب میں بھی خارج ہوتا رہتا ہے۔ پیشاب کے ایک سالٹ یوریا (UREA) سے زخموں کا علاج اب شروع ہوگیا ہے۔

۵۔ پاخانہ بھی ایک فضلہ اور نجس شئے ہے۔ مگر اس کے بھی بعض اجزاء طب میں استعمال ہوسکتے ہیں۔ یونان کی طب کی پُرانی کتب میں بعض قرصوں کا ذکر ملتا ہے جن میں پاخانہ کا جزو ہوتا ہے۔ شاید پت (BILE SALTS) کے بعض صفراوی اجزا جگر کی امراض میں مفید ہوں۔

انسانی فضلات بول و براز وغیرہ کا کھاد میں استعمال تو ایک موٹی شئے ہے۔ یہ وہی بدبودار، حقیر اور نجس چیز ہوتی ہے جسکو قدرت ہم کو خوشنما، تازہ اور انواع واقسام کی سبزیوں ترکاریوں کی صورت میں واپس دے دیتی ہے۔ گویا پُرانی شراب کو نئی بوتلوں میں نئے لیبل لگا کر لوٹا دیا جاتا ہے۔ . . . .

. . . .

. . . .

پیپ (ویکسین) سے علاج

(۶) پیپ، بلغم وغیرہ کے فوائد پھر تندرستی والے فضلات کے علاوہ جسم انسانی کے بعض وہ فضلات جو بیماری میں جسم سے خارج ہوتے ہیں مثلاً زخموں کی پیپ بلغم وغیرہ بھی مفید ہیں۔ ویکسین سے علاج جو کیا جاتا ہے وہ بھی پیپ اور بلغم وغیرہ سے ہی بنائی جاتی ہے۔ قرآن کریم نے بھی اس طرف رہنمائی کر دی ہے۔ فرماتا ہے لَا یَذُوْقُوْنَ فِیْھَا بَرْدًا وَّلَا شَرَابًا اِلَّا حَمِیْمًا وَّغَسَّاقًا۔ جَزَآءً وِّفَاقًا۔[۱] یعنی دوزخیوں کو جہنم میں کوئی سرد یا مزیدار چیز پینے کو نہ ملیگی۔ بلکہ گرم پانی اور زخموں کا دھوون (پیپ) بطور علاج بالمثل کے پینے کو دیا جائے گا۔ پھر فرماتا ہے وَیُسْقٰی مِنْ مَّآءٍ صَدِیْدٍ یَّتَجَرَّعُہٗ وَلَا یَکَادُ یُسِیْغُہٗ[۲] یعنی دوزخیوں کو گرم پانی یا گاڑھی پیپ دی جائیگی۔ جس کو وہ گھونٹ گھونٹ پئیں گے۔ اس میں ویکسین، سیرم اور بیکٹروفیج سے علاج بتایا گیا ہے۔ نیز یہ بھی بتا دیا کہ ویکسین کا علاج کس طرح کرنا ہوگا۔ اور گھونٹ گھونٹ کے لفظ میں اشارہ کر دیا کہ تھوڑی تھوڑی مقدار میں مقررہ وقفہ کے بعد باقاعدگی سے ٹیکہ کیا جائے۔ کیونکہ گھونٹ میں ہمیشہ تھوڑی مقدار منہ میں لی جاتی ہے۔ اور وقفہ کے بعد وہی چیز بار بار پی جاتی ہے۔ قرآن کریم نے آج سے ۱۳۵۰ سال قبل جب کوئی ان چیزوں کا نام بھی نہ جانتا تھا اس عظیم الشان طریقِ علاج کی طرف اشارہ فرما دیا۔ جو اس کی صداقت کا زندہ نشان بن رہا ہے۔

اسی طرح بلغم، پیشاب، پاخانہ وغیرہ سے بھی جراثیم الگ کر کے ویکسین بنائی جاتی ہے جس کے ذریعے سے اُسی جرم کا ٹیکہ لگایا جاتا ہے۔ جو مرض کا باعث ہو۔ اور اس طرح گویا بیماری کے ہی مختلف اجزا اور کیڑے کے لعابوں سے علاج کیا جاتا ہے۔ ان کے علاوہ بطور حفظِ ماتقدم کے بھی کئی ویکسین دی جاتی ہیں۔ مثلاً چیچک، ہیضہ، محرقہ، پلیگ، زرد بخار، نمونیہ، مالٹا فیور، خناق، وبائی انفلوانزا وغیرہ کے ٹیکے جن سے

---

[۱] سورۂ نبا۔ [۲] سورۂ ابراہیم۔

لاکھوں کروڑوں انسان ہر سال موت کے پنجے سے چھڑا لئے جاتے ہیں۔ یہ اس بات کا بین ثبوت ہے کہ انسانی جسم کا ذرہ ذرہ مفید اور ضروری ہے بلکہ انسان تو ایسا قیمتی وجود ہے کہ نہ صرف زندگی اور بیماری میں بلکہ مرنے کے بعد بھی اس کا جسم زندوں کے کام آسکتا ہے۔ گویا انسانی لاش بھی زندوں کے لئے رحمت بن سکتی ہے۔

مُردہ انسان کے خون، جلد، ہڈیوں اور قرنیہ (آنکھ) وغیرہ سے علاج

(۷) نافع النّاس مُردے موجودہ جنگ میں کثرت کے ساتھ زخمیوں کے جسم میں خون داخل کرنے کی ضرورت تھی۔ اسی طرح ہوائی جہازوں میں بُری طرح جلے ہوئے ہوابازوں کے زخموں کو مندمل کرنے کے لئے پرائی جلد (چمڑے) کی ضرورت پڑتی رہی ہے۔ جب زندہ انسانوں کے خون اور جلد سے یہ بڑھتی ہوئی ضرورت پوری نہ ہو سکی تو ماہرین کے دل میں مُردہ انسان کے خون اور جلد کو استعمال کرنے کا خیال پیدا ہوا۔ چنانچہ روس میں کثرت سے تازہ مُردوں کا (جو اتفاقی حوادث سے اچانک فوت ہو گئے تھے۔) خون اکٹھا کر کے بلڈ بنک بنایا گیا۔ اور وسیع پیمانہ پر یہ خون زخمی فوجیوں کو دیا گیا ہے۔ اسی طرح اب انگلستان میں مُردوں کا تازہ چمڑا (جلد) جلے ہوئے اعضاء کو گرافٹ کرنے کے لئے استعمال ہونے لگ گیا ہے۔ بلکہ اب تو اندھوں کو بھی مصنوعی آنکھیں دی جا رہی ہیں۔ یعنی جو لوگ قرنیہ (کارنیہ) کی سفیدی (پھولا) کی وجہ سے اندھے ہو جاتیں اُن کی آنکھ کی سفیدی کاٹ کر اس کی جگہ کسی تازہ مُردے کا قرنیہ احتیاط سے بٹھا کر سی دیا جاتا ہے جو بالکل جزوِ بدن ہو کر قدرتی آنکھ کا کام دے رہا ہے۔ اسی طرح شکستہ ہڈیوں کے اندر بھی مُردے کی ہڈی کا گرافٹ ڈال کر اُس کو مضبوط کر دیا جاتا ہے۔ شاید بعضوں کو حیرت ہو کہ مُردہ کا زندوں سے کیا تعلق کہ مُردہ ذرات زندے کا جُزوِ بدن بن جائیں۔ یہ بات عقل نہیں مانتی۔ اس لئے اس طریق علاج کی ذرا وضاحت کر دیتا ہوں۔

جسم کا نظام واضح ہو کہ موت دو قسم کی ہے۔ ایک تو جسم کی موت ہے (SOMATIC) اور دوسری ذرّات کی موت (MOLECULAR.) جسم کی موت کے یہ معنی نہیں ہوتے کہ رُوح کے پرواز کرتے ہی جسم کے تمام ذرات

اور مُردہ ہو جاتے ہیں۔ بلکہ اس کا مطلب صرف یہ ہوتا ہے کہ دورانِ خون بند ہے۔ اور اعضاء کا مرکز سے تعلق قطع ہو کر جسم کا نظام درہم برہم ہو گیا ہے۔ یعنی نظام طبعی دماغ وغیرہ کا تعلق قلب سے نہیں رہا۔ اور قلب کا تعلق جوارح سے نہیں رہا۔ کیونکہ یہ کام صرف رُوح ہی کر سکتی ہے۔ مگر منفرد طور پر ہر ایک عضو اور ذرّات زندہ ہوتے ہیں۔ چنانچہ موت کے بعد قوتِ حارّہ کا مرکز زندہ ہوتا ہے جس سے جسم کئی گھنٹے گرم رہتا ہے۔ اسی طرح سر کے بال بھی بڑھتے رہتے ہیں اور قلب، جگر، گُردے وغیرہ سب کے ذرّات (CELLS) کام کرتے رہتے ہیں۔ مگر بغیر کسی نظام یا مرکز سے تعلق کے۔ اور یہ زندگی ایسی ہی ہے جیسے کہ کسی شاخ کو درخت سے الگ کر لیا جائے تو وہ چند گھنٹے تک خشک نہیں ہوتی۔ یا کوئی پھُول درخت سے الگ ہو کر بھی تھوڑی دیر کے لئے تازہ رہتا ہے۔ یا جس طرح مثلاً پانی کو آگ پر تپایا جائے تو آگ بُجھ جانے کے بعد بھی وہ کئی گھنٹے گرم رہتا ہے۔ اسی طرح رُوح کی گرمی رُوح کے پرواز کر جانے کے بعد بھی جسم کو گرمائے رکھتی ہے۔ اور مختلف اعضاء کم و بیش عرصے تک اس عارضی زندگی کا اظہار کر سکتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ نرم اعضاء میں سے قلب اور اس کے بعد رحم سب سے آخر یعنی چند ہفتوں تک قبر میں رہ کر ذرّات کی موت مرتا ہے[1]۔ ذرّات کی یہ زندگی گو عارضی ہوتی ہے لیکن اگر ان اعضاء مثلاً خون، جلد، ہڈی، کرنیہ وغیرہ کو ذرّات کی موت وارد ہونے سے قبل کسی دوسرے نظام یعنی زندہ انسان کے ساتھ منسلک کر دیا جائے تو وہ اُس کا جزوِ بدن بن کر ہمیشہ کے لئے زندہ ہو جاتے ہیں۔

ایک روحانی سبق اِس میں زندہ قوموں کے لئے ایک روحانی سبق بھی ہے۔ کہ زندگی درحقیقت نام ہے مرکز اور انتظام سے وابستگی کا۔ نظام کے باہر جو زندگی ہوگی وہ خواہ کتنی ہی خوشنما ہو، ہوگی عارضی ہی پس ضروری ہے کہ ہر فرد نظام سے وابستہ ہو۔ جب بھی کسی کا نظام سے یا مرکز سے تعلق قطع ہو جائے تو وہ جلد ہی دوبارہ تعلق قائم کرے ورنہ دیر لگانے سے اگر ذرّات کی روحانی موت بموجب

[1] حضرت مسیح موعود علیہ السلام نے بھی کئی جگہ تحریر فرمایا ہے کہ رُوح کا تعلق ۴۰ دن تک قبر سے رہتا ہے اسی واسطے قبر پر ۴۰ دن تک میت کے لئے دُعا کرنا مسنون ہے۔ منہ

فرمودہ یتوبون من قریب) ہوگئی تو تعلق قائم کرنا بے سود ہوگا۔ یعنی توبہ گناہ کے بعد تو بہ جلدی کرنی چاہیئے اور نظام سلسلہ جو بھی سزا دے اس کو خوشی سے برداشت کرنا چاہیئے اور تعلق قطع نہیں کرنا چاہیئے۔

ہاں میں یہ بتا رہا تھا کہ دُنیا میں کوئی شے باطل پیدا نہیں کی گئی اور انسانی جسم کا کوئی حصہ بھی زائد یا بے فائدہ نہیں۔ اور نہ صرف جسم کے اعضاء، اس کے فضلات حتیٰ کہ پیپ اور بلغم وغیرہ بھی۔ بلکہ اب تو مُردے کے اعضاء بھی کارآمد اور مفید ثابت ہو رہے ہیں۔ جس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ قرآن کریم کا یہ فرمان کہ خلق لکم مافی الارض جمیعاً برحق ہے اور خداوند علام الغیوب کا فرمودہ بھی۔

پیداوار کا ضیاع اور بعض بظاہر لغو کام

دہریوں کا ایک یہ بھی اعتراض ہے کہ دُنیا میں بہت سی مخلوق پیدا کر کے یونہی ضائع کر دی جاتی ہے۔ مثلاً مچھلیوں، مینڈکوں اور دیگر آبی جانوروں کے لاکھوں من انڈے سمندر میں پڑ کر ضائع ہو جاتے ہیں۔ پرندوں کے بھی لاکھوں انڈے اور بچے تلف ہو جاتے ہیں۔ حیوانات اور انسان کے نطفہ میں کروڑوں حیواناتِ منویہ ہوتے ہیں۔ جن میں سے صرف ایک "کدح" کر کے نسل کو چلاتا ہے اور باقی سب ضائع ہو جاتے ہیں۔ سمندر کی سطح پر بارش نازل کی جاتی ہے۔ گویا آبِ مقطر کو نمکین پانی سے ملا کر لغو کام کیا جاتا ہے۔ (نعوذ باللہ)۔ اسی طرح بلند پہاڑوں کی چوٹیوں پر نباتات پیدا کر کے اُن کو ضائع کیا جاتا ہے۔ کیونکہ وہاں کوئی مخلوق نہیں جو ان کو کھا سکے۔ وغیرہ وغیرہ۔

(۸) انڈوں اور بچوں کا ضیاع

اس میں کوئی شک نہیں کہ بہت سی مخلوق ہم کو ایسی نظر آ رہی ہے جو بظاہر کسی کام نہیں آتی اور یونہی ضائع ہو جاتی ہے۔ مگر کیا اس کے یہ معنے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی نگاہ میں بھی وہ ضائع ہو جاتی ہے۔ اگر انسان اپنی لاعلمی سے اس سے فائدہ نہیں اٹھاتا تو کیا اللہ تعالیٰ بھی اس کو کسی کام نہیں لا سکتا۔ دنیا میں مخلوق کی پیدائش کی غرض صرف نسل چلانا ہی نہیں بلکہ اور بھی کئی مفید مادی اور روحانی اغراض ہیں۔ مثلاً کچھ جانور ملاحظہ

کے انڈے بلکہ بیج اور غلّہ، پھل وغیرہ انسان اور حیوانات کی خوراک بھی ہیں۔ کیونکہ نسل چلانے کے لئے تو بہت کم مقدار کافی تھی۔ فرض کرو دُنیا میں گیہوں اتنا ہی پیدا کیا جاتا جتنا کہ اس کی جنس کو قائم رکھنے کے لئے ضروری تھا یعنی موجودہ مقدار کا کروڑواں حصّہ تو اس کا نتیجہ یہ ہوتا کہ تمام دُنیا فاقوں سے مرجاتی۔ آخر یہ غلّہ، دالیں وغیرہ اجناس کیا ہیں؟ اپنی اپنی جنس کا بیج ہی تو ہیں جو انسان اور حیوان کھا جاتے ہیں۔ اور جو بیج جاتا ہے وہ آئندہ فصل کے کام آجاتا ہے۔ یہی حال حیوانات کا ہے۔ اور آبی جانوروں کو بھی اِسی پر قیاس کر لو۔ مثلاً جو لاکھوں کروڑوں انڈے سمندر میں تیر رہے ہوتے ہیں اُن میں سے قلیل حصّہ مچھلیوں کی نسل کو جاری رکھنے کے لئے ہوتا ہے اور باقی کثیر حصّہ دوسری مچھلیوں کی خوراک بن جاتا ہے۔ پس ضیاع کس طرح ہوُا؟۔ یہی حال انسان اور حیوان کے نطفہ کا ہے کہ ایک قلیل حصّہ سے نسل جاری رکھی جاتی ہے اور باقی کثیر حصّہ تقویت کے لئے کسی اور طرح کام آجاتا ہے۔ پھر اِس تکثیر کی ضرورت اس لئے بھی تھی کہ بقائے اصلح کے قانون کے ماتحت اعلیٰ ترین وجود کو نسل چلانے کا موقع دیا جائے اور دماغی ارتقاء کا عمل جاری رہے۔

انسان کے پیٹ کے اندر چکدو دانے، ملپ اور چھوٹے وغیرہ ہوتے ہیں اُنکے بھی انڈے بڑی کثرت کے ساتھ پاخانہ میں نکلتے رہتے ہیں۔ مگر ان میں سے اکثر ضائع ہو جاتے ہیں اور بہت کم کو اپنی نسل چلانے کا موقع ملتا ہے۔ اگر فرض کرو ایک کرم ایک ہی انڈہ دیتا اور وہ مہینہ میں ایک دفعہ پاخانہ میں نکلتا تو بتاؤ مرض کی تشخیص کس طرح ہو سکتی تھی؟ اب تو یہ سہولت ہے کہ جس دن اور جس وقت بھی چاہو مریض کے پاخانہ کا قلیل ترین حصّہ بھی لے کر خوردبین کے نیچے رکھ کر دیکھ لو تو درجنوں انڈے نظر آجاتے ہیں کیونکہ وہ لاکھوں کی تعداد میں روزانہ نکلتے ہیں۔ پس یہ بھی اِس کثرت کا ایک ضمنی فائدہ ہے۔

(۹) سمندر پر بارش

سمندر میں بارش برسانے میں بظاہر کوئی فائدہ نظر نہیں آتا مگر اس کی وجہ یہ ہے کہ معترض نے یہ فرض کر لیا ہے کہ بارش کا کام صرف یہ ہے کہ زمین کو سیراب کیا جائے جس سے کھیتی باڑی ہو۔ اور جانداروں کے لئے پانی مہیا ہو سکے۔ یہ ظاہر ہے کہ سمندر میں پانی برسانے سے یہ غرض پوری نہیں ہو سکتی۔ مگر

بارش کے دیگر فوائد بھی ہیں جن کے حصول کے لئے سمندر پر بارش برسانا پُرحکمت کام بن جاتا ہے۔ مثلاً بارش کی ایک ضرورت یہ بھی ہے کہ اس سے فضا کو پاک وصاف کیا جائے اور ہوا میں جو بخارات کی زیادتی (HUMIDITY) ہوتی ہے اس کو کم کر کے موسم کو خوشگوار بنایا جائے۔ اگر لمبے عرصہ تک بارش نہ ہو تو ہوا میں کئی طرح کے گرد وغبار کے ذرات، زہریلی گیسیں اور دُھواں وغیرہ مل جاتا ہے جو کہ پہلی بارش میں ہی گھل مل کر زمین پر واپس آجاتا ہے۔ جس سے فضا صاف اور صحت افزا ہو جاتی ہے۔ اگر یہ سوال ہو کہ سمندری فضا کی صفائی کس کے لئے کی جاتی ہے۔ کیا آبی جانوروں اور مچھلیوں کے لئے؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ اُن انسانوں کے لئے اس صفائی کی ضرورت ہے جو ہزاروں لاکھوں کی تعداد میں ہر روز دُخانی جہازوں اور ہوائی جہازوں میں سفر کر کے سمندروں کو پار کر رہے ہوتے ہیں۔ ممکن ہے سمندروں کے مکینوں کے لئے بھی بارش مفید ہو مگر اس بارے میں ابھی مجھے تحقیقات کرنے کا موقع نہیں ملا۔

(۱۰) پہاڑ کی چوٹیوں پر بوٹیاں

بلند پہاڑوں کی بالائی چوٹیوں پر جو بوٹیاں اُگتی ہیں اور جن کو کھانے والا تو درکنار اُنکے جوبن کو دیکھ کر لُطف اُٹھانے والا بھی کوئی نہیں ہوتا! وہ بھی بہر حال مفید ہیں۔ گو بالعموم انسان اُن تک پہنچ نہیں سکتے مگر آجکل ہوائی جہازوں کے زمانہ میں یہ امر بعید از امکان نہیں رہا کہ کسی دن انسانوں کو ان بوٹیوں کو استعمال میں لانا پڑے۔ ممکن ہے عام حالات میں کوئی ہواباز یا مسافر ان چوٹیوں پر اُترنا ضروری خیال نہ کرے۔ لیکن فرض کر و اگر کوئی جہاز کسی نقص کے باعث کسی بھی بلند چوٹی پر گر پڑے یا ان کو پیراشوٹ کے ذریعے کسی دن مجبوراً وہاں اُترنا پڑے تو اُس دن وہ بوٹیاں اُن کی خوراک بن جائیں گی۔ اور اِس طرح وہ بھی اشرف المخلوقات انسان کے (جو کہ عبودیت کے بعد ابدی زندگی کے لئے پیدا کیا گیا ہے) دل و دماغ کا جُزو بنکر خود بھی ابدی زندگی حاصل کر لیں گی۔ اور ان کی پیدائش کی غرض بھی جس کے لئے وہ صدیوں سے جھانک جھانک کر دیکھ رہی تھیں آخر ایک دن پوری ہو جائے گی۔ فتبارک اللہ احسن الخالقین۔

پس ثابت ہوا کہ اللہ تعالےٰ نے ہر شے انسان کے فائدہ کے لئے پیدا کی ہوئی ہے۔ اور کائناتِ عالم کا ذرّہ ذرّہ انسان کی خدمت کے لئے لگا ہوا ہے۔ اور اسی طرح ...

قرآن کریم کے سچے فرمان کی ہر لمحہ تصدیق کر رہا ہے کہ ربنا ما خلقت ھذا باطلاً سبحانک فقنا عذاب النار - (آل عمران آخری رکوع)

اتفاقی حوادث، امراض، دُکھ، درد وغیرہ کا فلسفہ

اللہ تعالےٰ کی صفتِ رحیمیت پر ایک اور پہلو سے بھی اعتراض کیا جاتا ہے۔ اور وہ دُنیا میں امراض، دُکھ، درد وغیرہ کے سلسلہ کی وجہ سے ہے۔ اِس میں شک نہیں کہ موذی اشیاء، سمیات وغیرہ سے بڑھ کر مصائب دُنیا میں امراض کی وجہ سے ہیں۔ پس ضروری ہے کہ امراض کی پیدائش کے فلسفہ پر بھی روشنی ڈالی جائے۔ تاکہ اللہ تعالےٰ کا منور چہرہ بغیر کسی شک و شبہ کے دُنیا کو دکھایا جا سکے۔ واللہ الموفق۔

قرآن کریم نے اِس اعتراض کا جواب بہت ہی حکیمانہ الفاظ میں دیا ہے۔ فرماتا ہے:-

"وَمِنْ اٰیٰتِہٖ خلق السمٰوٰت والارض وما بثّ فیھما من دآبۃ۔ وھو علیٰ جمعھم اذا یشاء قدیر۔ وَمَا اصابکم من مصیبۃ فبما کسبت ایدیکم۔ ویعفو عن کثیر (شوریٰ ع۳)

ترجمہ:- اور اللہ تعالےٰ کے انعامات اور فضلوں میں سے آسمانوں اور زمین کی پیدائش بھی ہے اور ان تمام جانداروں کی بھی جو ان دونوں کے درمیان ہیں۔ اور وہ قادر ہستی جب چاہے اِن سب کو اکٹھا کر سکتی ہے۔ اور جب کبھی بھی تم کو کوئی دُکھ درد یا تکلیف آتی ہے تو وہ تمہارے اپنے ہی کئے کا پھل ہوتا ہے۔ باوجودیکہ وہ (اللہ تعالےٰ) تمہاری غلطیوں کے مضر نتائج پر ہمیشہ پردہ ڈالتا رہتا ہے۔" دوسرے الفاظ میں اِس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالےٰ نے سورج، چاند، ستارے اور آسمان اور زمین اور جو مخلوق بھی ان دونوں کے درمیان ہے ان سب کو انسان کی خدمت کے لئے پیدا کیا ہے۔ لیکن اگر وہ ان سے اپنی لاعلمی کی وجہ سے فائدہ نہیں اُٹھاتا یا اپنی غفلت کی وجہ سے ان کا غلط استعمال کر کے کبھی نقصان یا دُکھ اُٹھاتا ہے تو یہ اس کی اپنی غلطی ہے۔ اللہ تعالےٰ تو کئی دفعہ انسان کی غلطیوں کے مضر نتائج کو دبا دیتا ہے۔ گویا جب کبھی انسان کو کوئی دُکھ پہنچتا ہے تو وہ اللہ تعالےٰ کے کسی فعل کی وجہ سے نہیں پہنچتا بلکہ

اس کی اصل وجہ یہ ہوتی ہے کہ انسان بعض دفعہ قوانینِ نیچر کی خلاف ورزی کر بیٹھتا ہے جن کو اللہ تعالیٰ نے اس کے فائدہ کے لیئے بنایا ہے۔

اتفاقی حوادث کے متعلق تو سمجھنا نسبتاً آسان ہے کہ یہ قانونِ طبعی کی خلاف ورزی کا نتیجہ ہوتے ہیں۔ مثلاً آگ میں اللہ تعالیٰ نے جلانے کی صفت رکھی ہے تا کہ انسان کھانا پکا سکے اور سردیوں میں آگ تاپ سکے لیکن اسی آگ کے غلط استعمال سے آدمی اور مکانات بھی جل جاتے ہیں۔ لیکن امراض کا معاملہ ذرا دقیق ہے اس سلئے اُنکا فلسفہ مکمل بیان کر دیتا ہوں۔

قوتِ مؤثرہ اور متاثرہ

واضح ہو کہ امراض بھی انسان کی اُن دو طاقتوں کے غلط استعمال کا نام ہے جن کو اللہ تعالیٰ نے انسان کے فائدہ اور اُس کی ترقی کے لیئے بنایا ہے۔ یعنی قوتِ مؤثرہ (اثر ڈالنا) اور متاثرہ (اثر قبول کرنا) یہ دونوں قوتیں ہر انسان میں کم و بیش فطرتاً پائی جاتی ہیں اور انسان کی تمام ترقی اِن دونوں طاقتوں کے صحیح اور مناسب استعمال یعنی اُن کے عمل اور ردِ عمل کی وجہ سے ہی ہے۔ اگر یہ دونوں طاقتیں انسان میں نہ ہوتیں تو انسان انسان نہ ہوتا پتھر کا بُت ہوتا۔ یہ قدرت کا عام قانون ہے کہ انسان اپنے ماحول پر اثر ڈالتا ہے اور اپنے گرد و پیش کے حالات سے متاثر بھی ہوتا ہے۔ اور جب کبھی اس اثر لینے اور ڈالنے کے فعل میں وہ کمی یا زیادتی کر کے قدرت کے قوانین کی خلاف ورزی کر بیٹھتا ہے تو اس پر کسی مرض کا حملہ ہو جاتا ہے۔ یا کسی اور طرح کا دُکھ پہنچ جاتا یا نقصان ہو جاتا ہے گویا کہ اللہ تعالیٰ نے مرض کو پیدا نہیں کیا بلکہ اس قانونِ قدرت کو بنایا ہے جو انسان کی ترقی کا جزوِ لاینفک ہے اور اسی قانون کی خلاف ورزی کا نام بیماری یا دُکھ درد ہے۔ اور چونکہ یہ قانون اپنی ذات میں اللہ تعالیٰ کی صفتِ رحمانیت کا نتیجہ ہے اس لئے محض اس وجہ سے کہ اِس قانون سے لاعلمی یا خلاف ورزی بیماری پیدا کر سکتی ہے اللہ تعالیٰ کی ذات پر کوئی اعتراض نہیں ہو سکتا۔ بیماری کا کوئی مستقل وجود نہیں کیونکہ یہ کسی مثبت حالت کا نام نہیں بلکہ یہ نفی کی حالت ہے۔ پس اللہ تعالیٰ نے مرض پیدا نہیں کیا بلکہ صحت اور اس کے قوانین کو بنایا ہے جو کہ مثبت ہے۔ اور بیماری عدمِ صحت کا نام ہے جو نفی کی حالت ہے۔ اور یہ نفی بندے کے فعل کا

نتیجہ ہے اس لئے بیماری بندے کی طرف منسوب ہوگی نہ کہ اللہ تعالےٰ کی طرف۔ جس طرح اللہ تعالےٰ نے روشنی پیدا کی ہے جو ایک مستقل وجود اور مثبت حالت کا نام ہے۔ اس لئے اندھیرا پیدا نہیں کیا۔ اندھیرا عدم روشنی کا نام ہے جس کا کوئی مستقل وجود نہیں۔ اور عدم چونکہ بندے کے فعل کا نتیجہ ہوتا ہے اس لئے اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب نہ ہوگا۔ مثلاً دن کے وقت اگر کوئی شخص دروازے بند کرکے بیٹھ جائے۔ تو اندھیرا ہو جائے گا جس کا ذمہ وار وہ خود ہوگا نہ کہ اللہ تعالےٰ جو روشنی کا خالق ہے۔ اس اصولی جواب کی روشنی میں اب ہم ذرا تفصیل سے دیکھتے ہیں کہ امراض کے اسباب کیا ہیں اور کس حد تک اس میں بندے کے فعل یا عدم فعل کا دخل ہے۔ اور قدرت کس کس طرح انسان کی مدد کرکے پردہ پوشی کرتی اور ہلاکت سے بچاتی رہتی ہے۔

امراض کے اصولی اسباب

اصولی طور پر امراض کے تمام اسباب چار موٹے موٹے حصوں میں تقسیم کئے جا سکتے ہیں:-

(۱) بیرونی چوٹ، جسمانی اور دماغی صدمات وغیرہ۔
(۲) جسم کی رطوبتوں، معدنیات، ہارمون وغیرہ کی مقدار میں کمی یا بیشی۔
(۳) پیدائشی روگ، ورثہ اور جنم کے نقائص وغیرہ۔
(۴) جراثیم، کیڑوں، فنگس وغیرہ کا حملہ۔

(۱) اتفاقی حوادث کا فلسفہ

سب سے پہلے ہم اتفاقی حوادث، بیرونی چوٹ وغیرہ کو لیتے ہیں۔

ہم دیکھتے ہیں کہ آئے دن ایسے واقعات ہوتے رہتے ہیں کہ بعض معصوم لوگ اتفاقاً زخمی ہو جاتے ہیں اور ہفتوں بستر پر پڑے تڑپتے رہتے یا فوت ہو جاتے ہیں۔ حالانکہ انہوں نے کسی طبعی قانون کی خلاف ورزی نہیں کی ہوتی۔ مثلاً ایک شخص بازار سودا لینے جاتا ہے اور وہ ایک گلی میں سے گذرتا ہے جہاں مکان بن رہا تھا۔ اور ایک بڑی اینٹ اتفاقاً اس کے سر پر آگرتی ہے جس سے اس کی کھوپڑی زخمی ہوکر خون بہت زیادہ بہہ جاتا ہے اور سر کی ہڈی شکستہ ہو کر دماغ کو داب لگ جاتی ہے اور وہ ایک ہفتہ بے ہوش

رہ کر فوت ہو جاتا ہے۔ اب کیا یہ ظلم نہیں کہ ایک بے گناہ شخص جس نے کسی طبعی یا شرعی قانون کی خلاف ورزی بھی نہ کی تھی مہلک حادثہ کا شکار ہو گیا۔ اس کا جواب یہ ہے کہ اس ظلم کی ذمہ واری اللہ تعالےٰ پر نہیں ہے۔ اور اگر کسی پر ہے تو قانون قدرت پر ہے مگر یہ قانون چونکہ انسان کے فائدہ کے لئے بنایا گیا ہے اس لئے اس کی ذمہ واری کسی پر بھی نہیں۔ اور یہ محض اس شخص کی بدقسمتی ہے کہ وہ قانونِ طبعی کی زد میں اتفاقاً آگیا۔ یا اللہ تعالےٰ کی کوئی باریک حکمت اس کو وہاں لے آئی۔ باقی رہا یہ سوال کہ چوٹ سے دکھ درد یا موت کیوں ہوئی؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ وہی قانونِ طبعی جو انسان کے فائدہ کے لئے بنایا گیا تھا اس کی خلاف ورزی تکلیف اور دکھ کا موجب ہوئی۔ اگر یہ کہو کہ انسان پر چوٹ کا اثر نہ ہوتا تو اس کے یہ معنے تھے کہ قانونِ قدرت کو تبدیل کر دیا جاتا۔ مثلاً انسانی جسم چوٹ کا اثر کیوں قبول کرتا ہے۔ اوّل اس لئے کہ بعض اشیاء میں اللہ تعالےٰ نے سختی رکھی ہے مثلاً اینٹ، پتھر، لوہا وغیرہ۔ دوسرے اس لئے کہ اشیاء کا وزن ہوتا ہے یعنی کشش ثقل جس کی وجہ سے وہ زور سے گر کر صدمہ پہنچاتی ہیں۔ تیسرے اس لئے کہ انسان کی جلد کو قدرت نے نرم بنایا ہے جو چوٹ سے پھٹ جاتی ہے۔ چوتھے اس لئے کہ خون دورہ کرتا ہے اور اس کی رگوں کے کٹ جانے سے جریانِ خون ہوتا ہے۔ پانچویں اس لئے کہ ہڈی کو قدرت نے سخت بنایا ہے جو چوٹ کا مقابلہ کر کے ٹوٹ جاتی ہے۔ چھٹے اس لئے کہ دماغ کو نرم بنایا گیا ہے اور وہ چوٹ سے جلد متورم ہو جاتا ہے۔ پس چوٹ کا اثر قبول نہ کر سکنے کے یہ معنے تھے کہ ان وجوہات کو مٹا دیا جاتا خواہ مستقل طور پر یا عارضی طور پر۔ گویا دوسرے لفظوں میں اس کا مطلب یہ بنتا ہے کہ اللہ تعالےٰ بعض اشیاء میں سختی نہ رکھتا۔ یعنی اینٹ، پتھر، لوہا وغیرہ سخت نہ ہوتے۔

قانونِ قدرت میں تبدیلی کے نتائج

بے شک اگر یہ اشیاء نرم ہوتیں تو چوٹ تو نہ لگتی لیکن ساتھ ہی دنیا کا کارخانہ بھی بند ہو جاتا۔ کیونکہ بعض اشیاء کی سختی بھی رحمت ہے۔ ورنہ نہ مکان بنتے نہ فرنیچر اور نہ آلات وغیرہ۔ دوسری وجہ چوٹ کی یہ بھی کہ اشیاء کا وزن ہے۔ اگر اللہ تعالےٰ اشیاء میں وزن نہ رکھتا تو اس کے معنے یہ تھے کہ کشش زمین و ثقل [illegible] موجب

کبھی پتھر پڑھکتا وہ ہوا میں معلق رہ جاتا اور چوٹ نہ آتی۔ اب بتاؤ کیا کشش ثقل رحمت ہے یا نہیں؟ اور کیا اس کا مٹا دینا زیادہ ظلم ہے یا کبھی کبھار کسی کے سر کا اس کشش کی وجہ سے زخمی ہو جانا۔ یقیناً کشش زمین کا نہ ہونا بہت سی تکالیف کا موجب ہوتا۔

تیسری وجہ یہ ہے کہ قدرت نے جلد کو نرم بنایا ہے اس لئے وہ زخمی ہو جاتی ہے اب اس کو بدلنے کے معنے یہ ہیں جلد پتھر کی طرح سخت ہوتی۔ تو اس طرح بے شک چوٹ تو نہ لگتی لیکن بتاؤ کیا ایسی جلد ہمارے لئے کسی سُکھ کا موجب ہو سکتی تھی؟ اب تو یہ ہے کہ کبھی کبھار زخم سے تکلیف ہو جاتی ہے مگر اس طرح تو انسان ساری عمر ہی اکڑا رہتا۔ چوتھی وجہ یہ تھی کہ خون دَورہ کرتا ہے۔ مگر یہ بھی ضروری تھا کیونکہ اس پر زندگی کا مدار ہے۔ ورنہ اگر خون کا دَورہ بند کر دیا جاتا تو بے شک جریان خون تو نہ ہوتا مگر ساتھ ہی مختلف اعضاء کو خوراک ملنی بند ہو جاتی اور جسم کا نظام جو اب خون کی وجہ سے قائم ہے درہم برہم ہو جاتا۔ پانچویں وجہ یہ ہے کہ ہڈی کو قدرت نے سخت بنایا ہے اس لئے وہ چوٹ سے ٹوٹ جاتی ہے لیکن اگر ہڈیوں کو نرم بنایا جاتا تو بے شک چوٹ سے وہ شکستہ نہ ہوتیں۔ مگر ساتھ ہی انسان کی زندگی کھیل تماشا بن جاتی۔ وہ چل نہ سکتا۔ بلکہ سیدھا کھڑا بھی نہ ہو سکتا۔ کیونکہ ٹانگیں اُس کا بوجھ اُٹھانے کی بجائے خمیدہ ہو کر زمین پر آ لگتیں۔ چھٹے دماغ کا نرم ہونا ہے مگر یہ بھی رحمت ہے۔ ورنہ دماغ بھی اگر سخت ہوتا تو وہ بڑھ نہ سکتا۔ اور سوچ و فکر کے لطیف کام نہ کر سکتا۔

موجودہ قانونِ طبعی ہی رحمت ہے

پس ثابت ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے جس طور پر انسان کو بنایا ہے وہی احسن تقویم ہے اور قانونِ قدرت جس رنگ میں اس پر اثر انداز ہوتا ہے وہی سراسر رحمت ہے اور ہمارے فائدہ کے لئے ہے۔ اور اس قانون کو بدل دینے سے ہر روز ہی ہر انسان دُکھ اور تکلیف میں ہوتا۔ یا پھر وہ پتھر کا بُت ہوتا۔ یعنی نہ قوائین سبعہ ہوتے نہ درد کا احساس ہوتا۔ گویا انسان صُمٌّ، بُکمٌ، عُمیٌ اور مفلوج ہوتا۔ جو نہ دُکھ اُٹھاتا نہ لذت اور سُکھ۔ نہ بیمار ہوتا اور نہ ہی مرتا۔ مگر ظاہر ہے کہ یہ حالت خود بیماری ہوتی بلکہ ابدی موت۔ کیونکہ احساس، حرکت اور ترقی ہی کا نام ابدی زندگی ہے۔ فتبارک اللہ احسن الخالقین۔

جسم کے اجزاء میں کمی بیشی

امراض کا دوسرا اصولی سبب جسم کے اجزاء یعنی ان معدنیات وغیرہ جن سے اس کی ابتداء ہوئی ہے اور جن کو وہ خوراک یا تنفس سے حاصل کرتا ہے کمی یا بیشی ہے۔ مثلاً فولاد، کلسیم، پوٹاسیم، سوڈیم، گندھک، فاسفورس، آیوڈین، مگنیز، آکسیجن، نائیٹروجن، کاربن، نمک، چینی، پانی وغیرہ۔

صحت کا مدار ان سب اجزاء کی ایک مناسب مقدار پر ہے۔ اگر ان میں سے کوئی ایک جزو بھی جسم میں زیادہ ہو جائے یا کم ہو جائے تو اس کا نام بیماری ہے۔

اسی طرح جسم کی بعض رطوبتیں ہیں مثلاً لعاب دہن، معدہ، امعاء اور لبلبہ کی ہاضمہ کی رطوبتیں۔ جگر کا صفرا، پسینہ، بول و براز وغیرہ۔ ان کا بھی مناسب حد تک بہنا یا جسم سے نکلنا ضروری ہے۔ اور کمی بیشی مرض پیدا کر دیتی ہے۔ پھر کئی ہارمون اور ریٹامین ہیں (HORMONES)-(VITAMINES) جن کا مناسب حد تک جسم میں موجود ہونا صحت کے لئے ضروری ہے۔ ان کی کمی بیشی بھی صحت میں فتور پیدا کر دیتی ہے۔

نوٹ:۔ عام طور پر خیال کیا جاتا ہے کہ خوراک کی زیادتی مضر ہے۔ لیکن پانی پر کوئی حد بندی نہیں۔ جتنا پیو صحت کے لئے اچھا ہے۔ چنانچہ اسی خیال کی بناء پر بعض لوگ تعجب سے پوچھا کرتے ہیں، اور بعض مخالف اعتراض بھی کرتے ہیں کہ اسلام نے روزے کی حالت میں پانی پینے سے کیوں منع کیا ہے۔ یہ پابندی بلا وجہ معلوم ہوتی ہے؟

پانی کی زیادتی سے امراض

اس کے متعلق عرض ہے کہ جسم میں پانی پر بھی پورا کنٹرول ہے اور اس کا معین مقدار میں جسم میں داخل ہونا اور خارج ہونا ضروری ہے۔ اگر اس توازن میں کمی بیشی ہو جائے تو انسان بیمار ہو جاتا ہے پس جس طرح جسم میں پانی کی کمی مضر ہے اسی طرح زیادتی بھی مضر صحت ہے۔ چنانچہ مرگی کے متعلق یہ معلوم ہوا ہے کہ اس کا ایک باعث دماغ کے پردوں اور خاص حصوں میں پانی کی زیادتی ہے۔ اسی طرح وسطی کان کی نازک ہڈیوں میں پانی کی زیادتی سے ایک مرض پیدا ہوتا ہے (MEINERS, SYNDROME) جس میں بہت سخت قے ہوتی ہے اور مریض کو چکر آتے ہیں۔ یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ پانی کی زیادتی بھی ...

کا باعث ہے۔ اس لیئے رمضان میں صحت کی بحالی کے لیئے پانی پر پابندی بھی ضروری ہے۔

پھر جس طرح جسم میں پانی کی ایک خاص مقدار کا داخل کرنا صحت کے لیئے ضروری ہے اسی طرح یہ بھی ضروری ہے کہ جسم میں سے پانی متوسط حد سے زیادہ خارج نہ ہو کیونکہ اس طرح بھی پانی کا توازن بگڑ کر DEHYDRATION کا مرض پیدا ہو جاتا ہے جسم میں سے اکثر حصہ پانی کا بول و براز پسینہ اور کچھ حصہ تنفس کے راستے طبعی طور پر خارج ہوتا ہے تجربہ سے معلوم ہوا ہے کہ عام طور پر گو سانس کے راستے جسم کا پانی بہت کم خارج ہوتا ہے لیکن تمباکو نوشی (سگریٹ حقہ وغیرہ) سے اس کی مقدار بہت بڑھ جاتی ہے چنانچہ تمباکو نوشوں کو اسی واسطے پیاس بہت لگتی ہے۔ اور انکا حلق خشک رہتا ہے۔

روزے کی حالت میں تمباکو نوشی کا ضرر

اسلام نے اسی واسطے روزہ کی حالت میں تمباکو نوشی کو جائز نہیں رکھا تاکہ جسم سے پانی بلاوجہ خارج ہو کر صحت پر مضر اثر نہ پڑے[1]۔

تمباکو نوشی اور متعدی امراض

ضمناً میں یہ بھی بتا دوں کہ تمباکو نوشی علاوہ عادت کے علاوہ ایک اور لحاظ سے بھی مضر ہے، جس کا تجربہ اس جنگ میں ہوا ہے اور وہ یہ کہ اس قبیح عادت سے متعدی امراض پھیلتی ہیں۔ یعنی جب تمباکو نوش منہ کھول کر دھواں زور سے باہر نکالتا ہے تو اس کے ساتھ باریک ذرات (DROPLETS) تھوک کے بھی ہوا میں داخل ہو کر منہ کے جراثیم کو منتشر کر دیتے ہیں۔ چنانچہ سرجیکل وارڈوں میں اسی واسطے جب تک مرہم پٹی زخموں کی نہ ہو جائے مریضوں کو سگریٹ نوشی کی اجازت نہیں دی جاتی۔ تاکہ ننگے زخموں کو تھوک کی زہر خراب نہ کر دے۔

ہاں تو میں یہ بتا رہا تھا کہ صحت کا مدار بعض معدنی، نباتی اور حیوانی اجزاء پر ہے۔ جن میں کمی بیشی ہو جانے کا نام مرض ہے۔ اب یہ کھانے پینے کا کام انسان کا اپنا فعل ہر

---

[1] سرجیکل اپریشن سے قبل بھی سگریٹ نوشی نہیں کرنے دیتے۔ کیونکہ اس طرح جسم میں سے پانی خارج ہو کر شاک (SHOCK) زیادہ ہوتا ہے۔ منہ

مگر وہ اس میں کمی بیشی کر کے جسم کے توازن کو بگاڑتا ہے تو اس کا ذمہ دار وہ خود ہے نہ کہ اللہ تعالیٰ جس نے یہ قانون بنایا کہ انسان غذا کا اثر لے اور ترقی کرے۔ انسان کو بعض دفعہ مناسب اور مقوی خوراک ملتی ہی نہیں۔ یا ملتی تو ہے مگر وہ ہضم نہیں کر سکتا۔ یا ہضم تو کر لیتا ہے مگر وہ جذب نہیں ہوتی۔ یا جذب ہو کر جزوِ بدن نہیں بنتی۔ بہرحال کوئی بھی وجہ ہو اس کی ذمہ داری خود انسان پر ہے۔ اگر کہو کہ کیوں نہ ایسا ہوا کہ معدہ کے اندر ایک الارم لگا دیا جاتا۔ تا جب انسان کسی غذا میں زیادتی کرنے لگے یا کوئی غذا کم کھائی جا رہی ہو تو وہ فوراً انسان کو آگاہ کر دیتا اور اس طرح انسان بیمار ہونے سے بچ جاتا۔ تو اس کا جواب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جو دماغ انسان کو دیا ہے اس سے زیادہ حساس ایک دماغ معدہ میں ہوتا جو ہر وقت الارم دینے کا ہی کام کرتا رہتا۔ مگر یہ قدرت کے ساتھ مذاق ہے۔

پیدائشی روگ وغیرہ تیز اصولی سبب امراض کا جسم کے نقائص یعنی پیدائشی روگ اور ورثے کی کمزوریاں اور میلان ہیں یہ بھی بہت سی تکالیف اور دُکھ درد کا موجب ہیں۔ اور اس کے ساتھ ہی یہ سوال بھی پیدا ہوتا ہے کہ ولادت کے بعد بھی بچوں کو کیوں تکلیف ہوتی ہے انہوں نے کونسا قدرت کا قانون توڑا ہوتا ہے جو وہ بیمار ہوتے ہیں۔ اور کیا وجہ ہے کہ والدین کی بے اعتدالیوں یا بے احتیاطی کا خمیازہ بچوں کو بھگتنا پڑتا ہے۔ یہ کہاں کا انصاف ہے کہ کرے زید اور بھرے بکر۔ کیا یہ سب باتیں اللہ تعالیٰ کی صفت رحم کے منافی نہیں ہیں؟

اس کا جواب بھی امراض کے اصولی جواب میں آ گیا ہے۔ کہ اللہ تعالیٰ نے ایک قانون بنا دیا ہے کہ ہر مخلوق اپنے ماحول سے متأثر ہوتی ہے۔ اور یہ قانون سراسر انسان کے فائدہ اور اُس کی ترقی کے لئے بنایا گیا ہے۔ اگر یہ قانون نہ ہوتا تو انسان ناقابلِ تغیر ہوتا۔ نہ بیرونی اثرات سے متأثر ہوتا اور نہ ہی ترقی کر سکتا۔ اسی قانون کی رُو سے بچے بھی والدین کا اچھا اور بُرا دونوں اثر لیتے ہیں۔ اگر وہ بُرا اثر یعنی بیماری یا نقص کی طرف میلان ورثہ میں نہ لیتے تو وہ اچھا اثر یعنی والدین کی جسمانی اور اخلاقی طاقتیں، خوبیاں وغیرہ بھی حاصل نہ کر سکتے۔ اور اس کا نتیجہ یہ ہوتا کہ انسان کا ہر بچہ

ایک پتھر کا بت ہوتا۔ جو نہ اچھا اثر لیتا اور نہ برا۔ اور اس طرح انسان کی پیدائش کا جو اصل مقصد ہے وہ فوت ہو جاتا۔ کیونکہ ایسے انسان کا وجود حیوانوں سے بھی بدتر ہوتا۔ بہرحال محض اس وجہ سے کہ بچہ ورثہ میں امراض اور نقائص کا میلان لیتا ہے اور بچوں کو تکلیف دکھ درد ہوتا ہے اللہ تعالےٰ کے رحم پر اعتراض نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ اس نے قانون بنا دیا ہے جو انسان کی بہتری اور ترقی کے لئے ہے۔ اگر اس کی خلاف ورزی کی وجہ سے وہ نقصان اٹھاتا ہے تو اس کا ذمہ وار وہ خود ہے۔ مگر اس کے باوجود اللہ تعالےٰ نے رحم کر کے ایسے دکھوں کی بھی جزا کا انتظام آخرت میں کر رکھا ہے۔ جن کی ذمہ واری اس پر براہِ راست نہ تھی۔ یعنی الوزنُ یومئذٍ الحق کے ماتحت ہر شخص کی روحانی ترقی کا موازنہ کرتے وقت اس کی ورثہ کی کمزوریوں کا بھی لحاظ رکھ لیا جائے گا۔

پیدائشی روگوں کے ضمنی فوائد

موروثی نقائص کا ایک ضمنی فائدہ یہ ہے جو کہ درحقیقت بنی نوع انسان کا ہی مجموعی فائدہ ہے کہ اس سے علمِ طب اور جراحی میں ترقی ہوتی ہے۔ اور جنین کے نشو و نما کے علم پر کئی لحاظ سے روشنی پڑتی ہے۔ اور حفظِ ما تقدم وغیرہ کے کئی نئے پہلو نمایاں ہوتے رہتے ہیں۔ جن سے ہزاروں آئندہ ہونے والے بچے نقص سے بچ جاتے ہیں۔ ماڈرن سرجری کا بہت سا حصہ ان پیدائشی نقائص کی اصلاح پر مشتمل ہے۔ جن سے سرجن بھی کافی سبق حاصل کر سکتے ہیں۔ مگر افسوس کہ دہریت کے اثر کے ماتحت وہ جہالت سے اللہ تعالےٰ کا مذاق اڑاتے رہتے ہیں۔ میرے سامنے افریقہ میں ایک دفعہ ایک ملٹری سرجن فتق (Hernia) کا اپریشن کر رہا تھا۔ کہ اس کے نائب نے پوچھا۔ آپ اب کیا کرنے لگے ہیں؟ تو سرجن نے بجائے اپریشن کی تفصیلات بتلانے کے مذاق سے کہا "میں خدا کی غلطی کی اصلاح کرنے لگا ہوں۔" (نعوذ باللہ) میں نے فوراً دخل دے کر کہا "معاف کیجئے! یہ اللہ تعالےٰ کی غلطی نہیں ہے بلکہ قانونِ طبعی کا ہی ایک مظاہرہ ہے۔ اللہ تعالےٰ افراد کے معاملہ میں عام حالات میں خاص ذاتی دلچسپی نہیں لیا کرتا۔" وہ آگے سے گھسیانہ سا ہو کر بولا "خدا میرے معاملات میں تو دلچسپی لیتا ہے"! میری مراد اس جواب سے یہ تھی کہ عام حالات میں جو بچے پیدا

تقدیر خاص طبعی کب جاری کی جاتی ہے؟

پیدا ہوتے ہیں وہ تقدیر عام طبعی کے ماتحت (جو وہ بھی اللہ تعالیٰ کی ہی جاری کردہ اور اس کے تابع ہے) پیدا ہوتے ہیں۔ یعنی ہر بچہ جو پیدا ہوتا ہے اس کے لئے اللہ تعالیٰ کوئی خاص تقدیر جاری نہیں کرتا۔ اس لئے جسم کے نقائص کا الزام اللہ تعالیٰ پر نہیں ہے۔ سوائے خاص حالات مثلاً کسی پیشگوئی یا بشارت کے ماتحت پیدا ہونے والے بچوں کے کہ ان کے لئے اللہ تعالیٰ تقدیر خاص طبعی جاری کرکے اُن کی ہر طرح رحم مادر میں حفاظت فرماتا اور نہ صرف انکو جسمانی اور دماغی عیب سے محفوظ رکھتا ہے، بلکہ اُن کو خاص قسم کی دماغی اور جسمانی طاقتیں بھی عطا فرماتا ہے جو اُن کے آئندہ مشن کے لئے ضروری ہوں صرف اور صرف ایسے بچوں کے معاملہ میں اللہ تعالیٰ ذاتی دلچسپی لیتا ہے اور انکی صحت اور عافیت کا براہِ راست ذمہ دار ہوتا ہے۔ جیسے انبیاء علیہم السلام خاص خلفا اور اُن کی مبشر اولاد وغیرہ۔

ورثہ کے اثرات اور جسم کے نقائص کا معاملہ ایسا پیچیدہ تھا کہ بعض لوگوں نے اسکے فلسفہ کو نہ جان کر تناسخ وغیرہ کے لغو عقیدے تراش لئے ہیں۔ مگر جس خوبی سے اسلام نے اِس دقیق معمہ کو حل کیا ہے اس میں قرآن کریم دیگر کتب سماویہ سے ممتاز اور منفرد ہے۔ اس نے اصولی طور پر اس کا جواب دے دیا ہے۔ کہ اللہ تعالیٰ نے قانونِ قدرت کے ماتحت انسانوں میں فاعلی اور انفعالی دو قوتیں خودِ انسان کے فائدہ اور ترقی کے لئے پیدا کر دی ہیں اور ان دونوں کے ردِ عمل سے بچہ جہاں صحت اور طاقت والدین سے لیتا ہے وہاں کبھی کبھی مرض کا میلان اور کمزوری بھی ورثہ میں لے لیتا ہے۔ جس کی تلافی آخرت میں کر دی جائے گی۔ الحمد للہ۔

جراثیم کا حملہ

امراض کا سب سے عام اور اہم اصولی سبب جراثیم اور کیڑوں کا حملہ ہے۔ جو کہ دنیا میں بہت سے دکھ درد اور مصائب کا موجب ہو رہا ہے۔ پس ضروری ہے کہ اس پہلو کو زیادہ واضح کرکے بیان کیا جائے اس کے لئے (۱) سب سے پہلے یہ جاننا ضروری ہے کہ مرض کسے کہتے ہیں کیونکہ لوگ عام طور پر جس چیز کا نام مرض رکھتے ہیں وہ درحقیقت مرض نہیں بلکہ بیماری کی علامات

مرض اور علامات میں فرق

ہوتی ہیں۔ مثلاً بخار، کھانسی، قے، اسہال، سوجن، ورم، درد وغیرہ امراض نہیں ہیں بلکہ محض علامات ہیں جو اصل مرض کے وجود کو نمایاں کر رہی ہوتی ہیں۔ جب جسم پر کوئی خراکش پیدا کرنے والی چیز حملہ کرتی ہے خواہ وہ شے جراثیم ہوں یا کوئی کیمیاوی زہر تو اس کے مقابلہ میں جسم میں ردِ عمل پیدا ہوتا ہے جو امراض کی مختلف علامات کا اصل موجب ہے۔ اور یہ ردِ عمل قدرت کی عطا کردہ دو طاقتوں یعنی فاعلی اور انفعالی قوت کا ہی رحیمانہ اور حکیمانہ مظاہرہ ہے۔ اس سے دو باتیں ثابت ہوگئیں۔ اوّل یہ کہ قدرت کا ردِ عمل اصل مرض نہیں بلکہ علامت ہے۔ اور یہ ردِ عمل (علامات) مضر نہیں بلکہ مفید اور ضروری ہیں۔ کیونکہ یہ جسم کی دفاعی قوت کا شاندار مظاہرہ اور جراثیم کو ہلاک کرنے یا جسم سے خارج کرنے کا اہم ذریعہ ہے۔ مثلاً جب جراثیم معدہ پر حملہ کریں تو جسم ان کو قے کے ذریعے خارج کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ اور اگر وہ امعاء میں داخل ہوجائیں تو اسہال کے ذریعے اُن کو باہر پھینکا جاتا ہے۔ اسی طرح خون میں اگر کوئی جرم چلا جائے تو اس کو جسم کی حرارت غریزی بڑھا کر ہلاک کیا جاتا ہے جس کا دوسرا نام بُخار ہے۔ پس بُخار، اُلٹی، اسہال وغیرہ کا ہونا ضروری اور رحمت ہے اور ان کا نہ ہونا اکثر دفعہ خراب علامت ہوتی ہے۔ کیونکہ اس کے یہ معنے ہوتے ہیں کہ جسم کی قوتِ مدافعت کمزور ہے۔ یا اس نے مقابلہ چھوڑ دیا ہے۔

جراثیم کا سلسلہ مفید ہے

(۲) قدرت نے جراثیم کی پیدائش کا وسیع سلسلہ دُنیا میں قائم کر رکھا ہے۔ اور یہ کہنا مبالغہ نہ ہوگا کہ کائنات عالم کا ہر کام ہی جراثیم کے ذریعے ہو رہا ہے۔ یہ جراثیم کئی مفید کام کر رہے ہیں۔ مثلاً خوراک کا تیار کرنا، انسانی جسم کی حفاظت وغیرہ۔ دہی اور خمیر بھی جراثیم ہی تیار کرتے ہیں۔ نائیٹروجن پر زندگی کا قیام ہے لیکن یہ نائیٹروجن جراثیم ہی بناتے ہیں۔ جو پودوں کی جڑوں کے ساتھ چمٹے ہوتے ہیں۔ پس جب تک جراثیم اپنے دائرہ عمل میں رہیں وہ مفید اور ضروری ہیں لیکن جب وہ اپنے طبعی ماحول کو چھوڑ کر غیر طبعی جگہ منتقل ہو جائیں تو اس کا نام بیماری ہے۔ مثلاً انسان کے جسم پر سر کی چوٹی سے لے کر پَیر کے ناخنوں تک جراثیم ہی جراثیم آباد ہوتے ہیں

خود مُنہ، ناک اور کان کے اندر جراثیم موجود ہیں۔ اور یہ خاموشی سے مفید کام کرتے رہتے ہیں۔ لیکن جب وہ غیر طبعی اور غیر مانوس ماحول میں انسان کی غلطی سے منتقل ہو جائیں تو وہ مرض پیدا کر دیتے ہیں۔ مثلاً مُنہ کے اندر نمونیہ کا جرم ہر وقت رہتا ہے اور وہ نقصان نہیں پہنچاتا۔ لیکن اگر ایک شخص کسی دوسرے انسان کو دانت سے کاٹے تو یہ جرم زخم کو آلودہ کر دیتا ہے۔ یا خود وہ شخص کسی بے احتیاطی کی وجہ سے اپنی قوتِ مدافعت کو کمزور کر لے۔ تو اس پر نمونیہ کا حملہ ہو جائے گا۔ اسی طرح انتڑیوں میں ایک مردار خور جرم رہتا ہے جو ہاضمہ وغیرہ میں مدد دیتا ہے اس کا نام بی کولائی (B.Coli) ہے۔ اگر یہ جرم اپنے طبعی مقام پر رہے تو یہ نہ صرف بے ضرر بلکہ مفید ہے لیکن اگر یہ کسی طرح مثلاً جگر کی باریک صفراوی نالیوں یا گردوں میں منتقل ہو جائے تو نہایت پریشان کُن مُزمن بُخار پیدا کر دیتا ہے۔

جراثیم کے حملہ کے لئے چار شرائط

پھر یہ بھی جاننا ضروری ہے کہ مرض پیدا کرنے کے لئے صرف جراثیم کا حملہ ہی کافی نہیں بلکہ اس کے لئے اور بھی شرائط ہیں۔ اور جب تک وہ پُوری نہ ہوں محض جراثیم کی موجودگی مرض پیدا نہیں کر سکتی مثلاً اوّل یہ ضروری ہے کہ جراثیم کی مُدّت کسی وجہ سے بڑھ گئی ہو۔ دوسرے یہ کہ جسم اُس جرم کا اثر قبول کرنے کو تیار ہو۔ جس کو دوسرے لفظوں میں قابلیتِ القاح بھی کہتے ہیں۔ ہر شے کا جوڑا ہے اور جب تک دونوں طرف آمادگی اور تیاری نہ ہو تعلق نہیں ہو سکتا۔ اس کی مثال بیج اور زمین کی ہے۔ جس طرح جب تک زمین کو تیار نہ کیا جائے محض بیج سے کھیتی نہیں ہو سکتی اسی طرح جرم بغیر جسم کی تیاری کے مرض پیدا نہیں کر سکتا۔ پس ضروری ہے کہ اوّل جراثیم موجود ہوں۔ دوسرے ان کی سمیت بڑھ چکی ہو۔ تیسرے جسم کی عام قوتِ مدافعت کسی بے اعتدالی یا بد پرہیزی کی وجہ سے کمزور ہو چکی ہو۔ چوتھے خاص اُس عضو کی مخصوص قوتِ مدافعت کمزور ہو چکی ہو جس پر جرم نے حملہ کیا ہے۔

غرضیکہ جب تک یہ چار شرائط پوری نہ ہوں جن کو کاخ صاحب کا پاسچولیٹ (KOCHS-POSTULATE) کہتے ہیں کوئی مرض نہیں لگ سکتا۔ اور یہ ظاہر ہے کہ ان میں سے تین ایسی ہیں جن کے لئے انسان خود ذمہ دار ہے۔ پس جراثیم کی پیدائش

صفاتِ رحمت کو کم نہیں کر سکتی بلکہ بڑھاتی ہے۔

یعفو عن کثیر کے مظاہرے

اس کے علاوہ یہ بھی جاننا ضروری ہے کہ اللہ تعالےٰ نے جراثیم کو پیدا کر کے انسان کو اُن کے رحم پر نہیں چھوڑ دیا بلکہ اُس نے حفاظت کے بھی ایسے وسیع انتظامات کر رکھے ہیں کہ دیکھ کر عقل دنگ رہ جاتی ہے۔ پس اس طرح اللہ تعالےٰ بڑی کثرت کے ساتھ اور بار بار انسان کو یعفو عن کثیر کے ارشاد کے ماتحت اس کی غلطیوں کے بد نتائج سے محفوظ رکھتا ہے۔ اور پردہ پوشی کرتا ہے۔ لیکن جب انسان بے احتدالیاں کرتے کرتے "کسب" کی حد تک پہنچ جاتے تو پھر بطور "عقاب" یعنی طبعی نتیجہ کے اُس کو تکلیف دی جاتی ہے۔ جو اس کی اپنی ہی کمائی ہوتی اور اس کے نیک انجام کے لحاظ سے رحمت ہوتی ہے۔ مگر افسوس ہے کہ عام طور پر لوگوں کو ان باتوں کا علم نہیں دیا جاتا۔ ورنہ وہ بھی اعتراض نہ کریں بلکہ اللہ تعالےٰ کے شکر گذار ہوں کہ کس طرح اس کی صفتِ حفیظ ہر لحہ اُن کی حفاظت کر رہی ہوتی ہے۔ مثلاً لوگوں کو یہ تو بتا دیا جاتا ہے کہ چوکس رہو، مُنہ میں بھی جرم ہیں، معدہ میں بھی جرم ہیں، دیکھنا تمہاری سانس کی ہوا، تمہاری خوراک اور تمہارے پانی میں بھی کروڑوں جراثیم ہیں، غرضیکہ ہر جگہ جرم ہی جرم ہیں جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ انسان ہر وقت خوفزدہ رہتا ہے جس سے اس کی قوتِ مدافعت کمزور ہو کر سچ مچ حملہ ہو ہی جاتا ہے۔ لیکن ساتھ یہ کوئی نہیں بتاتا کہ فکر نہ کرو بلکہ خوشی سے اُچھلو کہ تمہارے خالق و مالک اور رحیم خدا نے تمہاری حفاظت کے وسیع اور مکمل انتظامات کر رکھے ہیں اس لئے تم معمولی احتیاط کر کے اپنے کام کرتے چلے جاؤ اور جراثیم کے وہم میں نہ پڑو۔ مثلاً یہ بتانا درست ہے کہ سانس کی ہوا کے ذریعے لاکھوں ٹی بی کے جرم سینہ میں جاتے ہیں۔ مگر یہ بھی ساتھ ہی کہہ دو کہ وہ سورج کی تیز شعاعوں اور خون کے سفید دانوں کے ذریعے آناً فاناً ہلاک کر دیئے جاتے ہیں۔ اِسی طرح بیشک خوراک اور پانی میں کروڑوں جراثیم ہوتے ہیں مگر یہ بھی حقیقت ہے کہ لوزتین کے فلٹر اور معدہ کی تیز ایسڈ اور رطوبت سے وہ ایک منٹ میں ہلاک کر دیئے جاتے ہیں۔ وغیرہ وغیرہ۔

سینکڑوں دفعہ انسان بدپرہیزیاں کرتا ہے اور بے اعتدالیاں کرکے جسم کو کمزور کرلیتا ہے مگر اللہ تعالیٰ رحم کرکے اس کو بار بار موقع دیتا ہے اور بیمار نہیں ہونے دیتا جب تک کہ حد نہ ہو جائے۔ کئی دفعہ زخم آجاتے ہیں مگر وہ خود ہی مندمل ہو جاتے ہیں۔ یہ بھی رحم ہے ورنہ بعض دفعہ تو معمولی جُوتی کے کاٹنے سے انسان فوت ہو جاتا ہے۔ پس یہ حقیقت ہے کہ جسم انسانی کے اندر حیرت انگیز طاقت اور قوت امراض کے مقابلہ کی اللہ تعالیٰ نے رکھی ہے۔ مگر افسوس ہے کہ اکثر لوگ اس کو استعمال کرنا نہیں جانتے۔ یا لاعلمی اور غفلت سے ضائع کر دیتے ہیں۔ امراض کے علاوہ طبعی فرائض کی سرانجام دہی میں عوارض سے بچانے کے لئے بھی قدرت نے عجیب انتظامات کر رکھے ہیں۔ مثلاً حمل اور وضع حمل کے مقدس فرض کو بخیر و خوبی سرانجام دینے

زچہ کی حفاظت کا مکمل انتظام

کے لئے قدرت نے یہ انتظام کر رکھا ہے کہ اوّل حاملہ کے خون میں سُرخ دانے زیادہ کر دیئے جاتے ہیں۔ تاکہ وضع حمل کے وقت جو جریانِ خون ہو اُس کی تلافی ہو سکے۔ دوسرے حاملہ کے خون کے سفید دانے بھی بڑھا دیئے جاتے ہیں تاکہ وضع کے بعد چلہ کے بُخار وغیرہ کا اندیشہ دور رہے۔ تیسرا خطرہ جریانِ خون کا تھا اس کے لئے یہ انتظام کر دیا کہ خون کے اندر PLATELETTS زیادہ کر دی جاتی ہیں جو خون کو گاڑھا کرکے جریانِ خون جلد بند کر دیتی ہیں۔ سُبحان اللہ! کیسے مکمل حفاظت کے انتظامات ہیں۔ کیا ایسے محفوظ حالات میں کوئی شریف عورت حمل اور وضع حمل کے مقدس فرض کی سرانجام دہی سے پہلو تہی کر سکتی ہے؟ ہرگز نہیں —!

مہلک امراض کا فلسفہ

اب مَیں چند خطرناک امراض کا فلسفہ بیان کر دیتا ہوں تاکہ یہ واضح ہو سکے کہ قدرت کس طرح اپنی طرف سے انسان کو ہلاکت سے بچانے کی کوشش کرتی ہے یعنی جراثیم کے مقابلہ میں جسم کا ردِّ عمل جو ہوتا ہے وہ صفتِ رحمانیت کا ہی مظاہرہ ہوتا ہے۔

۱۔ نمونیہ۔ یہ بہت مہلک مرض ہے۔ بچوں اور بُوڑھوں پر اس کا حملہ خصوصیت

سخت ہو تا ہے۔ اسی واسطے اس کو "بوڑھوں کا دوست" کہا جاتا ہے۔ اور وہ اُن کو بلا کر ساتھ لے جاتا ہے۔ مگر اس کے باوجود ہم دیکھتے ہیں کہ اس کی تہ میں بھی اللہ تعالیٰ کا وسیع رحم کام کر رہا ہوتا ہے۔ نمونیہ کیا ہے؟ یہ درحقیقت جسم کی اس شاندار کوشش کا نام ہے جو وہ نمونیہ کے جراثیم کو خون میں داخل ہونے سے روکنے کے لئے کرتا ہے۔ یعنی جب جراثیم پھیپھڑوں کے راستے خون میں داخل ہونے کی کوشش کرتے ہیں تو قدرت پھیپھڑوں کو سخت اور ٹھوس بنا کر جراثیم کو قید کر دیتی ہے۔ اب تو یہ حالت ہے کہ علاج وغیرہ سے اس بات کا بہت حد تک امکان ہوتا ہے کہ جرم کو ہلاک کر کے پھیپھڑوں کو اپنی طبعی حالت پر واپس لایا جاسکے۔ لیکن اگر جرم کو اس طرح سینہ میں بند نہ کیا جائے تو سو فیصدی اور فوری ہلاکت کا اندیشہ ہے۔

بے شک قدرت کی اس کوشش میں جسم کے لئے خطرات بھی پیدا ہو جاتے ہیں۔ مثلاً پھیپھڑوں کے ٹھوس ہو جانے کی وجہ سے قلب پر بوجھ پڑتا ہے اور خون میں آکسیجن کی مقدار کم ہو کر مریض فوت بھی ہو جاتا ہے۔ لیکن اگر قدرت یہ رحیمانہ اور حکیمانہ انتظام جراثیم کو مقید کرنے کا نہ کرتی تو بچاؤ کی ایک فیصدی بھی امید نہ تھی۔ پس باوجود نمونیہ کے مہلک نتائج کے جسم کا ردِ عمل اللہ تعالیٰ کے رحم کا ثبوت ہے۔

۲۔ خناق وبائی (ڈفتھیریا) یہ بھی بہت مہلک مرض ہے اور خصوصیت سے بچوں کو لاحق ہوتا ہے۔ جس سے ہزاروں بچے ہر سال ضائع ہو جاتے ہیں۔ اس مرض میں حلق کے اندر ایک پردہ سا بن جاتا ہے۔ جو سانس کی ہوا کو پھیپھڑوں میں جانے سے روکتا ہے اور مریض دم گھٹ کر مر جاتا ہے۔ مگر اس مہلک انجام کے باوجود اگر مرض کی حقیقت یعنی جسم کے ردِ عمل پر غور کیا جائے تو صاف نظر آجاتا ہے کہ یہ پردہ ہی رحمت کا موجب اور مفید ہے۔ کیونکہ یہ پردہ درحقیقت اس لئے بنایا جاتا ہے کہ خناق کے جراثیم کو حلق کے اُوپر ہی روک لیا جائے۔ ورنہ اگر اس کو اس طرح نہ روکا جائے تو جرم پھیپھڑوں میں جا کر شدید قسم کا نمونیہ پیدا کر دیتے ہیں جو سو فیصدی مہلک ہوتا ہے۔

گو یوں بھی اکثر بچے مر جاتے ہیں لیکن قدرت کے اس رحیمانہ اور حکیمانہ انتظام میں کم سے کم ۹۰ فیصدی بچاؤ کی اُمید ضرور ہے بشرطیکہ مرض جلدی تشخیص کر کے ٹیکہ

شروع کرا دیا جائے۔ لیکن اگر قدرت اس طرح جراثیم کو حلق میں روک کر ہم کو علاج کی تیاری وغیرہ کا موقع نہ دے تو خناق نمونیہ شروع ہو جائے اور دنیا کا کوئی ڈاکٹر بھی بچے کو بچا نہ سکے۔ پس ثابت ہوا کہ خناق کا پردہ بہرحال مفید ہے اور قدرت کے رحم کا ثبوت ہے۔

۳۔ **بلیک واٹر فیور** (B.W. Fever) یہ بخار افریقہ میں عام ہوتا ہے۔ اور درحقیقت یہ ملیریا کی ہی ایک شدید اور مہلک قسم ہے۔ جس میں خون کے سرخ دانے پگھل کر پیشاب کے باہر نکل جاتے ہیں۔ اور پیشاب کا رنگ سرخ بلکہ سیاہ ہو جاتا ہے۔ یہ بھی بہت مہلک مرض ہے۔ اور اس میں ہلاکت کا باعث یہ ہے۔ کہ گردوں کا عمل کمزور ہو کر پیشاب بند ہو جاتا ہے۔ اس مرض کی بھی اصل حقیقت پر اگر غور کیا جائے تو اس میں بھی قدرت کا رحیمانہ ہاتھ نظر آ جاتا ہے۔

اس مرض میں قدرت اصل میں یہ کوشش کرتی ہے کہ خون کے سرخ دانوں کو توڑ کر ساتھ ہی ملیریا کے جرم کو بھی پیشاب کے راستے خارج کر دیا جائے تاکہ جسم ملیریا کے کیڑوں سے ہمیشہ کے لئے پاک ہو جائے۔ لیکن اس کوشش میں زخمی دانوں کے ساتھ تندرست دانے بھی کثرت سے پگھل جاتے ہیں جس سے موت کا اندیشہ پیدا ہو جاتا ہے۔ چنانچہ یہ اکثر دیکھا گیا ہے کہ بلیک واٹر فیور کا مریض اگر بچ جائے تو پھر اس کو کئی ماہ تک ملیریا کا حملہ نہیں ہوتا۔ یعنی جسم کی اس کوشش سے اس کا خون ملیریا کے زہر سے بکلی پاک ہو جاتا ہے۔ سوائے اس کے کہ نئے سرے سے اس کو مچھر کاٹیں اور ملیریا کا زہر خون میں چلا جائے۔ پس ثابت ہوا کہ بلیک واٹر فیور جیسی مہلک مرض میں بھی جسم کا ردّ عمل نہایت ہی حکیمانہ اور رحیمانہ ہوتا ہے جو درحقیقت اللہ تعالےٰ کی صفتِ رحمانیت کا ہی ظہور ہے۔

۴۔ **ہیضہ**۔ یہ بھی ایک سخت وبائی مرض ہے جس میں کثرت سے قے اور دست آتے ہیں۔ اور اس طرح خون میں سے زیادہ مقدار میں پانی اور نمک خارج ہو جانے کی وجہ سے مریض ہلاک ہو جاتا ہے۔

یہ درست ہے کہ اُلٹی اور اسہال ہی مریض کی ہلاکت کا باعث ہیں۔ مگر سوال یہ ہے کہ قدرت کا منشاء اس سے کیا ہے؟ اس کی غرض یہ ہوتی ہے کہ اس طرح جسم

میں سے ہیضہ کے جرم کو خارج کیا جائے۔ ورنہ اگر جسم کا یہ ردِ عمل جراثیم کو خارج نہ کرے تو مریض چند گھنٹوں میں ہی ہلاک ہو جائے۔ جیسا کہ کمزور لوگوں میں ہوتا ہے اور جن کو کم دست آتے ہیں۔ جسم میں سے قے اور دستوں کے ذریعے پانی اور نمک کا نکل جانا اتنا خطرناک نہیں جتنا کہ زہر کا اندر رہنا۔ کیونکہ خون کی پانی اور نمک کی کمی تو ہسپتالوں میں نمک پانی کا ٹیکہ کر دینے سے پوری ہو سکتی ہے مگر زہر کو جسم میں سے نکالنے کا ہمارے پاس کوئی ذریعہ نہیں ہے۔ پس قدرت وہ کام کرتی ہے جو ڈاکٹر نہیں کر سکتے۔ ورنہ کم ہیضہ کی صورت میں بچاؤ کی ایک فیصدی بھی امید نہیں رہتی۔ اس سے بھی ثابت ہوتا ہے کہ ہیضہ جیسی مہلک مرض میں بھی جسم کا ردِ عمل (الٹی اور اسہال وغیرہ) سراسر رحمت ہیں جس کے لئے ہم کو اپنے خالق کی حمد کرنی چاہئے جس نے رحم کر کے جسم کے اندر یہ طاقت رکھی ہے۔

۵۔ پلیگ۔ پلیگ کی گلٹی بھی مفید اور رحم کا نتیجہ ہے۔ ورنہ اگر گلٹی زہر کو نہ روکے تو سارے خون میں زہر پھیل کر فوراً مریض کو ہلاک کر دے اور علاج کا موقع ہی نہ ملے۔ اسی طرح اگر غور کیا جائے تو ہر ایک مرض کی تہ میں قدرت کا رحیمانہ ہاتھ کام کرتا ہوا نظر آ جائے گا۔ جو اس بات کا ثبوت ہے کہ اللہ تعالےٰ نے جو قانونِ قدرت بنایا ہے وہ بہت ہی حکیمانہ اور انسان کے فائدہ اور ترقی کے لئے ہے۔

تکلیف دہ علامات کے فوائد

شدید امراض کے علاوہ اکثر خطرناک علامات مثلاً بے ہوشی، سکتہ، ضعف، جسم کا سرد اور زرد پڑ جانا (SHOCK) یعنی خون کے دباؤ کا کم ہونا، درد وغیرہ سب مفید ہیں۔ یہ قدرت کا حکیمانہ اور رحیمانہ انتظام اتفاقی حوادث میں انسان کو زندہ رکھتا ہے۔ اتفاقی حادثہ، سخت چوٹ وغیرہ میں جو غشی ہو جاتی ہے یہ کئی لحاظ سے مفید ہوتی ہے اس سے مریض کا خوف دُور ہو کر اعصاب کو تسکین ہو جاتی ہے۔ خون کا دَورہ سُست ہو کر جریان خون بند ہو جاتا ہے۔ جوڑوں کی حرکت بند ہو کر شکستہ ہڈیوں کو آرام ملتا ہے خطرے کے وقت جو خوف سے چہرہ زرد پڑ جاتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ قدرت اطراف اور جلد سے خون کو اندر کی طرف (پیٹ، سینہ اور دماغ میں) کھینچ لیتی ہے۔ تاکہ مزید لگنے سے زیادہ خون نہ بہ سکے۔ اور اعضاء رئیسہ کو کافی خون ملتا رہے۔

بے ہوشی سے درد کا احساس کم ہو جاتا ہے اور مرض کی شدت میں کمی ہو جاتی ہے۔ یہاں تک کہ مرنے سے قبل جو بیہوشی ہو جاتی ہے وہ بھی رحمت ہے۔ گو پس ماندگان پر تو یہ ظاہرا ظلم ہی ہوتا ہے کیونکہ ان کی خواہش یہ ہوتی ہے کہ مریض آخری دم تک با ہوش رہے اور باتیں کرتا رہے لیکن خود مریض کے لئے بے ہوشی مفید ہے کیونکہ اس طرح جان کنی (نزع) کی تکلیف کا احساس نہیں ہوتا۔ ورنہ بعض حالتوں (مثلاً جل کر مرجانا) میں جن میں اعصاب کی حس بہت تیز ہو جاتی ہے مریض کو جان کنی کی شدید تکلیف ہوتی ہے۔ پس بے ہوشی کا ہو جانا بھی کئی لحاظ سے رحمت ہے۔

۲۔ درد کی حقیقت

سب سے عام اور تکلیف دہ علامت درد کا احساس ہے مگر اس کو پیدا کر کے بھی قدرت نے انسان پر بہت رحم کیا ہے۔ درد کے احساس کے ذریعے دماغ کو اطلاع دی جاتی ہے کہ جسم کے کسی حصہ میں کوئی خراش پیدا کرنے والا مادہ پیدا ہو گیا ہے۔ یہ درد کا احساس ہی ہے جس کی وجہ سے کسی مرض یا صدمہ یعنی چوٹ وغیرہ کا علم دماغ کو ہوتا ہے اور فوراً اس کی اصلاح کے انتظامات کئے جاتے ہیں اور مریض بھی علاج کی طرف توجہ کرتا ہے۔ ورنہ اس کو علم ہی نہ ہو سکتا کہ کوئی مرض شروع ہو رہا ہے۔ پھر یہ درد کی ہی برکت ہے کہ ڈاکٹر کو مرض کی کمی بیشی کا علم ہوتا رہتا ہے اور وہ علاج میں تبدیلی کر لیتا ہے اور درد کے ذریعے ہی آخر کار شفا اور صحت کا بھی علم ہوتا ہے۔ قدرت نے ایسا عجیب تاروں کا جال جسم اور دماغ کے درمیان بچھا رکھا ہے کہ جب کبھی کسی چھوٹے سے چھوٹے عضو پر بھی کسی بیرونی شے کا دباؤ پڑے یا کسی عضو میں کوئی زہر جمع ہونے لگے یا کسی مقام پر کوئی روک یا سُدہ ہو جائے۔ یا ہڈی شکستہ ہو جائے۔ یا جوڑ اُتر جائے تو فوراً اس کی اطلاع دماغ کو دی جاتی ہے جو کہ مناسب اور ضروری انتظام اصلاح کا کرنا شروع کر دیتا ہے۔

بعض کے نزدیک درد کا اور نرم دباؤ کا جو آرام اور لذت پیدا کرتا ہے منبع ایک ہی ہے۔ یعنی جو دباؤ لذت پیدا کرتا ہے وہی اگر بڑھ جائے تو اس کا نام درد ہے۔ تو گویا اصولی طور پر درد مٹانے کے یہ معنے تھے کہ لذت آرام اور راحت کا احساس بھی مٹا دیا جاتا۔ گویا انسان پتھر کا بُت ہوتا۔ جو نہ دُکھ محسوس کرتا نہ سُکھ۔

درد کس طرح رحمت ہے

پھر درد کا احساس بالکل مضر بھی نہیں ہے کیونکہ اس کی شدت اکثر دفعہ دوا بن جاتی ہے۔ کسی شاعر نے واللہ اعلم کس خیال سے کہا ہے ع

"درد کا حد سے گزرنا ہے دوا ہو جانا"

مگر اس میں طبعی لحاظ سے صداقت ضرور ہے۔ تجربہ سے معلوم ہوا ہے کہ درد جب جذبات کو ابھارتی ہے تو اس کی شدت سے جسم میں A DREWA LIW پیدا ہوتی ہے جو جگر میں سے گلوکوز نکال کر خون میں داخل کر دیتی ہے جو درد کے لئے بہت حد تک مفید اور ضروری ہوتا ہے۔ دردِ زہ جتنا بڑھتا جائے اتنا ہی وہ منزلِ مقصود کو قریب کر دیتا ہے۔ اسی واسطے دردِ زہ کو ڈاکٹر لوگ کم کرنے کے لئے بالعموم کوئی دوا نہیں دیتے بلکہ اس کو تیز کرنے کے لئے ٹیکہ کرتے ہیں۔

اکثر امراض کی ابتداء درد سے ہی ہوتی ہے اور یہ رحمت اور فضل ہے کیونکہ اس طرح مرض کا علم ہو کر علاج جلدی شروع ہو جاتا ہے، اور مرض بڑھتا نہیں۔ لیکن اگر سرطان (CANCER) وغیرہ کی طرح کسی مرض کی ابتداء بغیر درد کے ہو تو مرض کا علم اُس وقت ہوتا ہے جب وہ جسم میں پھیل چکا ہوتا ہے۔ درد کی اہمیت کو مدنظر رکھتے ہوئے ایک محقق ڈاکٹر نے ایک دفعہ کہا تھا کہ اگر مجھے خدا اجازت دے کہ جو چاہو مانگو تو میں تو یہی عرض کروں "یا اللہ! سرطان (CANCER) کی ابتداء میں درد ہوا کرے"

دردِ جگر، گردہ اور قولنج وغیرہ کا درد سب رحمت ہیں اور مفید ہیں۔ کیونکہ یہ اسباب کی علامت ہوتی ہے۔ کہ جسم سے پتھری، ہوا یا سُدّے کو زور دیکر باہر نکال دیا جائے۔ حقیقی علاج یہ نہیں ہوتا کہ مارفیا دے کر درد کا احساس مٹا دیا جائے بلکہ یہ ہوتا ہے کہ مرض کے اصل سبب کی اصلاح کی جائے۔ یا عارضی طور پر دونوں کو ملا لیا جائے۔ یہ حالات اس بات کا ثبوت ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے درد کا احساس رحم کر کے انسان کے فائدہ کے لئے پیدا کیا ہے۔

موت کی فلاسفی!

اگر فرض کر لیا جائے کہ اللہ تعالےٰ نے موذی اشیاء مثلاً امراض وغیرہ کا سلسلہ انسان کی بہتری اور فائدہ کے لئے جاری کیا ہے۔ یعنی ان کی پیدائش کی اصل غرض صفتِ رحمانیت کے ماتحت ہے اور انسان قانونِ قدرت کی خلاف ورزی کر کے خود بیمار ہوتا یا نقصان اٹھاتا ہے تو اس پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ امراض اور حوادث کا نتیجہ جو ہے یعنی موت' اس کا فائدہ کیا ہے؟ موت تو ایک شے بہت ہی تکلیف اور رنج کا موجب ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ موت کا وجود ضرور اللہ تعالےٰ کی صفاتِ رحمت کے منافی ہے؟

موت کا سلسلہ رحمت ہے اس کا جواب یہ ہے کہ موت کا سلسلہ بھی اللہ تعالےٰ کی صفتِ رحیم اور حکیم کے منافی نہیں۔ بلکہ اس کو ثابت کرتا ہے۔ موت کیا ہے؟ روحانی طور پر اس جہان سے جو کہ دار الابتلاء ہے دوسرے جہان یعنی دار الجزاء میں منتقل ہونے کا نام ہے اور طبعی طور پر موت جسم اور روح کے فراق کا نام ہے۔ یعنی جب روح یہ دیکھتی ہے کہ یہ جسم بوجہ بڑھاپے یا مرض یا حادثہ کے اب میری صفات کے اظہار کے قابل نہیں رہا تو وہ اس کو چھوڑ کر دوسرا جسم اختیار کر لیتی ہے۔ جس طرح کوئی مکان جب رہائش کے قابل نہ رہے، خواہ بوجہ پرانا ہو جانے یا کسی حادثہ کے، اور وہ انسان کو آرام پہنچانے کی بجائے اُلٹا تکلیف یا خطرہ کا موجب ہو جائے تو اس کو چھوڑ کر نیا مکان بنا لیا جاتا ہے۔ اسی طرح روح بھی اس جسم کو چھوڑ کر نیا جسم لے لیتی ہے۔ اگر فرض کرو موت نہ ہوتی تو اس کا نتیجہ یہ ہوتا کہ ایک انسان کسی مرض یا حادثہ سے بری طرح ناکارہ کیا ہوا شکستہ جسم کئی سالوں تک اُٹھائے پھرتا جو خود اس کے لئے اور اس کے عزیز و اقارب رشتہ داروں کے لئے زیادہ دُکھ کا موجب ہوتا۔ پس یہ زیادہ رحم ہے کہ ایسی حالت میں جبکہ جسم کی اصلاح کی امید بالکل نہ رہے رُوح کو جسم سے الگ کر کے اسے نئے اجسام دیگر دار الجزاء میں مزید ترقیات کا موقع دیا جائے۔ بجائے اس کے کہ وہ دُنیا میں کُڑھتا رہتا۔ اور نہ خود اپنی ترقی اور نہ دوسروں کی ترقی کا موجب بن سکتا۔

... زیادہ انتظام ہے جس سے مریض کو ناقابلِ اصلاح حالات میں دکھ درد ... سے ہمیشہ کے لئے نجات دے کر دوسروں کے لئے جگہ خالی کی جاتی ہے۔ ... غور کرو کہ اگر موت کا سلسلہ نہ ہوتا تو آج دنیا میں تل دھرنے کو جگہ نہ ہوتی اور خوراک کی اس قدر قلت ہوتی کہ لوگ خود فاقوں مرتے یا اپنے ہاتھوں بوڑھوں ... کو مارتے۔ پس اللہ تعالیٰ نے دنیا میں موت کا سلسلہ جاری کر کے بندوں پر ظلم کیا بلکہ احسانِ عظیم کیا ہے۔ باقی رہا افراد کی موت کا معاملہ۔ سو اس کا ... اللہ تعالیٰ پر نہیں ہے۔ اس نے قانونِ قدرت انسان کے فائدہ کے لئے بنا کر ... تقدیرِ طبعی کو جاری کر دیا ہے۔ اور جو بھی غلطی یا بے احتیاطی سے اس ... کی زد میں آجاتا ہے وہ بیمار ہو جاتا ہے اور مرتا بھی ہے۔ اور قدرت اس بات کا لحاظ نہیں کرتی کہ کسی کی بیوی جوان ہے یا اس کے بچے چھوٹے ہیں ابھی ... کو مہلت دو۔ پھر اس میں انسان کے نیک یا بد ہونے کا بھی کوئی سوال نہیں۔ ... ایک دہریہ بھی احتیاط سے چلے گا اور قانونِ قدرت کا احترام کرے گا تو وہ تندرست رہے گا اور لمبی عمر پائے گا۔ لیکن اس کے برخلاف ایک پرہیزگار، نیکوکار شخص اگر قانونِ طبعی کی خلاف ورزی کرے گا تو وہ ضرور بیمار ہوگا اور جلدی فوت بھی ہو جائے گا۔ الا ماشاء اللہ۔ کہ اللہ تعالیٰ خود پرہیز سے منع فرما دے۔ جیسا کہ حضرت مسیح موعود علیہ السلام کے ساتھ ایک دفعہ ہوا تھا۔

موت پر افسوس کی وجہ

اگر کہا جائے کہ موت پر افسوس کیوں کیا جاتا ہے اگر موت رحمت ہے تو اس پر تو خوشی کرنی چاہیئے تو اس کا جواب یہ ہے کہ افسوس موت پر نہیں بلکہ درمیانی تکلیف پر کیا جاتا ہے۔ یا پھر پس ماندگان کی حالتِ زار کو دیکھ کر رونا آتا ہے۔ کیونکہ بعض قیمتی افراد کی موت خود ان کی موت نہیں بلکہ پس ماندگان کی موت کا پیغام ہوتا ہے۔ باقی رہا یہ سوال کہ مرنے والے کو بھی تکلیف ہو رہی ہوتی ہے۔ مثلاً جان کنی (نزع) کی تکلیف وغیرہ تو اس کا جواب یہ ہے کہ جان کنی کی تکلیف بھی ہر ایک کو ایک جیسی نہیں ہوتی۔ اس کا دار و مدار بھی حالات پر ہوتا ہے۔ ذہنی اور روحانی لحاظ سے اس کا مدار مرنے والے کے اعمال، مقصد کی بلندی اور پس ماندگان کی حالت پر ہے۔ اور طبعی لحاظ سے اس کا

مدار مریض کے جسم کی بناوٹ، مرض کی نوعیت وغیرہ پر ہے۔ مثلاً اگر اعمال اچھے ہوں یا اعلیٰ مقصد کے لئے جان دی جارہی ہو اور پس ماندگان کے متعلق متوفی کو یقین ہو کہ میری قوم انکو ہاتھوں پر اُٹھالے گی تو تکلیف کم ہوتی ہے۔ اسی طرح اگر جسم تپلا دُبلا ہو، مرض پُرانا ہو، جیسے اسہال، تپ دق وغیرہ یا موت بے ہوش ہو کر جلد ہو جائے۔ مثلاً دم گھٹنا، یا ڈوب کر مرنا وغیرہ تو بھی تکلیف کم ہوتی ہے۔ اگر کہا جائے کہ سانس کی دقت اور غرغرہ وغیرہ تو سب کو ہوتا ہے۔ تو اس شبہ کا ازالہ اس طرح ہو جاتا ہے کہ سب حرکات بے ہوشی کی حالت میں بغیر ارادہ اور بغیر تکلیف کے ہوتی ہیں۔ اور تکلیف در حقیقت دیکھنے والوں کو ہو رہی ہوتی ہے نہ کہ مریض کو۔ قدرت ہم سے بہت زیادہ رحیم ہے اور وہ موت کا ہیبت ناک اپریشن ہمیشہ "کلوروفارم" دے کر کرتی ہے۔ یعنی مریض کو مرنے سے چند منٹ قبل بے ہوش کر دیا جاتا ہے۔ سوائے شاذ حالات کے مثلاً جل کر مرنا، جس میں تکلیف کسی حد تک ہوتی ہے۔ بہر حال یہ حقیقت ہے کہ موت کا سلسلہ اللہ تعالیٰ کے رحم کے ماتحت جاری ہے۔ اور افراد کی موت سے پس ماندگان کی حالت کا قابلِ رحم ہو جانا۔ رحمتی وسعت کلّ شیءٍ کے منافی نہیں ہے۔

خدائی قول اور فعل میں تصادم نہیں

اس مضمون میں طب اور سائنس کی روشنی میں بعض موذی اور بے فائدہ اشیاء، امراض وغیرہ کے بعض فوائد بتا کر یہ ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ اللہ تعالیٰ نور کی طرح "ظلمات" کا بھی خالق ہے اور دُنیا میں ہر شے مفید ہے اور انسان کے فائدہ کے لئے بنائی گئی ہے۔ اور اس کی حمد کو ثابت کرتی ہے۔ مگر افسوس ہے ابھی تک علومِ جدیدہ نے اس حد تک ترقی نہیں کی کہ ہر موذی شے کے فوائد بتائے جائیں۔ مگر یہ وثوق سے کہا جا سکتا ہے کہ آئندہ کی تحقیقاتیں قرآن کریم کے فرمودہ اصل خلق لکم ما فی الارض جمیعًا کی ہی صحیح تفسیر ہونگی جو کہ اللہ تعالیٰ نے آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے ذریعے آج سے ۱۳۵۰ سال قبل دُنیا کو سکھلایا۔ کیونکہ سچی سائنس اللہ تعالیٰ کا فعل ہے اور یہ ممکن نہیں کہ سچی سائنس اللہ تعالیٰ کے سچے قول (قرآن کریم) سے ٹکرائے۔ پس انسان کی سعادت اور دانشمندی اسی بات میں ہے کہ جہاں تصادم دیکھے بجائے اعتراض کرنے کے اسکو تطبیق دینے اور دُور کرنے کی کوشش کرے تا بعد میں ندامت اٹھانی

دیتے ہیں۔ قرآن کریم کی بے شمار فضیلتوں میں سے جو اسکو دیگر کتب سماویہ پر حاصل ہیں ایک یہ بھی ہے کہ وہ صرف اللہ تعالےٰ کی صفات کو ہی بیان نہیں کرتا بلکہ انکا فلسفہ اور باریک تفصیلات بھی بیان کرتا ہے جو قرآن کریم کے حُسن کو ایسا جاذبِ نظر بنا دیتا ہے کہ دل خود بخود اسکی طرف کھنچا جاتا ہے۔

اس مضمون کی روشنی میں آؤ پھر ایک دفعہ قرآن کریم کی سورۃ آل عمران کا آخری رکوع پڑھیں اور اس پاک وجود پر درود اور سلام بھیجیں جس کے ذریعے ہم کو یہ نورانی ہدایت نامہ ملا۔ فرماتا ہے۔ اِنّ فی خلق السمٰوٰتِ والارض واختلاف الیل والنّھار لاٰیٰتٍ لاُولی الالبابِ ۵ الّذین یذکرون اللہ قیاماً وقعوداً وعلیٰ جنوبھم ویتفکّرون فی خلق السمٰوٰت والارض ربنا ما خلقت ھذا باطلاً سبحٰنک فقنا عذاب النار یعنی آسمانوں (چاند سورج ستارے وغیرہ) اور زمین کی پیدائش اور اختلافِ شب و روز میں عقلمندوں کے لئے نشانات ہیں۔ جو اللہ تعالےٰ کو ہر حالت میں یاد کرتے ہیں اور ساتھ ہی آسمانوں اور زمین کی پیدائش پر غور بھی کرتے رہتے ہیں۔ یعنی مذہب کے ساتھ سائنس اور علوم جدیدہ کا بھی مطالعہ کرتے ہیں۔ وہ لوگ خدا تعالےٰ کے قول اور فعل دونوں کے مطالعہ کے بعد اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ اے ہمارے رب تُونے کائناتِ عالم کی کوئی شے بھی بے فائدہ، لغو، زائد یا موذی نہیں بنائی۔ بلکہ ہر شے انسان کے نفع کے لئے ہے جو نہ صرف تیری سبّوحیّت کو ثابت کرتی ہے بلکہ حمد کا موجب بھی ہے کیونکہ تو خود سبّوح اور حمید ہے۔ اور اگر کبھی اِس مخلوق کے غلط استعمال یا لاعلمی سے ہم کو نقصان ہوتا ہے تو یہ ہمارا اپنا قصور ہے۔ تیری سبّوحیت پر اس سے حرف نہیں آسکتا۔ تو ہی ہم کو آگ (یعنی موذی اشیاء کے ضرر) سے بچائیو۔ اِس آیت میں بتایا گیا ہے کہ اللہ تعالےٰ کی ہر مخلوق اس کی تسبیح کرتی ہے۔ اور یہ تسبیح عملی ہے یعنی یہ کارخانۂ عالم ایسے رنگ میں چلایا جا رہا ہے اور اللہ تعالےٰ کی تقدیرِ عام طبعی ایسے طور پر کام کرتی ہے کہ قانون قدرت کے اصل اور حقیقی مقصد کو دیکھ کر اللہ تعالےٰ کی حمد ثابت ہوتی ہے۔ کجا یہ کہ اس کی سبوحیت پر کوئی مخلوق حرف لا سکے۔ اس میں ہم انسانوں کے لئے بہت بڑا سبق ہے کیونکہ ہماری ذمہ واری بوجہ "ظلوماً جہولاً" اور امانت کے حامل ہونے کے سب مخلوق سے بڑھ کر ہے۔

تین طرح کی تسبیح قولی، قلبی، عملی۔

بلکہ ہمارا یہ فرض ہے کہ ہم نہ صرف قولی تسبیح کریں یعنی زبان سے سبحان اللہ سبحان اللہ پکاریں بلکہ یہ ضروری ہے کہ ہم قلبی اور باطنی تسبیح بھی کریں یعنی دل سے یہ یقین بھی رکھیں کہ اللہ تعالیٰ کی ہر مخلوق مفید ہے اور اس کی حمد ثابت کرتی ہے یہاں تک کہ اگر کسی کا سارا کنبہ بھی زلزلہ یا جہاز ڈوبنے سے تباہ ہو جائے یا مثلاً خود اسکو سانپ بھی کاٹ لے تو وہ یہ یقین رکھے کہ اس میں بھی میرے لئے کوئی بہتری ہے۔ کیونکہ ہو سکتا ہے کہ اسکے اندر مرگی پیدا کرنیوالا مواد جمع ہو رہا ہے جس کا اس سانپ کے زہر سے ازالہ ہو کر وہ آئندہ مرگی کا شکار ہونے سے بچ جائے۔ یا اور کسی مرض کا علاج اس زہر سے قدرت نے کیا ہو۔ پھر اس سے بھی بڑھ کر ایک تسبیح ہے جو دیگر مخلوق ہر وقت کرتی رہتی ہے۔ مگر اکثر انسان سوائے اس کے خاص بندوں کے اس سے غافل ہیں اور وہ عملی تسبیح ہے۔ اور جب تک قولی اور قلبی تسبیح کیساتھ عملی تسبیح نہ ہو تسبیح کے دانے پھیرتے رہنا منافقت ہے۔ عملی تسبیح یہ ہے کہ ہم دنیا میں ایسے طور پر زندگی بسر کریں کہ ہماری کسی حرکت، کسی قول یا کسی فعل سے کوئی شدید سے شدید دشمن بھی یہ نہ کہہ سکے کہ یہ خدا کے عبد نہیں ہیں۔ انسان کو چونکہ اللہ تعالیٰ کی شکل پر بنایا گیا ہے یعنی وہ اس کی صفات کا دنیا میں مظہر ہے اور بندوں کے فعل سے ہی اس بات کا علم ہوتا ہے کہ خالق کس طرح کا ہے۔ اس لئے ضروری ہے کہ ہر انسان ایسے طور پر رہے کہ اسکا ہر فعل نہ صرف اللہ تعالیٰ کی سبوحیت کا ثبوت ہے بلکہ وہ اس کی حمد کا موجب بھی ہو یعنی اسکے ہر تمدن، اس کی معاشرت، اس کے ہر فیصلے اس کی عبادات وغیرہ غرضیکہ ہر حرکت اور ہر قول کو دیکھ کر شریف انسان یہ کہنے پر [illegible] واقعی یہ بندہ اپنے خالق کی زمین پر اس کی صفات کا مظہر اور اس کا ظل اور نائب ہے۔ جب تک یہ تین طرح کی تسبیح قولی، قلبی اور عملی نہ کی جائے ایمان کامل نہیں ہو سکتا۔ پس ضروری ہے کہ انسان ہر حالت میں خواہ وہ خوشی کی ہو یا غمی کی سبحان اللہ اور الحمد للہ کی ہی مجسم عملی تفسیر بنا رہے۔ و آخر دعوٰینا ان الحمد للہ رب العٰلمین۔ اللّٰھم صل علیٰ محمد و علیٰ آل محمد و بارک و سلم۔

حضرت امیرالمومنین امام جماعت احمدیہ کی ایک نظم

"آغاز تو میں کردوں انجام خدا جانے"

متاثر ہو کر ایک غیر احمدی دوست کے خیالات

توحید کو عالم میں نکلے ہیں وہ پھیلانے
"تعریف کے قابل ہیں یارب ترے دیوانے"

ہر دل کو منور کر نور شمع ہدایت سے
ہر فرد بشر تیری توحید کو پہچانے

اک روح بلالی پھر پیدا ہو اذانوں میں
تکبیر سے گونج اٹھیں دنیا کے صنم خانے

انوار تجلی سے ہو جائیں وہ دل روشن
تاریکی باطل سے جو ہو گئے ویرانے

پستی کے مکینوں کو پھر اوج ترقی دے
معمور خوشی سے ہوں سب انکے عزا خانے

واعظ کی سوالی [illegible] میں یہ دو باتیں
دنیا میں تو راحت ہو عقبےٰ کی [illegible]

عالم ہی نرالا ہے [illegible] جنت کا
بیگانوں کی کیا کہیئے اپنے بھی ہیں بیگانے

دل بازبنہ عہدم ازحرص ہوا [illegible]
ہیں رہزن [illegible]

ہو جائے ظفر بخود یارب [illegible]
بھر بھر تو پلائے جام عرفاں بھرے پیمانے

ضروری

اعلان۔۔!

"البیان" کے "ختم نبوت نمبر" کے جواب میں جناب مولوی عطاء محمد صاحب ریٹائرڈ اور نٹیل ٹیچر کا نہایت ہی بسیط اور مدلل مضمون جون ۱۹۶۳ء کے ریویو آف ریلیجنز میں شایع ہو چکا ہے۔ بوجہ خاص اور ایک ایسے رسالہ "البیان" کے "ختم نبوت نمبر" کا جواب ہونے کے اس پرچہ کو خاص اہمیت حاصل ہے اور دفتر نے اس کی زائد کاپیاں چھپوائی ہوئی ہیں۔ خواہشمند دوست اور علم دوست حضرات منگوا کر ختم نبوت کے مسئلہ سے واقفیت حاصل کر کے فائدہ اٹھائیں۔

منیجر ریویو آف ریلیجنز اردو۔ قادیان

لا اله الا الله محمد رسول الله

هو الذي ارسل رسوله بالهدى ودين الحق ليظهره على الدين كله

ماہنامہ

اردو ریویو آف ریلیجنز

یعنی

دنیا کے مذاہب پر نظر اور اہلِ مذاہب کا تشحیذ الاذہان

جلد ۴۵	ماہِ ذی قعدہ ۱۳۶۵ھ مطابق ماہ اکتوبر ۱۹۴۶ء	عدد ۱۰

فہرست مضامین

انبیاء اور رسل کی تعداد

(جناب مولوی محمد صادق صاحب مولوی فاضل مبلغ سماٹرا)

بعض نادان حضرت مسیح موعود علیہ السلام کی تکذیب کے لئے یہ دلیل پیش کرتے ہیں کہ انبیاء اور رسل کی تعداد شریعت نے مقرر کر دی ہے۔ یعنی ایک لاکھ چوبیس ہزار۔ اس میں نہ تو کمی ہو سکتی ہے اور نہ ہی زیادتی ہو سکتی ہے۔ اگر زیادتی ہو سکے تو پھر اس تعداد کا ابطال لازم آتا ہے۔

اس کے جواب میں اوّل تو یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ اگر اس حدیث کو صحیح تسلیم کیا جائے تو اس میں صرف گذشتہ انبیاء اور رسل کا ذکر ہے۔ اس میں یہ تصریح نہیں کہ گذشتہ اور آئندہ سارے انبیاء اور رسل کی اتنی تعداد ہے۔ اور نہ ہی اس میں اشارہ تک پایا جاتا ہے کہ آئندہ کوئی نبی یا رسول نہ ہو گا۔ پس یہ حدیث ہمارے مخالفین کو کچھ فائدہ نہیں دے سکتی۔

اس کے علاوہ یہ بھی یاد رکھنا چاہیئے کہ ایک لاکھ چوبیس ہزار کی تعداد کوئی معین تعداد نہیں ہے۔ چنانچہ علامہ محمد نووی الجاوی الشافعی اپنی کتاب فتح المجید شرح الدر الفرید میں لکھتے ہیں:۔

"قیل بحصرھم فی عددٍ معیّنٍ فقیل مائة الف و اربعة وعشرون الفاً کما ورد فی روایةٍ وھذا ھو المشھور وفی روایة وخمسة وعشرون الفاً وقیل مائتا الف و اربعة وعشرون الفاً کما ورد فی روایة اُخریٰ وزِدوی انھم الف الف ومائتا الف وفی روایة واربعمائة الف واربعة وعشرون الفاً الرسل منھم ثلٰثمائة وثلٰثة

عشر کعدد اہل بدر وقیل واربعۃ عشر کعدد جیش طالوت الذین صبروا معہ علیٰ قتل جیش جالوت وقیل خمسۃ عشر لکن الاولیٰ عدم حصرھم ای الانبیاء والرسل فی عدد معین۔" (صلہ)

یعنی بعض لوگ اس بات کے قائل ہیں کہ انبیاء اور رسل کی تعداد مقرر ہے۔ پھر ان میں سے ان کی تعداد جیسا کہ ایک روایت سے ثابت ہوتا ہے ایک لاکھ چوبیس ہزار مانتے ہیں۔ اور یہی قول مشہور ہے۔ اور ایک روایت میں ایک لاکھ چوبیس ہزار کی بجائے ایک لاکھ پچیس ہزار کی تعداد بیان ہوئی ہے۔ ایک اور روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کی تعداد دو لاکھ چوبیس ہزار ہے۔ اور ایک روایت میں ہے کہ ان کی تعداد بارہ لاکھ ہے۔ ان روایات کے علاوہ ایک روایت میں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ ان کی تعداد چار لاکھ چوبیس ہزار ہے۔ ان میں سے بعض کا قول ہے کہ اہلِ بدر کی طرح ۳۱۳ بعض کا قول ہے کہ طالوت کے لشکر کی طرح ۳۱۴۔ اور بعض کا قول ہے کہ ۳۱۵ رسول ہیں۔ مگر زیادہ بہتر یہی قول ہے کہ انبیاء اور رسل کی تعیین نہ کیجائے"

یہ حوالہ ایک مشہور عالم کتاب کا ہے۔ اس میں اس نے انبیاء اور رسل کی تعداد کے متعلق جتنی روایات پائی جاتی تھیں درج کر دی ہیں۔ اس اختلاف کے ہوتے ہوئے پھر ان کی تعداد کا مقرر کرنا۔ اور پھر اس پر اڑے رہنا ایک بے معنی اور لغو بات ہے۔

ان روایات کے علاوہ ایک اور روایت بھی پائی جاتی ہے جس میں اس امر کا اظہار کیا گیا ہے کہ آٹھ ہزار انبیاء مبعوث ہوئے ہیں۔ جن میں سے چار ہزار تو بنی اسرائیل میں سے تھے اور چار ہزار دوسری اقوام میں سے تھے (ملاحظہ ہو منتخب کنز العمال بحاشیہ مسند احمد جلد ۵ صلہ)

مسلمانوں کے لئے کسی اختلاف کے فیصلے کے دو ہی طریق ہیں۔ فردّوہ الی اللہ والرسول (سورۃ نساء آیت ۵۹) کہ اوّل اسے اللہ تعالیٰ کے فرمان اور کلام سے طے کیا جائے۔ دوم آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان سے اُسے جانچا جائے۔

جیسا کہ بیان ہو گیا اس اختلاف کے متعلق احادیث میں شدید اختلاف ہے۔ اور وہ قولِ مشہور جس کی بناء ایک حدیث پر ہے' وہ حدیث بھی مجروح ہے۔ پس ہمارے لئے

فیصلہ کی ایک ہی صورت ہے وہ یہ کہ ہم اس اختلاف کو کلام الٰہی ، قرآن پاک پر پیش کریں۔ جو فیصلہ اس کی طرف سے صادر ہو وہی قطعی اور یقینی فیصلہ ماننا چاہئے۔

قرآن کریم میں اللہ تعالےٰ فرماتا ہے۔ منهم مَّن قصصنا عليك ومنهم مَّن لم نقصص عليك (سورہ المؤمن آیت ۷۸) کہ گزشتہ رسولوں میں سے بعض کو ہم نے بیان کر دیا ہے اور بعض کو ہم نے بیان نہیں کیا۔

اسی طرح دوسری جگہ فرمایا۔ ورُسُلاً قد قصصنٰهم عليك من قبل و رُسُلًا لم نقصصهم عليك (سورہ نساء آیت ۱۶۴) یعنی بعض رسولوں کے متعلق تو ہم نے تجھے اطلاع دی ہے اور بعض رسولوں کے متعلق ہم نے تمہیں کچھ نہیں بتایا۔

یہ دو فرمان اس اختلاف کے متعلق صاف فیصلہ دیتے ہیں کہ ان کی تعداد کا آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کو کوئی علم نہیں دیا گیا۔ ہاں ان میں سے بعض کا ذکر کر دیا گیا ہے۔

اسی فرمان کے زیر نظر علامہ الدسوقی اپنے الحاشیہ شرح ام البراہین کے ص۱۹۴ پر لکھتے ہیں:-

"فهو حديثٌ مُتكلَّمٌ فيهِ والحق انّ كلاً من الانبياء والرُّسُلِ لا يعلم عدّتهُ الّا الله لقوله مِنهُم مَّن قَصَصنَا عَلَيكَ وَمِنهُم مَّن لَّم نَقصُص عَلَيكَ۔"

یعنی وہ حدیث (جس میں انبیاء کی تعداد ایک لاکھ چوبیس ہزار بتائی گئی ہے) مجروح ہے (جسے دلیل نہیں بنایا جا سکتا) اور سچی بات یہ ہے کہ انبیاء اور رسل کی صحیح تعداد کو صرف اللہ تعالےٰ ہی جانتا ہے۔ کیونکہ وہ خود فرماتا ہے کہ ان انبیاء میں سے بعض کے متعلق تو ہم نے تجھے (اے نبی!) بتایا ہے اور بعض کے متعلق کچھ نہیں بتایا۔"

جب خدا تعالےٰ نے انبیاء اور رسل کی تعداد کا ذکر نہیں فرمایا۔ اور پھر اسکے متعلق رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی بھی کوئی صحیح حدیث نہیں ملتی تو ہمیں کوئی حق نہیں کہ ان کی تعداد کو مقرر کریں اور پھر اس پر اصرار کریں۔

بعض لوگ یہ کہتے ہیں کہ اللہ تعالےٰ نے پچیس رسولوں کا خود قرآن کریم میں ذکر فرمایا ہے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کی تعداد پچیس ہی ہے۔ یہ اعتراض میں نے ملایا کی طرف بعض دفعہ سنا ہے۔

ان کی یہ دلیل نہایت ہی بدیہی البطلان ہے۔ اوّل اس لئے کہ قرآن کریم نے خود وضاحت فرمادی ہے کہ اس میں سارے انبیاء اور رسولوں کا ذکر نہیں بلکہ صرف چند افراد کا ذکر ہے۔ قرآن کریم نے کہیں اشارہ تک نہیں فرمایا کہ انبیاء ورسولوں کی تعداد صرف اتنی ہی ہے جتنی کا اس میں ذکر ہوا۔ پس چند انبیاء و رسل کا ذکر تمام انبیاء اور رسل کی تعداد کے لئے کیسے دلیل گردانا جاسکتا ہے۔

دوم۔ یہ بھی یاد رکھنا چاہیئے کہ جن انبیاء کے نام قرآن کریم میں ذکر ہوتے ہیں وہ ۲۸ ہیں۔ چنانچہ علامہ الخازن تصریح فرماتے ہیں:۔

"المذکورون منھم فی القرآن باسماء الاعلام ثمانیۃ وعشرون نبیاً" (تفسیر خازن جلد ۱ ص۱۶۹) کہ جن انبیاء کے نام قرآن کریم میں درج ہیں ان کی تعداد ۲۸ (اٹھائیس) ہے۔

گویا ان دونوں باتوں میں اختلاف ہوگیا۔ لیکن اگر ہم خود تحقیق کریں تو ہمیں قرآن کریم کے مطالعہ سے معلوم ہوگا کہ:۔

امر اوّل:۔ بعض ایسے نبی ہیں جن کا قرآن کریم میں نام بھی درج ہے اور ان کا عُہدۂ رسالت بھی درج ہے۔ اور پھر ان کے عہدۂ نبوت و رسالت کے متعلق مسلمانوں کا اتفاق بھی ہے۔ ایسے انبیاء کے نام یہ ہیں:۔ (۱) ابراہیمؑ (۲) ادریسؑ (۳) اسحاقؑ (۴) اسمٰعیلؑ (۵) الیاسؑ (۶) الیسعؑ (۷) ایوبؑ (۸) داؤدؑ (۹) زکریاؑ (۱۰) سلیمانؑ (۱۱) شعیبؑ (۱۲) صالحؑ (۱۳) عیسیٰؑ (۱۴) لوطؑ (۱۵) موسیٰؑ (۱۶) نوحؑ (۱۷) ہارونؑ (۱۸) یحییٰؑ (۱۹) یعقوبؑ (۲۰) یوسفؑ (۲۱) یونسؑ (۲۲) محمد صلے اللہ علیہ وسلم۔

امر دوم:۔ وہ نبی ہیں جن کا نام قرآن کریم میں درج ہے مگر ان کے عہدہ کا صراحتاً ذکر نہیں ہے۔ مثلاً آدم علیہ السلام کے متعلق قریباً تمام مسلمانوں کا اتفاق ہے کہ وہ نبیٔ مرسل ہیں اور بعض احادیث میں بھی اس کا ذکر ہوا ہے۔ اور قرآن مجید کے طرزِ بیان سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ آپ نبی ہیں مگر آپ کے متعلق صریح طور پر نبی یا رسول کا لفظ مجھے قرآن کریم میں نظر نہیں آیا۔

اسی طرح عزیر علیہ السلام کے متعلق عام اہل تاریخِ اسلام اور عام علماء اسلام کا خیال ہے کہ وہ نبی ہیں مگر ان کے متعلق قرآن کریم میں رسالت یا نبوت دیئے جانے کا

بوضاحت ذکر نہیں ہوا۔

امر سوم۔ وہ نبی ہیں جن کا نام قرآن کریم میں درج ہوا ہے مگر اس کے متعلق اختلاف ہوا ہے کہ کیا وہ نام صفتی ہے یا ذاتی۔ اور پھر ان کی نبوت و رسالت کے متعلق بھی اختلاف ہوا ہے۔ ان میں سے پہلے ذوالکفل ہیں۔ بعض کہتے ہیں کہ یہ ان کا ذاتی نام ہے اور وہ نبی ہیں۔ اور یہی مشہور عقیدہ ہے۔ مگر بعض لوگ کہتے ہیں کہ یہ زکریاؑ کا لقب ہے اور بعض کہتے ہیں کہ یہ الیاسؑ کا صفتی نام ہے۔ (ملاحظہ ہو خازن جلد ۴ صفحہ ۲۵۷) اور بعض کہتے ہیں کہ یہ حزقیل کا دوسرا نام ہے۔ (خازن جلد ۱ صفحہ ۲۱۱) حضرت موسی الاشعریؓ اور مجاہد اس بات کے قائل تھے "لم یکن نبیاً" (تفسیر کبیر جلد ۶ صفحہ ۱۲۳) کہ ذوالکفل نبی نہ تھے بلکہ ایک مرد صالح تھے۔ پھر جلالین جلد ۲ صفحہ ۲۷۱ مطبع مجیدی کانپور میں بھی یہ اختلاف درج ہے۔ اور اس کے حاشیہ پر درج ہے کہ حضرت ابن عباسؓ بھی ان کی نبوت کے قائل نہ تھے۔

اسی طرح حضرت ادریسؑ کے متعلق لکھا ہے کہ یہ ان کا صفاتی نام تھا۔ "قیل سمی ادریس لکثرة دراسته واسمه اخنوخ" (تفسیر کبیر جلد ۵ صفحہ ۵۵۱) کہا گیا ہے کہ ادریس کا ذاتی نام اخنوخ تھا، مگر کثرت مطالعہ اور کثرتِ درس کی وجہ سے ان کا نام ادریس رکھدیا گیا ہے۔ اور بعض لوگ کہتے ہیں کہ ادریس اور الیاس ایک ہی شخص کا نام ہے۔ (تفسیر خازن جلد ۶ صفحہ ۲۵) مگر حضرت ادریس کو بالاتفاق نبی مانا گیا ہے خواہ اسے صفتی نام تسلیم کریں اور خواہ اس کا نام اخنوخ ہو یا الیاس۔

اگر ذوالکفل اور ادریس کو صفتی نام قرار دیں تو ذوالکفل ایک مرد صالح ماننے یا زکریا کا دوسرا نام تسلیم کرنے سے ایک اور نبی کی تعداد میں کمی واقع ہو گئی۔ اسی طرح اگر ادریسؑ کو حضرت الیاسؑ کا صفتی نام تسلیم کر لیا جائے تو قرآن کریم میں مذکورہ تعداد میں دو کی کمی واقع ہو گئی۔ پھر ان کے ساتھ اگر آدمؑ اور عزیرؑ کو بھی ملا لیا جائے جن کو صراحتاً قرآن کریم میں نبی اور رسول قرار نہیں دیا گیا تو چار کی کمی واقع ہو گئی۔

امر چہارم:۔ ایسے لوگ ہیں کہ جن کے نام قرآن کریم میں درج ہوئے ہیں (خواہ وہ صفتی نام ہوں یا ذاتی) مگر ان کی نبوت و رسالت کے متعلق بہت بڑا اختلاف ہوا ہے ان میں سے اول ذوالقرنین ہے "واختلفوا فی نبوته فقیل کان نبیاً..."

وقیل لم یکن نبیًا" (خازن جلد ۴ صفحہ ۱۸۰) کہ علماء میں ذوالقرنین کی نبوت کے متعلق اختلاف ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ وہ نبی تھا... اور بعض کہتے ہیں کہ وہ نبی نہ تھا"
دوسرا تُبّع ہے۔ نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے "ما ادری اکان تُبّع نبیًا او غیر نبی وعن ابن عباس انہ کان نبیًا" کہ میں نہیں جانتا کہ تبع نبی تھا کہ نہیں مگر ابن عباس رضی اللہ تعالےٰ عنہ فرماتے ہیں کہ وہ نبی تھا" (تفسیر ابو السعود)
تیسرا شخص لقمان ہے "وقال عکرمۃ والشعبی کان نبیًا والجمہور علی انہ کان حکیمًا ولم یکن نبیًا" (مدارک التنزیل) کہ عکرمہ اور شعبی کہتے ہیں کہ لقمان نبی تھا۔ مگر جمہور علماء اس بات کے قائل ہیں کہ وہ نبی نہ تھا بلکہ ایک صاحب حکمت آدمی تھا۔

امر پنجم:۔ بعض ایسے انبیاء بھی ہیں جن کا قرآن کریم میں ذکر ہوا ہے مگر انکا نام ذکر نہیں ہوا۔ ان میں سے اول تو سموئیل ہیں (جنہیں سورہ البقرہ کی آیت ۲۴۶ اور ۲۴۷ میں دو دفعہ نبی کے خطاب سے ذکر کیا گیا ہے) مگر ان کا نام قرآن کریم میں کہیں بھی درج نہیں ہوا۔ انہوں نے ہی بحکم خداوندی طالوت (ساؤل) کو بنی اسرائیل کا بادشاہ مقرر کیا تھا۔ دوم۔ سورۃ النساء کی آیت ۱۶۱ میں ذکر ہے کہ خدا تعالےٰ نے الاسباط کی طرف بھی وحی نازل فرمائی (یعنے انہیں نبی بنایا) الاسباط کے متعلق لکھا ہے "وھم اولاد یعقوب وکانوا اثنی عشر" (تفسیر خازن جلد ۱ صفحہ ۴۱۵) کہ اسباط سے مراد یعقوب علیہ السلام کے بارہ بیٹے ہیں" گویا اس آیت کے مطابق بارہ اور انبیاء کا ثبوت مل گیا۔ مگر امام رازیؒ فرماتے ہیں "وقد اختلف الناس فی نبوتہم وھو مشہور" (تفسیر کبیر جلد ۵ صفحہ ۱۶۵) کہ انکی نبوت کے متعلق لوگوں میں اختلاف مشہور ہے۔ سوم۔ اللہ تعالےٰ نے سورہ یٰسین کی آیت ۱۴ (اذ ارسلنا الیہم اثنین۔ الآیہ) میں تین رسولوں کا ذکر فرمایا ہے۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ یہ عیسےٰؑ کے حواری تھے جنہیں آپ نے تبلیغ کے لئے مبعوث فرمایا۔ مگر قرآن کریم کے ظاہری الفاظ کو دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ واقعی رسول تھے۔ جو خدا تعالےٰ کی طرف سے دوسرے رسولوں کی طرح اس بستی مذکورہ کی طرف مبعوث کئے گئے تھے۔ "وقیل انہم کانوا رسلًا من اللہ" (الفتوحات الالٰہیہ للجمل

جلد ۲ صفحہ ۵۲۵) یعنے کئی علماء اِس بات کے قائل ہیں کہ تین شخص واقعی خدا کے رسول تھے۔
گویا ایسے انبیاء کی تعداد چودہ ہے جنہیں خدا تعالےٰ نے نبی کہا مگر قرآن کریم میں ان کے نام ذکر نہیں ہوئے۔

امر ششم:۔ بعض ایسے لوگ بھی ہیں جن کا نام اور عُہدہ دونوں قرآن کریم میں ذکر نہیں ہوئے مگر چونکہ اُن کا ذکر آیا ہے اس لئے لوگوں نے اُن کے متعلق اختلاف کیا ہے۔ چنانچہ اس کی ایک مثال تو حضرت خضر کی ہے۔ یہ وہ عبد ہیں جنکی ملاقات کے لئے موسیٰ علیہ السلام نے ایک اہم سفر شروع کیا تھا۔ ان کے متعلق لکھا ہے "و اختلف فی الخضر أھُوَ نبیٌ او رسول او ملك او وليٌّ والصّحیح انّہٗ نبیٌّ" (الفتوحات الالٰھیہ جلد ۳ صفحہ ۲۳) کہ خضر کے متعلق اختلاف ہوا ہے کہ کیا وہ نبی تھے، رسول تھے، فرشتے تھے یا ولی تھے۔ صحیح بات یہ ہے کہ وہ نبی تھے"۔ امام رازیؒ لکھتے ہیں "قال الاکثرون ان ذٰلك العبد کان نبیًّا" (تفسیر کبیر جلد ۵ صفحہ ۵۰۰) کہ اکثر علماء اِس بات کے قائل ہیں کہ آپ نبی تھے۔
اب دیکھئے اکثر علماء کے نزدیک ایک اور نبی کی زیادتی ہو گئی۔

امر ہفتم:۔ بعض ایسے انبیاء بھی ثابت ہوتے ہیں جن کا قرآن کریم میں ذکر نہیں ہاں روایت میں ان کا ذکر پایا جاتا ہے۔ مثلاً اصحاب الرس کے متعلق روایات میں لکھا ہے کہ انہوں نے اپنے نبی کو قتل کیا (تفسیر کبیر جلد ۶ صفحہ ۲۳۳) اس نبی کا قرآن کریم میں بھی ذکر نہیں اور نہ ہی احادیث میں ذکر ہے۔

حضرت علیؓ سے روایت ہے "انّ اللہ بعث نبیًّا اسود فھو ممّن لم یقصص علیہ" (کشاف جلد ۲ صفحہ ۱۲۵) کہ "خدا تعالےٰ نے ایک سیاہ نبی بھی مبعوث فرمایا تھا مگر وہ قرآن کریم میں ذکر نہیں ہوا"۔

پھر الفتوحات الالٰھیہ للجمل جلد ۳ صفحہ ۴۸۰ پر لکھا ہے۔

"قال السدی بعث الی اھل سبا ثلاثہ عشر نبیًّا"

"سدی مفسر کہتا ہے کہ زمانۂ فترۃ میں اہل سبا کی طرف تیرہ نبی مبعوث ہوئے تھے"

پھر شیث کو نبی تسلیم کیا گیا ہے مگر قرآن کریم اور احادیث میں اُن کے عہدۂ نبوت ورسالت کا کہیں ذکر نہیں ہوا (تاریخ الکامل للطبری جلد ا صـــ۲۲)

پھر ایک اور نبی خالد بن سنان کا ذکر بھی حدیث میں آیا ہے۔

(زاد المعاد جلد ۲ صـــ۵)

اِن سب اُمور پر اگر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ وہ لوگ جو انبیاء کو ایک خاص تعداد میں محدود کرنے کی کوشش کرتے ہیں ان کی یہ کوشش بالکل بے سُود ہے۔ قرآن کریم کی نصوص ان کی تعداد کو باطل قرار دیتی ہیں۔ اور حدیث صحیح میں کسی تعداد کا ذکر نہیں۔ جو حدیث پیش کی جاتی ہے وہ مجروح ہے۔ اور ہرگز ہرگز قابلِ استناد نہیں۔ پس صحیح عقیدہ یہی ہے کہ خدا تعالےٰ نے اپنے انبیاء کو ہر قوم میں مبعوث فرمایا اور ان کی تعداد کا کہیں ذکر نہیں۔ فرمایا ولقد بعثنا فی کُلِّ اُمَّةٍ رَّسُولاً۔ کہ ہم نے ہر ایک اُمت میں رسول مبعوث فرمایا ہے۔ پس ہر ایک اُمت میں نبی مبعوث ہوئے۔ ہم جانیں یا نہ جانیں مگر خدا تعالےٰ کا فرمان اس بات کی صراحت کرتا ہے کہ کوئی اُمت رسول سے خالی نہیں۔ اور کہ تمام انبیاء کی صحیح تعداد کا علم خدا تعالےٰ کے سوا اور کسی کو نہیں ❖

ہندو قوم

(اور)

الہامات حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام

(از جناب محمد علی انور صاحب تار کاندی ضلع میمن سنگھ۔ بنگال)

ہندو قوم سے متعلق الہامات حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام دو طرح واقع ہیں۔ ایک تو وہ الہامات ہیں جو ساری قوم سے تعلق رکھتے ہیں اور ہندو قوم کے مستقبل کے متعلق بزرگ و شاندار پیشگوئیاں ہیں۔ دوم وہ الہامات جو افراد سے تعلق رکھتے ہیں۔ اس قسم دوم کے الہامات کے شاہد بعض ہندو افراد ہیں۔ اور وہ شاہد ہیں بعض نشانات و معجزات کے جو ایسے بین و صاف اور عظیم الشان ہیں کہ شاید ہی کسی اور نبی کے وقت میں کسی دوسری قوم نے دیکھے ہوں۔ اور یہ نشانات عظیم مشتمل بہ الہامات گواہ ہیں اس بات کے کہ وہ الہامات جو ساری قوم سے تعلق رکھتے ہیں ضرور ہے کہ وہ بھی اسی طرح سے پورے ہوں جس طرح سے متذکرہ بالا قسم دوم والے الہامات اپنے وقت میں ترقوں پر پورے ہوئے ہیں۔ سوچنے والوں کے لئے یہاں بہت بھاری نشانات ہیں۔ ہمدرد، طالب حق اور اہل دل سچائی کے تشنہ کو حق کیطرف رہنمائی کے لئے ان الہامات میں وہ سامان موجود ہے جس کی نظیر نہیں ہے۔

(۱)

حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کا پیغام ہے کہ راجہ کرشن جی خدا کے سچے نبی تھے جو بھارت بھوم میں مبعوث ہوئے۔ علیہ الصلوٰۃ والسلام۔ اور یہ کہ حضرت مسیح موعود

علیہ السلام آپ کے مثیل ہیں اور آپ کے نام پر آئے ہیں۔ اور آسمان پر یہ مقدر ہو گیا ہے کہ اب عروجِ ہندو قوم اسلام اور حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام سے وابستہ ہے۔

حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام فرماتے ہیں:-

"راجہ کرشن جیسا کہ میرے پر ظاہر کیا گیا ہے۔ درحقیقت ایک ایسا کامل انسان تھا جس کی نظیر ہندوؤں کے کسی رشی اور اوتار میں نہیں پائی جاتی۔ اور اپنے وقت کا اوتار یعنی نبی تھا جس پر روح القدس اترتا تھا جو خدا کی طرف سے فتح مند اور بااقبال تھا۔ جس نے آریہ بھارت کی زمین کو پاپ سے صاف کیا۔ وہ اپنے زمانہ کا درحقیقت نبی تھا جس کی تعلیم کو پیچھے سے بہت باتوں میں بگاڑ دیا گیا۔ وہ خدا کی محبت سے پُر تھا۔ اور نیکی سے دوستی اور شر سے دشمنی رکھتا تھا۔" (لیکچر سیالکوٹ صفحہ ۲۰)

پھر حضورؑ نے فرمایا:-

"میں ان گناہوں کو دُور کرنے کے لئے جن سے زمین پُر ہو گئی ہے۔ جیسا کہ مسیح ابن مریم کے رنگ میں ہوں ایسا ہی راجہ کرشن کے رنگ میں بھی ہوں۔ جو ہندو مذہب کے تمام اوتاروں میں سے ایک بڑا اوتار تھا۔ یا یوں کہنا چاہئے کہ روحانی رُو سے میں وہی ہوں۔ یہ میرے خیال اور قیاس سے نہیں بلکہ وہ خدا جو زمین اور آسمان کا خدا ہے اس نے میرے پر ظاہر کیا ہے۔ اور نہ ایک دفعہ بلکہ کئی دفعہ مجھے بتلایا ہے کہ تو ہندوؤں کیلئے کرشن اور مسلمانوں اور عیسائیوں کے لئے مسیح موعود ہے۔۔۔۔ یہ خدا کی وحی ہے جس کے اظہار کے بغیر میں رہ نہیں سکتا۔"

(لیکچر سیالکوٹ صفحہ ۲)

پھر آیا ہے:-

"مجھے منجملہ اور الہاموں کے اپنی نسبت ایک یہ بھی الہام ہوا تھا کہ ہے کرشن رودّر گوپال تیری مہما گیتا میں بھی لکھی گئی ہے۔ سو میں کرشن سے محبت کرتا ہوں کیونکہ میں اس کا مظہر ہوں۔" (لیکچر سیالکوٹ صفحہ ۲۲)

پھر حضور رقم فرماتے ہیں :-

"جیساکہ آریہ قوم کے لوگ کرشن کے ظہور کا ان دنوں میں انتظار کرتے ہیں وہ کرشن مَیں ہی ہوں۔ اور یہ دعویٰ صرف میری طرف سے نہیں بلکہ خدا تعالےٰ نے بار بار میرے پر ظاہر کیا ہے کہ جو کرشن آخری زمانہ میں ظاہر ہونے والا تھا وہ تو ہی ہے۔"

"آریوں کا بادشاہ"

یہ سارے الہامات و انکشافات یکم نومبر ۱۹۰۴ء تک کے ہیں۔ مگر واقعات سے ظاہر ہے کہ ستمبر ۱۹۰۰ء میں ہی اللہ تعالےٰ نے حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام پر آپ کا رودر گوپال سِری کرشن ہونا ظاہر فرما دیا۔ چنانچہ حضور نے تحریر فرمایا :-

"کشفی طور پر ایک مرتبہ مجھے ایک شخص دکھایا گیا۔ وہ سنسکرت کا ایک عالم آدمی ہے جو کرشن کا نہایت درجہ معتقد ہے۔ وہ میرے سامنے کھڑا ہوا۔ اور مجھے مخاطب کر کے بولا کہ

ہے رودر گوپال تیری استت گیتا میں لکھی ہے

اسی وقت مَیں نے سمجھا کہ تمام دُنیا ایک رودر گوپال کا انتظار کر رہی ہے کیا ہندو کیا مسلمان اور کیا عیسائی۔ مگر اپنے اپنے لفظوں اور زبانوں میں۔ اور سب نے یہی وقت ٹھہرایا ہے۔ اور اس کی یہ دونوں صفتیں قائم کی ہیں۔ یعنی سوروں کو مارنے والا اور گائیوں کی حفاظت کرنے والا۔ اور وہ مَیں ہوں۔ جس کی نسبت ہندوؤں میں پیشگوئی کرنے والے قدیم سے زور دیتے آئے ہیں کہ وہ آریہ بھارت یعنی اسی مُلک ہند میں پیدا ہوگا۔ اور انہوں نے اس کے مسکن کے نام بھی رکھے ہیں۔ مگر وہ تمام نام استعارہ کے طور پر ہیں۔ جن کے نیچے ایک اور حقیقت ہے۔"

(تحفہ گولڑویہ صفحہ ۱۳۰ حاشیہ)

ف۱ تذکرہ صفحہ ۴۸۳ - صفحہ ۴۸۴

ف۲ تذکرہ صفحہ ۳۶۳ - صفحہ ۳۶۴

پھر فرماتے ہیں :-

"خدا تعالیٰ نے کشفی حالت میں بارہا مجھے اس بات پر اطلاع دی ہے کہ آریہ قوم میں کرشن نام ایک شخص جو گذرا ہے وہ خدا کے برگزیدوں اور اپنے وقت کے نبیوں میں سے تھا۔ اور ہندوؤں میں اوتار کا لفظ درحقیقت نبی کے ہم معنی ہے۔ اور ہندوؤں کی کتابوں میں ایک پیشگوئی ہے اور وہ یہ کہ آخری زمانہ میں ایک اوتار آئے گا جو کرشن کے صفات پر ہوگا اور اس کا بروز ہوگا۔ اور میرے پر ظاہر کیا گیا ہے کہ وہ میں ہوں۔ کرشن کی دو صفات ہیں۔ ایک رودّر یعنی درندوں اور سوروں کو قتل کرنے والا۔ یعنی دلائل اور نشانوں سے۔ دوسرے گوپال یعنی گائیوں کا پالنے والا۔ یعنی اپنے انفاس سے نیکوں کا مددگار۔ اور یہ دونوں صفتیں مسیح موعود کی صفتیں ہیں۔ اور یہی دونوں صفتیں خدا تعالیٰ نے مجھے عطا فرمائی ہیں۔" (حاشیہ تحفہ گولڑویہ صفحہ ۱۳۰)

پھر حضور کے ارشاد یوں مرقوم ہیں :-

"دو دفعہ ہم نے رویا میں دیکھا کہ بہت سے ہندو ہمارے آگے سجدہ کرنے کی طرح جھکتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ اوتار ہیں اور کرشن ہیں۔ اور ہمارے آگے نذر دیتے ہیں۔

اور ایک دفعہ الہام ہوا :-

ہے کرشن رودّر گوپال تیری مہما ہو۔ تیری استتی گیتا میں موجود ہے۔"

(الحکم جلد ۶ صفحہ پرچہ ۲۴ر اپریل ۱۹۰۲ء)

یہ کشف و الہام ۷ر اپریل ۱۹۰۲ء سے قبل کا ہے (تذکرہ صفحہ ۲۹۴)

پھر حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کو بتایا گیا کہ ہندو قوم کو اسلام کی طرف آپ کے ذریعہ خاص توجہ و رغبت ہوگی۔ چنانچہ حضور کا ارشاد ہے :-

"مجھے یہ بھی صاف لفظوں میں فرمایا گیا ہے کہ پھر ایک دفعہ ہندو مذہب کا اسلام کی طرف زور کے ساتھ رجوع ہوگا۔"

(از اشتہار ۱۲ر مارچ ۱۸۹۷ء)

نیز:۔

"میں امید کرتا ہوں کہ کچھ تھوڑے زمانہ کے بعد عنایت الٰہی ان میں سے بہتوں کو اپنے ایک خاص ہاتھ سے دھکا دے کر سچی اور کامل توحید کے اس دارالامان میں داخل کر دے گی جس کے ساتھ کامل محبت اور کامل خوف اور کامل معرفت عطا کی جاتی ہے۔ اور یہ امید میری محض خیالی نہیں ہے بلکہ خدا کی پاک وحی سے یہ بشارت مجھے ملی ہے۔"

(از لیکچر لاہور ص۳۵)

جو اختلافات ملک میں پائے جاتے ہیں ان کے متعلق متواتر وحی کے ذریعہ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کو بتایا گیا۔

"مجھے بہت سے غور کے بعد اور نیز خدا کی وحی کے بعد معلوم ہوا ہے کہ اگرچہ اس ملک میں مختلف فرقے بکثرت پائے جاتے ہیں اور مذہبی اختلافات ایک سیلاب کی طرح حرکت کر رہے ہیں تاہم وہ امر جو اس کثرت اختلافات کا موجب ہے وہ درحقیقت ایک ہی ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ اکثر انسانوں کے اندر سے قوت روحانیت اور خداترسی کم ہو گئی ہے۔ اور وہ آسمانی نور جس کے ذریعہ سے انسان حق اور باطل میں فرق کر سکتا ہے وہ قریباً بہت سے دلوں پر سے جاتا رہا ہے۔ اور دنیا ایک دہریت کا رنگ پکڑتی جاتی ہے۔"

(از لیکچر لاہور ص۲۷)

ظاہر ہے کہ ایسے ہی وقت اور حالات میں کوئی نبی مبعوث ہوا کرتا ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام اس زمانہ میں پیدا ہوئے۔ اور یہ بھی ظاہر ہے کہ اسلام سے موجودہ بے پروائی رغبت سے بدل جائے گی۔ اور یہی امر وحی حق نے نرم الفاظ میں حضرت مسیح موعود علیہ السلام پر ظاہر کیا ہے۔ جیسا کہ اوپر مذکور ہوا ہے اپنی کتاب سرمہ چشم آریہ کے متعلق حضور نے ایک کشف کی بنا پر ۳ راکتوبر ۱۸۹۷ء کو حسب ذیل ارشاد صادر فرمایا:۔

"رات کو بعد تہجد لیٹ گیا۔ تو تھوڑی سی غنودگی کے بعد دیکھا کہ میرے ہاتھ میں سرمہ چشم آریہ کے چار ورق ہیں۔ اور کوئی کہتا ہے کہ آریہ لوگ اب خود

اِس کتاب کو چھپوا رہے ہیں" (الحکم جلد ۲ نمبر ۶ پرچہ ۱۰ اپریل ۱۸۹۸ء)

فرقہ آریہ کے متعلق حضور نے ارشاد فرمایا :۔

"جس مذہب میں روحانیت نہیں اور جس مذہب میں خدا کے ساتھ مکالمہ کا تعلق نہیں اور صدق و صفا کی روح نہیں اور آسمانی کشش اس کے ساتھ نہیں اور فوق العادت تبدیلی کا نمونہ اس کے پاس نہیں وہ مذہب مُردہ مذہب ہے اس سے مت ڈرو۔ ابھی تم میں سے لاکھوں اور کروڑوں انسان زندہ ہوں گے کہ اِس مذہب کو نابود ہوتے دیکھ لو گے کیونکہ یہ مذہب آریہ کا زمین سے ہے نہ آسمان سے اور زمین کی باتیں پیش کرتا ہے نہ آسمان کی" (تذکرہ ایڈیشن دوم ص ...)

ایک الہام یوں ہے :۔

"سیھزم الجمع ویولون الدبر" آریہ مذہب کا انجام یہ ہوگا کہ خدا ان کو شکست دیگا اور آخر وہ آریہ مذہب سے جدا ہو کر اور پیٹھ پھیر لیں گے اور کالعدم ہو جائیں گے۔ یہ الہام مدت دراز کا ہے جس پر قریباً تیس برس کا عرصہ گذرا ہے جس سے اطلاع پہلے ایک آریہ یعنے لالہ شرمپت کو اطلاع دی گئی تھی" (حقیقۃ الوحی ص ...)

ایک الہام میں فرمایا گیا :۔

"اواہن
یعنے خدا تیرے اندر اُتر آیا" (کتاب البریہ ص ...)

یہ الہام بھی ہندو قوم کے لئے خاص طور پر غور طلب ہے۔

ایک الہام انذاری پہلو رکھتا ہے۔ وہ بھی خاص طور پر ہندو قوم سے متعلق ہے :۔

"برہمن اوتار سے مقابلہ کرنا اچھا نہیں"

مثل مشہور ہے ؎

کو بیہر۔ جو میتر

یعنے برہمن وہی ہے جو ہمہ دوست ہے۔ لہٰذا برہمن اوتار سب کا ہمدرد ہونے کی وجہ سے سب کو اپنی طرف کھینچنے والا ہے۔ اور لفظ کرشن بھی اسی کی طرف رہنمائی کرتا ہے۔

پس ضرور ہے کہ مقابلہ کا انجام اچھا نہیں۔ وہ جیسا گوپال ہے ویسا ہی رودّر بھی ہے
ایسا ہی ایک اور الہام ہے جس میں بشارت بھی ہے اور انذار کا خاص پہلو بھی۔
یہ الہام بھی ہندو قوم سے متعلق معلوم دیتا ہے

"اِنِّیْ مَعَ الْاَفْوَاجِ اٰتِیْكَ بَغْتَةً

یعنے مَیں فوجوں کے ساتھ ناگاہ تیرے پاس آنے والا ہوں"

(مکتوبات جلد پنجم حصہ اوّل ص۸۱)

ایک الہام میں حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کو فرمایا گیا:۔

"غلام احمد کی جَے"

اس الہام میں ہندو قوم کے لئے خاص بشارات اور وجوہ مسرت معلوم ہوتی ہیں وہ غور فرمائیں +

ضروری اطلاع

جن احباب کا ریویو آف ریلیجنز اُردو کا چندہ ختم ہے۔ وہ خدام الاحمدیہ کے سالانہ اجتماع کے موقعہ پر اپنا چندہ دفتر کو ادا کرتے جائیں یا آنیوالوں کے ہاتھ روانہ کردیں تاکہ پرچہ اُنکے نام وی۔پی نہ ہو۔

مینجر

فریضۂ تبلیغ اور موجودہ مسلمان

(جناب مسعود احمد صاحب بی۔ اے واقفِ زندگی ابن ماسٹر محمد حسن صاحب آسان لاہوری)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے قبل جتنے بھی رسول و پیغامبر بشیر و نذیر ہادی و رہبر غرض تمام مصلحین و ریفارمر دُنیا میں خدا تعالیٰ کی طرف سے وقتاً بعد وقتٍ تشریف لائے وہ خاص قوموں اور خاص ملکوں کے لیے مبعوث ہوئے تھے ان کی بعثت بعثتِ عامہ نہ تھی۔ ان میں سے ہر ایک کی بعثت کسی ایک قوم، ملک یا علاقے کے لئے مخصوص ہوتی تھی۔ ان کی جدّ و جہد ان کی رسالت کی تبلیغ اور حق کی اشاعت کیا باعتبارِ زمانی اور کیا باعتبارِ مکانی محدود و مقید تھی۔ چنانچہ حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر حضرت عیسٰی علیہ السلام تک جتنے بھی انبیاء دُنیا میں تشریف لائے وہ اپنے اپنے زمانۂ نبوت میں دُنیا کے مختلف حصوں میں خاص خاص قوموں اور لوگوں کو راہِ ہدایت دکھاتے رہے لیکن صرف اور صرف خاتم النبیین حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم ہی اس شان کے نبی تھے کہ آپؐ بیک وقت تمام دُنیا کی طرف مبعوث کئے گئے تھے۔ آپؐ کے مخاطب ایک قوم کے افراد نہیں، ایک ملک کے باشندے نہیں، ایک براعظم کی اقوام نہیں بلکہ بلا تفریق و امتیاز کرۂ زمین پر بسنے والی تمام قومیں تھیں۔ چنانچہ آپکو خدا تعالیٰ کی طرف سے یہی حکم ہوا تھا:۔

قل یایھا الناس انی رسول اللہ الیکم جمیعا ؕ

کہدو کہ اے تمام دُنیا کے لوگو! مَیں تم سب کی طرف رسول بنا کر بھیجا گیا ہوں۔

آپؐ کی بعثت نہ صرف اس لئے بعثتِ عامہ قرار پائی کہ آپؐ بیک وقت تمام دُنیا کی طرف مبعوث کئے گئے تھے بلکہ اس لحاظ سے بھی کہ آپؐ کی رسالت کا فیضان

باعتبارِ زمانی موجودہ دُنیا کے اختتام یعنی روزِ قیامت تک ممتد قرار پایا۔ کیونکہ آپؐ کا لایا ہوا دین متین **الدّین القیّم** کے نام سے مشرف کیا گیا۔

آپؐ کی بعثت کی بیان کردہ یہ فوقیت متقاضی ہے تکمیلِ ہدایت کی، اور پھر تکمیلِ اشاعت کے ایک عظیم الشان نظام کی۔ چنانچہ تکمیلِ ہدایت خدا تعالیٰ نے قرآن مجید کی صورت میں آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے ذریعے حضورؐ کے زمانہ مبارک میں ہی کر دی اور اس کا اعلان الیوم اکملت لکم دینکم و اتممت علیکم نعمتی و رضیت لکم الاسلام دیناً کے الفاظ میں کر دیا۔ اور تکمیل اشاعت کی داغ بیل حضورؐ کے وجودِ باجود کے ذریعے ہی ایسے مستحکم و استوار اصولوں پر ڈال دی کہ جن پر عمل پیرا ہو کر ہر مسلمان تکمیلِ اشاعت کے عظیم الشان کام میں حصہ لے کر حیاتِ سرمدی حاصل کر سکتا ہے۔ اور پھر یہ کہ نہ صرف تکمیلِ اشاعت کی داغ بیل ڈال دی بلکہ بشارت بھی دیدی کہ یہ تکمیل اشاعت ایک زمانہ میں بہ تمام و کمال پُوری ہو کر رہے گی جو آپؐ کے نائب حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کے ہاتھوں ہوگی جیسا کہ آیت ھُوَ الَّذِی ارسل رسولہٗ بالھدٰی و دین الحق لیظھرہٗ علی الدین کلّہٖ سے ثابت ہے کیونکہ تمام مفسرین کا اجماع اِسی پر ہے کہ یہ غلبہ مسیح موعود کے زمانے میں پُورا ہوگا۔

جب ہم آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ طیبہ کا مطالعہ کرتے ہیں تو حضورؐ کی زندگی کا مقصدِ وحید یا نصب العین اعلاءِ کلمۃ اللہ و دعوۃ الی الاسلام نظر آتا ہے۔ آپؐ کا اُٹھنا اور آپؐ کا بیٹھنا آپؐ کا جاگنا اور آپؐ کا سونا، آپؐ کی عبادات اور دیگر دنیوی مصروفیات سب تکمیلِ اشاعت کے لئے وقف نظر آتی ہیں۔ مکہ کی تیرہ سالہ زندگی کا خلاصہ صرف لفظِ "تبلیغ" میں ادا کیا جاسکتا ہے کبھی آپؐ گھر گھر اور قبیلے قبیلے گھوم کر توحید کا اعلان فرما رہے ہیں، کبھی بازاروں میں تبلیغِ حق ہے تو کبھی کعبہ کی دیوار کے نیچے صداقتِ اسلام کا سبق ہے۔ کبھی صفا کی چوٹی پر خدا کا پیغام سُنا رہے ہیں، کبھی مکہ میں ہیں تو کبھی طائف میں سختیاں اُٹھاتے ہیں، مشکلات کا سامنا کرتے ہیں لیکن تبلیغ سے نہیں رُکتے۔ مدینہ میں یہی مصروفیت، یہی مشغلہ،

اردگرد اور دور دراز کے علاقوں سے وفود کی آمد ، ان سے تبادلۂ خیالات اور اسلام کی دعوت ، سلاطینِ عالم کو تبلیغ بذریعہ وفود و خطوط ، مسلمانوں کو دوسرے ممالک میں ہجرت کی ترغیب ، یہ سب کیا تھا ؟ فریضۂ تبلیغ کی ادائیگی ، کس لئے ؟ اس لئے کہ خدا تعالےٰ کی طرف سے بار بار یہی حکم ہوتا تھا جیسا کہ قرآن مجید میں آتا ہے۔

۱- یٰاَیُّھَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ مَآ اُنْزِلَ اِلَیْكَ

اے خدا کے رسول ! جو کچھ تم پر اُتارا گیا ہے اس کو لوگوں تک پہنچا دو۔ (مائدہ)

۲- یٰاَیُّھَا الْمُدَّثِّرُ قُمْ فَاَنْذِرْ

اے کپڑا اوڑھنے والے کھڑا ہو اور لوگوں کو ڈرا۔ (مدثر)

۳- وَاَنْذِرْ عَشِیْرَتَكَ الْاَقْرَبِیْنَ (شعراء)

اپنے خاندان کے لوگوں کو سمجھاؤ کہ نافرمانی کی صورت میں عذاب الٰہی سے ڈریں۔

۴- وَكَذٰلِكَ اَوْحَیْنَآ اِلَیْكَ قُرْاٰنًا عَرَبِیًّا لِّتُنْذِرَ

ہم نے قرآن عربی کو اسی لئے بذریعہ وحی تم پر نازل کیا ہے

اُمَّ الْقُرٰی وَمَنْ حَوْلَھَا (شوریٰ)

کہ تا تو اہلِ مکہ اور اطراف مکہ والوں تک پہنچا کر ڈرا دے۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی سے ظاہر ہے کہ مسلمان کی زندگی میں فریضۂ تبلیغ کس قدر اہمیت رکھتا ہے۔ موجودہ زمانے میں جبکہ مسلمان اسلام کی تعلیم سے دور جا پڑے ہیں اور صرف نام کے مسلمان رہ گئے ہیں ، وہ دیگر فرائض کے ساتھ فریضۂ تبلیغ سے بھی غافل ہیں۔ بلکہ یہاں تک نوبت آ چکی ہے کہ مغربی سیاست کی دلفریبی سے مرعوب ہو کر وہ اِس فریضے کی ادائیگی کے منکر ہوتے جا رہے ہیں۔ اکثر نوجوان جو دین سے بالکل کورے ہیں کہتے ہیں کہ "کبھی تبلیغ سے بھی کوئی عقیدہ بدلتا ہے ہاں ڈنڈے کے زور سے سب کچھ کرایا جا سکتا ہے۔ وہ زمانے لد گئے جب تبلیغ کارگر ہو جاتی تھی۔ یہ رسول اللہ ہی کی شخصیت تھی کہ مؤثر تبلیغ کر لیتے تھے۔ اور قرآن میں کھلے الفاظ میں اُنہی کو حکم ہے کہ اے رسولؐ ! تبلیغ کر ، یہ کام ہر شخص کے بس کا نہیں "۔ یہ خیال ایسا تباہ کن ہے کہ اسی کی وجہ سے مسلمان آج اس حالت کو پہنچے اور اسی کی بدولت دن بدن اخلاقی

اور سیاسی طور پر ذلت کے گڑھے میں گرتے جا رہے ہیں۔

چونکہ فریضۂ تبلیغ میں کوتاہی سے سیاسی طور پر بھی ہندوستان کے مسلمانوں کو سخت نقصان پہنچا ہے اس لئے اِس سیاسی نقصان کا ذکر بھی ضمناً بیان کر دینا مناسب معلوم ہوتا ہے۔ اگر ہم ہندوستان کی تاریخ پر نظر ڈالیں تو ہم دیکھتے ہیں کہ اگرچہ مسلمان قلیل تعداد میں یہاں آئے لیکن کامل سات سو برس تک نہایت شان و شوکت اور دبدبہ و عظمت سے انہوں نے یہاں کے باشندوں پر حکومت کی لیکن ان کی یہ حکومت محض سیاسی اقتدار کے پیشِ نظر تھی۔ صرف چند باخدا اور پاک طینت بادشاہوں کو چھوڑ کر دیگر شاہانِ اسلام کی حکومت کا مقصد احیاء اسلام اور تکمیلِ اشاعت نہ تھا۔ خدا کی ہزار ہزار برکتیں ہوں ان معدودے چند مقدس وجودوں پر جو محض تبلیغ اسلام کی خاطر یہاں ہجرت کر کے آئے اور یہیں کے ہو رہے اور آج اُنہی کی مبارک کوششوں کی بدولت مسلمان یہاں دس کروڑ کی تعداد میں موجود ہیں۔ وہ معدودے چند مقدس وجود حضرت معین الدین چشتیؒ اور ان کی قبیل کے دوسرے بزرگانِ دین ہیں۔ اگر یہ مجاہدین یہاں تشریف نہ لاتے تو مسلمانوں کی اِس وقت بہت بُری حالت ہوتی۔ اور کوئی تعجب نہ تھا کہ مسلمان یہاں چوڑھے چماروں کی طرح نظر آتے۔

مسلمان بادشاہوں نے سیاسی غلبہ حاصل کرنے کی کوشش کی، یہ تو چاہا کہ یہاں کے باشندے محکوم رہیں، لیکن یہ نہ چاہا کہ یہ سب کے سب حلقہ بگوش اسلام ہو جائیں اور ہماری حکومت کو اپنی حکومت سمجھنے لگیں۔ انہوں نے اس مقصد کو ایک دوسرے طریق سے حاصل کرنے کی کوشش کی جس سے مؤخر الذکر طریق کے مقابلے میں عارضی طور پر حصولِ مقصد میں کامیابی ہو سکی یعنی یہ کہ انہوں نے مذہب وغیرہ کے معاملے میں ناجائز رواداری سے کام لے کر غیر مسلم رعایا کو حکومت کے ساتھ وابستہ رکھا۔ برخلاف اسکے انہوں نے ان بزرگانِ دین کی جو اسلام پھیلانے یہاں گھر بار چھوڑ کر آئے مخالفت کی اور اُن کی توہین کے مرتکب ہوئے۔ ایسے مولوی جو بادشاہوں کی ہاں میں ہاں ملا کر اپنی وجاہت کو قائم رکھنا چاہتے تھے دربار میں راہ پا گئے اور اس طرح وہ مجاہدین جو خدمتِ دین کا جذبہ لے کر میدانِ تبلیغ میں نکلے تھے اکثر زیرِ عتاب رہے۔ کسی کو سُولی پر لٹکا دیا گیا، کسی کی کھال کھنچوائی گئی تو کسی کی بھرے دربار میں ڈاڑھی منڈوا دی گئی اور

ان مجاہدین کو سخت مشکلات میں سے گذر کر اشاعت اسلام کا کام کرنا پڑتا۔ اور بچارو ناچار اُن کو حالات کے مطابق طریقہ تبلیغ میں تبدیلی کرنی پڑی اور عارضی طور پر بعض ایسی رسوم کو اختیار کرنا پڑا جو یہاں کے باشندوں میں رائج تھیں۔ مثلاً قوالی بمقابلے بھجن اور نذر و نیاز بمقابلے پرشاد۔ الغرض اس طرح سے اپنوں ہی کے ہاتھوں تکلیفیں اٹھا اٹھا کر ان مجاہدین نے فرض تبلیغ ادا کیا اور پھر بھی کروڑوں انسان محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی غلامی میں داخل ہوئے۔ بے شک مسلمان بادشاہ شہری، معاشی اور سیاسی حقوق یہاں کے باشندوں کو پورے پورے دیتے ساتھ ہی مذہبی آزادی کا دور دورہ اس طرح پر رکھتے کہ دونوں طرف مذہبی فرائض کی ادائیگی اور اپنے اپنے مذہب کی تبلیغ میں کسی کو کوئی روک نہ ہوتی اور بحیثیت مسلمان ہونے کے اپنا فرض تبلیغ اس طرح ادا کرتے کہ ایسے بزرگان دین جو تبلیغ اسلام میں منہمک تھے ان کی پوری پوری تعظیم و تکریم کرتے اور ایسی آسانیاں جو غیر جانبدارانہ حیثیت رکھتی ہیں ان کو بہم پہنچاتے تو آج سوائے اسلام کے شاید ہی کوئی اور مذہب ہندوستان میں نظر آتا۔ اور سیاسی طور پر مسلمان اس قدر دل قتور ہوتے کہ اپنے حقوق کی حفاظت کے لئے ان کو پاکستان کی ضرورت پیش نہ آتی۔ برخلاف اس کے مسلمان حکمرانوں نے یہ کیا کہ ہندوؤں کی دلجوئی اس رنگ میں کرتے رہے کہ مذہب میں ہندوانہ رسوم کو داخل کر کے اور ان سے رشتے ناطے کر کے ان کی ہمدردی کو اپنی اپنی ذاتی حکومت سے وابستہ رکھا۔ کاش وہ ذاتی حکومت کی بجائے اسلامی حکومت سے وابستہ کرنے کی کوشش کرتے۔

یہ ہے وہ زبردست سیاسی نقصان جو ہندوستان کے مسلمانوں کو تبلیغ کو چھوڑ دینے سے اٹھانا پڑا۔ افسوس تو یہ ہے کہ اب بھی مسلمان اپنی اس روش سے باز نہیں آتے اور محض سیاسی اقتدار کے پیچھے جو موجودہ روش پر قائم رہ کر ملنا مشکل ہے۔ فریضہ تبلیغ سے غافل ہیں۔ نہ صرف غافل ہیں بلکہ اس کے سخت خلاف بھی ہیں۔ اس زمانے میں خدا تعالےٰ نے اسلام کو دوبارہ شوکت اور غلبہ بخشنے کے لئے حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کو مبعوث فرما کر آپ کے حسن و احسان میں نظیر بیٹے حضرت مصلح موعود کے ذریعے تبلیغ اسلام کے ایک عظیم الشان نظام کی بُنیاد ڈالی ہے۔ اور روئے زمین پر اس وقت جماعت احمدیہ ہی ایک ایسی جماعت ہے جو اپنی کوششوں پر بھروسہ کرتے نہیں بلکہ تازہ بتازہ

بشارتوں کے ماتحت خدا کے حکم کی تعمیل میں تکمیلِ اشاعت کے کام کو کامل اخلاص اور جانفشانی سے انجام دے رہی ہے۔ لیکن اپنی شومیٔ قسمت سے اِس زمانے کے مسلمان بھی گذشتہ مسلمانوں کی روش پر چل کر اِس جماعتِ حقّہ کی مخالفت کرتے ہیں۔ لیکن اب وہ دن دُور نہیں ہیں کہ جب انہیں اپنی غلطی کا احساس ہوگا اور اُن کی آئندہ نسلیں ان پر لعنت بھیجیں گی کہ یہ اِس خدائی جماعت کی مخالفت کر کے ہماری ترقی کے راستے پر روک بنے رہے۔ خدا تعالےٰ کی طرف سے اب یہ مقدر ہو چکا ہے کہ ان کے دل در جماعت احمدیہ ہی کے ہاتھوں دُھلیں گے، کیونکہ اب ہندوستان میں ہی نہیں بلکہ تمام دُنیا میں مسلمانوں کی اکثریت اِسی جماعت کے ہاتھوں ہونی ہے۔ دُنیا کی کوئی طاقت نہیں جو خدائی تقدیر کو بدل سکے۔ ہندوستان کا ایک گوشہ نہیں بلکہ تمام دُنیا پاکستان بننے والی ہے۔

تبلیغِ حق اور سیاست کا یہ باہم تعلق ظاہر کرتا ہے کہ فریضۂ تبلیغ مسلمان کے لئے کس درجہ اہم ہے۔ اس کے علاوہ کلامِ مجید میں بالصّراحت ایسی تعلیم موجود ہے، جو منکرینِ تبلیغ کے خیالات کی تردید کرتی ہے۔ اوّلاً ان کا یہ کہنا کہ تبلیغ کا حکم صرف آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ قدسی صفات کے لئے ہی ہے کیونکہ وہ اسی کام کے لئے مامور تھے، بالکل غلط ہے۔ قرآن مجید میں ایسی متعدد آیات ہیں جن میں تمام مسلمانوں کو تبلیغ کا حکم دیا گیا ہے۔ لیکن اگر بفرضِ محال یہ مان بھی لیا جائے کہ تبلیغ کا حکم آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے لئے ہی خاص ہے تو بھی یہ فریضہ ہم پر اسی طرح عائد ہوتا ہے جس طرح دوسرے وہ فرائض جن کی ادائیگی کا حکم ہر مسلمان کو صاف اور صریح الفاظ میں دیا گیا ہے۔ اسلئے کہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی زندگی اس دُنیا میں تمام شعبہ ہائے زندگی پر حاوی ہے جس میں افراط اور تفریط سے پرہیز کرتے ہوئے زندگی کے ہر نشیب و فراز میں کامل صحیح قابلِ عمل اور قابلِ تقلید نمونہ موجود ہے۔ قرآنِ مجید میں خدا تعالےٰ خود فرماتا ہے:-

لقد کان لکم فی رسولِ اللہِ اُسوۃٌ حسنۃ (احزاب)

اے لوگو! اللہ کے رسول کی ذات میں تمہارے لئے بہترین نمونہ موجود ہے۔

نیز یہ کہ:- قل اِن کنتم تحبّون اللہ فاتبعونی یُحببکمُ اللہ (آل عمران)

اے پیغمبر! لوگوں سے کہہ دو کہ اگر تم اللہ سے محبت رکھتے ہو تو میری پیروی کرو اسکے نتیجے میں خدا خود تم سے محبت کرنے لگیگا۔

تاریخ بتاتی ہے کہ تمام عمر رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم پورے انہماک کے ساتھ فریضۂ تبلیغ کی ادائیگی میں سرگرم عمل رہے۔ اور اپنے عمل سے دیگر شعبہ ہائے زندگی کی طرح تبلیغ کی اہمیت، طریق تبلیغ اور اصولِ تبلیغ کو اس قدر وضاحت سے اپنے متبعین پر ظاہر فرمایا کہ اس شعبے کا کوئی شعبہ ایسا نہیں کہ جو تشنۂ تکمیل رہ گیا ہو۔ چنانچہ صحابہ کرامؓ اور ان کی آئندہ نسلوں نے وہ کارہائے نمایاں اس میدان میں سرانجام دیئے کہ جس کی بدولت خود موجودہ منکرینِ تبلیغ سیاسی فوائد کے پیشِ نظر ہی سہی اپنے آپ کو مسلمان کہتے ہیں۔ پس اگر اس فریضہ کی ادائیگی کے لئے صاف اور صریح آیات نہ بھی ہوں تب بھی طرزِ نبویؐ میں اس کی ادائیگی ضروری ہے۔ تبلیغ اور اشاعتِ دین کے اہم کام کو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی ذات تک ہی محدود قرار دینا سراسر منشاءِ الٰہی کے خلاف ہے۔ کیونکہ منشاءِ الٰہی کے مطابق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ مبارک ہمارے لئے قیامت تک کے لئے بہترین قابلِ تقلید نمونہ بنائی گئی ہے۔

جب ہم قرآن کریم پر غور کرتے ہیں تو تبلیغ کی ادائیگی کے لئے ایسے صاف اور صریح تاکیدی احکام تمام مومنین کے لئے اس میں موجود پاتے ہیں کہ نجاتِ اُخروی اور فلاحِ دُنیوی اس پر موقوف نظر آتی ہے۔ خدا تعالےٰ تمام فلاح و بہبودی صرف ایمان لانے والے کے لئے نہیں بلکہ متقی کے لئے مقدر کرتا ہے۔ اور متقی صرف اسی کو گردانتا ہے جو دیگر فرائض کے ساتھ ساتھ فریضۂ تبلیغ کو بھی کما حقہٗ ادا کرتا ہے۔ متقیوں کی تعریف، ان کی پہچان اور ان کے کام کی تفصیل ان الفاظ میں بیان فرماتا ہے:-

هُدًى لِّلْمُتَّقِينَ الَّذِينَ يُؤْمِنُونَ بِالْغَيْبِ وَ

یہ کتاب ہدایت کرتی ہے متقیوں کو یعنی ان لوگوں کو جو غیب پر ایمان لاتے ہیں اور

يُقِيمُونَ الصَّلٰوةَ وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُونَ ۝

نماز کو قائم کرتے ہیں اور جو کچھ ہم نے انکو دیا ہے اس میں سے خرچ کرتے ہیں۔

یعنی متقی لوگ وہ ہیں جو خرچ کرتے ہیں اس کو جو کچھ ہم نے اپنی رحمانیت یا اپنی ربوبیت سے ان کو دیا ہے۔ یہاں صرف اموال ہی مراد نہیں۔ کیونکہ یہاں کسی خاص رزق کی تخصیص نہیں ہے بلکہ ہر وہ چیز جو خدا تعالےٰ کی طرف سے عطا ہوئی ہے

مراد ہے۔ اگر خدا نے زبان دی ہے تو اس سے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا کام لے۔ علم دیا ہے تو اس علم کو دوسروں تک پہنچائے اور ان کو بھی اس سے حصہ دے۔ امر بالمعروف، نہی عن المنکر، علم و عرفان کی اشاعت تبلیغ نہیں تو اور کیا ہے؟ خدا تعالےٰ ایمان کو اصل دولت قرار دیتا ہے اور فرماتا ہے کہ اس کا ملنا بندے کے لئے خدا تعالےٰ کی طرف سے ایک فضل، رحمت، انعام اور عطیہ کے طور پر ہوتا ہے۔ جس کو چاہتا ہے خدا یہ دولت دیتا ہے۔ کیونکہ وہ خود فرماتا ہے ذٰلک ھدی اللہ یھدی بہ من یشاء۔ یعنی یہ ہے اللہ کی ہدایت جس کو وہ چاہتا ہے دیتا ہے۔ چنانچہ ایمان اور ہدایت کا ملنا بھی ایک رزق ہے۔ اور متقی وہی بن سکتا ہے جو ہدایت پاکر، ایمان لاکر اس کو خرچ کرے۔ خرچ کس طرح کرے؟ اس طرح کہ جو ہدایت کے طالب ہیں اُن کو راہِ ہدایت بتائے۔ اور جو اس سے غافل ہیں ان کو اس کی طرف توجہ دلائے۔ خدا تعالےٰ دوسری جگہ فرماتا ہے۔ والذین فی اموالھم حقٌّ للسائل والمحروم کہ ان کی دولت میں مقرر حصہ ہے مانگنے والے کے لئے بھی یعنی جو خود مانگے اُس تک بھی ایمان کی دولت پہنچاؤ اور جو نہ مانگے اور راہِ ہدایت کی تلاش سے غافل ہو اس کو بھی ہدایت دکھاؤ۔ یہی تبلیغِ حق اور اشاعتِ اسلام ہے جس کی ادائیگی پر تقوےٰ کا دار و مدار ہے۔ اور متقی ہونے کے ساتھ ہی فلاح و بہبودی وابستہ ہے۔ کیونکہ متقیوں کی صفات بیان کرکے اللہ تعالےٰ بیان فرماتا ہے اولٰٓئک علٰی ھُدًی من ربّھم و اولٰٓئک ھم المُفلحون۔ یعنی ہدایت مکمل نہیں ہوتی جب تک انسان اس ہدایت کو دوسروں تک نہ پہنچائے۔ اس لئے کہ خدا تعالےٰ متقی کو ہدایت پر سمجھتا ہے نہ کہ خالی مومن کو۔

دوسری آیت جس سے صاف اور صریح طور پر پتہ چلتا ہے کہ تبلیغ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی ذات سے ہی مخصوص نہیں بلکہ اس فریضہ کی ادائیگی مسلمان پر فرض ہے یہ ہے قل ھٰذہٖ سبیلی ادعوا الی اللہ علٰی بصیرۃ انا و من اتبعنی اے رسول! لوگوں سے کہدو کہ یہ میری راہ ہے اور میں بھی بصیرت پر قائم ہو کر تمہیں اللہ کی طرف بلاتا ہوں اور میرے پیرو بھی

اس آیت میں آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے متبعین کی یہ خصوصیت بیان کی گئی ہے کہ وہ آنحضرت صلعم کے ساتھ ان لوگوں کو جو ابھی تک خدا سے دُور اور اُس کی ہدایت سے مہجور ہیں راہِ راست کی طرف لاتے ہیں۔ اس آیت کی روشنی میں تو سیاست کو اپنا دین و ایمان سمجھنے والے تمام نہاد مسلمان تبلیغ کے انکار سے آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی غلامی سے علیحدہ ہو جاتے ہیں۔ حضور اکرمؐ کے پیرو تو وہی قرار دیئے جا سکتے ہیں جو لوگوں کو اللہ تعالیٰ کی طرف بلا کر انصاری الی اللہ ہونے کا ثبوت دیں۔ برخلاف اس کے حالت یہ ہے کہ دوسروں کو بلانا تو درکنار خود خدا سے کنارہ کشی اختیار کرتے چلے جا رہے ہیں۔ اگر قرآن کریم کی پیش کردہ اس ایک نہج پر ہی دیکھا جائے تو جماعت احمدیہ ہی اس زمانے میں حقیقی معنوں میں آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی پیرو جماعت ہے کیونکہ روئے زمین پر صرف یہی جماعت ہے جو دُنیا کے ہر گوشہ میں لوگوں کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے راستے کی طرف بلا رہی ہے۔ مخالفین احمدیت اگر صرف اس امر پر ہی غور کریں تو ان کے واسطے احمدیت کی صداقت کے اعتراف کے لئے یہ ایک دلیل ہی کافی ہے۔

قرآن کریم کی دوسری آیات سے بھی پتہ لگتا ہے کہ تکمیل اشاعت کے اہم کام میں حصہ لینا تو ہر فردِ اُمت پر فرض ہے۔ اِس سے تو کسی کو انکار نہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم خیر الرسل ہیں اور آپؐ کی اُمت خیر الامم ہے لیکن دیکھنا یہ ہے کہ کن صفاتِ عالیہ کی وجہ سے حضورؐ کی اُمت خیر الامم قرار دی گئی ہے۔ خدا صرف آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب ہونے کو خیر الامم کے لقب کا ہم کو حقدار نہیں سمجھتا۔ جہاں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم خیر الرسل اس لئے قرار پائے کہ آپؐ کو خاتم النبیین کہا گیا جو تمام فضیلتیں اپنے اندر رکھتا ہے اور جس کی بدولت آپؐ کی رسالت کا فیضان قیامت تک جاری و ساری قرار پاتا ہے وہاں یہ رتبۂ عالیہ اس لئے آپؐ کو عطا ہوا کہ آپؐ "اپنی پاک باطنی و انشراحِ صدری و عصمت و حیا و صفا و توکّل و وفا اور عشقِ الٰہی" کے لوازم میں تمام دُنیا سے اس درجہ بڑھ گئے کہ آپؐ مظہرِ اتم اُلوہیت قرار پائے۔ اسی طرح آپؐ کی اُمت کا خیر امم ہونا بھی خدا نے آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم سے نسبت پر ہی موقوف نہیں رکھا بلکہ اس تعلق کو عمل سے ثابت کرنے پر موقوف رکھا ہے۔

جیسا کہ فرمایا:۔

كنتم خير امة اخرجت للناس تامرون بالمعروف

تم بہترین اُمت ہو اسلئے کہ تمہاری حیات دوسروں کے لئے ہے کہ انکو نیکی کا درس دو

وتنهون عن المنكر

اور برائیوں سے باز رکھو۔

اِس آیت میں تمام اُمت کو بحیثیتِ مجموعی مخاطب کیا گیا ہے۔ اور اس خطاب سے اُمت کا کوئی فرد بھی مستثنےٰ نہیں۔ ہر ایک کو کہا گیا ہے کہ اس کی زندگی دوسروں کے لئے وقف ہے اور اُمت کو خیر اُمم برقرار رکھنے کی لاج اُس پر ہے۔ پس ظاہر ہے کہ ہر مسلمان دوسروں کو حق کی طرف بلائے، جس گمراہی میں وہ ہیں اس سے ان کو منع کرے اور جس ہدایت پر وہ خود قائم ہے اُن کو بھی اس پر قائم کرے یا دوسرے الفاظ میں فریضۂ تبلیغ کو کما حقہٗ ادا کرتا رہے۔ خدا تعالےٰ اس کو ہی کافی نہیں سمجھتا کہ ہر شخص دیگر دنیوی مصروفیات کے ساتھ ساتھ تبلیغ کے کام کو بھی کرتا رہے بلکہ یہاں تک اس پر زور دیا ہے کہ ایک ایسی جماعت بنانے کا حکم دیتا ہے کہ جو سوائے تبلیغ کے اور کوئی کام نہ کرے۔ ان کی زندگیاں سوائے اس فریضے کی ادائیگی کے اور کسی کام کے لئے نہ ہوں۔ اور اوّل مقصد اور نصب العین ان کا یہی ہو۔ باقی کام ضمنی حیثیت رکھتے ہوں۔ چنانچہ فرماتا ہے:۔

ولتكن منكم امة يدعون الى الخير ويامرون

چاہیئے کہ تم میں سے ایک ایسی جماعت ہو جو نیکی کی طرف بلائے اور نیکی کا درس دے

بالمعروف وينهون عن المنكر (آل عمران ع ۱۱)

اور برائی سے باز رکھے۔

یہ سب اس لئے ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا لایا ہوا دینِ متین ایک خاص قوم کے لئے نہیں بلکہ تمام دُنیا کے لئے ہے۔ دُنیا کے ہر شخص تک اس پیغام کے پہنچنے پر تکمیلِ اشاعت ہو سکتی ہے۔ اور یہ اتنا عظیم الشان کام ہے کہ جب تک دنیا قائم ہے تبلیغ کا یہ سلسلہ جاری رہے گا۔ بہرحال فریضۂ تبلیغ انفرادی اور اجتماعی زندگی میں اتنی اہمیت رکھتا ہے، کہ اُمت کا کوئی فرد اپنے آپ کو اس کی ادائیگی سے سبکدوش خیال نہیں کر سکتا۔ اور اگر ایسا خیال کرتا ہے تو اپنی ذات کو ہی نہیں بلکہ بحیثیتِ مجموعی نقصان پہنچاتا ہے۔ کیونکہ اُس کے اِس فعل سے اُمت کے خیر اُمم ہونے پر زد پڑتی ہے۔

قرآن مجید سے تو یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ خدا تعالیٰ نہ صرف یہ چاہتا ہے کہ نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے پیرو اپنی اپنی جگہ پر دیگر دُنیوی مصروفیات کے ساتھ ساتھ فریضۂ تبلیغ کو بھی ادا کرتے رہیں یا یہ کہ ان میں سے بعض اپنی زندگیاں اس راہ میں وقف کر دیں بلکہ وہ یہ چاہتا ہے کہ وہ اُنکو اپنی زندگی کا مقصدِ وحید بنالیں۔ وطن سے بے وطن ہوں، عزیز و اقارب سے مُنہ موڑیں، دُنیا کے اطراف و اکناف میں پھیل جائیں۔ تجارت کرنیکی غرض سے نہیں، اموال جمع کرنے کی نیت سے نہیں، سیر و تفریح کی خاطر نہیں، بلکہ محض اور محض اعلاءِ کلمۃ اللہ کے نیک ارادے کے ساتھ۔ یہ اس کی خواہش ہی نہیں بلکہ وہ تمام مسلمانوں کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہؓ کو بھی اور آئندہ زمانے کے مسلمانوں کو بھی حکم دیتا ہے کہ جاؤ دُنیا کے کونے کونے میں پھیل جاؤ اور اس عظیم الشان نبی کے پیغام کو جو بیک وقت تمام دُنیا کی طرف تمام زمانوں کے لئے مبعوث کیا گیا ہے، زمین کے ایک سرے سے لے کر دوسرے سرے تک پہنچا دو۔ سورۃ الجمعہ کی ابتدائی آیات میں خدا تعالیٰ اپنے ایک بہت بڑے فضل کا ذکر فرماتا ہے۔ اور آخری آیات میں تمام مومنین کو اوّلین کو بھی اور آخرین کو بھی حکم دیتا ہے کہ تم بھی اِس فضل سے حصہ پاؤ۔ اِس فضل کو ڈھونڈو خواہ اس کی تلاش میں گھر سے بے گھر ہونا پڑے یا کُرۂ زمین پر اس طرح منتشر ہونا پڑے جس طرح کسان زمین میں دانے بکھیرتا ہے۔

ابتدائی آیات میں خدا تعالیٰ اپنے فضل کا ذکر ان الفاظ میں بیان فرماتا ہے:-

هو الذی بعث فی الامیین رسولا منهم یتلوا علیهم

خدا ہی ہے جس نے اُمیوں میں اُنہی میں سے ایک رسول بھیجا جو ان کو خدا تعالیٰ

ایٰته ویزکیهم ویعلمهم الکتٰب والحکمة و

کی آیات پڑھ کر سُناتا ہے اور ان کو پاک کرتا ہے اور کتاب کا علم اور حکمت

ان کانوا من قبل لفی ضلٰل مبین ۝ وآخرین

سکھاتا ہے درآنحالیکہ وہ اس سے قبل کھُلی کھُلی گمراہی میں تھے (اور وہی خدا ہے

منهم لما یلحقوا بهم وهو العزیز الحکیم ۝

کہ جس نے بھیجا رسول) دوسرے لوگوں میں بھی جو ان سے ابھی نہیں ملے (یعنی وہ لوگ جو بعد کے زمانے میں آنے والے تھے) اور اللہ غالب حکمت والا ہے۔

ذٰلك فضل الله يؤتيه من يّشآء والله
یہ رسول کا آکر لوگوں کو حق کیطرف بُلانا، تزکیہ کرنا، کتاب کا علم دینا اور حکمت سکھانا،
ذو الفضل العظيم ○
اللہ کا فضل ہے جس کو چاہتا ہے وہ یہ فضل عطا کرتا ہے اور اللہ تعالیٰ کا فضل بہت وسیع ہے۔

ان آیات میں خدا تعالیٰ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے رسول بنا کر بھیجے جانے کو اور ان لوگوں کا جو کھُلی کھُلی گمراہی میں تھے آپؐ کے ہاتھوں تزکیہ حاصل کرنے، کتاب کا علم اور حکمت سیکھنے کو اپنا فضل قرار دیتا ہے۔ پس اُمتّین اور آخرین میں رسول کا آنا اور ان کے ہاتھوں گمراہ لوگوں میں اسلام کا پھیلنا خدا تعالیٰ کا ایک بہت بڑا فضل ہے۔ سورۃ کے اختتام پر خدا تعالیٰ تمام ان لوگوں کو جو اس رسول پر ایمان لے آئے یہ حکم دیتا ہے

وإذا قضيت الصلوٰة فانتشروا في الأرض وابتغوا من فضل الله واذكروا الله كثيرًا لعلكم تفلحون ○ کہ

اے وہ لوگو! جو ایمان لے آئے ہو، تزکیہ حاصل کر چکے ہو، کتاب کا علم سیکھ چکے ہو اور حکمت و دانائی سے بہرہ اندوز ہو چکے ہو زمین میں پھیل جاؤ اور اس کے فضل میں سے حصہ ڈھونڈو۔

فضل کی تعریف اُوپر بیان ہو چکی ہے۔ یعنی یہ کہ گمراہ لوگوں کا تزکیہ، ان کو خدا کا پیغام سمجھانا اور راہِ راست پر لانا۔ پس خدا حکم دیتا ہے کہ زمین میں پھیل جاؤ اور جس طرح رسولؐ نے تم کو بذریعہ تبلیغ ہدایت دکھائی تم دوسروں کو راہِ ہدایت دکھاؤ کیونکہ اس فریضے کی ادائیگی ایک بہت بڑا فضل ہے اور اس کے بعد ہی فلاح و کامیابی کی امید ہے جیسا کہ آیت کے آخر میں فرمایا لعلكم تفلحون۔ کہا جا سکتا ہے کہ اس سورت میں تو پہلے نماز جمعہ ادا کرنے کے لیے تجارت، خرید و فروخت اور لین دین کو ترک کرنے کا حکم ہے اور نماز جمعہ ادا کرنے کے بعد حکم ہے کہ بے شک اب اِدھر اُدھر منتشر ہو جاؤ اور خدا کا فضل یعنی روزی تلاش کرو۔ کیونکہ نماز جمعہ میں اسی سے روکا گیا تھا۔ اور اس کی ادائیگی کے بعد اُسی کی تلاش کی ترغیب ہے نہ کہ تبلیغ کی۔ اس میں کچھ شک نہیں کہ بظاہر نماز جمعہ کے انصرام کا ذکر اس سورۃ میں ہے لیکن جمعہ کی نماز مقامی طور پر ادا ہوتی ہے اس کی ادائیگی کے بعد حکم یہ ہوتا کہ زمین میں پھیل جاؤ اور اس کے فضل کو تلاش

کرو کچھ عجیب سا معلوم ہوتا ہے۔ اگر جمعہ کی نماز کا اجتماع بین الاقوامی حیثیت رکھتا اور دُنیا کے کونے کونے کے لوگ اس میں جمع ہوتے تو پھر اس فریضے کی ادائیگی کے بعد بیشک یہ حکم کہ اب دُنیا میں پھیل جاؤ مناسب معلوم ہوتا۔ پس یہ امر ظاہر کر رہا ہے کہ یہاں جمعہ سے مراد نمازِ جمعہ کا اجتماع ہی نہیں جس میں ہم ہفتہ میں ایک بار مقامی طور پر اکٹھے ہوتے ہیں بلکہ کوئی اور عظیم الشان اجتماع بھی مراد ہے۔ چنانچہ حضرت خلیفۃ المسیح اوّل رضی اللہ تعالےٰ عنہ نے بھی جمعہ سے مراد نبی کی آمد پر لوگوں کا اس کے ہاتھ پر اکٹھا ہونا لیا ہے۔ پس اس لحاظ سے اس سورۃ کا ایک مفہوم یہ بھی ہوا کہ جب خدا کا نبی بُلائے تو اپنی تمام تجارتیں اور کاروبار چھوڑ کر دیوانہ وار اس کے حضور جمع ہو جاؤ اور جب اس کے ہاتھوں تزکیہ اور کتاب کا علم حاصل کر کے تم راستباز ہو جاؤ جیسا کہ قُضِيَتِ الصَّلٰوةُ کا فقرہ اِس بات کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ کیونکہ صلوٰۃ کہتے ہیں لکڑی کے سیدھا کرنے کو۔ یعنی یہ کہ جب نبی کے ذریعہ تمہاری اصلاح ہو جائے تو دُنیا کے اطراف واکناف میں پھیل جاؤ اور وہ فضل تلاش کرو جو خدا نے رسول پر نازل کیا۔ یعنی گمراہ لوگوں کو ہدایت پر لاؤ اور تبلیغ کا فریضہ ادا کر کے تکمیلِ اشاعت میں حصہ لو۔ تبلیغ کا کتنا صاف اور واضح حکم ہے۔ لیکن اِس زمانے کے مسلمان جب کہ آخرین میں کلام پاک کی پیشگوئی کے مطابق رسول مبعوث ہؤا ہے اور لوگوں کو بُلا رہا ہے کہ وہ تبلیغ کریں اِس فریضے کو آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی ذات یا آپ کے زمانے تک ہی محدود جانتے ہیں اور سیاست کو ہی دین اور مذہب تصور کرتے ہیں۔ خدائی تقدیر اب کچھ اور چاہتی ہے اور وہ یہی ہے کہ احمدیت تبلیغ کے ذریعے دُنیا پر غلبہ پائے گی۔

ایک نیا طریق تبلیغ سے انکار کا اور سیاست کو دین پر غلبہ بخشنے کا یہ اختیار کیا جا رہا ہے کہ لوگ تبلیغ کی اہمیت کا تو اقرار کرتے ہیں لیکن اس کے لئے ایسی شرائط لگاتے ہیں کہ اس کی ادائیگی سے بچ نکلنا ان کے لئے آسان ہو جاتا ہے۔ یہ طریق کمال ہوشیاری سے اعلیٰ تعلیمیافتہ سمجھدار لوگ اختیار کر رہے ہیں۔ تبلیغ کا سرے سے انکار جس کا اُوپر ذکر ہو چکا ہے اکثر کالجوں کی مسموم فضا میں تربیت یافتہ نوجوانوں کا شیوہ ہے۔ بہرحال

یہ نیا طریق جس کو بیان کرنا مقصود ہے یہ ہے کہ لوگ تبلیغ حق کو تکمیل نفس کے بعد ضروری سمجھتے ہیں اور اس سے پہلے تبلیغ کا ارادہ موجب زیاں تصور کرتے ہیں اور تکمیل نفس کو موہبتِ الٰہی قرار دیکر خود تبلیغ سے بے نیاز ہو جاتے ہیں۔ میرے ایک غیر احمدی محترم دوست جو دُنیوی لیاقت کے اعتبار سے بلند درجہ رکھتے ہیں اس موضوع پر بحث کے دوران میں فرمانے لگے بغیر تکمیلِ نفس کے تبلیغ کا ارادہ ایک شیطانی وسوسہ ہے اور تکمیل نفس اپنے بس کی بات نہیں سہ

"ایں سعادت بزورِ بازو نیست تا نہ بخشد خدائے بخشندہ"

جب میں نے اس بات پر زور دیا کہ آپ کو خود بھی تو تکمیلِ نفس کی کوشش کرنی چاہیئے۔ تو ہنس کے کہہ دیا سہ :-

"جانتا ہوں ثوابِ طاعت و زُہد پر طبیعت اِدھر نہیں آتی ...."

لیکن یہ ایک تباہ کن خیال جو موجودہ زمانے میں مسلمانوں میں پھیل رہا ہے اور اس کے نتیجے میں وہ فریضۂ تبلیغ سے غافل ہیں اور سیاست پر ہی جھکے ہوئے ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ تکمیلِ نفس نہایت ضروری ہے اور تبلیغِ حق کو مؤثر بنانے کا موجب ہے اس سے بڑھ کر یہ کہ تکمیلِ نفس بغیر کسی مزید کوشش کے تبلیغِ حق کا کام دیتی ہے۔ لوگ کامل النفس کو دیکھ کر اور اس کے حسنِ معاملگی اور دیگر خوبیوں سے متاثر ہو کر حق کی طرف رجوع کرتے ہیں اسی طرح یقیناً تبلیغ زیادہ مؤثر ہوتی ہے اگر مبلغ خود اس پر عامل ہو جس کی وہ تبلیغ کرتا ہے لیکن تکمیلِ نفس کو بہانہ بنا کر تبلیغ سے پیچھا چھڑانا سخت ناپسندیدہ فعل ہے

قرآن کریم تکمیلِ نفس کی بھی ترغیب دیتا ہے اور تبلیغِ حق کی بھی تاکید کرتا ہے اور ان دونوں کو مسلمانوں کے لئے فرض قرار دیتا ہے۔ لیکن ان میں تقدم و تاخر کے بارے میں نیت پر زور دیتا ہے۔ اگر انسان کی نیت نیک ہو اور نیک نیتی سے وہ تبلیغِ حق شروع کر دے حالانکہ اس کے اپنے نفس کی تربیت ابھی تشنۂ تکمیل ہو تو نتیجہ یقیناً خوشکن ہی ثابت ہوگا اور اس کی دوسروں کو تبلیغ اس کی اپنی ذات کے لئے بھی تکمیلِ نفس کا موجب بن جائے گی۔ بلکہ نیک نیتی سے تبلیغ کرنے والے کے لئے خدا اس بات کا ذمہ لیتا ہے کہ اس کے نفس کی تکمیل وہ خود کرے گا۔ چنانچہ مومن جب تکمیلِ نفس کی تڑپ دل میں لیکر خدا تعالےٰ سے دُعا مانگتے ہیں کہ :-

ربنا اننا سمعنا منادیا ینادی للایمان ان امنوا بربکم فامنا ربنا فاغفر لنا ذنوبنا وکفر عنا سیاتنا و توفنا مع الابرار (آل عمران)

اے ہمارے خدا بے شک ہم نے پکارنے والے کو پکارتے ہوئے سُنا کہ ایمان لاؤ اپنے پرورش کرنے والے پر سو ہم ایمان لے آئے ہیں۔ اے ہمارے رب تو ہمارے گناہ بخش دے اور ہم کی ہماری بُرائیاں دُور کر دے (یعنی ہمکو تکمیلِ نفس عطا کر) اور ہم کو وفات دے اِس حال میں کہ جب ہمارا شمار نیک لوگوں میں ہونے لگے۔

تو خدا تعالےٰ ان کو ایک طریقہ بتاتا ہے جس سے ان کی تکمیلِ نفس ہوسکتی ہے چنانچہ اسی سورۃ میں آگے چل کر فرماتا ہے کہ جب تمہاری نیت نیک ہے اور تمہارے دل میں تکمیلِ نفس کی تڑپ موجود ہے مَیں تم کو بتاتا ہوں کہ جو لوگ تبلیغ حق کریں گے اور اِن راستے میں تکالیف اُٹھائیں گے، گھر سے بے گھر ہوں گے اور اِس راہ میں جان دینے سے بھی دریغ نہ کریں گے مَیں اُن سے اُن کی بُرائیوں کو دُور کر دوں گا یعنی ان کو تکمیلِ نفس عطا کروں گا۔

فالذین ھاجروا و اُخرجوا من دیارھم و اُوذوا فی سبیلی و قٰتلوا و قُتلوا لاکفرن عنھم سیاٰتھم (آل عمران)

پس جن لوگوں نے ہجرت کی اور جن کو نکالا گیا ان کے اپنے وطنوں سے اور جن کو میرے راستے میں دُکھ اُٹھانے پڑے۔ اور جو لڑے اور مارے گئے مَیں ضرور اُن سے اُن کی بُرائیاں دُور کر دوں گا۔

اسی طرح فرماتا ہے:۔

تؤمنون باللہ ورسولہٖ وتجاھدون فی سبیل اللہ باموالھم وانفسھم ذٰلکم خیر لکم ان کنتم تعلمون۔ یغفر لکم ذنوبکم۔

ایمان لاؤ اللہ پر اور اس کے رسول پر۔ اور اپنے اموال اور اپنی جانوں کیساتھ خدا کے راستے میں جہاد کرو۔ یہ تمہارے اپنے فائدے کی بات ہے۔ کیونکہ اس کے بدلے میں خدا تمہارے گناہ بخش دے گا۔

یہاں بھی تبلیغِ حق کی خاطر اپنے اموال اور جانوں کو خرچ کرنے والوں کو خدا تعالےٰ وعدہ دیتا ہے کہ اُن کے گناہ بخشے جائیں گے اور اُن کی بُرائیاں اُن سے دُور کی جائیں گی اور وہی جنت کے وارث بنائے جائیں گے۔ تبلیغ بھی جہاد ہے بلکہ جہادِ اکبر ہے جیسا کہ قرآنِ مجید کی آیت فلا تطع الکافرین وجاھدھم بہ جھاداً کبیراً سے ظاہر ہے۔ پس تبلیغِ حق کے نتیجے میں بھی خدا تعالےٰ انسان کو دوسری نیکیوں اور اعمالِ صالحہ کی توفیق عطا فرماتا ہے جو اس کے لیے تکمیلِ نفس کا موجب بن جاتے ہیں۔ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں بھی ہم یہی دیکھتے ہیں کہ لوگ آج ایمان لاتے تھے اور فوراً تبلیغ شروع کر دیتے تھے اور دن بدن خدا اُن کو نیکیوں میں ترقی کرنے کی توفیق عطا فرماتا تھا کیونکہ ان کی نیت نیک ہوتی تھی اس لئے خدا اُن کے عمل کے نیک ثمرات پیدا کرتا دوسرے لوگ بھی ان کے ذریعے ایمان لاتے اور خود بھی اِس کی وجہ سے نیکیوں میں ترقی کرتے تھے۔

اگر ہم اس مسئلے پر خالص نفسیاتی پہلو سے ہی غور کریں تو ہم اسی نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ تکمیلِ نفس اور تبلیغِ حق لازم و ملزوم ہیں۔ دونوں میں سے کسی ایک کو اختیار کیا جائے دوسرا رُخ خود بخود ظاہر ہو جائے گا۔ اگر انسان تکمیلِ نفس کی خاطر تمام اچھے اعمال بجالائے تمام عبادات پورے شوق اور احترام سے ادا کرے، تقویٰ اور خشیت اللہ کو اپنا شعار بنائے تو اپنی ذات میں کامل ہونے کے بعد جب عرفان اور ایقان اور اس کے نتیجے میں سکینت و اطمینان، آزادئ ضمیر، بشاشتِ قلب اور دیگر نعماءِ روحانی اس کو میسر آئیں گے۔ طبعاً اس کے دل میں خواہش پیدا ہوگی کہ وہ اِس بیش بہا خزانہ کی دوسروں کو بھی اطلاع دے اور جس گمراہی میں وہ پڑے ہوئے ہیں اس سے ان کو نکالے اور اس طرح ان کو دُنیا کے دُکھوں سے نجات دلائے۔ چنانچہ یہ جذبہ اس کو تبلیغِ حق پر مجبور کر دے گا۔ برخلاف اس کے اگر ایک شخص نیک نیتی اور نیک ارادے کیساتھ ایک حق بات کو حق سمجھ کر دوسروں کو اس کی تلقین کرتا ہے اور دوسرے اس سے فائدہ اُٹھاتے ہیں تو طبعاً اس کے دل میں احساس پیدا ہوگا کہ اگر مَیں خود اِن باتوں پر عمل کروں تو کتنا فائدہ اُٹھاؤں، وہ اپنی حالت پر افسوس کرے گا۔ اور یہ افسوس اس کو اپنے نفس کی اصلاح پر مجبور کر دے گا۔ پس نیت اور ارادہ اصل چیز ہے۔ اگر نیت درست ہے تو

دونوں امر ایک حیثیت رکھتے ہیں اور ایک دوسرے کے لئے لازم و ملزوم کی طرح ہیں۔ اکثر استاد صاحبان اپنے افعال میں محتاط ہوتے ہیں اسی لئے کہ وہ بچوں کو نصیحت کرتے ہیں اُن کو بھی باتوں کی ترغیب دیتے ہیں اور بُرائیوں سے روکتے ہیں جہاں بچوں کو اس وعظ و نصیحت سے فائدہ پہنچتا ہے وہاں استاد صاحبان کو اُن کی اپنی عملی زندگی میں اس سے بھی زیادہ فائدہ پہنچتا ہے۔ اور وہ ایسا موقعہ پیدا نہیں ہونے دیتے کہ بچے اُن پر انگشت نمائی کر سکیں۔

اب رہیں وہ آیات جن میں خدا تعالیٰ ایسی تبلیغ سے منع کرتا ہے کہ [illegible] عمل خود ٹھیک نہ ہو اور پھر وہ دوسروں کو نیکی کی طرف بلائے [illegible] اس امر کی مخالفت کرتا ہے کہ ان کی نیت نیک نہیں ہوتی اور وہ جان بوجھ کر نیک اعمال بجالانے سے رُکے رہتے ہیں۔ تکمیلِ نفس سے پہلے ایسی تبلیغ تو یقیناً منع ہے [illegible] انسان کی اپنی اصلاح ساتھ ساتھ نہ ہو اور ایسی تبلیغ کرنے کی وہی شخص جرأت کرے گا جس کی نیت نیک نہ ہو اور وہ دین کو معاش کا ذریعہ بنانا چاہتا ہو اور خدا تعالیٰ کے احکام کو قیمتاً لوگوں تک پہنچا کر اس بہانے اپنے نفس کو موٹا کرنے کا خواہشمند ہو۔

پس قرآن مجید میں فریضۂ تبلیغ کی جو اہمیت بیان ہوئی ہے اس سے ظاہر ہے کہ تقویٰ کا مدار اس فریضے کی ادائیگی پر ہے آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی غلامی کا شرف دوسروں تک ہدایت پہنچانے پر موقوف ہے اور اُمتِ اسلامیہ لقبِ خیر الامم کی حقدار ہے تو تبلیغِ حقہ کرنے کی وجہ سے ہے۔ اب دُنیا کے اطراف و اکناف میں بسنے والے مسلمانوں کی حالت پر غور کیجیے جب وہ [illegible] میں تو تبلیغ تو فریضوں میں سے ایک فریضہ ہے اس کو بہت کم لوگ خاطر میں لاتے ہیں۔ [illegible] افرنگ نے دماغوں پر وہ رنگ چڑھا رکھا ہے کہ ہر شخص [illegible] کا خواہاں ہے اور مادی اسباب پر بھروسہ کرتے ہوئے [illegible] سیاست پر [illegible] ہے۔ یہ ہم ہی نہیں کہتے بلکہ موجودہ زمانے کے نازک دور میں تبلیغ جیسے اہم فریضے کی طرف سے عام مسلمانوں کی بے توجہی اور اس سے بیزاری کا اعتراف خود مسلمانوں کے سربرآوردہ علماء کو بھی ہے۔ حال ہی میں مصر کی یونیورسٹی جامعہ ازہر کے علماء کے اس بارہ میں خیالات

شائع ہوئے ہیں جن میں انہوں نے مسلمانوں کی تبلیغ سے لاپروائی کا رونا رویا ہے۔ ساتھ ہی ان کا اس طرح کفِ افسوس ملنا احمدیت کی صداقت کا ایک زندہ ثبوت ہے۔ کیونکہ وہ بھی خوابِ غفلت سے اپنی زبوں حالی پر مرثیہ خوانی کے واسطے اس وقت چونکے ہیں کہ جب احمدی مجاہدین کا وفد اپنی جانیں ہتھیلیوں پہ لئے ہوئے بلادِ یورپ میں آقائے نامدار حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے لائے ہوئے دین کو پھیلانے کی غرض سے انگلستان کے دارالخلافہ لندن میں پہنچا ہے۔ دُنیا کے مسلمان اِس وقت اِس اہم فریضے کی ادائیگی سے محروم و بے نصیب ہیں اور ان کے دل اسلام کے لئے ہمدردی سے خالی ہیں۔ اگر اس فریضے کی ادائیگی کی خاطر کسی نے اپنے اموال راہِ خدا میں خرچ کئے ہیں تو صرف جماعت احمدیہ نے۔ ہاں اس جماعت نے جس پہ ان مسلمانوں نے جو سراسر جمود کی حالت میں ہیں کفر کے فتوے جڑے تھے۔ اگر کسی نے اپنی اولادیں خدمتِ دین کے لئے وقف کی ہیں تو اسی مٹھی بھر جماعت نے۔ کیوں؟ اس لئے کہ اس کے افراد اس مسیح موعودؑ پر ایمان لائے ہیں کہ جس کے آنے پر غلبۂ اسلام کا ظہور مقدر تھا۔

موجودہ مسلمانوں کو چاہیئے کہ وہ غور کریں اور اپنی حالت پر بیان کردہ آیات کی روشنی میں نگاہ ڈالیں وہ محسوس کریں گے کہ تبلیغ کو چھوڑ کر وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی غلامی سے آزاد ہوتے جا رہے ہیں اور اپنی موجودہ جمود کی حالت میں وہ لقبِ خیرِ اُمم کے حقدار نہیں ہیں اور یہ کہ اِس وقت حقیقی معنوں میں آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی غلامی کا فخر اگر کسی کو حاصل ہے تو وہ جماعتِ احمدیہ ہی کو ہے اور اگر آج خیرِ اُمم کے لقب کی لاج قائم ہے تو وہ مسیح موعود پر ایمان لانے والی جماعت کے دم سے ہے۔ پس ہر مسلمان کا فرض ہے کہ وہ زمانے کی نزاکت کے پیشِ نظر ایک طرف مسلمانوں کے جمود کو دیکھے اور دوسری طرف خدا تعالےٰ کی قائم کردہ جماعت کے فریضۂ تبلیغ کی ادائیگی پر غور کرے اور بلا توقف اِس جماعت میں شامل ہو کر اسلام کی فتح کے دن کو قریب تر لانے میں حصہ لے۔ اور اپنی عاقبت کو سنوارے کیونکہ اب بجُز اس راہ کے فلاح کی اور کوئی راہ نہیں ہے +

لیلۃ القدر میں کس نے نزول کیا

(از جناب خانبہادر محمد دلاور خان صاحب ڈپٹی کمشنر ڈیرہ اسمٰعیل خان)

اِنَّا اَنزَلنٰہُ فِی لَیلَۃِ القَدرِ ـــــ وہ کونسی چیز ہے یا کونسی ہستی ہے جس کا نزول لیلۃ القدر میں ہوا ہے۔ وما ادرٰلک ما لیلۃ القدر۔ لیلۃ القدر خیرٌ من الف شھر۔ آگے فرمایا یہ لیلۃ القدر ایک ہزار ماہ یعنے ۸۳ سال سے بہتر ہے۔

احادیث میں آیا ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کیف انتم اذا انزل عیسیٰ ابن مریم فیکم...... کہ اس اُمت کے لئے کوئی گھبراہٹ کی بات نہیں اس لئے کہ عیسےٰ بن مریم ان کے لئے نزول فرمائیں گے۔ اور پھر فرمایا کیف تھلک اُمتی انا اوّلھا وعیسیٰ ابن مریم اٰخرھا۔ یعنی کہ وہ اُمت کس طرح ہلاک ہوسکتی ہے جس کے ابتدا میں محمد صلے اللہ علیہ وسلم جیسے رسول آئے ہوں اور آخر میں عیسےٰ بن مریم جیسے رسول نزول فرمائیں گے۔

میری سمجھ میں یہی آیا ہے کہ لیلۃ القدر میں جس کے نزول کا ذکر ہے وہ مسیح موعود ہے جس کی آمد کے لئے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے نزول کا لفظ احادیث میں استعمال کیا ہے۔ جس طرح پہلا مسیح حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بعد تیرھویں صدی کے اخیر پر آیا اسی طرح دوسرے مسیح حضرت محمد صلے اللہ علیہ وسلم کے بعد تیرھویں صدی کے اخیر میں رونق افروز ہوئے تاکہ تورات کے کتاب استثناء کے باب ۱۸ کی پیشگوئی ہر طرح پوری ہو۔ اب اگر ہم عیسوی صدی کی گنتی کریں یا ہجری صدی کی بہرکیف حضرت مسیح موعود علیہ السلام نے ہر دو صدیوں کے آخری زمانہ میں بعثت فرمائی ہے۔ ۱۸۸۳ء وہ سال ہے جبکہ حضرت اقدس پر الہام ورؤیا وکشوف کا سلسلہ پورے زور شور سے شروع تھا۔ اور آپ اسلام کی صداقت اور مدافعت میں نامور تصنیفات میں مشغول تھے۔ اور دوسری طرف دجّال اپنی کل طاقت

کے ساتھ اس ہندوستان میں اسلام کی بیخ کنی میں لگا ہوا تھا اور اس کا فتنہ کمال عروج کو پہنچا تھا۔ یہ وہ زمانہ تھا جبکہ بعض پادری مولویوں کے لباس میں پگڑی سر پر رکھے ہوئے ہماری مسجدوں میں گھس آتے تھے۔ ہمارے صوبہ سرحد میں پادری خیر اللہ وغیرہ اسی زمانہ میں عیسائی ہو گئے تھے۔ سُنا ہے کہ پادری خیر اللہ جو پہلے قاضی خیر اللہ تھے اب تک لاہور میں زندہ ہیں۔ اللہ تعالےٰ جو علیم اور حکیم ہے فرماتا ہے کہ بے شک دجال کا فتنہ اب کمال کو پہنچا ہے۔ اور اسلام کی ظاہری حالت سخت خطرہ میں ہے لیکن یہ تاریک رات بڑی برکت کی رات ہے۔ کیونکہ اسلام کے لئے جس قدر خطرات مقدر تھے اسی رات کے آخری حصہ میں ان سب خطرات کا اب خاتمہ ہوگا۔ اب خدا اور اس کے رسول کے وعدہ کے مطابق مسیح موعود کا ظہور ہوگا۔ اور اس کی روحانی طاقت کے طفیل دجال قتل کیا جائے گا۔ اس لئے فرمایا کہ یہ رات پچھلی ہزار راتوں سے تمہارے لئے بہتر ہے کیونکہ اسی رات میں مسیح موعود کا ظہور مقدر ہے۔ اور پچھلی ہزار راتوں یعنی ۸۳ سالوں میں تمہاری روحانی اور سیاسی حالت دجال کے عظیم الشان فتنہ کیوجہ سے بہت گر چکی ہے۔

یہاں یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ ہزار ماہ کا عرصہ وہ ہونا چاہیئے جو لیلۃ القدر سے قبل گذرا ہو اور اس میں مسلمانوں کو مذہبی اور دنیاوی لحاظ سے سخت نقصان پہنچا ہو۔ تاریخ اس پر شاہد ہے کہ جو تباہی دجال کے ذریعہ سے مسلمانوں کو اسی ہندوستان میں تیرھویں صدی ہجری اور انیسویں صدی عیسوی میں پہنچی ہے اس کی نظیر پچھلی صدیوں میں نہیں ملتی۔ اب اگر ہم یہ فرض کریں کہ قرآن شریف کا نزول لیلۃ القدر میں ہوا ہے تو پھر یہ ثابت کرنا ہوگا کہ قرآن شریف کے نزول سے قبل ۸۳ سال کا جو زمانہ تھا وہ بنی نوع کے لئے بدترین زمانہ تھا۔ اور کس لحاظ سے بدترین؟ اس کا جواب بڑا مشکل معلوم ہوتا ہے۔ دوسری طرف رسول اکرم صلے اللہ علیہ وسلم نے ہم کو خود دجال کے زمانہ سے ڈرایا ہے۔ اور ساتھ اس کے بشارت بھی دی ہے کہ اگرچہ دجالی فتنہ تمہارے لئے ہر لحاظ سے بدترین فتنہ ہوگا۔ اور اُس فتنہ سے ہر نبی نے اپنی قوم کو ڈرایا ہے۔ لیکن میں تم کو دجال کے فتنہ سے ڈرانے کے ساتھ بشارت بھی دیتا ہوں کہ جونہی کہ وہ فتنہ اپنے عروج کو پہنچے گا اُس کے خاتمہ کے لئے مسیح موعود ظہور فرما دیں گے اور وہی

دجال کو کچل دیں گے۔

بعض لوگوں کا یہ بھی خیال ہے کہ اس میں صدی کے مجدد کے ظہور کی طرف اشارہ ہے جو ہر صدی کے اخیر میں تجدید دین کی خاطر پیدا ہوتا ہے۔ جس طرح رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے ان اللہ یبعث لھذہ الامۃ علی راس کل مائۃ سنۃ من یجدد لھا دینھا۔ لیکن اس حدیث میں ایک بڑی پیشگوئی ہے اور وہ یہ ہے کہ آئندہ ۱۳۰۰ سال کا ایک بدترین زمانہ آئیگا اور اس کے اختتام پر ایک موعود ظہور کرے گا اور مسلمانوں کی حالت اس کے ظہور سے سدھر جائے گی۔ قرآن شریف کے تیسویں پارہ میں عام طور پر آخری زمانہ کے متعلق پیشگوئیاں ہیں۔ اور اکثر چھوٹی چھوٹی سورتیں ہیں اس لئے اس سورت کو بھی تیسویں پارہ میں رکھ دیا ہے۔ تنزل الملئکۃ والروح فیھا باذن ربھم من کل امر۔ سلام۔ فرمایا۔ کہ اس موعود سے قبل ملائکہ اور الہام کے نزول میں بڑی رکاوٹ جو محسوس ہوتی تھی وہ اب رفع ہوگی۔ اس کے آنے سے ملائکہ کا نزول شروع ہوگا اور الہام کے دروازے پھر کھل جائیں گے۔ اس موعود پر یعنے مسیح موعود پر ملائکہ نزول فرمائیں گے اور اس کو کثرت سے الہام ہوگا۔ یہاں تک کہ اس کے پیروؤں کو بھی الہام یا اور کشوف سے سرفرازی حاصل ہوگی۔ کل امر میں اس بات کی طرف اشارہ معلوم ہوتا ہے کہ مسیح موعود کے زمانہ میں اسلام پر قسما قسم کے حملے ہوں گے اور ان سب اعتراضات کا جواب وہ ملائکہ اور الہام کی قوت سے دیں گے اور اس کی کتابیں ان سوالات اور جوابات پر بہتوں کے لئے راہنمائی کی باعث ہوں گی۔ سلام میں اس امر کی طرف اشارہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ مسیح سلامتی کا شہزادہ ہوگا اور دین کی خاطر جنگ وجدال موقوف کر دیگا۔ یہاں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بھی ایک پیشگوئی یضع الحرب یاد رکھنے کے قابل ہے۔ دوسرے یہ کہ جب مسیح آجائے تو اس کو میرا اسلام پہنچایا جائے۔ حتی مطلع الفجر۔ مسیح موعود کے ظہور سے دجالی فتنہ کا خاتمہ ہوجائے گا۔ اور اسلام کا سورج پھر روشنی دیگا۔ اور یہ سورج اس کے زمانہ تک اپنی روشنی مشرق میں محدود رکھے گا لیکن اب یہ سورج مغرب یعنے یورپ و امریکہ سے طلوع ہوگا۔ جس طرح مہینہ کی آخری راتیں تاریک ہوتی ہیں اسی طرح صدی کے اخیر میں روحانی تاریکی زور پکڑتی

ہے۔ تب خدا کی محبت بنی نوع کے لئے جنبش میں آتی ہے اور ایک روحانی مُصلح کا ظہور ہوتا ہے۔

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ رمضان کی آخری دس راتوں میں لیلۃ القدر ہے بستائیسویں اور انتیسویں رات کے متعلق عام طور پر یہ خیال پایا جاتا ہے۔ اب اگر ہم مہینہ کی تیس راتیں چھ پر تقسیم کریں تو لیلۃ القدر آخری پانچ راتوں میں آئیگی اور اگر صدی کو چھ پر تقسیم کریں تو مسیح موعود کا ظہور صدی کے آخری ۱۶، ۱۷ سال میں ہوگا۔ یعنے ۸۳ سال کے اختتام پر۔ اور جیسا کہ میں نے پہلے ذکر کیا ہے مسیح موعود ۱۸۸۳ء میں ملائکہ اور الہام کی مدد سے دجّال کے فتنہ کے ملیا میٹ میں شب و روز مشغول تھے۔ علاوہ اس کے ایک روایت سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ مسیح موعود اور مہدی معہود کے ظہور کے وقت ماہ رمضان میں سورج گرہن اور چاند گرہن ہوگا۔ اور یہ ایک امتیازی نشان ہے جو کسی دوسرے مجدد یا نبی کے وقت ظاہر نہیں ہوا۔ اِس سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ رمضان کا مہینہ مسیح موعود و مہدیٔ معہود کے زمانہ کے ساتھ کچھ امتیازی نسبت رکھتا ہے۔ بعض اولیاء اللہ کا قول ہے کہ لیلۃ القدر کی رات ہم نے درختوں کو سجدہ کرتے دیکھا یا کچھ اور مظاہر ہم نے مشاہدہ کئے جن سے زمین پر بڑے تغیرات کا اندازہ ہوتا تھا۔ حضرت مسیح موعود علیہ السلام فرماتے ہیں کہ میں دُنیا میں ایک نیا نظام قائم کرنے آیا ہوں۔ اولیاء اللہ نے جو کچھ لیلۃ القدر کی رات زمین پر تغیرات کے بارے میں دیکھا وہ اس نئے نظام کی طرف اشارہ کرتا ہے جس کے لئے حضرت اقدس مسیح موعود علیہ السلام مبعوث ہوئے۔ واللہ اعلم وعندی علم قلیل۔

وَاٰخِرُ دَعْوٰنَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ

برہمن اوتار سے مقابلہ کرنا اچھا نہیں!

(جناب شیخ محمود صاحب شرما از کراچی)

شری یوگیراج کرشن علیہ السلام فرماتے ہیں:-

"ہے بھارت جب جب دھرم کی ہانی اور ادھرم کی بڑھوتی ہوتی ہے
تب تب ادھرم کے اُٹھا دینے اور دھرم کے قائم کرنے کے لئے مَیں اوتار
لیتا ہوں" (گیتا ادھیائے ۴ شلوک ۷)

اِس شلوک میں شری یوگیراج یہ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالےٰ عین ضرورت کے وقت ادھرم کو مٹا کر دھرم کو قائم کرنے کے لئے اپنا اوتار یعنی نبی بھیجتا ہے اور وہ نبی خداوند تعالےٰ کے حکم کے ماتحت برپا ہو کر یہ کام کرتا ہے:-

"سادھوؤں یعنی نیک لوگوں کی رکھشا اور پاپیوں کا ناش (اور) دھرم
کو قائم کرنے کے لئے پرتیک یُگ میں اوتار لیتا ہوں"

(گیتا ادھیائے ۴ - شلوک ۸)

مذکورہ بالا شلوکوں کی بناء پر ہمارے ہندو مترشری یوگیراج کرشن علیہ السلام کی آمدِ ثانی کا بڑی بے تابی کے ساتھ انتظار کر رہے ہیں اور پکار پکار کر کہہ رہے ہیں:-

اب وقتِ مسیحائی ہے گوکل کے گوالے
بیمار ترے نزع میں لیتے ہیں سنبھالے
مولے ترے بھارت میں گڑے غیر کے جھنڈے
آقا ترے بندوں کو پڑے جان کے لالے
بے یار و مددگار ہوں آغوشِ جفا میں!
بھیج اپنے کرم کو کہ مجھے آکے سنبھالے
کہنا یہ پھر اُس بندہ نوازِ دوجہاں سے

اے نند کے لختِ جگر اے بانسری والے
وعدہ پہ ترے زندہ ہیں ابتک تیرے شیدا
کیا دیر ہے آغوشِ محبت میں بٹھا لے
ورنہ تری اُمت کا ٹھکانا نہ ملے گا!
آنے کا تجھے کوئی بہانہ نہ ملے گا

(از اخبار ہند و لاہور ۷ر اپریل ۱۹۳۰ء)

اور بھائی پرمانند جی ایم۔ اے تحریر فرماتے ہیں:-

"بھگوان! آج اگر اپنے پیارے دیش میں آسکیں تو آپ ساری تصویر اُلٹی ہوتی دیکھیں گے.... آپ کو دیکھ کر کتنا شوک (افسوس) ہوگا کہ آپ کی جاتی کی سنتان نہ صرف دھرم سے بے مکھ ہو رہی ہے بلکہ دھرم پر چلنے والوں کو نشٹ کر دینے کے سامان ڈھونڈ رہی ہے..... انہوں نے آدرش چھوڑ دیا، وہ اُلٹے مارگ پر چل پڑے، اُن کے اندر سے ایسے گرداب اُٹھے اور باہر سے ایسے طوفان آئے کہ اب تو اُن کی اپنی ہستی خطرہ میں پڑ گئی ہے۔ بھگوان! اس سمے آپ کی جاتی پر بڑا بھاری سنکٹ آیا ہے۔ چاروں طرف سے خطروں نے اسے گھیر رکھا ہے۔ ایک خطرہ سے بچنے کے لئے دوسری طرف منہ کرتی ہے اُدھر دوسرا دشمن اُسے کھانے دوڑتا ہے۔ اس پر بڑی گھٹنائی یہ ہے کہ یہ اپنا آپ بھولی جا رہی ہے...... جو اسے خبردار کر کے جگاتے ہیں ان کو یہ گالیاں دیتی ہے۔ اُس کے اندر ہی اُسے ٹھگنے والے موجود ہیں جو اپنی بڑائی اور نام کیلئے اُسے برباد کر رہے ہیں۔ بھگوان! ایک بار پھر آؤ تو سہی۔ کسی دوسری آتما میں پرویش کر کے ہی آجاؤ۔ اپنی جاتی کو سیدھا راستہ ایک بار پھر بتا جاؤ۔ ان کی آنکھ میں اتنی روشنی تو ڈالو کہ یہ کھرے اور کھوٹے میں تمیز کر سکیں۔"

(از اخبار ہند و لاہور ۶ر اکتوبر ۱۹۳۰ء صہ ۴ کالم ۱)

دکھاؤ کرشن پھر بھارت کو صورت سانوری اپنی
کرو کچھ یاد دُنیا ناتھ پرتگیا دھی اپنی

(اخبار ہند و لاہور ۲۰ر اکتوبر ۱۹۳۰ء صہ ۱)

خداوند تعالیٰ بڑا ہی رحیم و کریم اور دیا کا بھنڈار ہے۔ اور وہ اپنے وعدہ کا پاس کرتا ہے۔ اس لئے خداوند تعالیٰ نے ہندوؤں کے دلوں سے نکلی ہوئی پکار کو سن کر اپنے پیارے بھگت شری یوگیراج حضرت اقدس مرزا غلام احمد صاحب قادیانی علیہ الصلوٰۃ والسلام کو کرشن ثانی بنا کر بھارت ورش کی پوتر بھومی میں سے پاپ کو ناش کرنے کے لئے اور دھرم کو قائم کرنے کے لئے نازل فرمایا۔ چنانچہ شری یوگیراج مسیح قادیانی کرشن ثانی علیہ الصلوٰۃ والسلام خداوند تعالیٰ سے آکاش بانی یعنی الہام پا کر فرماتے ہیں:۔

"جیسا کہ آریہ قوم کے لوگ کرشن کے ظہور کا ان دنوں میں انتظار کرتے ہیں وہ کرشن مَیں ہی ہوں۔ اور یہ دعویٰ میری طرف سے نہیں بلکہ خدا تعالیٰ نے بار بار میرے پر ظاہر کیا ہے کہ جو کرشن آخری زمانہ میں ظاہر ہونے والا تھا وہ تو ہی ہے۔ آریوں کا بادشاہ" (از تتمہ حقیقۃ الوحی ص۸۵)

نیز فرماتے ہیں:۔

"مَیں ان گناہوں کے دُور کرنے کے لئے جن سے زمین پُر ہو گئی ہے جیسا کہ مسیح ابن مریم کے رنگ میں ہوں ایسا ہی راجہ کرشن کے رنگ میں بھی ہوں جو ہندو مذہب کے تمام اوتاروں میں سے ایک بڑا اوتار تھا۔ یا یوں کہنا چاہیئے کہ روحانی حقیقت کی رُو سے مَیں وہی ہوں۔ یہ میرے خیال اور قیاس سے نہیں بلکہ وہ خدا جو زمین و آسمان کا خدا ہے اُس نے میرے پر ظاہر کیا۔ اور نہ ایک دفعہ بلکہ کئی دفعہ مجھے بتلایا ہے کہ تو ہندوؤں کے لئے کرشن اور مسلمانوں اور عیسائیوں کے لئے مسیح موعود ہے۔ ...... یہ خدا کی وحی ہے جس کے اظہار کے بغیر مَیں رہ نہیں سکتا۔" (از لیکچر سیالکوٹ ص۲)

ہمارے ہندو مِتروں کے لئے یہ فرض تھا کہ وہ حضرت یوگیراج کرشن قادیانی علیہ الصلوٰۃ والسلام کے دعوے پر غور کرتے اور سچا ثابت ہونے پر اس خدائی آواز کو قبول کر لیتے مگر عام ہندوؤں نے عموماً اور آریہ سماج نے خصوصاً سخت تکبر سے کام لے کر حضرت یوگیراج کرشن قادیانی علیہ الصلوٰۃ والسلام کی اندھا دھند مخالفت شروع کر دی۔ ہر قسم کے مکر و فریب سے کام لیا، سازشوں کا جال بچھایا لیکن وہ خداوند تعالیٰ کے برہمن اوتار کا کسی قسم کا نقصان نہ کر سکے۔ کیونکہ یوگیراج کرشن قادیانی

علیہ الصلوٰۃ والسلام نے خداوند تعالےٰ سے خبر پاکر پہلے ہی فرما دیا تھا کہ :-

"مخالف لوگ عبث اپنے تئیں تباہ کر رہے ہیں۔ میں وہ پودا نہیں ہوں کہ اُن کے ہاتھ سے اُکھڑ سکوں۔ اگر اُن کے پہلے اور ان کے پچھلے اور اُن کے زندے اور اُن کے مُردے تمام جمع ہو جائیں اور میرے مارنے کے لئے دُعائیں کریں تو میرا خدا ان تمام دُعاؤں کو لعنت کی شکل پر بنا کر اُن کے مُنہ پر مارے گا" (ضمیمہ اربعین نمبر ۳، ۴ صفحہ ۴)

دُنیا نے اپنی آنکھ سے مشاہدہ کر لیا ہے کہ وہ تمام مخالف آریہ جو احمدیت یعنی حقیقی اسلام کو مٹانا چاہتے تھے خداوند تعالےٰ کے زبردست ہاتھوں سے فنا کے گھاٹ اُتار دیئے گئے اور احمدیت اب ہندوستان میں پھیلنے کے علاوہ تمام دُنیا میں سرسبز ہو رہی ہے۔ اور دُنیا میں کوئی ایسا انسان نہیں ہے جو خداوند تعالیٰ کے کام میں رُکاوٹ پیدا کر سکے۔ دُنیا بار بار یہ مشاہدہ کر چکی ہے کہ خداوند کریم ہمیشہ اپنے نبیوں یعنی اوتاروں کو کامیاب کرتا رہا ہے پھر کس طرح یہ ممکن ہو سکتا ہے کہ وہ اب اپنے عظیم الشان اوتار یوگیراج کرشن قادیانی علیہ الصلوٰۃ والسلام کو تباہ ہونے دے۔ یہ ناممکن ہے۔ ؎

حق کو سدا پسند ہیں مردانِ حق پسند
ممکن نہیں کہ راستِ باطل ہو سر بلند

آریوں کے لئے اب بھی یہ بہتر ہے کہ وہ مخالفت کو چھوڑ کر موافقت اختیار کریں۔ کیونکہ خداوند تعالیٰ نے عام ہندوؤں کو عموماً اور آریوں کو خصوصاً یہ بتا دیا ہے کہ :-

"برہمن اوتار سے مقابلہ کرنا اچھا نہیں" (اخبار بدر جلد ۲ نمبر ۲۲ صفحہ ۲)

مذکورہ بالا آکاش بانی سے سربشکتیمان پرماتما نے عام ہندوؤں کو عموماً اور آریوں کو خصوصاً یہ کھول کر بتا دیا ہے کہ شری یوگیراج کرشن قادیانی علیہ الصلوٰۃ والسلام کی مخالفت کا نتیجہ اچھا نہ ہوگا۔ آریوں نے مخالفت کر کے دیکھ لیا ہے کہ خداوند تعالےٰ کس طرح انکو دن بدن تباہی کے گھاٹ اُتار رہا ہے اس لئے آریوں کے لئے یہی بہتر ہے کہ وہ اپنے بادشاہ کی شرن میں آکر ایشور کی آگیا کا پالن کر کے دین و دُنیا کی کامیابی کا مُنہ دیکھ لیں۔

ویدوں سے معلوم ہوتا ہے کہ ہندو قوم میں بھی یہودی قوم کی طرح بہت سے انبیاء تشریف لاتے تھے۔ بدبخت یہودیوں کی طرح ہندوؤں نے بھی اپنے اوتاروں کی مخالفت کی اور اس مخالفت کے نتیجہ میں ہندوؤں پر بڑی بڑی تباہیاں وارد کر دی گئی تھیں۔ یہی

وجہ ہے کہ خدا وند تعالےٰ نے ہندو قوم کو بتا دیا ہے کہ حضرت یوگیراج کرشن قادیانی علیہ الصلوٰۃ والسلام کی مخالفت کا نتیجہ اچھا نہ نکلے گا۔ اور دنیا یہ دیکھ رہی ہے کہ خدا وند تعالیٰ کی بات پوری ہو رہی ہے۔ اور اگر ہندوؤں نے اب بھی مخالفت چھوڑ کر موافقت اختیار نہ کی تو یقیناً اور یقیناً ہندو قوم برے نتیجہ سے بچ نہ سکیگی۔

ویدوں میں بھی یہ لکھا ہوا موجود ہے کہ برہمن اوتار کا مقابلہ کرنا اچھا نہیں ہے۔ ملاحظہ ہو:۔

"اے انسانوں کے لیڈر، یا اے منشوں کے مالک یعنی راجا! دیوتاؤں نے تجھے یہ کھانے کے لئے نہیں دی ہے راجنیہ مت برہمن کی گئو یعنی پاک لوگوں کو کھانے یا تباہ کرنیکی اچھا کر جو کھانے یا تباہ کرنے کے یوگیہ نہیں ہے۔"

(پوترا تھرو وید کانڈ ۵۔ وکت ۱۸۔ منتر ۱)

برہمن کی جماعت کی مخالفت کا نتیجہ یقیناً موت ہے۔ چنانچہ لکھا ہے:۔

"راجنیہ جو جوئے کے پانسوں سے دھوکہ کیا گیا۔ پادل بخود شکست خوردہ ہے۔ وہ برہمن کی گائے کو کھائے (جو جانے) نیں آج جیونگا کل نہیں۔"

(اتھرو وید کانڈ ۵۔ سوکت ۱۸۔ منتر ۲)

"چمڑے سے لپٹا ہوا یعنی شریر دھارنی برہمن اوتار یقیناً جان لو کہ سخت ہلاکت والا زہریلا سانپ ہے۔ یہ برہمن کی گئو یعنی جماعت بڑی سخت ہے۔ کھانے یوگیہ نہیں۔" (اتھرو وید کانڈ ۵۔ سوکت ۱۸۔ منتر ۳)

اس منتر نے صاف بتا دیا ہے کہ برہمن اوتار کی گائے سے مراد برہمن اوتار کی جماعت ہے۔ کیونکہ برہمن اور غیر برہمن کی گائے میں سختی کے لحاظ سے کوئی فرق نہیں ہے دونوں کی گائیں جسم کی بناوٹ کے لحاظ سے ایک جیسی ہوتی ہیں۔ اگر آریوں کے پاس کوئی ایسی گائے موجود ہو جو عام گائیوں سے زیادہ سخت ہو تو وہ پیش کریں۔ اگر وہ ایسی گائے پیش نہ کر سکیں تو یہ ماننا پڑے گا کہ اس منتر میں برہمن کی گائے سے مراد برہمن اوتار کی گئو یعنی پاک جماعت ہے۔ اور ہر زبان میں جو ہندوستان میں بولی جاتی ہے اس میں نیک انسان کو گئو کہا جاتا ہے۔ یہ بالکل صاف بات ہے۔ چنانچہ شری یوگیراج کرشن علیہ السلام فرماتے ہیں:۔

"گئوؤں میں کام دھینو یعنی بہت دُودھ دینے والی گئوئیں ہیں۔"
(گیتا ادھیائے ۱۰ شلوک ۲۸)

نیز لکھا ہے:۔

"بے شک وہ اپنی حکومت کو تباہ کر لیتا ہے۔ اپنی طاقت کو برباد کر دیتا ہے پکڑے ہوئے آگ کی طرح سب کو جلا ڈالتا ہے جو برہمن کو اُن ہی مانتا ہے۔ وہ یتیمات کے زہر کو پیتا ہے۔" (اتھروید کانڈہ سوکت ۱۸ منتر ۴)

"جو دیوتاؤں کا نندک دھن چاہتا ہؤا بیوقوفی سے اس کو یعنی برہمن اوتار کو نرم مانتا ہؤا مارتا ہے۔ اس کے دِل میں اندر آگ کو جلاتا ہے۔ دین و دنیا میں وہ ذلیل ہو جاتا ہے۔" (اتھروید کانڈ ۵ سوکت ۱۸ منتر ۵)

"وہ اگنی کی طرح برہمن کو کبھی تکلیف نہ دے۔ جو اپنے آپ کو پیار کرتا ہے سوم اس کا دایا د ہے اور اندر اس کا دوشول سے رکھوالا ہے۔"
(اتھروید کانڈ ۵ سوکت ۱۸ منتر ۶)

"وہ سَو پنکھوں والے (تیر) کو نگلتا ہے۔ اسکو ٹکڑے نہیں کر سکتا ہے جو بیوقوف برہمنوں کے اُن کو سمجھتا ہے کہ مَیں لذیذ کھانا کھاتا ہوں۔"
(اتھروید کانڈہ سوکت ۱۸ منتر ۷)

"تیز تیروں والے۔ اُستروں والے برہمن جن تیروں کی (صمصام اسیل) بچھاڑ کو پھینکتے ہیں وہ جھوٹی نہیں۔ تپ کے ساتھ اور منیو کے ساتھ پیچھا کر کے وے دُور سے بھی اس (دشمن) کو بھیدتے ہیں۔" (اتھروید کانڈہ سوکت ۱۸ منتر ۹)

اِس کی مثال دیتے ہیں:۔

"جو ہزار راج کرتے تھے اور دَس سَو تھے وے ویت ہویہ کے پُتر برہمن کی گائے کو کھا کر نشٹ ہوئے۔" (اتھروید کانڈہ سوکت ۱۸ منتر ۱۰)

"وے ایکسو ایک جن جنکو پرتھوی نے کنپایا وے برہمنوں کی سنتان کو ہانی پہنچا کر ختم نہ ہونیوالی بربادی کو پالیا۔" (اتھروید کانڈہ سوکت ۱۸ منتر ۱۲)

"دیوتاؤں کا نندک منشوں میں پھرتا ہے۔ وہ نگلے ہوئے زہر والا ہڈی پنجر ہو جاتا ہے جو دیوتاؤں کے بندھو برہمن کی ہنسا کرتا ہے وہ اس لوک کو بھی

پراپت نہیں ہوتا ہے جہاں پتر گئے ہیں" (اتھروید کانڈہ ۵ سوکت ۱۸ منتر ۱۳)
اس کی مثال دیتے ہیں :-

"وے بہت ہی اونچے آئے۔ ہاں انہوں نے آسمان کو پورا نہیں چھوا (پر) بھرگو کی ہنسا کر کے وِیت ہویہ کے پتر سرنجیہ نشٹ ہو گئے" (اتھروید کانڈہ ۵ سوکت ۱۹ منتر ۱)
بھرگو رشی کے متعلق یوگیراج کرشن علیہ السلام فرماتے ہیں :-

"مہرشیوں میں بھرگو رشی میں ہی ہوں" (گیتا ادھیائے ۱۰ اشلوک ۲۵)
ان مذکورہ بالا منتر اور گیتا سے یہ صاف معلوم ہو جاتا ہے کہ ان منتروں میں جن برہمنوں کا ذکر ہوا ہے وہ عام برہمن نہیں ہیں بلکہ ان سے برہمن اوتار یعنی انبیاء کرام مراد ہیں۔

"جن لوگوں نے انگرا کے پتر برہت سام برہمن کو دکھ دیا انکی سنتان کو دو جبڑے والے بھیڑیے اور بھیڑیے نے نگل لیا" (اتھروید کانڈہ ۵ سوکت ۱۹ منتر ۲)
اس منتر نے کھول کر بتا دیا ہے کہ برہمن اوتار کی جماعت کو تم بھیڑ بکری یعنی کمزور جان کر دکھ نہ دو۔ تا ایسا نہ ہو کہ تمہارے ظلم کی سزا تم کو ان بھیڑ بکریوں کے ہاتھوں سے ملے۔

"راجا اپنے کو اوگر مانتا ہوا جو برہمن کو کھانے کی اچھا کرتا ہے وہ حکومت ڈنکے (س کی طرح) پرے بہادی جاتی ہے۔ جہاں برہمن ہانی پہنچایا جاتا ہے"
(اتھروید کانڈہ ۵ سوکت ۱۹ منتر ۶)

"وہ حکومت چونے لگتی ہے جیسے شکستہ کشتی میں پانی۔ جہاں برہمن کی ہنسا کرتے ہیں اس کی حکومت کو نحوست تباہ کر دیتی ہے" (اتھروید کانڈہ ۵ سوکت ۱۹ منتر ۸)
اکو درخت پر سے ہٹا دیتے ہوئے کہتے ہیں "ہمارے سایہ میں مت آ جو برہمن کے واستو دھن کو ہے ارتھ مانتا ہے" (اتھروید کانڈہ ۵ سوکت ۱۹ منتر ۹)

برہمن کی مخالفت کے باعث جب تباہی برپا کی جاتی ہے تو وہ لوگ جو برہمن اوتار کی مخالفت کے باعث زیرِ عتاب ہو جاتے ہیں۔ ہر قسم کی مدد سے محروم کر دیئے جاتے ہیں۔ اور جن لوگوں کو خوش کرنے کے لئے وہ خدا کے پاک برہمن اوتار یا اس کی جماعت کی ہنسا کرتے ہیں وہ لوگ بوقتِ مصیبت کنارہ کش ہو جاتے ہیں۔ اس کی زندہ مثال امان اللہ خان والئے کابل ہمارے سامنے موجود ہیں۔ انہوں نے علماء سوء کو خوش کرنے کے لئے ہمارے پاک دل اور نیک نعمت اللہ خان صاحب اور قاری نور علی صاحب

رضی اللہ عنہما کو شہید کرا دیا۔ لیکن خداوند تعالےٰ نے اُنہیں مولویوں کے ذریعے سے امان اللہ کو تخت سے نیچے گرا دیا۔ یہ بالکل سچ ہے کہ وہ تباہی کو دیکھ کر بحسرت کہتا ہے ؎

باغباں نے آگ دی جب آشیانے کو مرے
جن پہ تکیہ تھا وہی پتے ہوا دینے لگے

ان تمام حوالہ جات پر غور کرنے سے یہ صاف ثابت ہو جاتا ہے کہ برہمن اوتار کا مقابلہ کرنا اپنے ہاتھوں سے تباہی کا خریدنا ہے۔ آریوں نے گزشتہ برہمن اوتاروں کے مخالفوں کے انجام پر غور کئے بغیر حضرت یوگیراج برہمن اوتار کرشن قادیانی علیہ الصلوٰۃ والسلام کی اندھا دھند مخالفت شروع کر دی۔ اور یہ کہنے لگ گئے کہ خدا وند تعالےٰ نے مرزا غلام احمد صاحب قادیانی کو پنڈت دیانندجی کی مخالفت سے منع فرمایا ہے۔ کیونکہ پنڈت دیانندجی برہمن اوتار تھے۔ وغیرہ وغیرہ۔

آریوں کا یہ کہنا کہ پنڈت دیانندجی برہمن اوتار تھے صداقت کا مُنہ چڑانا اور حقیقت کو جھٹلانا ہے۔ کیونکہ آریہ سماج کے عقیدہ کے مطابق کوئی انسان اوتار یا نبی نہیں ہو سکتا۔ اور آریہ سماجی دوست بارہا یہ اعلان کر چکے ہیں کہ پنڈت دیانندجی کا دعویٰ اوتار ہونے کا نہ تھا۔ نہ ہی آریہ سماج ان کو اوتار مانتی ہے۔ ملاحظہ ہو:۔

"رشی دیانند ایشور کے پیغمبر تھے، نہ اوتار۔ نہ ہم ان ہی کے سدہانت کے خلاف اُنہیں ایسا تسلیم کرتے ہیں" (از اخبار آریہ ویر لاہور ۱۸ فروری ۱۹۳۲ء صلا کالم ۱)

اس لئے مہاشہ چرنجی لال جی پریم یا کسی اور ناواقف آریہ کا یہ کہنا کہ "برہمن اوتار سے مقابلہ کرنا اچھا نہیں" میں خداوند تعالےٰ نے حضرت یوگیراج کرشن قادیانی علیہ الصلوٰۃ والسلام کو پنڈت دیانندجی کی مخالفت سے منع فرمایا ہے آریہ سدھانتوں کی دھجیاں فضائے آسمانی میں اُڑانا ہے۔

اگر پنڈت دیانندجی خدا کی طرف سے ہوتے تو خداوند تعالےٰ بجائے حضرت یوگیراج کرشن قادیانی علیہ الصلوٰۃ والسلام کی مدد کرنے کے پنڈت جی کی مدد کرتا کیونکہ وید بھگوان میں لکھا ہے:۔

"عقلمند انسان کے لئے یہ جاننا آسان ہے کہ سچائی اور جھوٹ (ایک دوسرے

کی مخالفت کرتے ہیں۔ ان میں سے جو سچائی ہے اور جو زیادہ سیدھی اور صاف ہے اس کی سوم (اور بقول آریہ سماج ایشور) حفاظت کرتا ہے اور جھوٹ کو نشٹ کر دیتا ہے۔"

(اتھرووید کانڈ ۸۔ سوکت ۴۔ منتر ۱۲)

جب ہم واقعات پر غور کرتے ہیں تو صاف معلوم ہو جاتا ہے کہ آریہ سماج دن بدن تباہی کے گہرے غار میں گر رہا ہے۔ اور اس کے مقابلہ میں احمدیت یعنی حقیقی اسلام دن دوگنی اور رات چوگنی ترقی کر رہا ہے۔ الحمد للہ!

ویدوں میں پہلے ہی لکھا ہوا ملتا ہے کہ:-

"جس برہمن کو انہوں نے (دنیاوی لوگوں نے) ہمارے (یعنی ایشور کی) ناکامیابی کے لئے آگے رکھا ہے ہے اندر وہ تیرے پاؤں کے نیچے ہو۔ میں اس کو مرتیو کے لئے اُلٹا پھینکتا ہوں"۔ (اتھرووید کانڈ ۵ سوکت ۹ منتر ۵)

نیز لکھا ہے:-

"جو کچھ وہ من سے۔ جو زبان سے۔ یگوں سے۔ ہولی سے۔ یجروید سے ہومتا ہے اس کو مرتیو کے ساتھ میل رکھتی ہوئی نرورتی سچا ہونے سے پہلے اُس کی آہوتی کو نشٹ کر دے۔ (اتھرووید کانڈ ۷ سوکت ۴۳ منتر ۱)

مذکورہ بالا منتروں سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ تمام واقعات پنڈت دیانند جی پر پورے ہوتے ہیں۔ کیونکہ انہوں نے یجروید کا ترجمہ کیا۔ یگ اور ہون کا رواج پیدا کرنے کی کوشش شروع کی۔ مگر کامیاب ہونے سے پہلے ہی پنڈت جگن ناتھ جی نے زہر دے کر پنڈت جی کا کام تمام کر دیا۔ کیونکہ یہ لکھا ہوا ہے کہ:-

"ٹیڑھی چال والے ظالموں کو ہے اگنی (اور بقول آریہ سماج) طاقتور پرمیشور! زہر کے ساتھ۔ تیور سنتاپ اور تپتے انگاروں جوالاؤں کے ساتھ اُلٹا برباد کر"۔ (اتھرووید کانڈ ۸ سوکت ۳ منتر ۲۳)

اللہ تعالےٰ نے بذریعہ زہر پنڈت جی کو موت دے کر اور آگ دے کر یہ بتادیا ہے کہ پنڈت دیانند جی کا خدا کے ساتھ کوئی تعلق نہ تھا۔ آریہ سماج کے لئے واجب تھا کہ پنڈت جی کی ناگہانی موت پر غور کر کے برہمن اوتار یوگیراج کرشن قادیانی علیہ الصلوٰۃ والسلام

کو قبول کر لیتے۔ مگر افسوس کہ آریوں نے پہلے سے بڑھ کر مخالفت پر کمر کس لی۔ اور پنڈت دیانند جی کے مرنے کے بعد ایک خود پسند پنڈت لیکھرام صاحب پشاوری کو اپنا لیڈر بنا کر خدا کی آواز کو گالیوں اور بدزبانیوں سے بند کرنے کی ناکام کوشش شروع کر دی مگر وہ خدا جو پہلے ہی کہہ چکا تھا۔

"جن کو انہوں نے اِتی سر بنایا ہے اور جن کو بنائیں گے ان کو تو ہے ورتر کے مارنے والے اُلٹے موڑ دے جیسے کہ وُے اس جن کو ماریں۔"

(اتھروید کانڈ ۵ سوکت ۸ منتر ۷)

نیز لکھا ہے:۔

"اگر وہ دیوتاؤں کے قلعوں میں چلے گئے ہیں وید کو انہوں نے اپنی جائے پناہ بنا لیا ہے۔ جسم کی حفاظت اور پوری حفاظت کرتے ہوئے انہوں نے جو اُتساہ بھرے بچن کہے ہیں ان سب کو بے اثر بنا دے۔"

(اتھروید کانڈ ۵ سوکت ۸ منتر ۶)

پنڈت لیکھرام صاحب پشاوری نے یہ کہا:۔

"ہمارا الہام یہ کہتا ہے کہ لڑکا کیا تین سال کے اندر اندر آپ کا خاتمہ ہو جائے گا اور آپ کی ذریت سے کوئی باقی نہ رہے گا۔"

(از کلیات آریہ مسافر صلا۵)

آریہ سماج جو یہ مانتا ہے کہ وید کے بعد کوئی خدا کا گیان نہیں اس کا یہ فرض تھا کہ وہ پنڈت لیکھرام صاحب سے یہ کہتا کہ پنڈت جی جھوٹ بول رہے ہیں اور جھوٹے الہام شائع کر رہے ہیں۔ آریہ سماجی لیڈروں کا چپ رہنا یہ بتاتا ہے کہ آریوں کو سچائی کے ساتھ کوئی لگاؤ نہ تھا۔ وہ صرف اسلام کو ہر ناجائز طریق سے مٹانا چاہتے تھے۔ مگر وہ خدا جو اپنے بھگتوں کے لئے غیرت رکھتا ہے۔ اُس نے پنڈت لیکھرام کی گستاخیوں کی سزا اسی طرح دی جس طرح وہ لکھتا ہے:۔

"دشٹ ہر دے والے کی ہم پسلیوں کو توڑتے ہیں۔"

(اتھروید کانڈ ۴ سوکت ۷ منتر ۵)

نیز لکھا ہے:۔

"نیچے گریں، چھوٹے ہوں، جو ہمارے نیک دل اوتار یعنی نبی کے خلاف فوج لاتے ہیں۔ میں بل سے مشترووں کا ناش کرتا ہوں اور اپنے اوتاروں کو اوپر لیجاتا ہوں۔" (اتھروید کانڈ ۲ سوکت ۱۹ منتر ۳)

دُنیا نے یہ دیکھ لیا ہے کہ خداوند تعالیٰ نے برہمن اوتار کرشن قادیانی علیہ الصلوٰۃ والسلام کو نہ صرف کامیاب کیا ہے بلکہ اُن کے الہامی قول کے مطابق پنڈت لیکھرام صاحب قتل کر دیئے گئے۔ اور حضرت کرشن قادیانی علیہ الصلوٰۃ والسلام کی ذریت بڑی کثرت کے ساتھ بڑھ رہی ہے۔ اگر کسی آریہ مِتر کو شک ہے تو وہ خود قادیان دارالامان میں جاکر دیکھ سکتا ہے۔

آخر میں آریہ سماجی مِتروں کی دو تحریریں پیش کرتا ہوں۔ جن میں حضرت برہمن اوتار کرشن قادیانی علیہ الصلوٰۃ والسلام کی کامیابی و کامرانی اور آریہ سماج اور پنڈت لیکھرام صاحب کی ناکامی کا صریح طور پر اعتراف کیا گیا ہے:۔

"آہ کتنے دردناک الفاظ ہیں جو کہ مہاشہ خوشحال چند خورسند ایسے مصلح و سچے سیوک کے قلم سے نکلے ہیں ...... پنڈت لیکھرام جی مہاراج کی زندگی و شہادت کے روشن واقعات کو لیجیئے اور اسکے مقابلہ میں مرزا غلام احمدؐ صاحبؑ قادیانی کی قدردانی کا ملاحظہ کیجئے اور پھر بتائیے کہ آج کس کی زیادہ عقیدت ہو رہی ہے .... کہاں ہیں پنڈت لیکھرام جی کے نام پر مشن کالج سرفروشوں کے سکول وغیرہ وغیرہ مگر اس کے مقابلہ میں دُنیا بھر کا کوئی آباد حصہ ایسا نہیں ہے جہاں پر مرزا صاحبؑ موصوف کے نام کا پرچار نہ ہو۔ بڑے بڑے عالم فاضل دُنیا کے کونہ کونہ پر اُن کے نام کا پرچار کر رہے ہیں۔ کیا اِن حقائق کی موجودگی میں کالج سیکشن یا گوروکل سیکشن کا کوئی آریہ سماجی لیڈر چھاتی پر ہاتھ رکھ کر کہہ سکتا ہے کہ مرزا غلام احمدؐ قادیانی کے مشن کے مقابلہ میں پنڈت لیکھرام کے نام پر کوئی مشن بنایا گیا ہے یا موجود ہے۔ یا اُن کے جاری کردہ مشن کو قائم رکھا ہے .... ذرا قادیان میں جاکر ان رسالوں، روزانہ ہفتہ وار، انگریزی، اُردو، عربی، فارسی کتابوں و اخباروں کی تو گنتی کریں۔

جبکہ مرزا صاحب کے مشن کو دنیا کے گوشہ گوشہ میں پھیلانے کا کام کر رہی ہے اور ان مبلغوں کی گنتی تو کریں جو دنیا بھر میں مرزا صاحب کی نبوت کا پیغام پھیلا رہے ہیں۔ ... اپنے ملک میں تمام اقوام ان کی مخالف ہیں۔ محمدی مسلمان ان کو کافر خیال کرتے ہیں۔ ان پر فتوے لگاتے ہیں مگر ... مرزا صاحب کے کلام و کام کو مست عاشق کی طرح پھیلاتے جاتے ہیں۔"

(از اخبار آریہ ویر لاہور شہید نمبر ۲۷ فروری ۱۹۳۲ء صفحہ ۱۲)

نیز لکھا ہے :-

"لاہوری مرزائیوں نے جب سے مرزا غلام احمد قادیانی کی حقیقی تعلیم سے روگردانی کر کے اس کو بجائے نبی و رسول کے محض مجدد و مسیح ماننا شروع کیا ہے تب سے یہ پارٹی اپنی ڈھائی اینٹ کی الگ بنائے الگ پڑی ہے۔ جہاں قادیان والے مرزائی دن بدن ترقی کر رہے ہیں وہاں لاہوری مرزائیوں کا سوگ ختم ہونے میں نہیں آتا۔"

{از جرنجی لال جی پریم۔ اخبار آریہ مسافر لاہور
۲۲ اپریل ۱۹۳۲ء صفحہ ۶۔ کالم ۲۔}

لا الٰہ الا اللّٰہ محمد رسول اللّٰہ

ھو الذی ارسل رسولہ بالھدیٰ ودین الحق لیظھرہ علی الدین کلہ

ماھنامہ

(اردو) ریویو آف ریلیجنز

یعنی

دنیا کے مذاہب پر نظر اور اہل مذاہب کا تشحیذ الاذہان

جلد ۴۵ | ماہ ذی الحجہ ۱۳۶۵ھ مطابق ماہ نومبر ۱۹۴۶ء | عدد ۱۱

فہرست مضامین

شذرات

مصری علماء کی اسلام سے بیگانگی

مولانا سید سلیمان ندوی نے "معارف" کی ماہ جولائی ۱۹۳۶ء کی اشاعت میں اپنے ایک مجاہد دوست محمد ولی خانصاحب کا خط شایع کیا ہے، جو آجکل مصر میں مقیم ہیں، اور اپنی قومی اور ملی خدمات کے لحاظ سے مولانا محمد علی صاحب جوہر مرحوم کے رفقاء میں سے ہیں۔

اس خط میں صاحب موصوف نے مصر کے مسلمانوں کی اسلام اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے بیگانگی کا ذکر حسب ذیل دردناک الفاظ میں کیا ہے:-

"آپ نے غالباً تازہ شایع شدہ "انسائیکلوپیڈیا برطانیکا" میں وہ دلخراش فقرے، ملاحظہ فرمائے ہوں گے، جو ان کٹے پادریوں اور پادرانیوں نے اپنی کور چشمی، کوردلی اور مجنونانہ تعصب کی وجہ سے حضور پُر نور کی ذاتِ مبارک کے متعلق سراسر غلط اور خلافِ حقیقت تراشے ہیں۔ ان دل کے اندھوں اور اندھیوں نے سرکارِ دوجہاں کو ظالم حکمرانِ مدینہ (Despot of Yathrib) کے گستاخانہ لقب سے دنیا میں پیش کیا ہے۔

خاکسار نے انگریزی اخبار کی نقلیں جس میں یہ اقتباس شایع ہوا تھا یہاں کُل ارکانِ حکومت، شیخ الازہر اور رئیس دیوانِ ملک کو بھیج دی تھیں لیکن

بعد انتظار مدید و شدید اس المناک حقیقت کا پتہ چلا کہ یہ سب کے سب سیاسیات اور آپس کی تُو تُو مَیں مَیں میں ایسے محو و گرفتار ہیں کہ انہیں باوجود عرب کہلانے کے رسولِ عربیؐ کی قدر و قیمت اور درجہ کا احساس تک نہیں۔ یہ سطور نہایت رنج والم سے لکھ رہا ہوں۔ انہیں اپنے تک ہی رہنے دیجئے۔"

صاحبِ مکتوب نے یہ خط سید صاحب کو پرائیویٹ حیثیت میں لکھا ہے، اور اُن سے درخواست کی ہے کہ وہ اسے اپنی ذات تک ہی محدود رکھیں ــــ شاید اس لئے کہ اِس حقیقت کا اظہار دشمنانِ اسلام کے لئے شماتت کا موجب ہوگا لیکن سید صاحب نے اِس کی عام اشاعت کو مناسب سمجھا ہے ــــ غالباً اس لئے کہ ان سادہ لوح مسلمانانِ ہند کو جو اس خوش عقیدگی میں مبتلا ہیں کہ مصر وغیرہ اسلامی ممالک اسلام کی تائید و حفاظت میں مصروف ہیں، اصلیت کا پتہ چل جائے۔

ہندوستانی مسلمانوں کا ایک بہت بڑا طبقہ جس میں بعض تعلیمیافتہ اور پڑھے لکھے لوگ بھی شامل ہیں مصری علماء اور بالخصوص جامعہ ازہر سے بڑی بڑی توقعاتِ حفاظت و حمایتِ اسلام کی رکھتے ہیں، اور وہ اِس غلط فہمی کا شکار ہیں کہ یہ اسلام کی بڑی خدمات سرانجام دے سکتے ہیں۔ چنانچہ ابھی تھوڑا ہی عرصہ ہوُا، اخبارات میں یہ خبر شائع ہوئی تھی کہ جاپان پر اتحادی قبضہ ہو جانے سے وہاں عیسائیت کی تبلیغ کی آزادی ہو گئی ہے جس سے فائدہ اُٹھانے کے لئے پانچسو پادریوں کی ایک فوج جاپان پہنچ گئی ہے، اور اُس نے جاپانیوں کو حلقہ بگوشِ عیسائیت بنانے کی مہم شروع کر دی ہے۔ اِس خبر کی اشاعت پر جمعیۃ علماء ہند کے آرگن "زمزم" لاہور نے "ایک مستقل نظام" کے ماتحت جاپانیوں کو اسلام کی تبلیغ کرنے کی ضرورت کے احساس کا اظہار کرتے ہوئے لکھا تھا کہ:-

"کیا یہ بہتر نہ ہوگا کہ جامعہ ازہر ہوشیار مبلغین کی ایک جماعت تیار کر کے جاپان بھیجے اور وہ جاپان میں فطری مذہب (اسلام) کی اشاعت کرے۔"

حالانکہ تبلیغِ اسلام کا کام جس طرح دارالعلوم دیوبند کے نزدیک غیر ضروری ہے، اسی طرح جامعہ ازہر کے نزدیک بھی غیر اہم ہے۔ اِس ضمن میں دُنیائے اسلام کی اِن دونوں سب سے بڑی "اسلامی" یونیورسٹیوں کا طرزِ عمل و فکر بالکل ایک جیسا ہی ہے۔

دارالعلوم دیوبند کی تبلیغِ اسلام سے لاپروائی تو ایسی کھلی ہوئی بات ہے، جسے ہر ہندوستانی اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا ہے۔ لہٰذا اس کے متعلق شک و شبہ کی کوئی گنجائش ہی نہیں ہے۔ البتہ جامعہ ازہر کی حقیقت اس کے ایک غیر ملکی ادارہ ہونے کے باعث ہندوستانی عوام کی نظروں سے اوجھل ہے۔ اور اسی وجہ سے وہ اپنی سادگی سے جامعہ ازہر کو مسلمانوں کا ایک تبلیغی ادارہ سمجھتے ہیں لیکن جناب محمد ولی خاں صاحب کے مذکورہ بالا خط کی روشنی میں جامعہ ازہر کے مشائخ اور مصری علماء کے بارے میں ہندوستانی مسلمانوں کی اس خوش عقیدگی کی کوئی وجہ باقی نہیں رہ جاتی۔

امرِ واقعہ یہ ہے کہ موجودہ دَور میں سیاسیات کی اتنی چمک ہے جو عوام تو عوام خواص کی آنکھوں کو بھی خیرہ کر رہی ہے۔ اور ہر کوئی سیاسی پلیٹ فارم پر اپنی جگہ بنانے کی فکر اور کوشش میں مصروف ہے۔ علماء بھی خواہ وہ مصر کے ہوں یا ہندوستان کے، اِس تگ و دو میں کسی سے پیچھے نہیں رہنا چاہتے۔ کیونکہ دُنیا میں عزت اور نام پانے کا آج یہی ذریعہ سمجھا جاتا ہے۔ رہی تبلیغ، سو یہ تو ان سرپھروں کا کام ہے جو دُنیاوی جاہ و جلال کو خیرباد کہہ کر صرف اسلام کے لئے مرنا اور جینا چاہتے ہوں۔ اور یہ آجکل کی دُنیا میں صرف وہی لوگ کر سکتے ہیں جن کے دل نورِ ایمان سے منور ہوں۔ اور اسکی بے پناہ قوت اُن کی نگاہ کو دُنیاوی مستقبل شاندار بنانے کی بجائے اُخروی مستقبل شاندار بنانے کی طرف پھیر دے۔

تبلیغ کا میدان ایک بڑا کٹھن میدان ہے۔ اِس میں صرف وہی لوگ قدم رکھ سکتے ہیں جو دُنیوی نقطۂ نگاہ سے موت قبول کرلیں ؎

جلیلؔ آساں نہیں آباد کرنا گھر محبت کا!
یہ اُن کا کام ہے جو زندگی برباد کرتے ہیں

اور اس زمانہ میں یہ زندگی برباد کرنے والا گروہ بننے کی سعادت حاصل کرنے کے لئے اللہ تعالیٰ نے جماعت احمدیہ کو چُن لیا ہے جس کے پچاس مبلغ اس وقت مختلف ممالک میں اسلام اور بانی اسلام علیہ الصلوٰۃ والسلام کے نام کو بلند کرنے کے لئے سر بکف پھر رہے ہیں۔

جماعت احمدیہ کی حیثیت مسلمانوں میں آٹے میں نمک کے برابر ہے لیکن باوجود یکہ باقی سارے مسلمان تبلیغ اسلام کی سعادت سے محروم اور جماعت احمدیہ اس سعادت سے بہرہ ور کیوں ہے؟ اس کا جواب ہمیں حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کی اس پُر درد اور پُر سوز آواز میں ملیگا جو آپ نے اپنی بعثت کی ابتداء میں یوں بلند کی۔

مے سزد گر خوں ببارد دیدۂ ہر اہلِ دیں	بر پریشاں حالیٔ اسلام و قحط المسلمیں
ہر طرف کفر است جوشاں ہمچو افواجِ یزید	دینِ حق بیمار و بے کس ہمچو زین العابدیں
مردمِ ذی مقدرت مشغولِ عشرتہائے خویش	خرّم و خنداں نشستہ با بتانِ نازنیں
عالماں را روز و شب باہم فساد از جوشِ نفس	زاہداں غافل سراسر از ضرورتہائے دیں
ہر کسے از بہرِ نفسِ دونِ خود طرفے گرفت	طرفِ دیں خالی شد و ہر دشمنے جست از کمیں

(فتح اسلام صـ۷ مطبوعہ ۱۸۹۰ء)

اسلام کی یہی بےکسی اور بےبسی کی حالت تھی جس کو بدلنے کے لئے اللہ تعالیٰ نے جماعت احمدیہ کو قائم کیا۔ الحمد للہ کہ یہ جماعت اپنے نصب العین کو سامنے رکھکر ساری دُنیا میں اسلام کا پیغام پہنچانے میں مصروف ہے۔ اس کا دائرۂ اثر روز بروز وسیع ہوتا جارہا ہے۔ اور وہ دن دُور نہیں جب خدا تعالیٰ کے فضل سے اس کی مساعی کامیابی و کامرانی کا مُنہ دیکھیں گی۔ اور اسلام دُنیا میں پھر ایک مرتبہ زبردست قوّت بن

کا مقام حاصل کریگا، وَمَا ذٰلِکَ عَلَی اللّٰہِ بِعَزِیْزٍ ۝

سوئیٹزرلینڈ میں ایک نیا مشن

اس ماہ ہمارا ایک نیا مشن یورپ کے خوبصورت ملک سوئیٹزرلینڈ میں کُھل رہا ہے جس میں کام کرنے کے لئے ہمارے تین مبلغ زیورچ پہنچ گئے ہیں۔ لنڈن سے روانگی سے قبل ہمارے ایک مجاہد بھائی نے ایک ایڈریس کا جواب دیتے ہوئے کہا:۔

"ہم گو اُس علاقہ میں جا رہے ہیں جسے لوگ یورپ کا نہایت عمدہ علاقہ تصور کرتے ہیں۔ مگر ہمارے لئے یہ کوئی کشش کے قابل امر نہیں ہے ہم وہاں سیر و سیاحت کے لئے نہیں جا رہے۔ بلکہ ہمیں وہاں جا کر ایک عظیم الشان کام کرنا ہے۔ یعنی اندھیرے کو روشنی میں تبدیل کرنے کے سامان کرنے ہیں۔ اور حقیقتاً یہ بڑا مشکل کام ہے۔ بظاہر ایک مُٹھی بھر جماعت کے یہ ارادے مضحکہ خیز معلوم ہوتے ہیں۔ مگر ہمیں یقین ہے کہ یہ کام ہو کر رہے گا۔ خدائی سُنّت اسی طرح دُنیا میں کارفرما رہی ہے۔ خدا تعالےٰ کے تمام پیغمبر اکیلے دُنیا میں آئے، تمام دُنیا نے مل کر اُن کا مقابلہ کیا۔ مگر خدائی فرستادے ہمیشہ غالب ہی ہوتے آئے ہیں۔ آج سے پچاس سال قبل حضرت مسیح موعود علیہ السلام بھی تنہا کھڑے ہوئے۔ آپ کو اُس وقت اپنے علاقہ میں بھی کوئی نہ جانتا تھا۔ مگر خدا تعالےٰ کا وعدہ تھا کہ وہ آپ کو دُنیا کے کناروں تک شہرت دے گا۔ سو اب یہ زمانہ ہمارے سامنے ہے۔ آج سات ہزار میل دُور آپ کے خدام کے وفود آپ کے مشن کو کامیاب بنانے میں مصروف ہیں۔ اور اسلام کا پیغام اکنافِ عالم میں پہنچا رہے ہیں۔ گو موجودہ حالات میں ہماری کوششیں محدود ہیں مگر ہمیں کامل یقین ہے کہ خدا تعالےٰ ضرور ہمیں کامیابی عطا کریگا۔ کیونکہ یہ سب اُسی کا کام ہے۔"

یہی وہ ایمانی قُوّت ہے جو ہمیشہ دُنیا میں چھوٹی اور کمزور جماعتوں سے بڑے بڑے کام کراتی آئی ہے۔ خدا تعالیٰ کے فضل سے ہمارے مبلغین جہاں جاتے ہیں ایک ناقابلِ تسخیر قُوّت کے ساتھ جاتے ہیں۔ اور مشرقی نوجوانوں کی طرح مغربی تہذیب سے مرعوبیت کا شکار ہونے کے بجائے اُسے اپنا شکار بنا لینے کے زبردست عزم اور پختہ ارادہ سے مسلح ہو کر میدان میں نکلتے ہیں۔ کیونکہ حضرت مسیح موعود علیہ السلام کی تعلیم کی برکت سے انہیں یہ کامل یقین ہے کہ دُنیا کی کوئی تہذیب اور فلسفہ اسلامی تہذیب اور فلسفہ کے سامنے ٹھہر نہیں سکتا۔ یہی وہ سبق ہے جو ہمارے مبلغین قادیان کی رہائش کے دَوران میں حضرت امیر المومنین ایدہ اللہ بنصرہ العزیز کی مقدس صحبت سے فیضیاب ہو کر حاصل کرتے ہیں۔ اور یہی وہ تربیت ہے جس کے گہرے نقوش اُن کے دلوں میں ایسے مرتسم ہو جاتے ہیں کہ کسی طرح بھی مٹ نہیں سکتے۔ آج اسلام کو ایسے ہی ایمان اور عزم کی ضرورت ہے جس کی بدولت انشاء اللہ دُنیا میں انقلاب عظیم برپا ہو کر رہے گا۔

ایک اور نیا مشن

"لنڈن ۱۳ راکتوبر۔ رائیٹر کا ایک تار مظہر ہے کہ مسجدِ لنڈن کے ڈاکٹر یوسف سلیمان کل جنوبی افریقہ روانہ ہوئے جہاں وہ کیپ ٹاؤن میں ایک مسلم مشن قائم کریں گے۔ یہ مشن جنوبی افریقہ کی یونین میں اپنی قسم کا واحد ادارہ ہوگا۔ ڈاکٹر سلیمان نے رائیٹر کو بتایا کہ گو مشرقی اور مغربی افریقہ میں ہمارے بہت سے اسلامی تبلیغی مشن اور مسجدیں قائم ہیں۔ مگر جنوبی افریقہ میں اب تک کوئی ایسا مشن نہیں ہے۔ مسجدِ لنڈن کے اربابِ اختیار نے جنوبی افریقہ میں مسلمانوں کی کثیر آبادی کے پیشِ نظر جو وہاں کے مُلکی باشندے بن چکے ہیں ڈاکٹر سلیمان کو کیپ ٹاؤن میں مشن قائم کرنے کی ذمہ داری سپرد کی ہے۔ ڈاکٹر سلیمان نے کہا کہ مشن کیلئے

مناسب جگہ منتخب کرنے میں کسی جانب سے کوئی اعتراض نہیں اُٹھایا جائیگا"

("ڈان" دہلی مؤرخہ ۱۴ اکتوبر ۱۹۴۶ء)

ڈاکٹر یوسف سلیمان جنوبی افریقہ کے باشندے ہیں۔ ایک لمبے عرصہ تک وہ لنڈن میں طبی پریکٹس کرتے رہے ہیں۔ اور لنڈن ہی میں احمدی ہوئے تھے۔ گذشتہ سال جنوبی افریقہ جاتے ہوئے وہ قادیان تشریف لائے، تو حضرت امیرالمومنین ایدہ اللہ بنصرہ العزیز نے اُن کو اپنی آئندہ زندگی خدمت و تبلیغ اسلام میں صرف کرنے کی تحریک فرمائی اور جنوبی افریقہ میں تبلیغی مرکز کھولنے کا ارشاد فرمایا۔ ڈاکٹر صاحب نے حضور کے ارشاد پر لبیک کہی۔ اور آج ہم یہ خوش خبری سُن رہے ہیں کہ وہ اپنے مشن پر روانہ ہو گئے ہیں۔ جنگ کے خاتمہ کے بعد اب تک ہمارے کئی نئے مشن یورپ، امریکہ اور مشرقی و مغربی افریقہ میں کھل چکے ہیں۔ اب ان میں جنوبی افریقہ کے مشن کا قابلِ قدر اضافہ ہوا ہے۔ اَللّٰھُمَّ زِدْ فَزِدْ۔

طلوعِ شمس اِس ماہ کا ایک اور قابلِ ذکر اور خوشکن واقعہ ہمارے محترم بھائی مولٰنا جلال الدین صاحب شمسؔ امام مسجد لنڈن کی دارالامان میں کامیاب واپسی ہے۔ مولٰنا موصوف دس سال یعنی ۱۹۳۶ء سے ۱۹۴۶ء تک انگلستان میں فریضۂ تبلیغ نہایت محنت اور جانفشانی سے ادا کرنے کے بعد واپس تشریف لائے ہیں۔ جنگ کے انتہائی خطرناک دنوں میں جبکہ لنڈن پر جرمن بمباروں کی خوفناک بمباری کے علاوہ اور بھی بہت سی صبر آزما مشکلات کا سامنا تھا احمدیت کے اِس جلیل القدر فرزند نے غریب الوطنی میں جس علوِّ حوصلہ کا ثبوت دیا، اور اعلائے کلمۃ الحق کے لئے تحمّلِ شدائد کا جو اعلیٰ نمونہ دکھایا وہ تاریخ احمدیت میں ہمیشہ یاد رہیگا اور سلسلہ کے نوجوانوں کیلئے مشعلِ راہ کا کام دیگا۔

محترم مولوی صاحب ۱۹۲۲ء میں تعلیم سے فارغ ہو کر میدانِ تبلیغ میں داخل ہوئے۔

اور پہلے دس سال دمشق اور فلسطین میں تبلیغ کرتے رہے جہاں آپ ایک سازش کے ماتحت خنجر سے سخت مجروح بھی ہوئے۔ اُس وقت سے لے کر اب تک آپ کو اللہ تعالیٰ نے جس شاندار رنگ میں خدمتِ دین کے کامیاب مواقع عطا فرمائے ہیں وہ ہر اعتبار سے قابلِ رشک ہیں۔ ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَآءُ۔

ہم جناب مولوی صاحب کی خدمت میں ان کی انگلستان میں تبلیغی کامیابیوں پہ ہدیۂ مبارکباد پیش کرتے ہیں اور ان کی دیارِ حبیبؐ میں مراجعت پر خوش آمدید کہتے ہیں اور دُعا کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ اُن کو پہلے سے بھی زیادہ خدمتِ سلسلہ انجام دینے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

"ریویو" کے ساتھ جناب مولوی صاحب کی وابستگی اُس وقت سے ہے جبکہ ابھی وہ پُورے مبلغ نہیں بنے تھے، بلکہ تعلیم حاصل کر رہے تھے، اور رسالہ کی ادارت جناب قاضی محمد ظہور الدین صاحب اکمل کے ہاتھ میں تھی۔ تشحیذ الاذہان کے بعد اسی رسالہ سے اُن کی تحریری زندگی کی ابتدا ء محترم قاضی صاحب کی زیرِ تربیت ہوئی تھی۔ اور شمس کا لقب بھی اُنہیں قاضی صاحب موصوف ہی نے رسالہ تشحیذ میں دیا تھا جو اب ریویو میں شامل ہے۔

جناب مولوی صاحب نے اِس رسالہ کے ساتھ اپنے دیرینہ تعلقات کو ہمیشہ بہت اچھی طرح نبھایا ہے۔ دورانِ قیامِ انگلستان میں بھی وہ اپنے قیمتی مضامین اس میں چھپنے کے لئے بھیجتے رہے ہیں۔ اور ہم امید رکھتے ہیں کہ وہ آئندہ بھی اِن تعلقاتِ قدیمہ کو برقرار رکھنے کی کوشش فرمائیں گے۔

جناب مولوی صاحب کے ساتھ ہمارے ایک اور محترم بھائی السید المنیر الحصنی بھی تشریف لائے ہیں۔ یہ دمشق کے ایک نہایت معزز خاندان کے فرد ہیں۔ ۱۹۲۷ء میں جب شمس صاحب دمشق میں مبلغ تھے تو اُنہیں کے ذریعہ احمدیت میں داخل ہوئے تھے۔ آپ کے دل میں سلسلہ کے لئے بڑی محبت اور اخلاص ہے۔ اور اِس راہ میں آپ کو

بڑی بڑی آزمائشوں میں سے گزرنا پڑا ہے حتّٰی کہ سرکاری عدالتوں میں بھی لیجایا گیا۔ مگر اللہ تعالیٰ نے آپ کو وہ نورِ بصیرت بخشا کہ آپ ہر آزمائش میں پورے اُترے اور دینِ حق پر استقامت کا نہایت اچھا نمونہ دکھایا۔

خدا کے فضل سے اب شام اور فلسطین میں بہت سے لوگ احمدیت میں داخل ہو چکے ہیں۔ جن میں سے بعض احباب اپنی نیکی اور پرہیزگاری میں بہت نمایاں مقام پر پہنچے ہوئے ہیں۔ ہمارے نو وارد بھائی السیّد المنیر الحصنی بھی اُنہیں میں سے ایک ہیں۔ آپ دمشق کی جماعت احمدیہ کے صدر ہیں۔ چہرہ سے شرافت نیکی اور تقویٰ کے آثار نمایاں ہیں۔ اُن کو دیکھ کر حضرت مسیح موعود علیہ السلام کا وہ الہام یاد آجاتا ہے جس میں آپ کو بتایا گیا تھا کہ ملک شام کے ابدال آپ کیلئے دُعائیں کریں گے۔

ہم اپنے محترم بھائی کی آمد پر اَھْلًا وَّ سَھْلًا وَّ مَرْحَبًا عرض کرتے ہیں اور دُعا کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ اُن کے دارالامان کے قیام کو ہر جہت سے بابرکت بنائے آمین۔

مذہبی آزادی اور امریکی حکومت

جماعت احمدیہ کے ڈائرکٹر اطلاعات و پریس نے حسبِ ذیل اعلامیہ برائے اشاعت بھیجا ہے:۔

"حضرت امام جماعت احمدیہ قادیان نے احمدیہ مشن لندن کو ہدایت کی تھی کہ وہ حکومت سے درخواست کرے کہ وہ مسلم مشنریوں کو اجازت دے کہ وہ نیورمبرگ میں اُن جرمن لیڈروں کو مل کر جنہیں موت کی سزا دی گئی ہے اسلام قبول کرنے کی دعوت دیں، تا وہ اِس دُنیا کو چھوڑنے سے قبل اللہ تعالیٰ کے اُس آخری کلام کو سُن لیں، جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوا تھا چوہدری مشتاق احمد صاحب بی۔اے ایل ایل بی انچارج احمدی مبلغین لندن نے تار بھیجا ہے کہ انہوں نے اِس غرض کے لئے نیورمبرگ کی امریکن حکومت سے برطانوی حکومت کے ذریعہ درخواست دی تھی، مگر امریکن حکومت کے افسران نے

مُسلم مشنریوں کو اِس بات کی اجازت نہیں دی کہ وہ جرمن لیڈروں کو مل سکیں
حضرت امام جماعت احمدیہ نے اب امریکن حکومت کے پاس اپیل کی ہے، کہ
مذہبی معاملات میں عدل و انصاف ایسا ہی ضروری ہے، جیسا کہ سیاسی
اور اقتصادی اُمور میں۔ اور مسلمان امریکن حکومت کے اِس رویّہ کو نہایت
ناپسند کرتے ہیں۔ آگے بھی جاپان میں اُنہوں نے سینکڑوں عیسائی مشنریوں
کو جانے کی اجازت دے رکھی ہے مگر مُسلم مشنریوں کو وہاں جانیکی اجازت
نہیں۔ اور اب جرمنی کے امریکن مقبوضہ حصہ میں بھی مُسلم مشنریوں کو داخل
ہونے کی اجازت نہیں دی جا رہی۔ امریکہ کے حُریّت پسند لوگوں سے بھی یہ
اپیل کی جاتی ہے کہ وہ اپنی حکومت پر یہ دباؤ ڈالیں کہ وہ اپنے تمام مقبوضہ
علاقوں میں مُسلم مشنریوں کو برابر کے اور پُورے حقوق دے۔"

انگریزوں کی عام سیاسی پالیسی کی نسبت کوئی خواہ کچھ کہے، لیکن ان کی اس
خوبی کا اقرار اُن کے شدید سے شدید دشمنوں کو بھی کرنا پڑتا ہے، کہ ضمیر اور تقریر و تحریر
کی آزادی کا جو اصول اور عمل اُن کے زیرِ نگیں علاقوں اور مُلکوں میں رائج ہے وہ کسی
دوسری حکومت کی عملداری میں خواہ وہ حُریّت پسندی کے کتنے ہی بلند بانگ دُعادی
کرے، ہرگز رائج نہیں ہے۔

امریکہ کے متعلق عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے، کہ وہ انسانی ابتدائی حقوق دینے میں
سب حکومتوں سے زیادہ لبرل اور وسیع الحوصلہ ہے لیکن تجربہ نے یہ ثابت کر دیا ہے
کہ اپنے مقبوضہ علاقوں میں مذہبی آزادی دینے میں امریکہ ابھی انگریزوں سے بہت
پیچھے ہے۔ ایک مذہبی اور تبلیغی جماعت ہونے کی وجہ سے انگریزوں کی یہی وہ خوبی
ہے، جس کی جماعت احمدیہ ہمیشہ سے تعریف کرتی آئی ہے۔ اور ان کے اِس احساس کا کُھلا
اعتراف کرتی رہی ہے کہ وہ ہماری تبلیغِ اسلام کے راستہ میں کوئی روکاوٹ اور

پابندی عائد نہیں کرتی۔ ہماری اِس حق گوئی کی بنا پر ہمیں ہندوستان میں اور ہندوستان سے باہر بھی بعض کوتاہ اندیش لوگ مطعون کرتے ہیں، اور ہمیں انگریزوں کے پٹھو اور خوشامدی مشہور کیا جاتا ہے لیکن جن لوگوں کو دوسری حکومتوں کا تجربہ ہے، وہ انگریزی حکومت کی اِس خوبی کو تسلیم کرنے میں جماعتِ احمدیہ کے ہمنوا ہیں، کہ اِس وقت تقریر و تحریر اور ضمیر کی آزادی دینے میں کوئی دوسری حکومت انگریزوں کے ہم پلہ نہیں ہے۔

امریکی حکومت نے جاپان اور جرمنی میں تبلیغِ مذہب کے معاملہ میں جس جانبداری اور تنگ نظری کا اظہار کیا ہے، وہ ہر آزادی پسند انسان کے نزدیک قابلِ مذمت ہے۔ کیونکہ یہ پالیسی انسان کے ابتدائی حقوقِ آزادی پر ناواجب دست درازی ہے

اچھوتوں سے مسلمانوں کی عملی ہمدردی

ہندوستانی سیاسیات میں بہت جلد جلد عظیم الشان تغیرات رونما ہو رہے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی ہندوستان کے دس کروڑ مسلمانوں کی سیاسی زندگی میں بھی تبدیلی ہونا ایک طبعی امر ہے۔ گذشتہ ماہ ہندوستان کی عارضی مرکزی حکومت کی تشکیل ہوئی تھی۔ جس میں اعلیٰ ذات کے ہندوؤں کے نمائندہ کی حیثیت میں صرف کانگریس اور اسکے حلیفوں نے شمولیت اختیار کی۔ اور مسلم لیگ نے، جو مسلمانوں کی سب سے بڑی سیاسی نمائندہ جماعت ہے اس میں حصہ نہ لینے کا فیصلہ کیا۔ مگر اب حالات کی رفتار کو دیکھ کر لیگی رہنماؤں نے مرکزی حکومت میں حصہ لینے کا فیصلہ کر لیا ہے۔

برطانوی حکومت نے مسلم لیگ کے لئے پانچ نشستیں مقرر کی تھیں۔ مسٹر جناح صدر مسلم لیگ نے اِن پانچ نشستوں کو پُر کرنے کے لئے چار مسلمانوں اور ایک اچھوت کو نامزد کیا ہے۔ مسلمانوں کے کوٹا میں سے ایک اچھوت کا انتخاب ہر طبقہ اور خیال کے لوگوں کی گفتگو کا موضوع بحث بنا ہوا ہے۔ اور ہر گروہ اپنے اپنے نقطۂ نگاہ سے اِس پر رائے زنی کر رہا ہے۔ کانگریس سخت برافروختہ ہے، اور گاندھی جی نے تو اِس بات پر

بڑی بوکھلاہٹ اور برہمی کا اظہار کیا ہے کہ مُسلم لیگ نے ایک اچھوت کو اپنے حصّہ میں کیوں شریک کیا ہے۔ اُنہوں نے مُسلم لیگ کی نیّت پر بھی حملہ کرنے سے گریز نہیں کیا۔ زیادہ تکلیف اور غم اُنھیں یہ معلوم ہوتا ہے کہ مُسلم لیگ کی اِس رواداری سے متاثر ہوکر اچھوت ہندوؤں سے اور بھی زیادہ دُور اور مسلمانوں کے زیادہ قریب ہوجائینگے اور اِس طرح ہندو قوم کو، جس کے وہ سب سے زیادہ محافظ ہیں، سخت نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہے۔

گاندھی جی ہمیشہ اپنے آپ کو اچھوتوں کا ہمدرد ظاہر کرتے رہے ہیں۔ اور ان کی حالت کو بہتر بنانے کی اپیلیں آئے دن اُن کی طرف سے اخبارات میں شائع ہوتی رہتی ہیں مُسلم لیگ نے خود نقصان اُٹھاکر ایک اچھوت کو مرکزی حکومت میں جگہ دی ہے۔ اور یہ اچھوتوں کے ساتھ عملی ہمدردی کا با محل اور با موقعہ اظہار ہے۔ گاندھی جی اگر واقعہ میں اچھوتوں کو بہتر حالت میں دیکھنا چاہتے ہیں تو یہ امر اُن کے لئے خوشی کا موجب ہونا چاہئے تھا، نہ کہ غم و غصّے کے اظہار کا۔ اِس سے معلوم ہوتا ہے کہ گاندھی جی کی ہریجن ادھار کی تحریک محض ریا کاری پر مبنی ہے۔ ان کا اصل مُدعا اچھوتوں کی حالت کو بہتر بنانے کی بجائے محض طفل تسلیوں سے ان کو ہندوؤں کا غلام بنائے رکھنا ہے۔

پولیٹکل نقطۂ خیال سے مسٹر جناح کے اِس اقدام کو بہت سراہا جارہا ہے۔ لیکن ہماری دلچسپی اس کے سیاسی پہلو کی نسبت اس کے مذہبی پہلو سے زیادہ ہے۔ ہندوستانی اچھوت ایک بڑی مظلوم قوم ہے۔ ہزارہا سال سے اعلیٰ ذات کے ہندو اس کے ساتھ حیوانوں سے بھی بدتر سلوک کر رہے ہیں۔ ان کی حالت میں پہلا تغیر ہندوستان میں اسلام کے داخلہ کے ساتھ آیا۔ اسلامی اخوّت و مساوات سے متاثر ہوکر یہ لوگ کثیر تعداد میں مُسلمان ہونے لگے، اور اسلام کی عالمگیر برادری

نے انہیں اپنے اندر ایسا جذب کیا کہ ان کو مسلمانوں میں سے الگ پہچاننا ناممکن ہے
انگریزی عملداری نے بھی ان کی حالت سُدھارنے میں کافی مدد دی۔ اور اب وہ اپنے
تئیں انسان سمجھنے لگے ہیں۔

جوں جوں اچھوت بیدار ہو رہے ہیں، ہندوؤں کے مظالم کی یاد اُن کو اُن سے متنفر کر رہی ہے مشکل یہ ہے کہ ان مظالم کا سلسلہ اب بھی ختم ہونے میں نہیں آیا۔ بلکہ بدستور جاری ہے۔ یہ سب کچھ دیکھتے ہوئے بھی برطانوی گورنمنٹ نے اُنکے ساتھ یہ شدید ناانصافی کی ہے کہ مرکز میں عارضی حکومت قائم کرتے ہوئے اُنکو اعلیٰ ذات کے ہندوؤں کے رحم وکرم پر چھوڑ دیا گیا۔ اور کانگریس نے اپنے ڈھب کا ایک نمائندہ اچھوتوں میں سے چُن کر چھ کروڑ کی اِس بے زبان قوم پر اپنے مظالم میں ایک اور ظلم کا اضافہ کر دیا۔

ہندوؤں کی اِس بے رحمی اور بے دردی کو دیکھ کر اب اُن کی نگاہیں مسلمانوں پر لگی ہوئی تھیں، کہ وہ اُن کی کچھ مدد کریں۔ مسلمان کو اللہ تعالےٰ نے روزِ اوّل ہی سے مظلوموں کا حامی بنایا ہے۔ مسٹر جناح نے اسلام کی گذشتہ روایات کے مطابق اچھوتوں کی حمایت کو اپنا فرض سمجھا، اور اُنہیں مسلمانوں کے حصۂ حکومت میں شریک بنا لیا۔

مسلمانوں کی اِس فراخ دلی سے اچھوتوں کے دل احسان مندی اور تشکر کے جذبات سے لبریز ہیں۔ کوئی اڑھائی ماہ کا عرصہ ہُوا ہے، اچھوتوں کے مشہور لیڈر ڈاکٹر امبید کر نے یہ کہا تھا کہ وہ ہندو مذہب اور ہندوؤں سے بالکل مایوس ہو چکے ہیں، اور اب وہ یہ محسوس کرتے ہیں کہ اچھوتوں کی نجات اسلام ہی میں ہو سکتی ہے۔ لہذا وہ اپنی قوم کو مشورہ دیں گے کہ وہ اسلام قبول کر لے۔ بعض مسلم لیگی لیڈروں نے ڈاکٹر امبید کر کے اِس اعلان کا بڑی گرمجوشی سے خیر مقدم کیا تھا، اور انہیں

اسلام کے برکات سے متمتع ہونے کی دعوت دی تھی۔ اب مسلم لیگ اچھوتوں کی ہمدردی کا یہ عملی قدم اٹھا کر بہت آگے بڑھی ہے۔ اور اچھوت لیڈروں پر بھی اس کا خاطر خواہ اثر ہوا ہے۔ چنانچہ مسٹر بھوج راج جنرل سیکرٹری آل انڈیا شیڈولڈ کاسٹ فیڈریشن نے ایک بیان میں مسٹر جناح کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا کہ وہ ڈاکٹر امبیدکر کے اس نظریہ سے کامل اتفاق کا اظہار کرتے ہیں کہ اگر اچھوتوں کے ساتھ بے انصافی ہوتی رہی تو وہ اُن کو اسلام قبول کر لینے کا مشورہ دیں گے۔ انہوں نے مزید کہا کہ ہندو مذہب سے انہیں کسی بھلائی کی اُمید نہیں ہے۔ اور ان کی قوم کی اکثریت تبدیلِ مذہب کر لینے کے حق میں ہے۔ (روزنامہ ڈان مورخہ ۱۴ اکتوبر ۱۹۴۶ء)

یہ ردِ عمل بڑا حوصلہ افزا ہے لیکن ضرورت یہ ہے کہ مسلمان اس موقعہ سے فائدہ اُٹھائیں اور چھ کروڑ اچھوتوں کو اسلام کے قریب تر لانے کی کوشش کریں۔ حالات یقیناً سازگار ہیں۔ اگر مسلمان توجہ کریں تو ایک قوم کی قوم یا اسکے اکثر حصہ کو اسلام میں داخل کرنے کی سعی اور جد وجہد کر کے وہ خدا تعالیٰ کی رضا اور خوشنودی کو حاصل کرنے کے علاوہ سیاسی لحاظ سے بھی ہندوستان میں اسلام کو تقویت پہنچائیں گے۔

ضروری تصحیح

"ریویو اپریل ۱۹۴۶ء کے شروع میں شیخ عبدالقادر صاحب لائلپور کا مضمون یاجوج ماجوج کی حقیقت شائع ہوا ہے۔ مضمون کے آخر میں حاشیہ میں یہ ذکر ہے کہ جب طغرل بیگ کے جانشین مغرب میں برابر اپنی فتوحات بڑھاتے گئے یہانتک کہ تمام ایشیائے کوچک کو انہوں نے ختم کر دیا اور خود قسطنطنیہ ان کی وجہ سے خطرے میں پڑ گیا۔ اس موقعہ پر اسلامی شہنشاہ نے پوپ سے مدد کے لئے درخواست کی۔"

اس عبارت میں "اسلامی شہنشاہ" کی بجائے "عیسائی شہنشاہ" چاہئے تھا۔ یہ امداد مسلمانوں کی طرف سے تو نہ ہوسکتی تھی، وہ تو خود فاتح تھے۔ بلکہ شاہِ قسطنطنیہ نے پوپ سے اس قسم کی مدد کے لئے درخواست کی تھی۔

جہاد فی سبیل اللہ

مولانا مودودی صاحب کے نظریۂ جہاد پر ایک نظر

(از جناب شیخ روشن دین صاحب تنویر بی-اے ایل ایل-بی)

جب آدمی رنگین عینک چڑھا لیتا ہے تو جس رنگ کی عینک ہوتی ہے، تمام چیزیں جنکو وہ دیکھتا ہے اُسی رنگ میں رنگی جاتی ہیں۔ اگر عینک کے شیشے قرمزی ہوں، تو ہری ہری گھاس سے بھی لال لال خون ٹپکتا نظر آتا ہے۔ یہ تو ظاہری آنکھوں کا حال ہے۔ عقل کی آنکھوں پر بھی جب کسی خاص نقطۂ نظر کی عینک چڑھ جاتی ہے تو عقل کا بھی یہی حال ہوتا ہے۔ یعنی وہ خیالات جو درحقیقت اُس کے نقطۂ نظر کے متضاد ہوتے ہیں اُن میں بھی اُسے اپنی تائید کی جھلک نظر آنے لگتی ہے۔

پچھلے دنوں میں کئی تحریکیں یورپ میں اِس اصل کی بناء پر رونما ہوئی ہیں کہ "جسکی لاٹھی اُسی کی بھینس"۔ اِن تحریکوں میں سے فسطائیت اور اشتراکیت خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ فسطائیت کا گڑھ جرمنی اور اشتراکیت کا جنم بوم روس ہے۔ انیسویں صدی عیسوی کے نصف ہی سے جرمنی کے خیالات میں ایک انقلاب پیدا ہو رہا تھا۔ جرمنی والے دیکھ رہے تھے کہ انگریز قوم دُنیا کے اکثر حصہ پر چھا گئی ہے اور خود اُن کے لئے پھیلنے کے لئے گنجائش نہیں رہی۔ یورپین ممالک میں جرمنی لوہے کی صنعت اور خاص طور پر مشینری کی ساخت میں

ترقی کر رہا تھا۔ اس کو اپنا مال کھپانے کے لئے منڈیاں درکار تھیں لیکن تمام منڈیاں کسی نہ کسی طرح انگریزوں کے ہاتھ میں تھیں۔ ان کو اپنے لئے تمام راستے مسدود نظر آئے۔ اس جبر کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس میں نٹشے جیسے لوگ پیدا ہوئے جن کی تعلیم یہ تھی کہ زندگی دراصل طاقت ہی کا نام ہے۔ اور طاقتور کا فلسفہ یہ ہے کہ کمزور کو نگل جائے کمزوروں کو بہ تشدد دبا دینا ہی نیکی ہے۔ اور کمزوری ہی سب سے بڑا گناہ ہے جرمنی میں یہ وبا عام ہوئی، تو اس کی دیکھا دیکھی دوسری ہمسایہ قومیں بھی یہی راگ گانے لگیں۔ اس کا نتیجہ پہلی جنگ عظیم کی شکل میں رونما ہوا۔ جرمنی میں شکست کے بعد یہ جذبہ اور بھی ابھرا، اور کئی ایک اندرونی انقلابات کے بعد آخر ہٹلر اپنی آمریت قائم کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ اس کا پہلا اور آخری اصول یہی تھا کہ "تلوار سے دنیا کو فتح کرو" ادھر روس میں بھی انقلاب ہوا تو زاریت کو مٹا کر عوام نے اشتراکی حکومت برپا کر لی۔ امرا کو فنا کے گھاٹ اتارا اور ان کے اموال و املاک چھین لئے۔ انہوں نے بھی یہی اصول اختیار کیا، کہ "تشدد سے سرمایہ داری کو مٹایا جائے"

جرمنی اور روس نے اپنی بنیادیں مادیات پر رکھیں۔ مذہب کو ملک سے باہر کیا۔ عیسائیت اور یہودیت کے ساتھ اسلام کو بھی انسانی سوسائٹی کی تعمیر کے لئے خطرناک قرار دیا۔ اور اس تمام لٹریچر کو جو نرمی اور رواداری کی تعلیم دیتا تھا مٹا کر اپنے جابرانہ اور متشددانہ لٹریچر کی ترویج کی۔ جرمنی میں خدا کا تصور صرف یہ تھا کہ خدا صرف جرمن ہے، اور وہ جرمنوں کا ہی حامی ہے لیکن روس نے تو کھلم کھلا الحاد کا پرچار کیا۔

یہ خیالات آگ کی طرح تمام دنیا میں پھیلنے لگے۔ ممالکِ مغرب میں اٹلی، ہسپانیہ اور ترکی خاص طور پر متاثر ہوئے۔ رفتہ رفتہ ہندوستان میں بھی یہی خیالات آ گئے۔ مسلمانوں میں سے ڈاکٹر سر محمد اقبال نے ان خیالات کو اپنایا اور تشددی سیاست کے

عجیب طور سے اسلامی جامہ پہنایا۔ مسلمانوں میں علمائے سوء کی مہربانی سے "جہاد بالسیف" کا جبری تصور پہلے ہی موجود تھا۔ اب مغرب سے بھی اس کو نئی رنگینیاں میسر آگئیں۔ تمام مسلمانوں کی زبانوں پر گونج اٹھنے لگی، کہ "اسلام اور سیاست ایک ہی" "اسلام شیروں کا دین ہے"! "شہبازوں کا لائحہ عمل ہے"۔ تحریر و تقریر میں یہی ترانے گائے جانے لگے۔

ڈاکٹر اقبال کی شاعری کا بیشتر حصہ ایسے ہی خیالات سے پُر ہے۔ خیر یہ تو شاعری کی باتیں تھیں، جس میں کسی حد تک مبالغہ جائز سمجھا جاتا ہے۔ اور ان ترانوں نے سوائے گرمیٔ محفل کے کوئی نتیجہ پیدا نہ کیا۔ مگر اس جبری اور تشددی تصور نے مسلمانوں کو جادۂ مستقیم سے بھٹکا دیا۔ اکثر علماء نے اسلام کی پُر امن تعلیم کو اس رنگ میں پیش کیا جس سے معلوم ہو کہ اسلام بھی ایک اسی قسم کی انقلابی تحریک ہے جس طرح کہ اشتراکیت یا فسطائیت انقلابی تحریکیں ہیں۔ اور جو تشددی اور جبری ذرائع اِن تحریکوں میں جائز ہی نہیں بلکہ مستحسن خیال کئے جاتے ہیں، وہ اسلام میں بھی جائز بلکہ مستحسن ہیں۔ چنانچہ مولانا مودودی صاحب نے اپنے رسالہ "جہاد فی سبیل اللہ" میں اسی قسم کا نظریہ پیش کیا ہے۔ ہم اِس مقالہ میں اُن کے اِس نظریہ کی جانچ اور پڑتال کر کے دکھلائیں گے کہ اسلام کی پاک تعلیم کو کس طرح مسخ کر دیا گیا ہے۔ آپ اِس رسالہ کا آغاز اِن الفاظ میں کرتے ہیں:-

"عموماً لفظ جہاد کا ترجمہ انگریزی زبان میں (Holy War) مقدس جنگ کیا جاتا ہے۔ اور اس کی تشریح و تفسیر مدتہائے دراز سے کچھ اس انداز سے کی جاتی رہی ہے کہ اب یہ لفظ جوشِ جنوں کا ہم معنی ہو کر رہ گیا ہے۔ اس کے سنتے ہی آدمی کی آنکھوں میں کچھ اِس طرح کا نقشہ پھرنے لگتا ہے کہ مذہبی دیوانوں کا ایک گروہ ننگی تلواریں ہاتھ میں لئے داڑھیاں چڑھائے

خونخوار آنکھوں کے ساتھ اللہ اکبر کے نعرے لگاتا ہوا چلا آرہا ہے' جہاں کسی کافر کو پاتا ہے پکڑ لیتا ہے' اور تلوار اس کی گردن پر رکھ کر کہتا ہے کہ بولو "لا الٰہ الا اللہ" ورنہ ابھی سرِ تن سے جُدا کر دیا جاتا ہے ماہرین نے ہماری تصویر بڑی قلمکاریوں کے ساتھ بنائی ہے' اور اس کے نیچے موٹے حرفوں سے لکھ دیا کہ ؏

بوئے خوں آتی ہے اِس قوم کے افسانوں سے"

ماہرین سے آپ کا اشارہ مغربی ماہرین کی طرف ہے۔ آپ کے اِن پُر زور الفاظ سے قیاس کیا جا سکتا تھا' کہ آپ مسلمانوں کی اس تصویر کو غلط ثابت کریں گے' اور اس کی جگہ صحیح تصویر پیش کر کے ماہرینِ مغرب کی قلمکاریوں کا پول کھول کر رکھ دینگے۔ اور ان کی جگہ اپنی گلکاریوں سے دُنیا کے سامنے اسلام کا حقیقی دلآویز منظر پیش کریں گے' جس سے لوگ اُن ماہرین کی تصویر کو اپنے دل سے محو کر دیں گے مگر ؏

اے بسا آرزو کہ خاک شدہ

آپ نے ان ماہرین کی غیر مقدس جنگ کا ذکر کر کے ان مسلمانوں کو جنہوں نے ان ماہرین کی تصویر کو غلط ثابت کرنے کی کوشش کی' اِس طرح آڑے ہاتھوں لیا ہے۔ فرماتے ہیں :-

"مگر ان کی مہارت قابلِ داد ہے۔ انہوں نے ہماری تصویر اتنی بھیانک اور اتنی بڑی بنائی کہ خود اُن کی تصویر اس کے پیچھے چھُپ گئی۔ اور ہماری سادہ لوحی بھی قابلِ داد ہے۔ جب ہم نے غیروں کی بنائی ہوئی اپنی یہ تصویر دیکھی تو ایسے دہشت زدہ ہوئے' کہ ہمیں اس تصویر کے پیچھے جھانک کر خود مصوروں کی صورت دیکھنے کا ہوش ہی نہ آیا' اور لگے معذرت کرنے کہ حضور بھلا ہم جنگ و قتال کو کیا جانیں' ہم تو بھکشوؤں اور پادریوں کی طرح پُر امن مبلغ لوگ ہیں' چند مذہبی عقائد کی تردید کرنا اور اُن کی جگہ دوسرے عقائد لوگوں سے تسلیم کرا لینا'

بس یہ ہمارا کام ہے۔ ہمیں تلوار سے کیا واسطہ۔ البتہ اتنا قصور کبھی کبھار ضرور ہم سے ہوا ہے کہ جب کوئی ہمیں مارنے آیا تو ہم نے بھی جواب میں ہاتھ اُٹھا دیا۔ سو اب تو ہم اس سے بھی توبہ کر چکے ہیں۔ حضور کی طمانیت کے لئے تلوار والے جہاد کو "سرکاری طور" پر منسوخ کر دیا گیا ہے۔ اب تو جہاد فقط زبان و قلم کی کوشش کا نام ہے۔ توپ اور بندوق چلانا سرکار کا کام ہے، اور زبان و قلم چلانا ہمارا کام ہے"

مودودی صاحب نے اپنی ان پُرظرافت قلمکاریوں سے اُن لوگوں کی تصویر کھینچنے کی کوشش فرمائی ہے جو اسلام کو ایک پُرامن دین سمجھتے ہیں۔ ان دونوں اقتباسات کو پڑھ کر آدمی حیران ہوتا ہے کہ مولنا کیا فرما رہے ہیں۔ ایک طرف تو آپ کو یہ گلہ ہے کہ ماہرین نے ہماری یہ بھیانک تصویر بڑی قلمکاریوں سے بنائی ہے، حالانکہ ہم بالکل معصوم ہیں۔ اور دوسری طرف آپ کو یہ شکایت ہے کہ ہم نے اپنی اس بھیانک تصویر سے انکار کیوں کیا ہے۔ ایک طرف تو مولنا اپنی بھیانک تصویر دیکھ کر بلبلا اُٹھتے ہیں، اور ماہرین کو اُن کی اپنی غیر مقدس جنگ پر طعن و تشنیع کرنے لگے ہیں، تو دوسری طرف خود اپنے آپ پر اس لئے برس پڑے ہیں کہ جو بھیانک تصویر ماہرین نے ہماری کھینچی ہے' اس کو دیکھ کر ہم دہشت زدہ کیوں ہو گئے ہیں' بھلا اپنی تصویر سے بھی کوئی ڈرتا ہے۔ کیا بھیڑیا اپنی خوفناک ہیئت آئینہ میں دیکھ کر ڈر جاتا ہے اور کہنے لگتا ہے کہ میں پھاڑنے والا درندہ نہیں ہوں؟

اس مضمون میں ہم انشاءاللہ یہ دکھائیں گے، کہ مولنا نے جو تصویر "جہاد فی سبیل اللہ" کی بنائی ہے، وہ بھیانک پن میں کسی طرح ان ماہرین کی تصویر سے کم نہیں۔ اور ہم یہ بھی دکھائیں گے کہ اس بھیانک تصویر کے بنانے کے لئے مودودی صاحب نے اسلام کی پاک تعلیم کو کس طرح مسخ کر دیا ہے۔

اور قرآن کریم کو کس غلط طور پر پیش کیا ہے۔ پہلے ہم اس نتیجہ کو درج کر دیتے ہیں جس پر بعد استدلال مودودی صاحب پہنچے ہیں۔ تاکہ شروع ہی سے ناظرین کے پیش نظر آ جائے کہ مولانا کیا ثابت کرنا چاہتے ہیں۔ اس کے بعد ہم اس استدلال کو جانچیں گے جو آپ نے قرآن کریم اور تاریخِ اسلام سے اپنی تائید میں پیش کیا ہے۔ آپ اپنی کتاب کے صفحہ ۹ میں فرماتے ہیں:۔

"اس غرض کے لئے وہ تمام ان طاقتوں سے کام لینا چاہتا ہے جو انقلاب برپا کرنے کے لئے کارگر ہو سکتی ہیں۔ اور ان سب طاقتوں کے استعمال کا ایک جامع نام جہاد رکھتا ہے۔ زبان و قلم کے زور سے لوگوں کے نقطۂ نظر کو بدلنا اور اُن کے اندر انقلابِ ذہنی پیدا کرنا بھی جہاد ہے۔ ظالمانہ نظامِ زندگی کو بدل دینا اور نیا عادلانہ نظام مرتب کرنا بھی جہاد ہے۔ اور اس راہ میں مال اور جسم سے دوڑ دھوپ کرنا بھی جہاد ہے۔"

اس کے بعد آپ صفحہ ۳۰ میں زیرِ عنوان "جارحانہ اور مدافعانہ کی تقسیم غیر متعلق ہے" رقمطراز ہیں:۔

"یہ جو کچھ بیان کیا گیا ہے، اس پر جب آپ غور کریں گے تو یہ بات بآسانی آپ کی سمجھ میں آ جائے گی کہ جنگ کی جو تقسیم جارحانہ (Offensive) اور مدافعانہ (Defensive) کی اصطلاحوں میں کی گئی ہے، اس کا اطلاق سرے سے اسلامی جہاد پر ہوتا ہی نہیں ..... اسلامی جہاد بیک وقت جارحانہ بھی ہے اور مدافعانہ بھی۔ جارحانہ اس لئے کہ مسلم پارٹی مسلکِ مخالف کی حکمرانی پر حملہ کرتی ہے اور مدافعانہ اس لئے کہ وہ خود اپنے مسلک پر عامل ہونے کے لئے حکومت کی طاقت حاصل کرنے کے لئے مجبور ہے۔"

پھر صفحہ ۳۲ میں فرماتے ہیں:۔

"لہذا مسلم پارٹی کے لئے اصلاح عمومی اور تحفظِ خود دونوں کی خاطر یہ ناگزیر ہے کہ کسی ایک خطہ میں اسلامی نظام کی حکومت قائم کرنے پر اکتفا نہ کرے، بلکہ جہانتک اس کی قوتیں ساتھ دیں اس نظام کو تمام اطراف میں وسیع کرنے کی کوشش کرے، وہ ایک طرف اپنے افکار و نظریات کو دُنیا میں پھیلائے گی اور تمام ممالک کے باشندوں کو دعوت دیگی کہ اِس مسلک کو قبول کریں جس میں اُن کے لئے حقیقی فلاح مضمر ہے۔ دوسری طرف اگر اس میں طاقت ہوگی تو وہ لڑکر غیر اسلامی حکومتوں کو مٹا دیگی اور اُن کی جگہ اسلامی حکومت قائم کرے گی۔

یہی پالیسی تھی جس پر رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے اور آپ کے بعد خلفائے راشدین نے عمل کیا۔ عرب جہاں مسلم پارٹی پیدا ہوئی تھی سب سے پہلے اسی کو اسلامی حکومت کے زیرِ نگیں کیا گیا۔ اس کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اطراف کے ممالک کو اپنے اصول و مسلک کی طرف دعوت دی مگر اس کا انتظار نہ کیا کہ یہ دعوت قبول کی جاتی ہے یا نہیں، بلکہ قوت حاصل کرتے ہی رومی سلطنت سے تصادم شروع کر دیا۔ آں حضرتؐ کے بعد ابوبکر رضی اللہ عنہ پارٹی کے لیڈر ہوئے تو انہوں نے روم اور ایران دونوں کی غیر اسلامی حکومت پر حملہ کیا اور پھر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اِس حملہ کو کامیابی کے آخری مراحل تک پہنچا دیا۔"

تصویر کو مکمل کرنے کے لئے ہم یہاں مولنا موصوف کی تصنیف "تجدید و احیائے دین" سے بھی ایک اقتباس درج کر دیتے ہیں، تاکہ ناظرین کو آپ کا صحیح نقطہ نظر سمجھنے میں آسانی ہو۔ آپ اِس رسالہ کے صلا میں فرماتے ہیں:۔

"پس دُنیا میں انبیاء علیہم السلام کے مشن کا منتہائے مقصود یہ رہا ہے، کہ

حکومت الٰہیہ قائم کرکے اس پورے نظام زندگی کو نافذ کریں جو وہ خدا کیطرف سے لائے تھے۔ وہ اہلِ جاہلیت کو یہ حق دینے کے لئے تیار تھے کہ اپنے جاہلی اعتقادات پر قائم رہیں۔ اور جس حد کے اندر اُن کے عمل کا اثر اُنہی تک محدود رہتا ہے اس میں اپنے جاہلی طریقوں پر بھی چلتے رہیں۔ مگر وہ انہیں یہ حق دینے کے لئے تیار نہ تھے اور فطرۃً نہ دے سکتے تھے کہ اقتدار کی کُنجیاں اُن کے ہاتھ میں رہیں"

مولانا کی تحریروں کے اِن اقتباسات کو پڑھئے اور پھر اس تصویر کو دیکھئے، جو مولانا کے خیال میں ماہرین نے ہماری بنائی ہے۔ اور پھر بتائیے کہ اس میں ان ماہرین کا کیا قصور ہے؟ جب ہم اس بھیانک تصویر کو بنانے کے لئے خود مسالہ مہیا کرتے ہیں تو پھر جب وہ اس کے مطابق ہماری تصویر بناتے ہیں تو چیختے کیوں ہیں؟

اِن حوالوں کے پڑھنے سے ثابت ہوتا ہے کہ مولانا ممدوح کے نزدیک اسلام بھی اُسی قسم کی ایک انقلابی تحریک ہے جس قسم کی اشتراکی تحریک ایک انقلابی تحریک ہے اور اشتراکی تحریک کی طرح دُنیا میں انقلاب پیدا کرنے کے لئے اُن ہمسایوں کے ہاتھ سے، جو اس تحریک کے اصول بخوشی ماننے کے لئے تیار نہ ہوں، سیاسی اقتدار بزور شمشیر چھین لینا اسلام میں نہ صرف جائز ہے بلکہ اس کا مُقتضائے مقصود ہے۔ رُوسی اشتراکیوں کے کارنامے ابھی حال کا واقعہ ہیں۔ ہماری آنکھوں کے سامنے انہوں نے جو کچھ کیا وہ یہ ہے کہ انہوں نے تلوار کے زور سے اموال و املاک لوٹ لئے۔ اہلِ رُوس کو سخت عذاب دیکر چلتا کر دیا۔ بڑے بڑے کارخانہ داروں کو خاک سیاہ اور بڑے بڑے زمینداروں کو مٹی میں ملا دیا۔ ملک میں انقلاب کے لئے خون کی ندیاں بہا دیں۔ ہمسایہ ممالک کے سیاسی اقتدار بزور چھین لئے اور اُن کی مرضی کے خلاف اپنا اشتراکی نظام اُن پر ٹھونس دیا۔ جہاں تک نیک نیتی کا تعلق ہے اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اشتراکی بھی اپنے نظام کی خوبیوں پر پورا ایمان رکھتے ہیں۔ اور دوسری اقوام میں

اس کو پھیلانا بنی آدم کی بہبود اور بہتری کے لئے نہایت ضروری خیال کرتے ہیں۔ اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ مانتے ہوئے کہ اسلام انسان کی بہبود کے لئے بہترین اصول پیش کرتا ہے کیا دُنیا میں اِس کو غالب کرنے کے لئے اسی طرح شمشیر و سنان اور توپ و بندوق سے کام لینا جائز ہے جس طرح اشتراکیوں نے کیا؟ کیا قرآن کریم اِسکی اجازت دیتا ہے اور کیا تاریخ اسلام سے ثابت ہوتا ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم فداہُ ابی و اُمی اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے ایسا کیا؟

پیشتر اس کے کہ ہم مندرجۂ بالا سوالات پر غور کریں، ہم کو یہ بات مدنظر رکھنی ضروری ہے کہ اشتراکی نظام انسان کا بنایا ہوا ہے۔ اور اسلام کے نظام کی واضع وہ ذات ہے جو ربّ العالمین، الرحمٰن اور الرحیم ہے۔ ایک نظام اس محدود و مقید عقل کی پیداوار ہے جس کو اتنا بھی علم نہیں کہ ایک ہی لمحہ میں دُنیا میں کیا انقلاب واقعہ ہو رہا ہے۔ اور دوسرا نظام اُس عقل کُل اور علیم و حکیم کی تخلیق ہے جس کے لئے ازل و ابد ایک ہی لمحہ ہے۔ جو تمام زمانوں پر اس کمال کے ساتھ حاوی ہے کہ جس کمال کے ساتھ ہم ایک لمحہ پر بھی حاوی نہیں ہو سکتے۔ اس لئے ظاہر ہے کہ انسانی انقلابی تحریک کو پھیلانے کے لئے جو ذرائع اس کے معتقدین استعمال کریں گے وہ بھی نہایت محدود و مقید ہوں گے۔ ان میں وہی تنگ دِلیاں اور کوتہ اندیشیاں ہوں گی جو انسانی فطرت کا خاصہ ہیں۔ لیکن جو ذرائع اللہ تعالےٰ اپنے دین کی اشاعت کے لئے اختیار کریگا وہ ضرور اُس کی رحمانیت اور رحیمیت کی شان کے شایاں ہوں گے۔ اللہ تعالےٰ سے بڑھ کر طاقتور اور قوی و عزیز اور کون ہستی ہے۔ مگر وہ فرماتا ہے۔ کہ:۔

وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَجَعَلَكُمْ اُمَّةً وَّاحِدَةً وَّلٰكِنْ لِّيَبْلُوَكُمْ فِيْ مَآ اٰتٰكُمْ فَاسْتَبِقُوا الْخَيْرٰتِ ۔

اگر خدا چاہتا تو تم سب کو ایک ہی اُمت بنا دیتا۔ لیکن اُس نے ایسا نہیں کیا تاکہ اُس چیز میں تمہاری آزمائش کرے جو اُس نے تمکو دی ہے۔ پس تم نیکی کی طرف بڑھو۔

اِلَى اللّٰهِ مَرْجِعُكُمْ جَمِيْعًا فَيُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ فِيْهِ تَخْتَلِفُوْنَ ۙ (مائدہ ع)	تم سب کو اللہ کے سامنے حاضر ہونا ہے۔ اس لئے وہ تم کو اس بات سے متنبہ کرتا ہے جس میں تم باہم اختلاف کرتے ہو۔

پھر فرماتا ہے:۔

اِنْ يَّشَاْ يُذْهِبْكُمْ وَيَاْتِ بِخَلْقٍ جَدِيْدٍ ۙ وَّمَا ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ بِعَزِيْزٍ ۝ (فاطر ع)	اگر وہ چاہے تو تم کو مٹا دے اور دے آئے نئی خلقت۔ اور یہ بات اللہ پر بھاری نہیں ہے۔

اس قسم کی آیات قرآن کریم میں اور بھی ہیں۔ ان سے اللہ تعالےٰ کا یہ اصول معلوم ہوتا ہے کہ وہ باوجود طاقت رکھنے کے دین میں کسی قسم کے جبر کو خواہ نظام باطل کے ہاتھ سے سیاسی اقتدار ہی چھینا ہو بالکل پسند نہیں کرتا۔ اور دین اور ہدایت میں جو وہ بھیجتا ہے لوگوں کی آزمائش کرتا ہے کہ کون بخوشی اس کو اختیار کرتا ہے اور کون نہیں کرتا۔ اس بارے میں اللہ تعالےٰ نے لوگوں کو آزادی دے رکھی ہے اور کسی قسم کے جبر کا شائبہ بھی اللہ تعالےٰ کے اس اصول کی خلاف ورزی میں شامل ہوگا چنانچہ اللہ تعالےٰ رسولوں کو بھی یہی ہدایت دیتا ہے کہ دین کے معاملہ میں اُن کا فرض صرف تبلیغِ حق ہے اور وہ بھی نہایت احسن طریق سے۔ اللہ تعالےٰ محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو مخاطب کرکے فرماتا ہے:۔

فَاِنْ اَعْرَضُوْا فَمَآ اَرْسَلْنٰكَ عَلَيْهِمْ حَفِيْظًا ؕ اِنْ عَلَيْكَ اِلَّا الْبَلٰغُ ؕ (شوریٰ ع)	پس اگر لوگ اعراض کریں تو ہم نے تجھ کو اُن پر داروغہ بنا کر تو بھیجا نہیں۔ تجھ پر تو صرف تبلیغِ حق فرض ہے۔

پھر اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:۔

فَذَكِّرْ ؕ اِنَّمَآ اَنْتَ مُذَكِّرٌ ۙ	پس نصیحت کر، تُو تو صرف نصیحت کرنے والا ہے

لَسْتَ عَلَيْهِمْ بِمُصَيْطِرٍ (الغاشیہ)	اُن پر داروغہ نہیں ہے۔

پھر فرماتا ہے:۔

نَحْنُ اَعْلَمُ بِمَا يَقُوْلُوْنَ وَ مَا اَنْتَ عَلَيْهِمْ بِجَبَّارٍ فَذَكِّرْ بِالْقُرْاٰنِ مَنْ يَّخَافُ وَعِيْدِ ۝ (ق ع ۳)	ہم خوب جانتے ہیں جو کہ یہ (کافر لوگ) کہتے ہیں اور تو اُن پر ہرگز جبر کرنے والا نہیں ہے۔ سو نصیحت کر قرآن کیساتھ اُسے جو میری (اُخروی) وعید سے ڈرتا ہے۔

پھر فرماتا ہے:۔

وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ مَآ اَشْرَكُوْا ؕ	اور اگر اللہ چاہے تو یہ (مشرک اشرک نہ کرتے۔
وَمَا جَعَلْنٰكَ عَلَيْهِمْ حَفِيْظًا ۚ	اور تجھے ہم نے ان پر نگران بناکر نہیں بھیجا۔
وَمَآ اَنْتَ عَلَيْهِمْ بِوَكِيْلٍ (انعام)	اور نہ تم اُن پر وکیل مقرر کئے گئے ہو۔

ان آیات پر سرسری غور کرنے سے بھی اِس سوال کا جواب سامنے آجاتا ہے، کہ نظامِ کفر سے بزورِ شمشیر سیاسی اقتدار چھیننا جبر فی الدین ہے یا نہیں۔ مندرجہ بالا آیات کے زور دار اور فیصلہ کُن الفاظ پر غور کیجئے، کہ اللہ تعالےٰ تو حکم دیتا ہے کہ لوگ میری تعلیم سے مُنہ بھی پھیرلیں تو کوئی مضائقہ نہیں، اور تم کو کوئی اختیار نہیں کہ تم کسی قسم کا جبر کرو۔ کیونکہ تم کو لوگوں پر کوئی داروغہ یا خدائی فوجدار بنا کر نہیں بھیجا گیا تمہارا کام تو صرف اتنا ہے کہ اللہ کا پیغام دُنیا کو پہنچادو، وبس۔ اِس سے زیادہ تمہارا کوئی اختیار نہیں۔ اب اللہ تعالےٰ کی تو یہ صریح تعلیم ہے کہ حضرت محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نہ لوگوں پر داروغہ ہیں اور نہ خدائی فوجدار، مگر مودودی صاحب یہ فرماتے ہیں کہ روم و ایران کو دعوتِ حق دیکر آنحضور صلے اللہ علیہ وسلم نے یہ انتظار بھی نہ کیا کہ دیکھیں دعوت کا کیا اثر ہوتا ہے، اور روم سے تصادم شروع کردیا تاکہ قیصر سے سیاسی اقتدار چھین کر خود اس پر قابض ہوجائیں۔ کیا آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم، صحابہ کرامؓ اور خلفائے راشدین

پر خدا تعالیٰ کے اِن احکام کہ اِنْ عَلَيْكَ اِلَّا الْبَلٰغُ اور لَسْتَ عَلَيْهِمْ بِمُصَيْطِرٍ اور مَا اَنْتَ عَلَيْهِمْ بِجَبَّارٍ اور مَا جَعَلْنٰكَ عَلَيْهِمْ حَفِيْظًا اور مَا اَنْتَ عَلَيْهِمْ بِوَكِيْلٍ ۔ کا نعوذ باللہ کوئی اثر نہیں ہوا تھا کہ وہ بلاوجہ روم و ایران سے سیاسی اقتدار چھیننے کے درپے ہو گئے تھے ۔

ہم اس بات کو تسلیم کر سکتے ہیں کہ انبیاء علیہم السلام اور آپ کی جماعت کا یہ بھی ایک عظیم الشان مقصد رہا ہے کہ وہ جائز اور خدا کی مقررہ حدود کے اندر رہتے ہوئے دُنیا میں ایسا عالمگیر انقلاب پیدا کرنے کے لئے جدوجہد کریں جس کی بدولت تمام دُنیا کا سیاسی اقتدار ایسے نیک اور متقی لوگوں کے ہاتھ میں آجائے جو خدا کے احکام کے مطابق سیاسی توازن قائم رکھ سکیں۔ مگر حاشا وکلا اسلام کی تعلیم ہرگز یہ روا نہیں رکھتی کہ یہ انقلاب بذریعہ شمشیر و سنان پیدا کیا جائے۔ ذرا غور فرمایئے کہ دُنیا کی سیاسی قوت کا نیک و متقی لوگوں کے ہاتھ میں آنا بھی تو دین ہی کا کام ہے۔ اور اس کے لئے جدوجہد کرنا بھی تو دین ہی کا جزو ہے۔ بلکہ خود مودودی صاحب کے نظریہ کے مطابق تو انبیاء علیہم السلام کا مُنتہائے مقصود ہی یہ ہے۔ تو پھر جب دین کے دوسرے اصولوں کو منوانے کے لئے تلوار چلانا جائز نہیں تو سیاسی اقتدار ہاتھ میں لینے کے لئے جو جدوجہد ہوگی اُس میں تلوار سے کام لینا کیونکر جائز ہو سکتا ہے۔ اگر دُنیا کا سیاسی اقتدار ہاتھ میں لینا بھی دین ہی ہے، بلکہ بقول مودودی صاحب منشاء دین ہے تو اللہ تعالیٰ نے تو صاف فرما دیا ہے۔ کہ :-

لَاۤ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ قَدْ تَّبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ	دین میں کوئی جبر نہیں یقیناً ہدایت گمراہی سے ممیز ہو چکی ہے۔

پھر مودودی صاحب اِس تعلیم کے بالکل اُلٹ اپنے رسالہ کے صـ۲۲ میں یہ کیسے فرماتے ہیں کہ :-

"یہ مذہبی تبلیغ کرنے والے واعظین (Preachers) اور مبشرین (Missionaries) کی جماعت نہیں ہے، بلکہ خدائی فوجداروں کی جماعت ہے، (لِتَكُونُوا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ) اور اس کا کام یہ ہے، کہ دنیا سے ظلم و فتنہ و فساد و طغیان اور ناجائز انتفاع کو بزور مٹادے اور اَرْبَابٌ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ کی خداوندی کو ختم کردے، اور بدی کی جگہ نیکی قائم کردے۔"

اُوپر کی آیات کی روشنی میں اس ٹکڑے کو دیکھئے۔ مودودی صاحب نے قرآن کریم کے عین متضاد اصول پیش کیا ہے۔ اللہ تعالےٰ تو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو فرماتا ہے کہ تم صرف تبلیغ کرنے والے واعظ اور مبشر ہو، اور خدائی فوجدار نہیں ہو، مگر مولنا فرماتے ہیں کہ مسلمان تبلیغ کرنے والا واعظ اور مبشر نہیں، بلکہ خدائی فوجدار ہے۔ زورِ قلم کی یہ حُسن آفرینیاں ملاحظہ فرمایئے ؎

جنوں کا نام خرد رکھ دیا خرد کا جنوں
جو چاہے آپ کا حُسنِ کرشمہ ساز کرے

یہی نہیں بلکہ مولنا نے یہ بھی غضب کیا ہے کہ اپنے اِسی لادینی اور خلافِ اسلام اصول کو قرآن کریم کی ایسی آیات کے ٹکڑوں سے ثابت کرنے کی کوشش فرمائی ہے، جو عین آپ کے اصول کی تردید کے لئے اللہ تعالےٰ نے نازل فرمائی ہیں۔ ع

چہ دلاور است دزدے کہ بکف چراغ دارد

آپ نے اس آخری ارشاد کے ثبوت میں قرآن کریم سے مندرجہ ذیل ٹکڑے پیش کئے ہیں :-

(۱) وَقَاتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّيَكُوْنَ الدِّيْنُ لِلّٰهِ ط

(۲) اِلَّا تَفْعَلُوْهُ تَكُنْ فِتْنَةٌ فِي الْاَرْضِ وَفَسَادٌ كَبِيْرٌ

(۳) هُوَ الَّذِيْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهٗ

عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُوْنَ ۝

اِن تینوں ٹکڑوں میں سے جو جناب مودودی صاحب نے اپنے نظریہ کی تائید میں پیش کئے ہیں صرف پہلے ٹکڑے میں لڑائی کا ذکر ہے۔ ہم مان لیتے ہیں کہ یہ تلوار کی لڑائی کا ذکر ہے لیکن جب ہم اس ٹکڑے کے ساتھ کے حصوں کو دیکھتے ہیں تو آپ کے استدلال کی تمام عمارت دھڑام سے نیچے آگرتی ہے۔ ہم آپ کی دیانت کے متعلق کچھ شبہ نہیں کرتے۔ مگر استدلال کی خطا کو ضرور واشگاف کریں گے۔ یہ آیت اپنے سیاق و سباق کے ساتھ یوں آئی ہے:-

وَقَاتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ الَّذِيْنَ	اللہ کی راہ میں اُن سے لڑو جو تم سے لڑتے ہیں۔
يُقَاتِلُوْنَكُمْ وَلَا تَعْتَدُوْا ۚ اِنَّ	اور زیادتی نہ کرو۔ یقیناً اللہ زیادتی کرنیوالوں
اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِيْنَ ۝	سے محبت نہیں رکھتا۔
وَاقْتُلُوْهُمْ حَيْثُ ثَقِفْتُمُوْهُمْ	جہاں اُن سے تمہاری مڈھ بھیڑ ہو جائے انکو مارو
وَاَخْرِجُوْهُمْ مِّنْ حَيْثُ	اور جہاں سے انہوں نے تم کو نکالا ہے تم بھی انکو
اَخْرَجُوْكُمْ وَالْفِتْنَةُ اَشَدُّ	وہاں سے نکال دو۔ اور فتنہ قتل سے زیادہ سخت
مِنَ الْقَتْلِ ۚ وَلَا تُقٰتِلُوْهُمْ عِنْدَ	ہے۔ کعبہ کے پاس اُن سے لڑائی نہ کرو۔
الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ حَتّٰى يُقٰتِلُوْكُمْ	یہاں تک کہ وہ خود وہاں تم سے لڑیں۔
فِيْهِ ۚ فَاِنْ قٰتَلُوْكُمْ فَاقْتُلُوْهُمْ	پس اگر وہ لڑیں تم سے تو مارو اُن کو۔
كَذٰلِكَ جَزَآءُ الْكٰفِرِيْنَ ۝	کافروں کی یہی جزا ہے۔
فَاِنِ انْتَهَوْا فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ	پس اگر وہ باز آجائیں تو یقیناً اللہ غفور
رَّحِيْمٌ ۝ وَقٰتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا	رحیم ہے۔ اور اُن سے لڑو۔ یہاں تک کہ
تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّيَكُوْنَ الدِّيْنُ	فتنہ نہ رہے اور دین اللہ کے لئے
لِلّٰهِ ۚ فَاِنِ انْتَهَوْا فَلَا عُدْوَانَ	ہو جائے۔ پھر اگر وہ باز آجائیں تو نہیں زیادتی کا حکم

اِلَّا عَلَی الظّٰلِمِیْنَ ۝ اَلشَّھْرُ الْحَرَامُ بِالشَّھْرِ الْحَرَامِ وَ الْحُرُمٰتُ قِصَاصٌ فَمَنِ اعْتَدٰی عَلَیْکُمْ فَاعْتَدُوْا عَلَیْہِ بِمِثْلِ مَا اعْتَدٰی عَلَیْکُمْ وَاتَّقُوا اللّٰہَ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰہَ مَعَ الْمُتَّقِیْنَ ۝ (بقرہ ع ۲۴)	مگر ظالموں پر۔ پاک مہینے کے بدلے پاک مہینہ ہے۔ اور سب عزت والی چیزیں برابر کا بدلہ ہیں۔ پس جو تم پر زیادتی کرے تو تم بھی اتنی ہی زیادتی اس پر کرو جتنی کہ اس نے تم پر کی ہے۔ اور اللہ سے تقویٰ کرو۔ اور جان لو کہ یقیناً اللہ تقویٰ کرنیوالوں کے ساتھ ہے۔

ہم نے اس حصہ پر خط کھینچ دیا ہے جو مولانا مودودی صاحب نے اپنے نظریہ کے ثبوت میں پیش کیا ہے۔ اور اس کا اگلا اور پچھلا حصہ بھی آپ کے سامنے رکھدیا ہے۔ اب ناظرین کرام انصاف کریں کیا ان آیات سے وہ مطلب جو مولانا موصوف نے ایک ٹکڑے کو علیحدہ کر کے نکالا ہے نکل سکتا ہے؟ یہ تو وہی طریق استدلال ہے جو کسی ظریف نے کیا تھا اور کہا تھا کہ قرآن مجید میں آیا ہے کہ نماز نہ پڑھا کرو۔ اور ثبوت میں لَا تَقْرَبُوا الصَّلٰوۃَ کے الفاظ پیش کر دیئے تھے۔ اور وَاَنْتُمْ سُکٰرٰی کو چھوڑ دیا تھا۔ کہاں یہ مقدس تعلیم اور کہاں مودودی صاحب کا خواہشاتی اور لادینی نتیجہ کہ کفار سے بزور سیاسی اقتدار چھین لو۔ اگر قرآن پاک میں ایسی تعلیم کا اشارہ بھی ہوتا تو مولانا کو اس خود فریبی کی ضرورت نہ پڑتی۔ اور آپ ایک ٹکڑے کو اس کے سیاق و سباق سے جدا کر کے اپنے نظریہ کی تائید میں پیش نہ کرتے۔ دیکھئے، ان آیات میں اللہ تعالیٰ نے جہاد فی سبیل اللہ کی بنیادی قیود و حدود کس صفائی اور صراحت سے مقرر فرما دی ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے جہاد بالسیف کے بارے میں کس قدر نازک سے نازک احتیاط کو مدنظر رکھنے کی تاکید فرمائی ہے۔ کہ دیکھنا کہیں تم سے ذرا بھی زیادتی نہ ہو جائے۔ ورنہ تم تقویٰ کی حدود سے نکل جاؤ گے، اور خدا تعالیٰ

کی تائید کو کھو دو گے۔ اللہ تعالیٰ تو فرماتا ہے کہ وہ کفار جنہوں نے تم کو اس قدر اذیتیں دیں کہ تم کو وطن سے نکال دیا، وہ بھی اگر لڑائی بند کریں تو تم فوراً تلوار ہاتھ سے رکھ دو مگر مولنا ہمیں تلقین فرما رہے ہیں کہ جن کفار نے تم کو کبھی کوئی نقصان نہیں پہنچایا تم تلوار کے زور سے ان کے سیاسی اقتدار چھین لو۔ بے شک مولنا مارکس وغیرہ اشتراکیوں کی الکتاب سے یا ہٹلر اور مسولینی کے صحیفوں سے تو اپنا نظریہ آسانی سے ثابت کر سکتے ہیں مگر اس قرآن کریم سے جو محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم جیسے رحمۃ للعالمین پر خدائے غفور و رحیم نے اُتارا تھا اس سے یہ اصول ہرگز نکال نہیں سکتے۔ اس کا ہر ہر لفظ اِس خیال کو دھکے دے رہا ہے۔

اِن آیاتِ کریمہ نے مولنا موصوف کے اِس پیچ در پیچ اور عجیب وغریب استدلال کی بھی قلعی کھول کر رکھ دی ہے، جو آپ نے جارحانہ اور مدافعانہ جنگ کے بارے میں کیا ہے۔ بیشک جب لڑائی چھڑ جاتی ہے تو اُس وقت جب تک لڑائی کا زمانہ قائم رہے بیچ کی مڈھ بھیڑوں میں جارحانہ اور مدافعانہ کا امتیاز بظاہر نہیں رہتا۔ لیکن یہ بات آسانی سے معلوم ہو سکتی ہے کہ کون ظالم ہے اور کون مظلوم۔ اگر مظلوم اپنی خود حفاظتی کے لئے کوئی ایسی پیش قدمی کرتا ہے، کہ اگر یہ مصلحت اندیشانہ کارروائی نہ کی جاتی تو ظالم کا حملہ مظلوم کو بالکل تباہ کر دیتا تو ایسی پیش قدمی کو اصولاً ہم جارحانہ نہیں کہیں گے۔ جب کوئی جماعت لڑائی سے بچنے کے لئے وطن تک چھوڑ دیتی ہے، اور امن قائم رکھنے کی تمام تدبیریں بے سُود ثابت ہو چکی ہیں، اور اس مظلوم جماعت کو مجبوراً خون کی ہولی کھیلنا پڑتی ہے، تو پھر اگر وہ جماعت حملہ آور دشمن کی طاقت کو کمزور کرنے کے لئے کوئی پیش قدمی کرتی ہے تو اس کو مدافعانہ نہ کہنا کس قدر ظلم ہے۔ بے شک کسی حملہ آور دشمن کی طاقت کو توڑنے کیلئے جو تدابیر عمل میں لائی جاتی ہیں وہ بعض اوقات بظاہر جارحانہ انداز کی ہوتی ہیں مگر

حقیقت میں وہ اقدام اور تدابیر بھی مدافعانہ ہی کہلائیں گی۔ کیونکہ اگر دشمن پہلے لڑائی نہ چھیڑتا تو اس بظاہر جارحانہ اقدام کی ضرورت ہی نہ پڑتی۔ مولنا نے جو مغالطہ کھایا ہے اس کی بناء یہ ہے کہ کفارِ قریش نے پہلے مسلمانوں پر جارحانہ حملے شروع کئے اور اس میں اپنے حلیف قبیلوں سے بھی استمداد لی، اور تمام عرب میں جنگی فضا پیدا کر دی۔ لیکن اس کے باوجود آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم اور آپؐ کے صحابہ کرامؓ نے جور و اداری اور اخلاقی بلندی دکھائی، اس کی نظیر دُنیا کی تاریخ میں ڈھونڈنا بے سُود ہے۔ اِن آیات میں اللہ تعالےٰ نے جہاد فی سبیل اللہ کی غرض و غایت اور اس کے بُنیادی حدود و قیود قائم کر دیئے ہیں۔ اب جہاد بالسیف کے متعلق جو بھی آیت ہوگی، وہ اِن شرائط کے ماتحت ہوگی۔ یہ آیات ایک قاعدہ کلیہ کے طور پر عالمگیر اور اَن مٹ ہیں۔ اللہ تعالےٰ نے ایک دفعہ یہ شرائط بیان کر دی ہیں، اس لئے ضروری نہیں کہ ان کو بار بار دُہرایا جائے۔ ہاں دوسری آیات میں مزید شرائط بیان ہونگی۔ قرآن کریم میں ایک لفظ بھی ایسا نہیں جس سے ثابت ہو کہ امن کے زمانے میں محض دوسروں سے سیاسی اقتدار چھیننے کے لئے تلوار اُٹھانا جہاد فی سبیل اللہ ہے۔

اب ہم مودودی صاحب کے پیش کردہ دوسرے ٹکڑے کو لیتے ہیں، اور اسکو اس کے ماحول میں رکھ کر دیکھتے ہیں کہ آیا مولنا کے خیال کو اس ٹکڑے سے کوئی مدد مل سکتی ہے؟ اللہ تعالےٰ فرماتا ہے:-

اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَهَاجَرُوْا وَ	یقیناً وہ جو ایمان لائے اور انہوں نے ہجرت کی اور
جَاهَدُوْا بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ	اپنے مالوں اور جانوں کے ساتھ جہاد کیا
فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَالَّذِيْنَ اٰوَوْا وَّ	اللہ تعالےٰ کے رستے میں، اور وہ جنہوں نے پناہ دی
نَصَرُوْٓا اُولٰٓئِكَ بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ	اور مدد کی، ان میں سے بعض بعض کے دوست ہیں
بَعْضٍ ۭ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَلَمْ يُهَاجِرُوْا	اور وہ جو ایمان لائے مگر انہوں نے ہجرت نہ کی،

مَا لَكُمْ مِّنْ وَّلَايَتِهِمْ مِّنْ شَيْءٍ
حَتّٰى يُهَاجِرُوْا ۚ وَاِنِ اسْتَنْصَرُوْكُمْ
فِي الدِّيْنِ فَعَلَيْكُمُ النَّصْرُ اِلَّا
عَلٰى قَوْمٍ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَهُمْ مِّيْثَاقٌ ۗ
وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ○ وَ
الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ
بَعْضٍ ۗ اِلَّا تَفْعَلُوْهُ تَكُنْ فِتْنَةٌ
فِي الْاَرْضِ وَفَسَادٌ كَبِيْرٌ ۗ (انفال)

ان کی دوستی میں سے تمہارے لئے کوئی حصہ نہیں یہاں تک کہ وہ ہجرت کریں۔ اور اگر وہ دین کے بارے میں تم سے مدد کے طالب ہوں تو تم پر مدد واجب ہے مگر اس قوم کے خلاف ہرگز نہیں جس کے درمیان اور تمہارے درمیان معاہدہ ہو اور جو تم کرتے ہو اللہ اسے دیکھنے والا ہے۔ اور جنہوں نے کفر کیا ان میں سے بعض بعض کے دوست ہیں۔ دیکھو اگر تم یہ نہ کروگے تو زمین میں فتنہ اور بڑا فساد برپا ہوگا۔

ان آیات میں اللہ تعالےٰ نے مندرجہ ذیل اصولِ جہاد بیان فرمائے ہیں:۔

(۱) مومن مہاجرین جنہوں نے جہاد میں جان و مال قربان کیا اور ان انصار کی جنہوں نے ان کو پناہ دی اور ان کی مدد کی دوستی جائز ہے۔

(۲) ان مومنوں کے ساتھ دوستی جائز نہیں جنہوں نے ہجرت نہیں کی مگر مندرجہ ذیل صورت میں۔

(الف) وہ ہجرت کریں۔

(ب) اگر غیر اسلامی حکومت ان کو دین میں تکلیف دیتی ہو اور وہ خود طالبِ امداد ہوں۔ لیکن اس صورت میں بھی اگر اس غیر اسلامی حکومت کیساتھ تمہارا معاہدہ ہو جس کے خلاف مدد مانگی جاتی ہے تو ایسے مومنوں کی مدد کرنے کی بھی اجازت نہیں۔

دیکھئے، اللہ تعالےٰ نے کس احتیاط سے کام لیا ہے۔ معترض کہہ سکتا تھا کہ غیر اسلامی حکومت کے مصیبت زدہ مومنوں سے جو طالبِ امداد ہوں دوستی کرنا ناواجب ہے، یہ دوسرے کے اندرونی معاملات میں دخل دینا ہے۔ اللہ تعالےٰ نے ایسی دوستی کے

جواز میں یہ دلیل پیش کرتا ہے کہ کافر بھی تو بعض سے بعض دوستی رکھتے ہیں۔ جب ان کے لئے جائز ہے تو مومنوں کے لئے کیوں جائز نہیں ۔ایک غیر اسلامی حکومت دین کی وجہ سے مومنوں کی ایک خاص جماعت کو تکلیف دے رہی ہے اور اگر وہ مصیبت زدہ لوگ اپنے آزاد بھائیوں سے استمداد کرتے ہیں تو ایسے مصیبت زدگان کی امداد میں بظاہر کوئی حرج نظر نہیں آتا لیکن اسلامی تعلیم کی رواداری کا کمال دیکھئے کہ (۱) اگر ایسے مصیبت زدہ ہم سے طالب امداد نہ ہوں۔ اور (۲) طالب امداد ہوں بھی مگر وہ ایسی حکومت کے زیر سایہ ہوں جس کے ساتھ آزاد مومنوں کا معاہدہ ہو تو ان دونوں آخری صورتوں میں وہ مصیبت زدہ مومن ہماری امداد کے مستحق نہیں اور ہمیں جائز نہیں کہ ہم خواہ مخواہ دخل دیں۔ ہاں اگر وہ ہجرت کر آئیں تو وہ ہمارے ویسے ہی دوست ہیں جیسے کہ پہلے مہاجرین۔ اور ہمکو انکی ویسے ہی امداد کرنی چاہیئے اور ان کو ویسے ہی پناہ دینی چاہیئے جیسے پہلے مہاجرین کی امداد کرنا اور انکو پناہ دینا ہمارا فرض ہے۔

اللہ تعالےٰ فرماتا ہے کہ اگر تم اِن اصولوں کی پابندی نہ کرو گے، تو زمین میں فتنہ پھیل جائے گا اور بڑا فساد ہوگا۔ اب بتایئے اس آیت سے مودودی صاحب کا اصول کہ تبلیغ کا اثر دیکھے بغیر روم پر ہلّہ بول دو جہاں ایک بھی مسلمان موجود نہیں جس کو دین کے بارے میں ستایا گیا ہو اور جس نے طلبِ امداد کی ہو مستنبط ہوتا ہے یا آپ کے اس لادینی اصول کی صاف صاف تردید ہوتی ہے؟ اللہ اللہ کیسی پاک تعلیم ہے کیسے غیر مبہم الفاظ میں بتا دیا گیا ہے کہ غیر اسلامی حکومت پر چڑھائی کر کے تلوار کے زور سے اس کا سیاسی اقتدار چھین لینا جہاد فی سبیل الطاغوت ہے نہ کہ جہاد فی سبیل اللہ۔ کس قدر بہتانِ عظیم ہے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم پر اور آپ کے صحابہ کرامؓ پر کہ انہوں نے محض سیاسی اقتدار بزورِ چھیننے کے لئے روم و ایران پر ہلّہ بول دیا، جہاں کوئی مسلمان موجود ہی نہ تھا، جس پر ان حکومتوں نے دین کے بارے میں سختیاں کی ہوں اور اس نے

امداد طلب کی ہو۔

اللہ تعالیٰ نے کیسے کھلے کھلے الفاظ میں ان شرائط کی پابندی مومنوں پر لازم کی ہے اور کس طرح ان کو اس لادینی نظریہ پر عمل کرنے سے روکا ہے جس کا الزام مودودی صاحب خدا کے سب سے برگزیدہ انسان اور اس کے مقدس ساتھیوں پر لگاتے ہیں۔ اس نے صاف کہدیا ہے کہ وَاللّٰہُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِیْرٌ یعنی جو تم کرتے ہو اللہ تعالیٰ اس کو دیکھتا ہے۔ دیکھنا کہیں ایسا نہ ہو کہ مصیبت زدہ مسلمانوں کی حالت زار کو سُن کر جو نہ تو ہجرت کرتے ہیں اور نہ طالبِ امداد ہوتے ہیں اور طالبِ امداد ہوتے ہیں مگر ایسی حکومت کے خلاف ہوتے ہیں جن سے تمہارا معاہدہ ہے تم خواہ مخواہ جوش میں آجاؤ اور اللہ تعالیٰ کی مقررہ حدود کو توڑ دو۔ اور غیر اسلامی ممالک پر چڑھائی کردو اور اس طرح فتنہ و فساد کے بانی بنو۔ ایسے مومنوں سے جو ان شرائط کی تحت میں نہیں آتے تم دوستی کا دم بھی نہ بھرو۔ اُن کو خدا پر چھوڑ دو۔ اللہ تعالیٰ خود اُن کے لئے سامان پیدا کر دے گا۔ یہی اصول تھا جس کی پابندی میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے باوجود صحابہ کرامؓ کی مخالفت کے صلح حدیبیہ میں ابو جندلؓ کو کفار کے حوالے کر دیا تھا۔ اب یہ نئے بہادر نبی اسلام اُٹھے ہیں اور فرماتے ہیں کہ ان پاک لوگوں نے قرآن کریم کی اس پاک تعلیم کو پس پُشت ڈال کر بے گناہ روم و ایران پر بزور سیاسی اقتدار چھیننے کے لئے تصادم شروع کر دیا تھا۔ کچھ تو خدا کا خوف چاہئے۔ مجاہدینِ فی سبیل اللہ کی اِس سے زیادہ بھیانک اور گھناؤنی تصویر اور کیا ہوگی۔ اسے بہادرو! اِن کُند تلواروں کو اب تو میان میں کرو، اب تو اِن میں وہ کاٹ بھی نہیں رہی، جس پر تمھیں کبھی ناز تھا۔ اب تو تمھاری وہی حالت ہے جو کسی نے اس مصرع میں بیان کی ہے ع

لڑتے ہیں اور ہاتھ میں تلوار بھی نہیں

یاد رکھو کہ اللہ تعالیٰ نے تم کو اس کے سوا کچھ بھی حکم نہیں دیا اِنْ عَلَيْكَ اِلَّا الْبَلٰغُ اور کہ وَمَآ اَنْتَ عَلَيْهِمْ بِجَبَّارٍ۔ یہی جہاد فی سبیل اللہ ہے۔ ہاں جب تمہارے دین کو تلوار کے زور سے دبانے کی کوشش کی جائے، تو پھر ان حدود و قیود میں رہ کر جو اللہ تعالیٰ نے مقرر کی ہیں، تم تلوار بھی اُٹھا سکتے ہو۔ مگر ان نازک شرائط کی پابندی تم سے کیا ہوگی جو دوسروں کا سیاسی اقتدار بزور چھیننے کا فاشی اور اشتراکی اصول قرآن و حدیث سے ثابت کرنے نکلے ہو۔ اللہ تعالیٰ تو یہ فرماتے کہ یہ فتنہ فی الارض اور فسادِ کبیر ہے کہ تم ایسے مومنین کی امداد کا دم بھی بھرو جو نہ تو ہجرت کرتے ہیں اور نہ مظلوم ہو کر استمداد کرتے ہیں، اور یا جو استمداد تو کرتے ہیں، مگر ایسی غیر اسلامی حکومت کی رعایا ہیں، جن کے ساتھ تمہارا سیاسی معاہدہ ہے۔ لیکن یہ بہادرانِ اسلام بالکل ہی اس پاک تعلیم کے اُلٹ ایک ٹکڑے کو اُس کے سیاق و سباق سے جُدا کر کے استدلال کرتے ہیں، کہ یہاں اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے، کہ غیر اسلامی حکومتوں پر اُن کا سیاسی اقتدار چھیننے کے لئے حملہ کر دو، اور تمہارا یہ فعل فتنہ فی الارض کو مٹانے والا اور فسادِ کبیر کو ہٹانے والا تصور ہوگا ع

بسوخت عقل ز حیرت کہ ایں چہ بوالعجبی است

کیا اس قسم کی تحریف اسی پیروئی یہود کی وجہ سے نہیں ہے، جس کے متعلق رسول اکرم صلے اللہ علیہ وسلم نے اس زمانہ کے متعلق پیشگوئی کی ہوئی ہے۔ فتدبّروا

یہی وہ لوگ ہیں، جو آئے دن احمدیوں پر یہ الزام لگاتے ہوئے نہیں تھکتے، کہ یہ قرآن مجید کی آیات کی تاویلیں کرتے ہیں۔ اور احمدیہ تفسیر القرآن بالقرآن کو "تاویل کا پھندا" بتاتے ہیں۔ دوستو! سیاسی شکستوں نے تم کو بوکھلا دیا ہے، اور احساسِ کمتری تم سے قرآن و حدیث میں سے وہ باتیں ثابت کرانا چاہتا ہے، جو قرآن و حدیث میں نہیں ہیں۔ تم نے مسیح موعود علیہ السلام کا انکار کر کے اپنے آپ کو دُنیاوی

عقل کے حوالے کر دیا ہے۔ اب تم اسی دُنیاوی عقل سے قرآن وحدیث کو جانچنا چاہتے ہو۔ اقامتِ دین سے تمہاری اصل غرض صرف سیاسی اقتدار حاصل کرنا ہے، ورنہ تم اپنے بہترین اوقات یہ غلط اصول ثابت کرنے میں نہ خرچ کرتے، کہ "صرف سیاست ہی کا نام اسلام ہے"۔ تم اسلام کو تشدّدی سیاست کا نظریہ سمجھتے ہو، حالانکہ خود لفظِ اسلام اس کی کھُلی کھُلی تردید ہے۔ تم مسلمانوں کی غلط رہنمائی کر رہے ہو۔ ان کو ان کے اصل کام اِنْ عَلَيْكَ اِلَّا الْبَلٰغُ سے پرے ہٹا کر فاشی اور اشتراکی نظاموں کے گورکھ دھندوں میں پھنسانا چاہتے ہو۔ حالانکہ اسلام صلح اور امن کے ذریعہ اپنے اصول کی تبلیغ کی تلقین فرماتا ہے۔ مَیں آپ کی نیت پر حملہ نہیں کرتا۔ بے شک آپ دیانتداری سے یہ کام کر رہے ہوں گے۔ مگر یاد رکھیئے ؎

ترسم کہ نہ رسی بہ کعبہ اے اعرابی
کیں راہ کہ تو میروی بہ ترکستان است

اسلام تلوار کا مرہونِ منّت نہیں ہے، بے شک صدرِ اول میں مسلمانوں کو تلوار اٹھانی پڑی، کیونکہ دُنیا اسلام کو تلوار کے زور سے مٹانا چاہتی تھی۔ اللہ تعالےٰ نے اپنا جلال دکھانا تھا، سو ان ظالموں فتنہ پردازوں کو اُنہی کے ہتھیاروں سے تباہ کیا گیا۔ مگر آج دُنیا نئی ہے، کوئی قوم بھی تمہارے دین کو تلوار کے زور سے دبانا نہیں چاہتی۔ مخالفینِ اسلام نے اب اور ہی طریقے اسلام کو دبانے کے نکالے ہیں۔ ضرور ہے کہ ہم اُنہی کے ہتھیاروں سے اُن کو شکست دیں۔ ان کی تلواروں کی دھاریں اب دُنیاوی فوائد حاصل کرنے کی طرف پھر گئی ہیں، اور انہوں نے صاف صاف اعلان کر دیا ہے کہ ہم تمہارا دین تلوار کے زور سے نہیں مٹائیں گے، بلکہ قلم اور پراپیگنڈہ کے ہتھیاروں سے مٹائیں گے۔ اگر آج اِنْ عَلَيْكَ اِلَّا الْبَلٰغُ

پرعمل کرنے کا وقت نہیں تو پھر کب ہو گا؟ اگر آج اسلامی مبلغین اور مبشرین کا زمانہ نہیں تو پھر کب آئے گا؟ خود آپ کے بزرگوں نے اس زمانے کے متعلق پیشگوئیاں کی ہوئی ہیں۔ سُنیئے مجدد الف ثانی کیا فرماتے ہیں:-

"وَاَقُوْلُ قَوْلاً عَجَبًا لَمْ يَسْمَعْهُ اَحَدٌ وَمَا اَخْبَرَ بِهٖ مُخْبِرٌ بِاِعْلَامِ اللّٰهِ تَعَالٰى اِيَّايَ وَبِفَضْلِهٖ وَكَرَمِهٖ۔ آنچہ بعد از ہزار و چند سال از زمانِ رحلتِ آنسرور علیہ وعلی آلہ الصلوات والتحیات زمانے میآید کہ حقیقتِ محمدی از مقامِ خود عروج فرماید و بمقامِ حقیقتِ کعبہ متحد گردد و ایں زماں حقیقتِ محمدی حقیقتِ احمدی نام یابد و مظہرِ ذاتِ احد جل سبحانہٗ گردد۔"

(رسالہ مبدأ معاد صفحہ ۵۵)

یہ پیشگوئی صاف ہے اور موجودہ خالص تبلیغی زمانے کا نقشہ بیان کر رہی ہے جبکہ رسولِ اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کی شانِ جلالی کی بجائے شانِ جمالی یعنی محمدیت کی بجائے احمدیت کا ظہور ہو گا۔ حضرت مسیح موعود علیہ السلام نے اِس بات کو اپنی کتابوں میں کئی جگہ واضح کیا ہے اور اِسی سے متاثر ہو کر ڈاکٹر اقبال نے بھی کہا تھا ؎

ہو چکا گو قوم کی شانِ جلالی کا ظہور
ہے مگر باقی ابھی شانِ جمالی کا ظہور

(بانگِ درا۔ شاہی گورستان)

مگر مودودی صاحب ہیں کہ کسی کی سُنتے ہی نہیں اور اِن معصوم آیات سے خونی اسلام کا ثبوت دے رہے ہیں۔ جی ہاں خونی اسلام ہی تو ہے' جو یہ سکھائے کہ روم و ایران کو تبلیغ کرو، مگر اس بات کا انتظار نہ کرو کہ تبلیغ کا کیا اثر ہوتا ہے' بلکہ بلاوجہ ان سے تصادم شروع کر دو' اور ان کا سیاسی اقتدار اُن کے بے گناہ حکام سے بزورِ شمشیر چھین لو۔ یہ خونی اسلام نہیں تو اور کیا ہے۔ خونی اسلام! کس قدر بے جوڑ اور متضاد ذہنیت پیدا ہوتی ہے اِس لفظ کے

تصور سے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ دماغ کے اچانک دو ٹکڑے ہو گئے ہیں۔ اسلام کے معنی ہیں امن، تو خونی اسلام کے معنی ہوئے خونی امن۔ خدا ایسے امن سے محفوظ رکھے اور ایسے اسلام سے پناہ دے۔

اب ہم مودودی صاحب کی پیش کردہ تیسری آیت کو لیتے ہیں۔ یہ سورہ صف کی مندرجہ ذیل آیات میں آئی ہے:۔

وَاِذْ قَالَ عِیْسَى ابْنُ مَرْیَمَ یٰبَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ اِنِّیْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَیْكُمْ مُّصَدِّقًا لِّمَا بَیْنَ یَدَیَّ مِنَ التَّوْرٰىةِ وَمُبَشِّرًۢا بِرَسُوْلٍ یَّاْتِیْ مِنْۢ بَعْدِی اسْمُهٗۤ اَحْمَدُ ؕ فَلَمَّا جَآءَهُمْ بِالْبَیِّنٰتِ قَالُوْا هٰذَا سِحْرٌ مُّبِیْنٌ ○ وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ وَهُوَ یُدْعٰۤى اِلَى الْاِسْلَامِ ؕ وَاللّٰهُ لَا یَهْدِی الْقَوْمَ الظّٰلِمِیْنَ ○ یُرِیْدُوْنَ لِیُطْفِـُٔوْا نُوْرَ اللّٰهِ بِاَفْوَاهِهِمْ وَاللّٰهُ مُتِمُّ نُوْرِهٖ وَلَوْ كَرِهَ الْكٰفِرُوْنَ ○ هُوَ الَّذِیْۤ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِیْنِ الْحَقِّ لِیُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّیْنِ كُلِّهٖ وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُوْنَ ○ (سورہ صف ع)	یاد کرو اُس وقت کو جب عیسیٰ ابن مریم نے کہا کہ اے بنی اسرائیل یقیناً میں تمہاری طرف اللہ کا رسول ہوں تصدیق کرنیوالا ہوں تورات کا اور بشارت دینے والا ہوں ایک رسول کی جو میرے بعد آئے گا۔ اس کا نام احمد ہے۔ جب وہ آگیا نشانیوں کے ساتھ تو لوگوں نے کہا یہ تو کھلا جادو ہے۔ پس اس سے زیادہ کون ظالم ہے جو اللہ پر جھوٹ باندھتا ہے درآنحالیکہ اسکو اسلام کی دعوت دی جاتی ہے۔ اور اللہ ظالموں کی قوم کو ہدایت نہیں دیتا۔ یہ لوگ چاہتے ہیں کہ اللہ کے نور کو پھونکوں سے بجھا دیں۔ مگر اللہ تعالیٰ اپنے نور کو پورا کرنیوالا ہے خواہ کافر بُرا منائیں۔ وہی ہے جس نے اپنے رسول کو ہدایت اور دینِ حق دیکر بھیجا ہے تاکہ وہ اسکو تمام ادیان پر غالب کر دے۔ خواہ مشرکین بُرا ہی منائیں۔

ہم حیران ہیں کہ اِن آیات سے یہ کیسے نکلتا ہے کہ تلوار کے زور سے غیر اسلامی ممالک کا سیاسی اقتدار چھین لو۔ اگر جہاد بالسیف پر بھی اِن آخری آیات کو منطبق کریں تو پھر بھی ظاہر ہے کہ پہلے کفار ہیں جو چاہتے ہیں کہ اللہ کے نور کو مُنہ کی پھونکوں سے بُجھا دیں۔ یہاں تو صرف یہ بتایا گیا ہے کہ آخر میں اسلام ہی کو غلبہ ہوگا جھوٹے دین سب فنا ہو جائیں گے، اور خدا کا دین ہی سب ادیان پر غالب آئے گا۔ مگر تلوار کا یہاں کیا کام ہے۔ اللہ تعالےٰ نے تو صرف ایک ہی طریقہ بتایا ہے کہ اگر کفار دین کو دبانے کے لئے تلوار اُٹھائیں، تو جہاد بالسیف نہ کرو، ہاں اگر تلوار کے زور سے دین کو دبانا چاہیں، تو تم کو بھی تلوار اُٹھانے کی اجازت ہے مگر انہی پابندیوں کے ساتھ جو پہلے بیان ہو چکی ہیں۔ لیکن تمہارا اصلی کام صرف یہی ہے اِنْ عَلَيْكَ اِلَّا الْبَلٰغُ تم اتنی سی کوشش کئے جاؤ، اسلام کو غالب کرنا تو اللہ تعالےٰ کا کام ہے تمہارا کام صرف جدوجہد ہے۔ پس یہ آیت اور اِس قسم کی دوسری آیات بھی مودودی صاحب کو کوئی مدد نہیں دے سکتیں۔ لیکن چونکہ ؎

خشتِ اوّل چوں نہد معمار کج ٭ تا ثریا میرود دیوار کج

مودودی صاحب نے فاشی اور اشتراکی نظاموں کی رنگین عینک لگا کر قرآن وحدیث کو جانچنا چاہا ہے، اس لئے ان کو خدا کے کلام کے زمین وآسمان خونین ہی نظر آتے ہیں۔ اور وہ قرآن کریم کی ہر آیت کو اسی رنگ میں رنگنا چاہتے ہیں۔ حالانکہ قرآن کریم اور اُسوۂ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کا رنگ ہی اور ہے۔ ماہرین کی قلمکاریوں نے جو بھیانک تصویر "مجاہدین" کی کھینچی ہے، وہ مودودی صاحب کو کچھ ایسی دلآویز معلوم ہوتی ہے کہ جب تک قرآن کریم کی ہر معصوم آیت سے اس کو اُجاگر نہیں کرلینگے آپ دم نہیں لیں گے۔ چنانچہ فرماتے ہیں:۔

"حق جغرافی حقوق کو قبول کرنے سے انکار کرتا ہے۔ اور اسکا مطالبہ

یہ ہے کہ میں اگر کسی دریا یا پہاڑ کے اُس پار حق ہوں تو اِس پار بھی حق ہی ہوں نوع انسان جہاں بھی ظلم وستم کا اور افراط و تفریط کا تختہ مشق بنی ہوئی ہے وہاں اس کی مدد کے لئے پہنچنا میرا فرض ہے۔ اسی تخیل کو قرآن ان الفاظ میں بیان کرتا ہے۔ وَمَا لَكُمْ لَا تُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَ الْمُسْتَضْعَفِيْنَ مِنَ الرِّجَالِ وَالنِّسَآءِ وَالْوِلْدَانِ الَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَآ اَخْرِجْنَا مِنْ هٰذِهِ الْقَرْيَةِ الظَّالِمِ اَهْلُهَا ج (النسآء ع)"

اگر مولانا مودودی صاحب کا اس سے یہ مطلب ہے، کہ طاقت حاصل کر کے اور خدائی فوجدار بن کر تمام دُنیا میں حق پھیلانے اور مظلوموں کے استخلاص کے لئے تلوار لے کر اُٹھ کھڑے ہو، اور اس طرح دُنیا کے امن کو درہم برہم کر دو، تو افسوس سے کہنا پڑتا ہے، کہ یہ ایک مریض دماغ کی ایجادِ بندہ ہے۔ اس کو اسلام کی پاک اور مقدس تعلیم سے کچھ بھی تعلق نہیں۔ اِس آیت کو پیش کرنے میں بھی مولٰنا نے احتیاط سے کام نہیں لیا۔ اور اس کا وہ حصہ چھوڑ دیا ہے جو ان کے خود ساختہ نظریہ کی تردید کرتا تھا۔ یہ آیت مع اپنے سیاق و سباق کے یوں ہے:۔

مَا لَكُمْ لَا تُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَالْمُسْتَضْعَفِيْنَ مِنَ الرِّجَالِ وَالنِّسَآءِ وَالْوِلْدَانِ الَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَآ اَخْرِجْنَا مِنْ هٰذِهِ الْقَرْيَةِ الظَّالِمِ اَهْلُهَا ج وَاجْعَلْ لَّنَا مِنْ لَّدُنْكَ وَلِيًّا ۚ وَّاجْعَلْ لَّنَا مِنْ لَّدُنْكَ نَصِيْرًا ۰	تم کو کیا ہوا ہے کہ تم اللہ کی راہ میں نہیں لڑتے اور کمزور مرد، عورتیں اور بچے پکار رہے ہیں کہ اے ہمارے پروردگار ہمکو اس شہر سے نکال جس کے رہنے والے ظالم ہیں۔ اور اپنے ہاں سے ہمارے دوست بنا اور اپنے ہاں سے ہمارے مددگار پیدا کر۔

اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۚ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ الطَّاغُوْتِ فَقَاتِلُوْٓا اَوْلِيَآءَ الشَّيْطٰنِ ۚ اِنَّ كَيْدَ الشَّيْطٰنِ كَانَ ضَعِيْفًا ۝ اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ قِيْلَ لَهُمْ كُفُّوْٓا اَيْدِيَكُمْ وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ ۚ فَلَمَّا كُتِبَ عَلَيْهِمُ الْقِتَالُ اِذَا فَرِيْقٌ مِّنْهُمْ يَخْشَوْنَ النَّاسَ كَخَشْيَةِ اللّٰهِ اَوْ اَشَدَّ خَشْيَةً ۚ وَقَالُوْا رَبَّنَا لِمَ كَتَبْتَ عَلَيْنَا الْقِتَالَ ۚ لَوْلَآ اَخَّرْتَنَآ اِلٰٓى اَجَلٍ قَرِيْبٍ ۗ قُلْ مَتَاعُ الدُّنْيَا قَلِيْلٌ ۚ وَالْاٰخِرَةُ خَيْرٌ لِّمَنِ اتَّقٰى ۗ وَلَا تُظْلَمُوْنَ فَتِيْلًا ۝ (نساء ع ۱)

وہ جو ایمان لائے ہیں وہ اللہ کی راہ میں لڑتے ہیں، اور جنہوں نے کفر کیا ہے، وہ طاغوت کی راہ میں لڑتے ہیں۔ پس تم شیطان کے دوستوں سے لڑو۔ یقیناً شیطان کی تدبیر کمزور اور بودی ہے۔ کیا تو اُن کو نہیں دیکھتا جن کو (پہلے) کہا گیا تھا کہ اپنے ہاتھوں کو تھامے رکھو، اور نماز قائم کرو، اور زکوٰۃ دو۔ پس جب اُن پر لڑائی فرض کی گئی، تو دیکھو اُن میں سے ایک فریق لوگوں سے اس طرح ڈرتا ہے جس طرح کہ صرف خدا سے ڈرنا چاہئے بلکہ اس سے بھی زیادہ۔ اور انھوں نے کہا کہ اے ہمارے رب تو نے ہم پر لڑائی کیوں فرض کی، کیوں نہ ہمکو مہلت دی تھوڑی دیر تک۔ کہو دُنیا کی پونجی تھوڑی ہے اور متقیوں کے لئے آخرت اچھی ہے۔ اور اُن پر ذرا بھی ظلم نہیں ہوگا۔

غور فرمائیے ان آیات پر اور پھر اس نتیجہ پر جو مولانا مودودی صاحب نے پہلی آیت سے نکالنے کی کوشش کی ہے۔ صاف ظاہر ہوتا ہے کہ کمزور فریاد کرنے والے مرد، عورتیں اور بچے وہی ہیں، جو ان کفار کے نرغے میں پھنسے ہوئے ہیں، جنہوں نے پہلے مسلمانوں سے جنگ چھیڑی۔ كُفُّوْٓا اَيْدِيَكُمْ کے الفاظ سے معلوم ہوسکتا ہے کہ شروع میں کفار کے حملوں کے باوجود مسلمانوں کو صبر ہی کی تلقین کی گئی تھی، لیکن جب پانی سر سے گذر گیا، تو مجبوراً مدافعانہ لڑائی فرض کی گئی۔ اس پر بھی بہت سے مسلمان لڑائی پر آمادہ

نہ تھے۔ مگر اللہ تعالےٰ نے ان کی شجاعت کو اُبھارنے کے لیے ان مستضعفین کی فریادوں کا ذکر کیا ہے۔ جو محارب کفار کے نرغے میں تھے، اور استمداد کے لئے پکار رہے تھے۔ صاف پتہ چلتا ہے کہ یہ مستضعفین وہی کمزور مرد، عورتیں اور بچے ہیں جن کا ذکر انفال ع ۱۰ میں ہوا ہے۔ جب ان آیات میں بنیادی اصول پیش کر دیا گیا۔ تو ضروری ہے کہ ان آیات کا مطلب اسی بنیادی اصول کے ماتحت ہوگا۔ کمزور مرد، عورتیں اور بچے وہ ہیں جو ایمان لائے ہیں اور دشمنوں کے نرغے میں ان پر ظلم ہو رہا ہے۔ اور وہ استمداد کر رہے ہیں۔ ان کی استمداد پر ان کی مدد کرنا اللہ تعالےٰ نے سورۂ انفال میں جائز ٹھہرایا ہے، اس لئے ان آیات میں مسلمانوں کو ان کی مدد کے لئے لڑنے پر اکسایا جا رہا ہے۔ اگر ان آیات کی تفسیر اس طرح نہ کی جائے، تو قرآن کریم میں نعوذ باللہ تضاد ماننا پڑے گا۔ اور اللہ تعالےٰ اسی سورت کے گیارہویں رکوع میں فرماتا ہے:۔

اَفَلَا يَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ ۚ وَلَوْ كَانَ مِنْ عِنْدِ غَيْرِ اللّٰهِ لَوَجَدُوْا فِيْهِ اخْتِلَافًا كَثِيْرًا ۝ (نساء ع ۱۱)	کیا یہ لوگ قرآن کے بارے میں غور نہیں کرتے۔ اور اگر یہ اللہ کے سوا کسی اور کی طرف سے ہوتا تو وہ اس میں بہت سے اختلافات پاتے۔

پھر اسی رکوع میں اللہ تعالےٰ آگے چل کر فرماتا ہے:۔

عَسَى اللّٰهُ اَنْ يَّكُفَّ بَاْسَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ۚ وَاللّٰهُ اَشَدُّ بَاْسًا وَّاَشَدُّ تَنْكِيْلًا ۝	قریب ہے کہ اللہ انکار کرنیوالوں کی لڑائی کو تھام دے۔ اور اللہ سخت لڑائی والا ہے۔ اور سخت عذاب دینے والا ہے۔

اس آیہ کریمہ سے بھی یہی ثابت ہوتا ہے کہ کفار نے پہلے مسلمانوں پر حملے کئے تھے، انکو اذیتیں دی تھیں، انہیں نے جنگ کا آغاز کیا تھا، اور مسلمانوں کو قتال کا حکم مدافعت کے لئے دیا گیا تھا، نیز اس لئے کہ ان ظالموں کو انہی کے ہتھیاروں سے سزا دی جائے اب ذرا انصاف سے بتایا جائے، کہ اس تمام فضا کا مطالعہ کرنے کے بعد کیا اس

آیت سے جو مودودی صاحب نے پیش کی ہے یہ نتیجہ نکل سکتا ہے کہ محض غیر اسلامی ممالک میں مظلوموں کو ظلم سے بچانے کے لئے ان ممالک کے سیاسی معاملات میں تلوار سے دخل دینا مسلمانوں کے لئے جائز ہے، اور حق پھیلانے کے لئے شمشیر و سنان کا استعمال جائز ہی نہیں بلکہ مستحسن ہے؟ یہاں ہم قرآن کریم سے ایک اور فیصلہ کُن آیت پیش کرتے ہیں۔ اِس آیت کے متعلق امام زہریؒ کا قول ہے، کہ یہ آیت پہلی آیت ہے جو قتال کی اجازت میں نازل ہوئی۔ اِس سے ثابت ہوگا کہ قتال کا حکم کیوں دیا گیا۔ ہم تمام ماحول کو پیش کریں گے، یہ نہیں کہ اپنے مفید مطلب ٹکڑا الگ کر کے معانی کو غت ربود کر دیا جائے۔ عبارت جس میں یہ آیت کریمہ ہے حسب ذیل ہے:۔

إِنَّ اللّٰهَ يُدَافِعُ عَنِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ۗ إِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ كُلَّ خَوَّانٍ كَفُوْرٍ ۝ أُذِنَ لِلَّذِيْنَ يُقٰتَلُوْنَ بِأَنَّهُمْ ظُلِمُوْا ۚ وَإِنَّ اللّٰهَ عَلٰى نَصْرِهِمْ لَقَدِيْرٌ ۝ الَّذِيْنَ أُخْرِجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ بِغَيْرِ حَقٍّ إِلَّا أَنْ يَّقُوْلُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ ۗ وَلَوْلَا دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لَّهُدِّمَتْ صَوَامِعُ وَبِيَعٌ وَّصَلَوٰتٌ وَّمَسٰجِدُ يُذْكَرُ فِيْهَا اسْمُ اللّٰهِ كَثِيْرًا ۗ وَلَيَنْصُرَنَّ اللّٰهُ مَنْ يَّنْصُرُهٗ ۗ إِنَّ اللّٰهَ لَقَوِيٌّ عَزِيْزٌ ۝ الَّذِيْنَ إِنْ مَّكَّنّٰهُمْ فِي الْأَرْضِ أَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَ

یقیناً اللہ تعالےٰ اُن لوگوں سے مدافعت کرتا ہے جو ایمان لائے۔ اللہ بیشک کسی دغاباز ناشکرے کو پسند نہیں کرتا۔ جن (مومنوں) سے کفار لڑتے ہیں اُنکو بھی اب اسلئے لڑنے کی اجازت دیجاتی ہے کہ اُن پر ناحق ظلم کیا گیا اور اللہ اُنکی مدد کرنے پر قادر ہے۔ وہ لوگ جن کو محض انکے اِس قصور پر اپنے گھروں سے نکال باہر کیا گیا، کہ وہ کہتے تھے کہ ہمارا رب اللہ ہے اور اگر اللہ کا بعض سے بعض لوگوں کے ذریعہ دفع کرنا نہ ہو تو درویشوں کے حجرے، گرجے اور نماز گاہیں اور مساجد جن میں کثرت سے اللہ کا ذکر ہوتا ہے مسمار کر دی جائیں۔ اللہ اسکی مدد کریگا جو اسکی مدد کرتا ہے۔ بیشک اللہ بڑا طاقتور اور غالب ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں کہ اگر ہم انکو زمین میں حکومت دیں، تو نماز کو قائم کریں گے، اور

اٰتَوُا الزَّكٰوةَ وَاَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ ۗ وَلِلّٰهِ عَاقِبَةُ الْاُمُوْرِ ٥ (سورہ حج ع ۶،۵)	زکوٰۃ دیں گے، اور نیکی کا حکم دیں گے، اور برائی سے منع کریں گے، اور تمام کاموں کا انجام اللہ ہی کے ہاتھ میں ہے۔

ان آیاتِ کریمہ سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ قتال کی اجازت صرف مدافعت کے لئے دی گئی تھی۔ اور قتال یا جہاد فی سبیل اللہ غیر اسلامی ملکوں کی سیاسی قوت بزور چھیننے کے لئے شروع نہیں ہوا تھا۔ یہاں اللہ تعالیٰ نے خود لفظ مدافعت استعمال کر کے مودودی صاحب کے استدلال باطل کی دھجیاں بکھیر دی ہیں۔ کتنا صاف اور مقدس کلام ہے۔ اور مدافعت کے لئے بھی جو عذر پیش کیا ہے کتنا روادارانہ اور انصاف پر مبنی ہے۔ انسانوں کا بنایا ہوا قانون اس الٰہی قانون کے سامنے کتنا ظالمانہ اور خود غرضانہ ہے، کہ دوسروں پر سیاسی اقتدار چھیننے کے لئے بغیر تبلیغ کے اثر کا انتظار کئے ہلہ بول دو۔ نعوذ باللہ من ذٰلک۔

ان آیات میں ایک اور بات بھی قابل غور ہے۔ اللہ تعالیٰ نے یہ تو کہا ہے کہ اب تم کو تلوار اٹھانے کی اجازت ہے لیکن مدافعت اور تمکن فی الارض کا حقیقی فاعل اپنے آپ کو ہی ٹھہرایا ہے۔ انسان خواہ کتنی کوشش کرے، یہ دونوں باتیں اللہ تعالیٰ کی نصرت کے بغیر حاصل نہیں ہو سکتیں۔ دیکھ لیجئے کہ آج مسلمان دنیا میں چالیس کروڑ سے زیادہ ہیں لیکن چونکہ انہوں نے اپنے اعمالِ بد سے خدا تعالیٰ کو ناراض کر دیا ہے، اتنی جمعیت ہوتے ہوئے بھی اللہ تعالیٰ نے اپنی نصرت ان سے ہٹالی ہے۔ اور ان کی تلواروں سے وہ بُرِش چھین لی ہے جس نے قیصر و کسریٰ کے غرور توڑ دیئے تھے۔

لیکن اللہ تعالیٰ کا وعدہ اب بھی موجود ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:-

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا هَلْ اَدُلُّكُمْ عَلٰى تِجَارَةٍ تُنْجِيْكُمْ مِّنْ عَذَابٍ	اے لوگو! جو ایمان لائے ہو، کیا میں تم کو وہ تجارت بتاؤں جو تم کو دردناک عذاب سے نجات دے

اَلِیْمٍ ۝ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰہِ وَرَسُوْلِہٖ وَتُجَاھِدُوْنَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ بِاَمْوَالِکُمْ وَاَنْفُسِکُمْ ؕ ذٰلِکُمْ خَیْرٌ لَّکُمْ اِنْ کُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ۝ یَغْفِرْ لَکُمْ ذُنُوْبَکُمْ وَیُدْخِلْکُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْھٰرُ وَمَسٰکِنَ طَیِّبَۃً فِیْ جَنّٰتِ عَدْنٍ ؕ ذٰلِکَ الْفَوْزُ الْعَظِیْمُ ۝ وَاُخْرٰی تُحِبُّوْنَھَا ؕ نَصْرٌ مِّنَ اللّٰہِ وَفَتْحٌ قَرِیْبٌ ؕ وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِیْنَ ۝

(سورہ صف ع ۲)

تم ایمان لاؤ اللہ اور اس کے رسول پر، اور جہاد کرو اللہ کی راہ میں اپنے مالوں اور جانوں کے ساتھ۔ یہ بہتر ہے تمہارے لیئے اگر تم جانو۔ وہ معاف کردے گا تمہیں تمہاری غلطیاں، اور داخل کرے گا تم کو باغات میں بہتی ہیں جن کے نیچے نہریں، اور ایسے پاک گھروں میں جو ہمیشہ کی جنت میں ہیں۔ یہ بڑی کامیابی ہے۔ اور ایک دوسری بات ہے جسے تم پسند کروگے۔ یعنی خدا کی مدد اور فتح قریب بھی آئے گی۔ اور اے رسول! مومنوں کو بشارت دے کہ ان کو یہ سب چیزیں ملیں گی۔

یہاں تُجَاھِدُوْنَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ کہا گیا ہے۔ ہم اوپر ثابت کرچکے ہیں کہ دوسرے ملکوں پر تلوار سے حملہ کرنا قرآن کریم کی تعلیم کے خلاف ہے۔ اور یہ جہاد فی سبیل اللہ نہیں کہلا سکتا۔ آج جیسا کہ ہم پہلے عرض کرچکے ہیں، مسلمانوں پر کوئی قوم بھی دین کے بارے میں تلوار کا حملہ نہیں کررہی، اس لئے صاف ظاہر ہے، کہ اگر آج مسلمان جہاد کرنا چاہے، تو تلوار کا جہاد نہیں کرسکتا۔ کیونکہ تلوار کے جہاد کی شرائط موجود نہیں۔ آج تقریر و تحریر کا جہاد ہی ہو سکتا ہے۔ اور خود مولانا بھی اسی پر عمل کررہے ہیں۔ اس لئے جہاد کی صرف ایک ہی صورت ہے

اِنْ عَلَیْکَ اِلَّا الْبَلٰغُ

اس وقت موقع ہے، کہ ہم قرآن کریم لے کر چاروں طرف دُنیا میں پھیل جائیں، اور جان و مال سے جہاد فی سبیل اللہ کریں۔ تب جاکر اس عذابِ الیم سے نجات حاصل

کر سکتے ہیں، جو مسلمانوں پر آج مسلط ہے۔ اور خدا کے فضل اور رحم سے آج یہ جہاد جماعتِ احمدیہ ہی کر رہی ہے۔ اور دُنیا جانتی ہے کہ اِس جماعت کے سوا اور کوئی بھی جہاد نہیں کر رہا۔

مندرجہ بالا قرآنی احکام کے مطالعہ کے بعد کسی تاریخی تفتیش کی ضرورت نہ تھی، مگر چونکہ مولانا مودودی نے اپنے نظریہ کو تقویت دینے کے لئے بعض تاریخی حقائق کو غلط رنگ میں پیش کیا ہے۔ اس لئے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ہم اسلامی تاریخ کی ورق گردانی بھی کریں۔ اور دیکھیں کہ جو بہتانِ عظیم مولانا نے رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپؐ کے اصحاب رضی اللہ عنہم پر باندھا ہے، واقعات اس کی تائید کرتے ہیں یا تردید۔

حضرت محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اِنْ عَلَیْكَ اِلَّا الْبَلٰغُ کے حکم کی فرمانبرداری میں اُس وقت جب آپؐ کو طاقت حاصل ہو چکی تھی، کئی وفود اشاعتِ اسلام کے لئے عرب کے اطراف میں روانہ کئے۔ اگرچہ وہ مسلح ہوتے تھے، کیونکہ عرب کے جُہلا ذرا ذرا سی بات پر حملہ کر دینے کے عادی تھے، مگر ان وفود کو اجازت نہ تھی کہ لڑائی کریں۔ ہم یہاں ایک وفد کا حال علامہ شبلی مرحوم کی سیرۃ النبی جلد اوّل صفحہ ۴۲۸ - ۴۲۹ سے نقل کرتے ہیں:۔

"فتح مکہ کے بعد جب آنحضرت (صلے اللہ علیہ وسلم) نے خالد بن ولیدؓ کو بنو خزیمہ کی طرف بھیجا، اور ۳۰۰ آدمیوں کی جمعیت ساتھ کر دی، تو صاف فرما دیا، کہ صرف دعوتِ اسلام مقصود ہے، لڑائی مقصود نہیں۔ (اس کے بعد ابن سعد اور طبری کے حوالے ہیں۔ ناقل) باوجود اس کے بھی حضرت خالدؓ نے تلوار سے کام لیا، اور آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے سُنا تو آپؐ کھڑے ہو گئے، اور قبلہ رو ہو کر کہا "اے خدا خالد نے جو کچھ کیا، میں

اُس سے بَری ہوں"۔ تین دفعہ اسی طرح یہ الفاظ فرمائے۔ پھر حضرت علیؓ کو بھیجا، جنہوں نے ایک ایک بچہ کا یہاں تک کہ کتوں کا بھی خوں بہا ادا کیا، اور اس پر مزید رقم دی۔ یہ واقعہ باختلافِ الفاظ حدیث کی کتابوں میں بھی مذکور ہے"۔

یہ واقعہ فتح مکہ کے بعد کا ہے۔ جب عرب میں مسلمانوں کی دھاک بندھ گئی تھی۔ بنو خزیمہ ایک عربی قبیلہ تھا، جس کو تھوڑی سی فوج سے مفتوح و منقاد بنایا جاسکتا تھا۔ مگر رسولِ خدا صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم خوب جانتے تھے، کہ اسلام میں جبر کا کوئی حکم نہیں، آپؐ نے جس مؤثر طریقے سے اپنی برات چاہی ہے، وہ ہمارے لئے باعثِ عبرت ہونا چاہیئے۔ کجا یہ پاک نمونہ اور کجا یہ ناپاک الزام کہ آپؐ نے طاقت حاصل کرتے ہی اس بات کا انتظار نہ کیا کہ آپؐ کی دعوت قبول کی جاتی ہے یا نہیں، رومی حکومت سے تصادم شروع کردیا تھا۔ اور وہ اس لیئے کہ نظامِ باطل سے سیاسی قوت بزورِ شمشیر چھین لی جائے۔ گویا اللہ تعالےٰ کا فرمان اِنْ عَلَيْكَ اِلَّا الْبَلٰغُ رسولِ اکرم صلے اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرامؓ کی نظر میں نعوذ باللہ بالکل بے معنی تھا۔ اشتراکی اور نازی تشدّدی اصولوں نے دماغ ایسا پراگندہ کردیا ہے، کہ یہ لوگ ضرور وہی بات کہیں گے جو کھلم کھلا قرآن کریم کی تعلیم کے متضاد ہو، اور اس کی نفی کرتی ہو۔ اللہ تعالےٰ تو یہ فرمائے فَاِنْ اَعْرَضُوْا فَمَآ اَرْسَلْنٰكَ عَلَيْهِمْ حَفِيْظًا، اور فرمائے بھی کس کو؟ اسلامی جماعت کے امامِ اوّل حضرت محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کو، جس کو اللہ تعالےٰ نے اپنے پاس سے رحمۃ للعالمین کا خطاب عطا فرمایا ہے، اور جو تمام عالموں کے لئے بطور اسوہ حسنہ پیش کئے گئے ہیں، مگر مولٰنا مودودی صاحب فرماتے ہیں کہ "یہ مذہبی تبلیغ کرنے والے واعظین اور مبشرین کی جماعت نہیں ہے بلکہ خدائی فوجداروں کی جماعت ہے"۔ اللہ اللہ قرآن اور

اُسوۂ رسولؐ کس طرف اور آپ کس طرف ع

ببیں تفاوتِ رہ از کجاست تا بکجا

آئیے! اب ذرا یہ بھی دیکھ لیں کہ رومی سلطنت سے تصادم کس طرح شروع ہوا اور ان واقعات کو جو اس وقت پیش آئے مودودی صاحب کے اس من گھڑت اصول سے کہ "تلوار کے ذریعہ نظامِ باطل سے سیاسی قوت چھیننا بھی جہاد فی سبیل اللہ ہے" کہاں تک تعلق ہے۔ پہلے ہم یہاں وہ دعوت نامہ درج کرتے ہیں جو سرورِ کائنات علیہ الصلوٰۃ والتحیات نے ہرقل رومی کو تحریر کیا تھا۔ وھو ھذا:-

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ۔ مِنْ مُحَمَّدٍ عَبْدِ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ اِلٰى هِرَقْلَ عَظِيْمِ الرُّوْمِ سَلَامٌ عَلٰى مَنِ اتَّبَعَ الْهُدٰى۔ اَمَّا بَعْدُ فَاِنِّيْ اَدْعُوْكَ بِدِعَايَةِ الْاِسْلَامِ اَسْلِمْ تَسْلَمْ يُؤْتِكَ اللّٰهُ اَجْرَكَ مَرَّتَيْنِ فَاِنْ تَوَلَّيْتَ فَعَلَيْكَ اِثْمُ الْاَرِيْسِيِّيْنَ وَيَا اَهْلَ الْكِتٰبِ تَعَالَوْا اِلٰى كَلِمَةٍ سَوَآءٍ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ اَنْ لَّا نَعْبُدَ اِلَّا اللّٰهَ وَلَا نُشْرِكَ بِهٖ شَيْئًا وَّلَا يَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَاشْهَدُوْا بِاَنَّا مُسْلِمُوْنَ ۝

اللہ کے نام کے ساتھ جو رحمٰن اور رحیم ہے۔ یہ خط محمد اللہ کے بندہ اور اس کے رسول کی طرف سے روم کے سردار ہرقل کے نام ہے۔ سلامتی ہے اس پر جو ہدایت کی پیروی کرے۔ اما بعد میں تجھے اسلام کی دعوت دیتا ہوں۔ اسلام قبول کر لو کہ امن میں رہو۔ (اور) اللہ تعالیٰ تم کو دوہرا اجر دے گا لیکن اگر تم نے منہ پھیرا تو تم پر اپنے ماتحتوں کا گناہ بھی ہوگا۔ اور اے اہل کتاب آؤ ایک کلمہ پر اکٹھے ہو جائیں جو ہمارے اور تمہارے درمیان برابر ہے یعنی یہ کہ ہم اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہ کریں اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہرائیں اور ہم میں سے کوئی دوسرے کو خدا کے سوا رب نہ بنائے۔ پس اگر تم منہ پھیرو تو گواہ رہو کہ ہم تو مسلمان ہیں۔

اس دعوت نامہ کو اوّل سے آخر تک پڑھیئے کیا اس میں کہیں معمولی اشارہ بھی ہے کہ اگر تم نے اسلام کو قبول نہ کیا تو ہم بزورِ شمشیر تمہاری سیاسی قوت تم سے چھین لیں گے۔ صرف یہ کہا ہے کہ

اگر تم نے دعوت سے مُنہ پھیر لیا تو مُلک والوں کا گناہ بھی تم پر ہوگا، اور یہ کہ گواہ رہو کہ ہم مسلمان ہیں۔ اگر آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارادہ ہوتا کہ روم پر حملہ کرنا ہے تو وہ ضرور اس خط میں اُسکا ذکر فرماتے۔ کیونکہ آپؐ کی سی شان کے بشر سے یہ اُمید نہیں کی جاسکتی کہ آپؐ الٹی میٹم دیئے بغیر ایسا اقدام کرتے۔ لیکن مولانا مودودی صاحب یہ عجیب بات کہتے ہیں کہ الٹی میٹم تو کیا آپؐ نے یہ بھی انتظار نہ کیا کہ دیکھیں آپؐ کی دعوت قبول کی جاتی ہے یا نہیں، بس ایک دم روم سے تصادم شروع کر دیا، بعینہٖ اسی طرح جس طرح ہٹلر نے روس پر اور جاپان نے امریکہ پر بلا اطلاع یلغار بول دی تھی۔ اس دعوت کا ہرقل پر کیا اثر ہوا تھا؟ اسلامی تاریخ سے ثابت ہے کہ وہ دل میں ایمان لے آیا تھا، صرف بطارقہ اور اہلِ دربار کے خوف سے زبان سے اقرار نہ کر سکا۔ بخاری شریف میں یہ واقعات درج ہیں۔ بیشک وہ روشنی جو اس کے دل میں چمکی تھی تخت و تاج کی تاریکی میں گم ہوگئی، لیکن اس پر دعوتِ اسلام کا اثر ضرور پڑا تھا۔

سب سے پہلا تصادم جو سلطنتِ روم سے کہا جا سکتا ہے، وہ غزوۂ موتہ ۸ھ تھا۔ مولانا شبلی سیرۃ النبیؐ کے صفحہ ۴۷۰، ۴۷۱ میں اس کے متعلق تحریر فرماتے ہیں:۔

"سلاطین اور رؤسا کو دعوتِ اسلام کے جو خطوط بھیجے گئے تھے، ان میں ایک خط شرجیل بن عمرو کے نام تھا، جو بصریٰ (حوران) کا بادشاہ اور قیصر کا ماتحت تھا۔ یہ عربی خاندان ایک مُدت سے عیسائی تھا، اور شام کے سرحدی مقامات میں حکمران۔ یہ خط حارث بن عمیرؓ لیکر گئے تھے، شرجیل نے انکو قتل کر دیا۔ اس کے قصاص کے لئے آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے تین ہزار فوج طیار کر کے شام کی طرف روانہ کی۔۔۔۔
۔۔۔۔ گو یہ مہم قصاص لینے کی غرض سے تھی، لیکن چونکہ تمام مہمات کا اصلی محور تبلیغِ اسلام تھا، ارشاد ہوا کہ پہلے انکو دعوتِ اسلام دی جائے، اگر وہ اسلام قبول کرلیں تو جنگ کی ضرورت نہیں۔۔۔۔ فوج مدینہ سے روانہ ہوئی تو جاسوسوں نے شرجیل کو خبر دی، جس نے مقابلہ کے لئے کم و بیش لاکھ فوج طیار کی۔ ادھر خود قیصر روم

(ہرقل) قبائلِ عرب کی بے شمار فوج لیکر ماب میں خیمہ زن ہوا، جو ملقاء کے اضلاع میں ہے۔"

اب فرمایئے! یہ پہلا تصادم سیاسی قوت بزور چھیننے کے لئے تھا یا قصاص لینے کے لئے؟ کس نے ابتدا کی تھی؟ شرحبیل عیسائی نے یا محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے؟ ہاں بیشک آپ کو اسلام کی اشاعت کا شوق تھا۔ آپ نے اس موقع سے بھی فائدہ اٹھانے کی کوشش کی۔ اگر شرحبیل اسلام لے آتا تو آپ قصاص کو بھی چھوڑنے کے لئے تیار تھے۔ یہ رعایت تھی کوئی جبری تبلیغ نہ تھی۔

دوسرا تصادم ۹ھ میں غزوۂ تبوک کہا جاسکتا ہے۔ مولانا شبلی سیرۃ النبیؐ کے ص۲۰۹ میں فرماتے ہیں:

"جنگ موتہ کے بعد سے رومی سلطنت نے عرب پر حملہ کرنے کا ارادہ کردیا تھا۔ غسانی خاندان جو شام میں رومیوں کے زیرِ اثر حکومت کررہا تھا، مذہباً عیسائی تھا، اس لئے قیصرِ روم نے اسی کو اس مہم پر متعین کیا۔ مدینہ میں یہ خبریں اکثر مشہور ہوتی رہتی تھیں۔ آنحضرتؐ کے ایلاء کے واقعہ میں حضرت عمرؓ سے جب عتبان بن مالک نے دفعتہً آکر یہ کہا کہ "غضب ہوگیا" تو انہوں نے کہا "کیوں خیر ہے، کیا غسانی آگئے؟" (بخاری ذکر واقعہ ایلاء حاشیہ)

مواہب لدنیہ میں طبرانی سے روایت نقل کی ہے کہ عرب کے عیسائیوں نے ہرقل کو لکھ بھیجا تھا کہ محمد (صلے اللہ علیہ وسلم) نے انتقال کیا، اور عرب سخت قحط کی وجہ سے بھوکوں مر رہے ہیں، اس بنا پر ہرقل نے چالیس ہزار فوجیں روانہ کیں۔ بہرحال یہ خبریں تمام عرب میں پھیل گئیں، اور قرائن اس قدر قوی تھے کہ غلط ہونے کی کوئی وجہ نہ تھی۔ اس بناء پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فوج کی تیاری کا حکم دیا۔۔۔۔ تبوک پہنچ کر معلوم ہوا کہ وہ خبر صحیح نہ تھی، لیکن اصلیت سے بالکل خالی بھی نہ تھی۔ غسانی رئیس عرب میں ریشہ دوانیاں کررہا تھا۔ صحیح بخاری (غزوہ تبوک) میں جہاں کعب بن مالک کا واقعہ مذکور ہے لکھا ہے، کہ شام سے ایک قاصد آیا، اور کعب بن مالک کو رئیس غسان کا

ایک خط دیا، جس میں لکھا تھا، کہ میں نے سنا ہے کہ محمدؐ نے تمھاری قدر نہ کی، اسلئے تم میرے پاس چلے آؤ، میں تمھاری شان کے مطابق تم سے برتاؤ کروں گا۔ کعب گو معتوب نبویؐ تھے، لیکن انہوں نے خط تنّور میں ڈال دیا۔"

یہ ہے وہ ماحول جس میں غزوۂ تبوک کا اقدام ہوا تھا۔ اگر غسانی رئیس کی قیادت میں رومی اچانک مدینہ پر آپڑتے تو مسلمانوں کو کیا کیا مصائب کا سامنا نہ کرنا پڑتا۔ رسولِ اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کی نہایت دُور اندیشی تھی کہ خطرے کو محسوس کر کے اس کے دفاع کی تدبیر کر لی۔ اس لحاظ سے یہ اقدام مدافعانہ نہیں تو اور کیا ہے؟ اس کی ہرگز غرض یہ نہ تھی کہ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے طاقت حاصل کرتے ہی رومی حکومت سے اس لئے تصادم شروع کر دیا کہ اس کا اقتدار چھین لیں جب آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کو معلوم ہوا کہ غسانی اور رومی لڑائی کے لئے آمادہ ہیں تو آپؐ واپس چلے آئے۔ اگر وہ غرض ہوتی جو مودودی صاحب نے خیال کی ہے تو آپؐ آگے بڑھ کر حملہ کرتے۔ آپؐ کے ساتھ تیس ہزار جوشیلے اور بہادر مسلمانوں کی فوج تھی۔ لیکن چونکہ جس خطرے کی روک کے لئے یہ اقدام کیا گیا تھا، وہ موجود نہ تھا آنحضور صلعم واپس آگئے۔

روم سے تو اس طرح تصادم ہوا تھا۔ ایران کے شہنشاہ خسرو پرویز کو جب آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کا خط ملا تو اس نے غرور سے کہا "میرا غلام ہو کر مجھکو یوں لکھتا ہے۔" مولانا شبلی فرماتے ہیں:

"نامۂ مبارک پہنچنے کے بعد خسرو پرویز نے گورنر یمن کو جس کا نام باذان تھا، فرمان بھیجا کہ کسی شخص کو حجاز بھیجو، کہ اس نئے مدعی نبوت کو پکڑ کر میرے دربار میں لائے۔ باذان نے دو شخصوں کو جن میں سے ایک کا نام بابویہ تھا، اور دوسرے کا خرخرہ تھا، مدینہ منورہ روانہ کیا۔ ان دونوں نے بارگاہِ رسالت میں آکر عرض کی کہ شہنشاہِ عالم (کسریٰ) نے تم کو بلایا ہے، اگر تعمیلِ حکم نہ کروگے، تو وہ تم کو اور تمھارے ملک کو برباد کر دے گا۔"

اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ ایران نے پہلے چھیڑ کی تھی۔ درحقیقت بات یہ ہے کہ روم و ایران

عرب کو ایک پسماندہ ملک خیال کرتے تھے لیکن جب خدا کے پاک رسول کی قیادت میں عرب کی منتشر قوتیں مجتمع ہو رہی تھیں، ان حکومتوں کو قدرتاً خوف پیدا ہوا، اور انہوں نے غرور و نخوت کی وجہ سے پیشتر اسکے کہ عرب کی طرف سے اقدام ہوتا خود ہی چھیڑ چھاڑ شروع کر دی۔ پہلے تو انکو مسلمانوں کی طاقت کا علم نہ تھا لیکن جب رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہؓ نے دفاعی حملے کئے تو انکی آنکھیں کھلیں یہانتک کہ انہوں نے اپنی پوری قوتیں میدان میں لا رکھیں۔ جنگ کا آغاز خود انکی طرف سے ہوا تھا۔ پھر اس زمانے کے حالات کی وجہ سے جنگ شروع ہوئی تو اُس وقت تک جاری رہی جبتک ان طاقتوں کا زور نہ ٹوٹ گیا۔ قدرتاً ایسا ہونا ہی تھا۔ زمانہ جنگ میں دشمن کی طاقت توڑنے اور انکو کمزور کرنے کے لئے جو حملے کئے جاتے ہیں، وہ اس قوم کی طرف سے دفاعی حملے ہی کہے جائیں گے جس نے جنگ کی پہلے طرح نہ ڈالی ہو اور ہر وقت صلح کے لئے تیار ہو۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور شیخین رضی اللہ تعالیٰ عنہم کے زمانے میں خود عرب میں مسلمانوں کی حالت مخدوش تھی۔ ایسے بہت سے قبیلے باقی تھے، جو ایمان نہیں لائے تھے! اور بعض جو ایمان لائے تھے، اُن کا اسلام قابلِ اعتبار نہ تھا۔ پھر ایک طرف مسیلمہ کذاب نصف عرب کا مطالبہ کر رہا تھا۔ دوسری طرف سجاح باغیہ اسکے ساتھ مل گئی تھی۔ طلیحہ بن خویلد مرتد، اسود عنسی اور لقیط بن مالک وغیرہ مدعیانِ نبوت بن بیٹھے تھے، اور کئی کئی قبیلوں کو ساتھ ملا کر علمِ بغاوت بلند کر رہے تھے۔ ان کے علاوہ بھی کئی قبیلے مخالفت پر تلے ہوئے تھے۔ الغرض خود عرب کی حالت ابھی درست نہیں ہوئی تھی۔ ایسی فضا میں روم و ایران جیسی طاقتور حکومتوں سے محض اسلئے تصادم شروع کر دینا کہ انکا سیاسی اقتدار چھین لیا جائے سخت تعجب خیز ہے۔ یہ ممکن نہیں کہ ایسی عظیم الشان ہستیوں پر ایسے غیر مصلحت اندیشانہ اقدام کا الزام لگایا جائے حقیقت یہی ہے کہ خود ان حکومتوں نے مسلمانوں کو لڑائی میں گھسیٹا تھا اور رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرامؓ کو مجبوراً ان سے نبرد آزما ہونا پڑا تھا۔ الغرض از روئے تاریخ اور واقعات کی جانچ پڑتال سے بھی مودودی صاحب کا نظریہ جبریہ باطل ثابت ہوتا ہے۔

اب ہم آخر میں قرآن کریم کی ایک اور واضح آیت پیش کرتے ہیں جو مسئلہ زیر بحث پر پوری روشنی

ڈالتی ہے۔ وَهُوَ هٰذَا :-

لَا يَنْهٰكُمُ اللّٰهُ عَنِ الَّذِيْنَ لَمْ
يُقَاتِلُوْكُمْ فِي الدِّيْنِ وَلَمْ يُخْرِجُوْكُمْ
مِّنْ دِيَارِكُمْ اَنْ تَبَرُّوْهُمْ وَتُقْسِطُوْٓا
اِلَيْهِمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِيْنَ ۝
اِنَّمَا يَنْهٰىكُمُ اللّٰهُ عَنِ الَّذِيْنَ قٰتَلُوْكُمْ
فِي الدِّيْنِ وَاَخْرَجُوْكُمْ مِّنْ دِيَارِكُمْ وَ
ظٰهَرُوْا عَلٰٓي اِخْرَاجِكُمْ اَنْ تَوَلَّوْهُمْ ۚ
وَمَنْ يَّتَوَلَّهُمْ فَاُولٰۗىِٕكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ ۝

اللہ تمکو اُن لوگوں سے نیکی اور انصاف کرنے سے نہیں روکتا
جنہوں نے تم سے دین میں لڑائی نہیں کی، اور تم کو
تمھارے شہروں سے نہیں نکالا۔
یقیناً اللہ انصاف کرنیوالوں سے محبت کرتا ہے
یقیناً اللہ تم کو اُن لوگوں سے دوستی کرنے سے منع کرتا ہے جنہوں نے
تم سے دین میں لڑائی کی اور تم کو تمہارے شہروں سے نکالا اور
تمہارے اخراج میں مدد کی۔ اور جو ایسے لوگوں سے
دوستی کریں گے پس یقیناً وہ ظالم ہیں۔

(سورہ ممتحنہ ع ۲)

ایسی واضح آیت کی موجودگی میں اور ایسے صاف حکم کے ہوتے ہوئے مودودی صاحب فرماتے ہیں کہ خواہ کسی نے تمہارے ساتھ دین میں لڑائی کی ہو یا نہ کی ہو، اور خواہ کسی نے تم کو تمہارے شہروں سے نکالا ہو یا نہ نکالا ہو، بحیثیت مسلمان ہونیکے تمہارا یہ فرض ہے کہ تلوار لیکر اُٹھو اور سب سے سیاسی اقتدار چھین لو۔ نیکی کرنا تو خیر بڑی بات ہے۔ مودودی صاحب کا یہ عُذر بھی کہ زبردستی اسلام کی نعمت یا اسلامی حکومت کی نعمت ایسے لوگوں کو عطا کرنا بھی تو نیکی ہے، ایسا ہی ہے جیسے کوئی بھیڑیا کسی بکری سے کہے کہ اب تو تم صرف بکری ہو آؤ میں تمہیں پھاڑ کر کھا جاؤں اس طرح تم بھی بھیڑیا بن جاؤ گی۔ سچ ہے خوئے بدرا بہانہ بسیار۔ اگر اللہ تعالیٰ کی ذہنیت بھیڑیے کی سی ہوتی تو پھر اعتراض کی کوئی گنجائش نہ تھی لیکن سوال تو یہ ہے کہ دین میں انسان آزاد ہے یا مجبور۔ اگر مجبور ہے تو اللہ تعالیٰ خون خرابہ کے بغیر ہی اپنی حکمت سے سب کو مجبوراً ایک اُمت بنا سکتا ہے! اور ایک ہی حکومت اُن پر مسلط کر سکتا ہے۔ لیکن دین میں اگر انسان مجبور نہیں بلکہ آزاد ہے، اور اللہ تعالیٰ آزمائش کرنا چاہتا ہے کہ کون اسکے احکام پر بخوشی کاربند ہوتا ہے اور کون نہیں، تو سوچنا چاہیئے کہ اللہ تعالیٰ کو کیا ضرورت ہے کہ وہ مسلمانوں

کو ایسا ناجائز حکم دے کہ تلوار کے زور سے تمام دُنیا کی حکومت اپنے قبضہ میں کر لو۔ اس کی بجائے مٹنے کے فساد و ظلم کی آگ اور بھڑک اٹھیگی۔ لیکن خدا کی کتاب اور اُسوہ رسول اللہؐ سے تو یہی ثابت ہوتا ہے کہ اس آگ کو بھڑکانے والے صرف کفار ہی ہوتے آئے ہیں خدا کے انبیاء علیہم السلام اور خدا کے بندے تو اس آگ کو ہمیشہ فرو ہی کرتے چلے آئے ہیں۔ وہ تو اس آگ کو بجھانے کیلئے بھی اپنی ذات پر ہزاروں سختیاں برداشت کرتے ہیں۔ مگر جب یہ آگ کسی طرح نہیں بجھتی، تو پھر کہیں جاکر مجبوراً تلوار اٹھاتے ہیں، چہ جائیکہ دوسرے پُرامن لوگوں کے ہاتھ سے سیاسی اقتدار چھیننے کے لئے خود اس آگ کو بھڑکانے والے بنیں۔

ہم کو مودودی صاحب کے دوسرے اقوال سے اختلاف کرنے کی ضرورت نہیں ہے مگر ہمکو آپکی اس رائے سے سخت اختلاف ہے، کہ محض نظامہائے باطلہ سے سیاسی قوت چھیننے کیلئے اسلام میں تلوار اٹھانا ناجائز ہی نہیں، بلکہ بڑے ثواب کا کام ہے، اور جہاد فی سبیل اللہ میں داخل ہے جس کو افضل العبادات کہا گیا ہے۔ ہمارے نزدیک یہ خیال ہرگز اسلامی نہیں ہے۔ کہ اپنے اصول پھیلانے کے لئے جبراً اغیار کی حکومتوں پر قبضہ کر لیا جائے۔ اس خیال کی پیروی اشتراکیت اور نازیت میں تو جائز ہے جو خود غرض ظالم انسانوں کے بنائے ہوئے نظام ہیں، اور جن میں قدرتاً وہ وسعت خیالی اور رواداری نہیں ہو سکتی جو ایسے نظام میں ہو سکتی ہے جس کا بنانے والا غفور رحیم خدا ہے، جس کو کسی مخالف کی مخالفت کا کوئی خوف نہیں، اور جو اپنی تمام مخلوق سے خواہ کافر ہو یا مومن انصاف کرتا ہے۔ جو رحمٰن و رحیم ہے۔ علیم و حکیم ہے۔ قوی و عزیز ہے وہ اگر چاہے تو تمام نظامہائے باطلہ اور اُن کے حامیوں کو ایک لمحہ میں ہلاک کر دے۔

بیشک انبیاء علیہم السلام اور خدا کے نیک بندوں کا یہ عظیم الشان مقصد ہے کہ دُنیا کی سیاست اسلامیت کے رنگ میں رنگین ہو، مگر اس میں جبر اور تلوار کا کوئی کام نہیں۔ اس مقصد کو حاصل کرنے کے لئے خدا کا بتایا ہوا صرف ایک ہی طریقہ ہے، اور وہ ہے

اِنْ عَلَيْكَ اِلَّا الْبَلٰغُ ۔

مودودی صاحب اور انکے طرز خیال سے متاثر مولوی جس طرح چاہیں تمسخر اڑائیں ہم نے "حقیقی سرکار" کا کلام دیکھا ہے سنا ہے اور اس پر غور کیا ہے ہم کو یہی معلوم ہے کہ اس قسم کا جہاد فی سبیل اللہ جسکے وہ حامی ہیں حضرت آدم علیہ السلام سے لیکر حضرت محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانے تک اول ہی روز سے "منسوخ" ہے۔ اس کیلئے اسلامی تعلیم میں کوئی بنیاد نہیں ہے۔ یہ صرف نئے "بہادران" اسلام کی اختراع ہے اور وہ بھی اشتراکیت اور نازیت کے اثر سے۔ اس قسم کے جہاد کی لن ترانیاں موجودہ مسلمانوں کو کوئی فائدہ نہیں پہنچا سکتیں۔ اور اگر مسلمان طاقت حاصل کرکے ایک بار پھر اس قسم کا جہاد شروع کرینگے تو وہ اسلام کو نقصان پہنچائیں گے۔ اور اسی طرح اس دین امن کو بدنام کرینگے جس طرح کہ مسلمان ایک بار پہلے جبکہ اللہ تعالے نے انکو دنیا میں متمکن کیا تھا کر چکے ہیں۔ ہم مسلمانوں سے صرف اتنا عرض کرتے ہیں کہ وہ پھر ایکدفعہ واعظین اور مبشرین کی جماعت بنکر دنیا میں پھیل جائیں، تو انشاء اللہ وہ اس چیز کو پالینگے جس کا وعدہ سورہ صف میں اللہ تعالےٰ نے ان الفاظ میں کیا ہوا ہے:۔

وَأُخْرَىٰ تُحِبُّونَهَا نَصْرٌ مِّنَ اللَّهِ وَفَتْحٌ قَرِيبٌ ۝	اور دوسری کامرانی جس کی انکو محبت ہے، یعنی اللہ کی نصرت اور فتح، وہ قریب ہے۔

اگر آپ دوراز کار تخیلات میں وقت ضائع نہیں کرینگے۔ اگر آپ ان باتوں کے پیچھے نہیں پڑینگے جو نہ صرف غلط ہیں بلکہ موجودہ حالات میں غیر محل بھی ہیں، اور اللہ کے دین کو اس طرح پھیلانے میں دل سے مصروف ہوجائینگے جس طرح کہ اللہ تعالےٰ نے اپنے پاک کلام میں حکم دیا ہے تو آپ دیکھیں گے کہ ابھی تھوڑا عرصہ نہیں گذریگا کہ یہ عالم ہوگا:۔

إِذَا جَاءَ نَصْرُ اللَّهِ وَالْفَتْحُ ۝ وَرَأَيْتَ النَّاسَ يَدْخُلُونَ فِي دِينِ اللَّهِ أَفْوَاجًا ۝ فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ وَاسْتَغْفِرْهُ ۚ إِنَّهُ كَانَ تَوَّابًا ۝ (سورہ نصر)	جب اللہ کی مدد اور فتح آئیگی اور تو لوگوں کو دین میں فوج در فوج داخل ہوتا دیکھیگا، تو اللہ کی حمد وثنا کرنا اور اس سے مغفرت طلب کرنا یقیناً وہ رحمت سے توجہ کرنے والا ہے۔

کیونکہ نظامہائے باطلہ کے آخری دن قریب آچکے ہیں۔ فقط تمھارے اٹھنے کی دیر ہے۔ کہ:۔

لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ

ھُوَ الَّذِیْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَہٗ بِالْھُدٰی وَدِیْنِ الْحَقِّ لِیُظْھِرَہٗ عَلَی الدِّیْنِ کُلِّہٖ

ماھنامہ

(اردو)

ریویو آف ریلیجنز

یعنی

دنیا کے مذاہب پر نظر اور اہل مذاہب کا تشحیذ الاذہان

جلد ۴۵ | ماہ محرم الحرام ۱۳۶۵ھ مطابق ماہ دسمبر ۱۹۴۶ء | عدد ۱۲

فہرست مضامین!

الامام المہدی

سرسید، ڈاکٹر اقبال اور مولانا مودودی کے تصوراتِ مہدیؑ پر سرسری نظر!

(از جناب شیخ روشن دین صاحب تنویر بی۔اے۔ ایل ایل۔بی)

جناب امام حسین علیہ السلام کی شہادت خلافتِ راشدہ کی شہادت تھی۔ ان کے بعد خلافت کا نام محض لبطور تبرک رہ گیا تھا، حقیقت میں خودمختار بادشاہی قائم ہو چکی تھی۔ اُس عہد سے لیکر سلطان عبدالمجید آخری عثمانی بادشاہ کے عہد تک خلافت سلطنت کے مختلف دوروں میں سے گذرتی چلی آتی رہے سوائے ان معدودے چند سالوں کے جب کہ حضرت عمر بن عبدالعزیز اموی تختِ خلافت پر متمکن رہے۔ خلیفہ کا خطاب خلفائے راشدہ کے علاوہ اموی، عباسی، فاطمی اور عثمانی بادشاہوں نے اختیار کیا۔ انکے سوا اور کسی خاندان کو یہ خطاب اختیار کرنے کی جرأت نہیں ہوئی۔ جب تاتاری ہلاکو خاں نے بغداد کو لوٹ لیا، اور آخری عباسی خلیفہ مستعصم باللہ کو قتل کر دیا، تو ساڑھے تین سال کے بعد ابوالقاسم احمد جو مستعصم باللہ کا چچا تھا بھاگ کر مصر جا پہنچا، اور وہاں سلطان رکن الدین بیبرس والی مصر نے اس کو خلیفہ تسلیم کر لیا، مگر حکومت میں

اس کو کوئی دخل نہ تھا۔ شاہ سلیم اول عثمانی کے عہد تک یہ غیر شاہی خلافت قائم رہی۔ شاہ سلیم نے آخری مصری خلیفہ عباسی متوکل باللہ سے رضامندی لیکر یہ خطاب خود اختیار کر لیا۔ اُس وقت سے لیکر خلافت آلِ عثمان ہی کے قبضہ میں رہی۔ یہاں تک کہ آخر "ترک ناداں" نے ۱۹۲۳ء میں خلافت کی قبا چاک کر دی۔

عباسی خلافت کے عہد میں گو فاطمیوں نے شمالی افریقہ میں اور امویوں نے اندلس میں جداگانہ خلافت قائم کر لی تھی۔ مگر وہ محدود الاثر تھیں۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے عہد ہی میں بادشاہی کی تخم ریزی ہو چکی تھی، گو بیج ابھی پھوٹا نہ تھا۔ خود جناب عثمانؓ بھی اس امر سے بے خبر تھے۔ خلافتِ راشدہ کی خصوصیت یہ تھی کہ دینی اور دُنیوی نظام ایک ہاتھ میں تھا۔ مگر اس کے بعد آنے والے خلفاء کی توجہ رفتہ رفتہ بیش از بیش دُنیا کی طرف ہوتی چلی گئی، اور دین صرف علماء کے ہاتھوں میں رہ گیا۔ اِس تفریق کا بیج بھی حضرت عثمانؓ کے عہد ہی میں بویا جا چکا تھا۔ مسلمانوں میں امراء اور غرباء کے الگ الگ طبقے پیدا ہو چکے تھے۔ چنانچہ جب حضرت ابوذر غفاریؓ نے دمشق میں امراء کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی تو حضرت معاویہؓ کی تحریک پر اُن کو دارالخلافت میں واپس بُلا لیا گیا۔ مگر جب وہاں بھی انہوں نے اپنی تبلیغ جاری رکھی، تو حضرت عثمانؓ کے حکم سے اُن کو گاؤں میں نظر بند ہونا پڑا۔ یہ ایک مثال ہے، ورنہ اور بھی بہت سے صحابۂ نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم اُس وقت کے حالات سے مطمئن نہ تھے، اور دینی لحاظ سے اُمرائے وقت سے اختلاف رکھتے تھے۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے عہدِ خلافت میں تو ایک باغی گروہ خوارج کا کھُلم کھُلا پیدا ہو گیا۔ مگر ان کو چھوڑ کر اور پاک لوگ بھی تھے جو نیک نیتی سے ان حالات کو بنظرِ تاسف دیکھتے تھے، مگر بے دست و پا ہونے کی وجہ سے کچھ نہ کر سکتے تھے۔ واقعۂ کربلا نے اِس تفریق کی خلیج کو اور بھی وسیع کر دیا۔ اور جوں جوں خلافتِ اموی مستحکم ہوتی گئی، یہ خلیج وسیع تر ہوتی چلی گئی۔ صحابہؓ اور اُن کے بعد تابعین اس نظام سے نالاں تھے، اور شاید اسکی روحانی

اثر تھا کہ اموی خاندان میں سے حضرت عمر بن عبد العزیز سا مجددِ وقت پیدا ہوا جس نے خلافتِ راشدہ کے دن پھر ایک بار زندہ کر دیئے۔ مگر آپ کے بعد خلفائے اموی پھر دُنیا کمیٹنے کی طرف متوجہ ہو گئے۔ لیکن جو کام مجددِ وقت نے کیا تھا وہ رائگاں نہیں جا سکتا تھا۔ لوگوں کا رُجحان علمِ دین کی طرف زیادہ ہو گیا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ امام ابو حنیفہؒ امام مالکؒ اور امام احمد ابن حنبلؒ جیسے ستارے مطلعِ اسلام پر طلوع ہوئے۔

احادیث اور امام مہدی کا پہلا تصور۔

یہ ناممکن تھا کہ خلفاء کی بے اعتدالیاں دیکھ کر علمائے حق کو اُن سے نفرت نہ ہوتی۔ وہ اس نظامِ حکومت کو خلافِ اسلام سمجھتے تھے اور کسی ایسے خلیفہ کی تمنا کرنے لگے تھے جو اسلامی اصول پر کاربند ہو۔ اسی عہد میں علمِ حدیث کا شوق پہلے پہل زوروں پر ہوا۔ احادیث میں ایک ایسے امام کی آمد کی خبر دی گئی تھی جو خلافت کو از سرِ نو منہاجِ نبوت پر قائم کرے گا اور جس کا نام الامام المہدی ہوگا۔ مگر چونکہ موجودہ خلفاء تو مسلمان ہی تھے اگرچہ بے راہ رو ہو چلے تھے ان علماء اور اُن کے پیروؤں کی نگاہ میں مہدیٔ موعود کا جو تصور رہا گا وہ یہ تھا کہ وہ دین کو قائم کرنے والا ہوگا۔ اُن کی نظر میں امام مہدی کا کام صرف غلبۂ دین ہی تھا۔ یعنی مہدی موجودہ دُنیا پرست خلفاء کو ہٹا کر دینی حکومت قائم کریگا جس کی کوششوں اور تبلیغ سے اسلام تمام دُنیا میں اشاعت پا جائے گا۔

وسعت کے لحاظ سے حکومتِ اسلامیہ دُنیا میں دولتِ فائقہ (Paramount power) کا درجہ حاصل کر چکی تھی۔ اندلس سے لے کر چین تک مسلمان ہی مسلمان چھائے ہوئے تھے۔ دُنیا میں جن نعمتوں پر کوئی ناز کر سکتا ہے، وہ سب مسلمانوں کے قدموں میں تھیں، اس لئے دُنیاوی حکومت کے لحاظ سے وہ سیر چشم تھے۔ مگر یہ حکومت اسلامی حکومت کے اصول پر نہ تھی۔ علماءِ حق اس کو کوئی وقعت دینے کو تیار نہ تھے۔ وہ تو ایسی حکومت چاہتے

تھے جو دینی ہو، جس حکومت میں خلافتِ راشدہ کی شان ہو، جس میں امیر و غریب کی کوئی تفریق نہ ہو، لوگوں کے اعمال میزانِ تقویٰ میں تولے جائیں، نہ میزانِ کثرتِ مال و متاع میں، خلفاء کی جدوجہد اشاعتِ اسلام کے لئے ہو، نہ کسبِ جاہ و حشمت کے لئے۔ یہ جذبہ اُن میں اس قدر ترقی کر گیا تھا، کہ بڑے بڑے با جبروت خلفاء بھی اُن کے آگے سر بخم ہو جاتے تھے۔ اگرچہ علماء میں سے بہت سے ایسے افراد بھی تھے جو حکومت کے اشاروں پر ناچتے تھے، مگر علماءِ حق کی بھی کمی نہ تھی، جو اس قدر نڈر تھے کہ ظالم سے ظالم خلیفہ کے مُنہ پر بھی سچی بات کہنے سے نہیں ہچکچاتے تھے۔ ایسے ایمان افروز واقعات سے اس عہد کی تاریخ پٹی پڑی ہے۔ لیکن اس مضمون میں اُن کا بیان کرنا غیر ضروری ہے۔

جب علم حدیث کی ترقی کے ساتھ مہدئ موعود والی حدیثیں عام ہوئیں تو انہی خلفاء میں سے کسی ایک کے متعلق صاف پراپیگنڈہ کیا گیا کہ وہی مہدئ موعود ہے۔ اور یہ پراپیگنڈہ اسی بات کا اثر تھا کہ علماءِ حق خلافت راشدہ کی سی حکومت کے متمنی تھے۔ درباری علماء نے کسی ایک خلفاء کے حُلیوں کو اُس حُلیہ سے مطابق ثابت کرنے کی کوشش کی جو احادیث میں امام موعود کا بیان کیا گیا تھا۔ بلکہ بعض خلفاء نے تو اپنے لڑکوں کے نام ہی مہدی رکھے۔ عباسیوں اور فاطمیوں میں اپنے اپنے خاندان سے مہدی کے ظہور کے متعلق گویا ایک رقابت سی پیدا ہو گئی۔ بہت سے علماء اسلام کا خیال ہے کہ اس عہد میں امام مہدی کے متعلق بہت سی حدیثیں بنائی گئیں، لیکن یہاں اس بحث کی ضرورت نہیں۔

مہدئ کے تصور میں تبدیلی

فتنۂ تاتار تک تو یہ معاملہ ایک اندرونی حیثیت رکھتا تھا۔ لیکن جب ایک غیر مسلم قوم نے اسلامی حکومت کو متزلزل کر دیا، اور تاتاریوں نے اسلامی بغداد کی اینٹ سے اینٹ بجا دی، تو امام مہدی کے تصور میں بھی تھوڑی سی تبدیلی ہو گئی۔ اب اس تصور میں فوجی عنصر شدت کے ساتھ شامل ہو گیا، اور مسلمان ایک ایسے مہدی کی آرزو کرنے لگے جو

ان کو سلطنت پھر واپس دلا دے۔ صلیبی جنگوں نے بھی اسی تصور کو پختہ کیا۔ جب تک مسلمانوں کا آپس کا معاملہ تھا، امام موعود کے تصور میں دینی عنصر غالب تھا، سیاسی اقتدار تو حاصل تھا ہی۔ پہلوں کی نظر میں امام اس لئے آنا چاہیئے تھا کہ وہ موجودہ حکومت کو دینی اصولوں پر لے آئے۔ مگر جب غیر اسلامی غلبہ کا دباؤ پڑا تو حکومت پہلے آگئی یعنی یہ سمجھا گیا کہ اگر اسلامی حکومت پھر سے قائم ہو جائے، تو دین کا قیام اس کا لازمی نتیجہ ہوگا۔ مسلمانوں کے لئے سلطنت کا زوال ایک ایسا صدمہ تھا جس کو طبعاً وہ گوارا نہیں کر سکتے تھے۔ تصورِ مہدی میں شاید یہ تبدیلی خفیف اور سطحی خیال کی جائے، مگر جو اہم نتائج اس ذراسی تبدیلی سے پیدا ہوئے اُن سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ ایک بہت بڑی تبدیلی تھی۔

جہاد بالسیف

جہاد بالسیف: کے مسئلہ کو بھی تاریخاً امام مہدی کے تصور سے بڑا تعلق ہے۔ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم اور خلفاء راشدین کو جو لڑائیاں لڑنی پڑیں وہ تمام کی تمام اصولاً دفاعی حیثیت رکھتی تھیں۔ مگر جب خلافت نے سلطنت کی ہیئت اختیار کر لی تو اس اصل پر قائم رہنا مشکل ہوگیا۔ مسلمان بادشاہوں نے جہاد کے مسئلہ سے محض ہوسِ جہانبانی کو پورا کرنے کے لئے بطور ایک ہتھیار کے کام لیا۔ حقیقی جہاد ایسا مسئلہ تھا کہ خود علماء حق بھی اس کے نام پر تلوار اُٹھانا سعادتِ دارین کا موجب سمجھتے تھے۔ اور گو آپ کو تاریخ میں ایسے واقعات بھی کثرت سے مل جائیں گے جنہیں خالص دفاعی رنگ میں اسلامی جہاد کہا جا سکتا ہے مگر اس دریا کی منجدھار محض مسلمان بادشاہوں کی خودغرضی پر ہی رواں تھی۔ درباری علماء نے ذرا ذرا سی بات پر جہاد کا فتویٰ دینا شروع کر دیا۔ قومی اُٹھان اس نہج پر ہوگئی کہ مسلمان ہر غیر مسلم قوم کے لئے ایک مذہبی ہَوّا بن گیا۔ کافر اور مُرتد کا قتل شعائرِ دینی میں سے سمجھا جانے لگا۔ قرآن کریم کی اُن آیات سے جو زمانۂ جنگ سے تعلق رکھتی تھیں استدلال کر کے جہاد اور قتلِ کافر و قتلِ مرتد کا جواز ثابت کرنا درباری علماء کا خاص مشغلہ بن گیا۔ یہاں تک کہ اُن آیاتِ کریمہ کو جن میں نرمی اور

رواداری کی تعلیم تھی ان متذکرہ بالا آیات سے منسوخ قرار دیا گیا۔ ان وجوہات میں سے جن سے غیر اقوام میں یہ عقیدہ راسخ ہو گیا کہ اسلام تلوار سے پھیلا ہے، یہ بات بھی ایک بڑی وجہ ہے۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ مسلمان بادشاہوں نے ماسوائے چند کے خالص اشاعتِ اسلام کے لئے کبھی کچھ نہیں کیا، بلکہ اُلٹا نقصان پہنچایا ہے۔ اِس غلط طرزِ خیال ہی کا نتیجہ ہے کہ آج تک غیر اقوام یہ ماننے کے لیے تیار نہیں ہیں کہ اسلام ایک امن سکھانیوالا دین ہے۔ بیشک اِس میں غلط پراپیگنڈہ کا بھی بڑی حد تک دخل ہے مگر اس کا کیا کیا جائے کہ اِس زمانے میں بھی علماء اسلام صریح نصوصِ قرآنی کے خلاف جہاد، قتلِ کافر و قتلِ مُرتد کے مسائل کے اُسی طرح قائل ہیں جس طرح کہ درباری علماء نے ان مسائل کو پھیلانیکی کوشش کی۔ اِس امر کی بحث کا یہاں موقع نہیں ہے، صرف اتنا اشارہ کر دینا کافی ہے کہ جناب ابوالاعلیٰ مودودی صاحب نے قتلِ مُرتد کے زیرِ عنوان حال ہی میں ایک مقالہ اپنے رسالہ "ترجمان القرآن" میں سپردِ قلم کیا ہے، جس میں آپ نے باوجود اِس اعتراف کے کہ قرآن کریم میں اِس مسئلہ کی کوئی بنیاد نہیں ہے، محض چند واقعات کی بناء پر قتلِ مُرتد کو اسلامی شریعت کا ایک فیصلہ شدہ مسئلہ قرار دیدیا ہے۔ آپ نے اِس بات پر ذرا بھی غور نہیں فرمایا کہ گو روایتاً یہ واقعات صحیح بھی ہوں تو پھر بھی قرآن مجید کے صریح ارشادات کی موجودگی میں ان کی کیا وقعت ہو سکتی ہے۔ یہاں ہم صرف ایک آیت پر ہی اکتفا کریں گے۔

اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ثُمَّ كَفَرُوْا ثُمَّ اٰمَنُوْا ثُمَّ كَفَرُوْا ثُمَّ ازْدَادُوْا كُفْرًا لَّمْ يَكُنِ اللّٰهُ لِيَغْفِرَ لَهُمْ وَلَا لِيَهْدِيَهُمْ سَبِيْلًا ۝ (نساء ع ۲۱)	یقیناً جو لوگ ایمان لائے، پھر کافر ہو گئے، پھر ایمان لائے، پھر کافر ہو گئے، اور کفر میں بڑھتے چلے گئے، اللہ تعالیٰ نہ تو اُن کی مغفرت کرے گا اور نہ اُن کو راہِ راست کی ہدایت کرے گا۔

ظاہر ہے کہ اگر اسلام میں قتلِ مُرتد جائز ہوتا، تو یہ حکم ہوتا، کہ جو ایمان لاکر کافر ہو جائے اُس کی

گردن اڑا دو، اور اس کو دوبارہ ایمان لانے کا موقع ہی نہ دیا جائے۔ مگر یہاں تو صرف ایمان لانے کا ہی موقع نہیں دیا گیا، بلکہ یہاں تک فرما دیا ہے کہ اگر دوبارہ ایمان لا کر دوبارہ کافر ہو جائے اور کفر میں بڑھتا بھی چلا جائے، تو اس کی سزا یہ ہے کہ اللہ تعالےٰ اسکی مغفرت نہیں کریگا اور وہ کفر ہی کی حالت میں مر جائے گا اور نیکی کی راہ نہیں پائے گا۔ جائے غور ہے کہ اِس سے بڑھ کر رواداری کی تعلیم کیا ہو سکتی ہے۔ اب یا تو اِس آیہ کریمہ کو نعوذ باللہ منسوخ قرار دیا جائے۔ اور یا پھر اِس گمراہ کن خیال سے باز آنا چاہیئے کہ اسلام میں ارتداد کی سزا قتل ہے۔ افسوس ہے کہ خود مسلمانوں ہی نے اسلام کی پاک تعلیم کو اپنی خواہشات اور امانی پر اس طرح قربان کر دیا کہ غیروں کا گلہ کرتے ہوئے شرم آتی ہے ؎

من از بیگانگاں ہرگز نہ نالم ❊ کہ با من ہر چہ کرد آں آشنا کرد

جہاد بالسیف کے اِس غیر اسلامی تصور نے خون آشام مہدی کے تصور میں اور بھی رنگینیاں بھر دیں ہر طبقے کے لوگوں کا یہ عقیدہ جزوِ ایمان بن گیا کہ امام موعود آکر تلوار کے زور سے کفار کو مار مار کر یا مسلمان کر دیگا یا مٹا دیگا اور مسلمانوں کو ساری دنیا کی حکومت دلا دیگا۔ جب بھی کسی اسلامی حکومت میں زوال کے آثار نظر آتے ہیں یہ خیال کم و بیش طاقت کے ساتھ منظرِ عام پر آتا رہا ہے۔

حضرت سیّد احمدؒ بریلویؒ کی تحریک کے دو پہلو۔

جب انگریزوں نے ہندوستان میں اپنے قدم جما لئے تو ہندی مسلمانوں کے ذہن بھی اِسی خیال سے پُر تھے۔ اسی عہد میں وہ تحریک اُٹھی جسکے مرکز حضرت سیّد احمدؒ علیہ الرحمۃ بریلوی تھے۔ ہمارا ایمان ہے کہ آپؒ وقت کے مجدد تھے، اور آپؒ خدا کی طرف سے مبعوث ہوئے تھے۔ جس کام کے لئے آپؒ مبعوث ہوئے تھے اُس کے دو پہلو تھے، ایک مثبت اور دوسرا منفی۔ مثبت پہلو تو یہ تھا کہ جو دینی جمود مسلمانوں پر چند صدیوں سے طاری تھا اُس کا جادو توڑا جائے۔ حضرت مجدد الف ثانیؒ اور حضرت

شاہ ولی اللہ علیہما الرحمۃ نے جو تجدیدی کام کیا تھا، گو علمی لحاظ سے بے نظیر تھا، مگر عملی لحاظ سے اس جاہلی غلبہ سے دبا رہا جو گذشتہ کئی سو سال سے تمام اسلامی دُنیا پر چھا گیا ہوا تھا۔ دونوں حضرات نے بڑی جانکاہی سے کھوٹے کو کھرے سے الگ کر دیا، اور علمی حلقوں میں اُنکی تصنیفات وتحریرات نے قبولیت حاصل کرلی، مگر وہ علماء بھی جو علمی طور پر تو ان سے متاثر ہو چکے تھے، عملی طور سے استفادہ نہ کرسکے۔ خود اُن کے اپنے گھروں میں ایسی بدعات جاری ہوگئی تھیں، جن کو وہ علم کے زور سے مٹا نہ سکتے تھے۔ لیکن حضرت سید احمد بریلوی علیہ الرحمۃ نے ایسا صور پھونکا کہ گویا صدیوں کے مُردوں کو جگا دیا۔ صحیح شریعت اب کتابوں میں بند نہ رہی بلکہ میدانِ عمل میں نکل آئی۔ جس فضا میں پہلے سکوت تھا وہ نعرۂ توحید سے لرز گئی۔ حقائقِ اسلام کو دلائل سے نہیں بلکہ عمل سے ثابت کرنے کا جذبہ ہر دل میں پیدا ہو گیا۔ یہ ایک بہت بڑا کام تھا جو آپؒ نے کیا۔ اور یہ تھا آپؒ کی تحریک کا مثبت پہلو۔

اسی عملی جذبہ کا نتیجہ تھا کہ آپؒ نے ایک نہایت مخلص جماعت صالح لوگوں کی اپنے گرد جمع کرلی۔ اُس وقت حالت یہ تھی کہ اسلامی سلطنت ہندوستان میں تباہ ہو چکی تھی۔ انگریزوں نے ہندوستان کے ایک بڑے حصہ پر اپنا تسلط قائم کرلیا تھا۔ پنجاب میں سکھا شاہی تھی۔ مسلمان ہر طرف ذلیل وخوار ہو رہے تھے۔ یہ ایک ایسا زلزلہ تھا کہ ناممکن تھا کہ آپ کی قوتِ عمل کو دھچکا نہ لگتا۔ آپؒ تو فطرتاً بیدار ہی پیدا ہوئے تھے، آپؒ کی آواز نے بہت سے سوئے ہوؤں کو بھی ساتھ ہی بیدار کر دیا۔ آپؒ ساری اسلامی تاریخ میں پہلے شخص ہیں جنہوں نے صحیح معنوں میں خلافتِ راشدہ کی شان کے ساتھ جہاد کے لئے تلوار اُٹھائی۔

بے شک آپؒ نے خدا کے حکم سے تلوار اُٹھائی تھی، مگر اس حکم میں ایک منفی پہلو بھی تھا اور جو لوگ اِس تحریک کو ناکام سمجھتے ہیں، وہ یہی غلطی کرتے ہیں، کہ وہ اِس پہلو کو نظر انداز کر دیتے ہیں۔ جو غلط تصورِ جہاد بالسیف کا مسلمانوں میں رواج پا گیا تھا اور جو خونی مہدی انہوں نے اپنے خیال سے بنا لیا تھا، وہ اسلام کو بہت نقصان پہنچا رہا تھا۔ نہ صرف اسلام کی اشاعت ہی

رُک گئی تھی، بلکہ خود مسلمان بھی نعمتِ اسلام سے محروم ہو گئے تھے۔ اِس کا دفعیہ ضروری تھا۔ اور یہ کام ایک بہت بڑی قربانی چاہتا تھا۔ ایسی قربانی جو صرف ایک مبعوث من اللہ ہی پیش کر سکتا تھا۔ جس کام کے لئے یہ تحریک اُٹھائی گئی تھی وہ کام پُورا ہو گیا۔ اللہ تعالےٰ نے سید صاحب موصوف کو اِس کام کے لئے ایک کثیر جماعت بھی ایسے مخلص شرکاء کار کی عطا کی کہ شاید و باید۔ یقیناً اللہ تعالےٰ کی مشیّت میں اِس تحریک کا ایک یہ بھی مقصد تھا کہ جہاد بالسیف اور خونی مہدی کا غلط عقیدہ جو مسلمانوں کے ذہنوں میں راسخ ہو چکا تھا، اس کا قلع قمع کیا جائے۔ اگر یہ نہ مانا جائے تو ممکن تھا کہ اِس تحریک کا وہ انجام ہوتا جو بظاہر ہُوا۔ یہ ناکامی اگر آپ اس کو ناکامی کہیں اس لئے ہوئی کہ اللہ تعالےٰ ان غافلوں کو بیدار کرنا چاہتا تھا جنہوں نے اپنے اعمال اور اقوال سے اغیار میں اِس مغالطہ کی پرورش کی تھی کہ اسلام تلوار کے زور سے پھیلا ہے۔ اور جنہوں نے یہ سمجھ رکھا تھا کہ کافروں کو قتل کرنے سے خدا کی بادشاہت قائم ہوگی۔ اور جنہوں نے اس عقیدہ کو جزوِ ایمان بنا لیا تھا کہ مہدیٔ موعود آ کر تلوار سے اسلام دُنیا میں پھیلائے گا۔ اسلام کی پاک اور پُر امن تعلیم پر یہ ایک بدنما دھبہ تھا۔ خدائے قدوس اِس دھبہ کو دھو ڈالنا چاہتا تھا۔ اِس کارِ عظیم کے لئے حضرت سیدؒ اور اُن کے پاک نفس اور مخلص رفقاء کے خون سے زیادہ مقدس خون کون تھا جو چہرۂ اسلام سے اِس دھبہ کو دھو سکتا۔ آپؒ نے اور آپؒ کے رفقاء نے اپنی شہادتوں سے اسلامی حکومت کی تاریخ کے آخری صفحہ پر سُرخی سے ثبت کر دیا کہ اسلام نہ کبھی پہلے تلوار کا مرہونِ منت ہُوا ہے، اور نہ آئندہ کبھی ہوگا۔

اگر حضرت سید موصوفؒ، حضرت شاہ اسمٰعیل شہیدؒ اور دیگر اکابر علماء کی شہادت سے یہ سبق نہیں ملتا تو پھر بتایا جائے کہ یہ مخلص تحریک کیوں ناکام ہوئی۔ اس کا جواب ان لوگوں کے ذمہ ہے جو اس کو ناکام سمجھتے ہیں۔ ہم تو اس تحریک کو سراسر کامیاب سمجھتے ہیں عظیم الشان

قربانیاں جو صداقت کا اصول از سر نو سکھانا چاہتی تھیں اسکھا گئیں، اگر کوئی سیکھنے والا ہو۔ مگر افسوس کم ہیں جو سمجھنے اور سیکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ جو لوگ اِن مینارِ روشنی کی سی شان رکھنے والے بندوں کو محض امرِ تکوینی کے سہارے پر کھڑا ہونے والے سمجھتے ہیں وہ ہمکو بتائیں گے کہ اس تحریک میں دُنیاوی دانشمندی کے پہلو سے کیا کیا خامیاں تھیں۔ چنانچہ مولانا مودودی صاحب نے اپنی کتاب "تجدید و احیائے دین" میں کم سے کم تین اسبابِ ناکامی بیان فرمائے ہیں۔ دُنیاوی حکومتوں کے اسبابِ زوال کی طرح اِس تحریک کی ناکامی کے اسباب بھی گننے کو تو بہت سے گنے جا سکتے ہیں مگر ہم تو صرف ایک ہی سبب سمجھتے ہیں اور وہ یہ ہے کہ مسبب الاسباب نے مسلمانوں کے اِس جذبۂ شمشیر پرستی کو روکنے کے لئے قربانیاں مانگی تھیں جن پر ان خدا کے بندوں نے لبیک کہی تھی۔ اللہ تعالیٰ نے ان شیخی پسند گرے ہوئے اخلاق کے حامل ناکارہ آرزوؤں کے کھوکھلے ڈھانچوں کو جو "دین امن" کا نام طنزاً "دین روباہی" رکھتے ہیں اور اپنی بداعمالی کو مصنوعی شیروں کی کھال سے ڈھانپنا چاہتے ہیں للکار کر کہا کہ "لو ہم تم جیسے بزدلوں کو نہیں آزماتے۔ ہم اپنا ایک اور پیارا تمھارے لئے نثار کرتے ہیں، اور اس اعجاز سے تم پر حجت قائم کرتے ہیں، کہ اسلام کو نہ فولادی تلواروں کی ضرورت ہے، اور نہ آتشی گولوں کی۔ اسلام کی فتح ملک گیری پر منحصر نہیں، بلکہ دلوں کی تسخیر پر ہے۔ اسلام کی بُنیاد جنگی سامانوں پر نہیں بلکہ اخلاقی چٹان پر ہے۔ اسلام کو کسی خالد، کسی صلاح الدین، کسی سلیم کی تیغ زنی کا بھروسہ نہیں بلکہ ان کے اسلامی اخلاص کی چاہ ہے، مگر ہم کہتے ہیں کہ جس طرح تم نے پہلے حسینؓ کی قربانی سے کچھ نہ سیکھا۔ اِس آلِ حسینؓ کی قربانی سے بھی کچھ نہ سیکھو گے"۔ یہ آواز ہے جو بالاکوٹ کی وادی سے اُٹھ اُٹھ کر اسلامی دُنیا کے گوشے گوشے میں پھیل رہی ہے۔ یہ کامیابی نہیں تو اور کیا ہے۔ کاش کوئی اس آواز کو سُنے۔

سرسید کا نظریۂ مہدیؑ اور مغرب سے مرعوبیت

جو تصور مہدیٔ موعود کا اِس

عہد کے مسلمانوں میں پھیل رہا تھا اس کا اثر بعض دماغوں پر بالکل متضاد ہؤا۔ ہندوستان میں ۱۸۵۷ء کی لڑائی کے بعد مسلمانوں کی بے دست و پائی طشت از بام ہو چکی تھی۔ مغربی خیالات کا تفوّق دلوں پر اقتدار قائم کر رہا تھا۔ اس زمانے میں سرسیّد نے مسلمانوں کی رہنمائی کی عنان اپنے ہاتھ میں لی۔ اُس نے اور اُس کے رفقاء نے سرے سے کسی مہدی کے آنے سے ہی انکار کر دیا۔ انہوں نے کہا کہ یہ خیال کہ کوئی امام آکر مسلمانوں کی گذری ہوئی شان و شوکت پھر اُن کو واپس دلائیگا، نہایت تباہ کُن خیال ہے۔ اِس نے مسلمانوں کی قوتِ عمل چھین لی ہے اور ان کو ناکارہ کر دیا ہے۔ انہوں نے صاف کہدیا کہ اسلامی تعلیم میں ایسی پیشگوئیوں کی کوئی بُنیاد نہیں، اور اس کے متعلق تمام احادیث موضوع ہیں۔ جو لوگ مغربی خیالات سے متاثر تھے انہوں نے اِس آواز پر لبیک کہی۔ ضرور تھا کہ پُرانے اور اِس نئے خیال میں تصادم ہوتا۔ چنانچہ تصادم ہؤا اور سخت ہؤا۔ نئے خیال والوں نے نہ صرف مہدی کی آمد سے انکار کیا بلکہ انہوں نے پیشگوئی کی حقیقت سے بھی انکار کر دیا۔ معجزات کی طبعی تشریحات کیں۔ دُعا کو بے اثر کہا۔ نبوت کو فطری ملکہ اور الہام و وحی کو دل کی روشنی سے نامزد کیا۔ الغرض اسلام کو مغربی فلسفہ اور سائنس کے ہاتھوں فروخت کر دیا گیا۔ مغرب کے مادی نظریات جو اُنیسویں صدی کی پیداوار تھے ان کو عقائدِ اسلام کی کسوٹی سمجھ لیا گیا۔ اور اسلام کی جو بات ان معیاروں پر پُوری اُترتی معلوم نہ ہوئی اُس سے صاف انکار کر دیا گیا۔ دوسری طرف بھی سوا خشک مُلّاؤں اور گدی نشین پیروں کے کوئی مقابلہ پر نہ تھا۔ عوام و خواص توہمات کے اندھیرے میں گمراہ ہو رہے تھے۔ اسلئے اِس تحریک کو خاص قبولیت حاصل ہو گئی۔

سرسید احمدؒ اور اس کے پیروؤں نے اچھے کام بھی کئے۔ اُن کا سب سے بڑا کارنامہ یہ تھا کہ انہوں نے مسلمانوں کو مغربی علوم کی طرف مائل کیا اور جو بے جا تعصب ان علوم کے خلاف پھیلا ہؤا تھا اُس کو دُور کر کے مسلمانوں کے لئے نئی مہمات کی راہیں کھول دیں۔ اُنکے

رفقاء میں سے حافظ نذیر احمد صاحب دہلوی نے قرآن مجید کا با محاورہ اُردو ترجمہ کرکے اور حالی مرحوم نے مسدس مد و جزر اسلام لکھ کر مسلمانوں پر بڑا احسان کیا۔ مگر اس تحریک کا جو نقصان ہوا وہ بھی کم نہیں ہے۔ اِس تحریک نے اسلام کی جڑ یعنی تعلق باللہ کاٹ کر رکھدی اور لوگوں کو اسلام کو مادی اصول پر پرکھنے کی عادت ڈال دی۔ اور نئے خیال کے علماء اسکو حاصل تحقیقات سمجھنے لگے، کہ قرآن کریم کی صداقتوں کو مغربی اصطلاحات میں پیش کیا جائے اور یہ نہ سوچا کہ مغرب کے رجحانات بالکل مادی ہو رہے تھے، اور وہ حقائقِ عالم کو ورلی دُنیا کی عینک ہی سے دیکھنے لگا تھا۔ گویا بالکل اسلام کی ضد۔ ظاہر ہے کہ اِس ماحول میں کسی تقوے کا خیال پنپ نہیں سکتا تھا۔

مغربی سیاست کا اثر اسلامی مفکرین پر

ہندوستان میں جو نظامِ حکومت انگریزوں نے قائم کیا وہ بھی طبعاً مغربی خیالات کا پروردہ تھا۔ اگرچہ ملکۂ وکٹوریہ نے کمپنی بہادر سے اختیارات اپنے ہاتھ میں لیتے وقت اعلان کر دیا تھا کہ حکومتِ ہند مساوات کے اصول پر چلائی جائے گی، مگر نسل و وطن کے تصورات جو مغربی سیاسیات میں طوفان بپا کر رہے تھے، انگریزوں کے ساتھ ہندوستان کی فضا میں بھی پھیل گئے۔ رفتہ رفتہ ہر طرف سیاسی بازار گرم ہونے لگا۔ یورپ میں سائینٹفک ایجادات اور مشینری کی ترقی کے ساتھ ساتھ زندگی کا نظریہ ہی بالکل تبدیل ہوگیا۔ ہر چیز کو نئی قدروں میں جانچا اور تولا جانے لگا۔ جنگِ عظیم نے تو پُرانی دُنیا کو بالکل تہ و بالا کر دیا۔ آزادی کی تگ و دو میں ہندو مسلم اچھوت اور سکھ وغیرہ فرقہ داریوں نے اور بھی پیچیدگیاں پیدا کر دیں۔ یورپ کی سیاسی چالوں سے طرابلس سے لے کر چین تک اسلامی حکومتوں کا وقار بالکل خاک میں مل گیا، اور مفکرین اِس سوچ میں پڑ گئے ؎

پس چہ باید کرد اے اقوامِ شرق

لازماً اِس افراتفری میں بڑے بڑے دُور بین نگاہ رکھنے والوں کی نظر اسلام کے مرکزی نقطہ پر

ہٹ گئی۔ اور بڑے بڑے اسلامی مفکر سیاست کی رو میں بہہ گئے۔ ہر طرح کے نئے خیال جو یورپ کی فضا میں محوِ پرواز ہو رہے تھے ان کو لے کر اسلامی لباس پہنا یا گیا، اور سیاسی زندگی کے جو نئے زاویئے مغرب میں ایجاد ہوئے اُن کو مشرقی دائروں میں کھپانے کی کوشش کی گئی۔ خاص کر فاشی نظریۂ حیات کو مسلمانوں میں ترویج دینے کی سعی کی گئی۔ اور بتایا گیا کہ یہی اصل اسلام ہے۔ تشدّد آمیز سیاست کو اسلام کا جزو لاینفک قرار دیا گیا۔ اور اسلام کو امن و صلح کا پیغام سمجھنا کمزوروں کی اختراع بتایا گیا۔ بلاشبہ اسلام نرمی اور سختی کو اپنے اپنے وقت پر استعمال کرنے کی تعلیم دیتا ہے۔ مگر ان مفکّرین نے اِس امتیاز کو بالکل نظر انداز کر دیا۔

ڈاکٹر اقبال کا تصورِ مہدی

ان مفکّرین میں سے ڈاکٹر اقبال نے اپنی شاعری میں فلسفۂ خودی کو کئی رنگینیوں کے ساتھ بیان کیا، اور نٹشے کے تتبع میں کامل انسان کا تصور عجیب انداز میں پیش کیا۔ یہاں تک تو خیر تھی۔ مگر نٹشے کی بہت سی شاعرانہ تعلّیاں بھی ساتھ ہی لپٹ کر آگئیں۔ اقبال نے اِن خیالات کو اپنی سحر بیانی سے ایسا جاذب بنایا کہ ہر کوئی اُس کے دلآویز اشعار پڑھ کر جھومنے لگا۔ اقبال ایک شاعر تھا، ایک فلاسفر تھا اور ایک سیاست دان بھی۔ مغربی دُنیا میں جو نئی تحریکیں چند سالوں سے پیدا ہوئی تھیں اُن کا رُجحان بھی مترفین کے ہاتھ سے بالجبر طاقت چھین لینے کی طرف تھا۔ زمانہ بڑی تیزی کے ساتھ گردش کر رہا تھا۔ آمریت کی تخلیق اور انسانِ کامل کے تصور نے مِل جُل کر اقبال کو امام مہدی کے تصور کی طرف راجع کر دیا۔ حالانکہ جیسا کہ ہم آگے چل کر بیان کریں گے، رسالت وغیرہ کے متعلق اُس کا نظریہ صریحاً تکوینی تھا، جس سے آپ معلوم کریں گے کہ اس میں سرسید کی رُوح بول رہی ہے۔ وہ اِس بات کا قائل نہیں ہے کہ امام مہدی کو اللہ تعالےٰ اپنے خاص حکم سے مبعوث کرے گا۔ اس کا نظریہ خالص نفسیاتی ہے۔ اس کا استدلال مادی دُنیا سے شروع ہوتا ہے اور مادّی دُنیا ہی میں ختم ہو جاتا ہے۔ وہ اسی قسم کا ایک امام ایک

ابراہیم زمانہ چاہتا ہے جو مغرب اور مغرب کے اقتدار کو پاش پاش کر دے۔ زمانہ جس تعجیل سے حرکت کر رہا تھا اس میں علامہ اقبال کو اتنی فرصت کہاں تھی کہ ٹھہر کر اسلام کی صحیح تعلیم پر سوچتا۔ ایک تو شاعرانہ طبیعت پھر اس پر فلسفہ اور سیاست کی پُٹھ اسلئے اسلامی تعلیم کے اثر سے اُس کے کلام میں کہیں نرم خرامی کا نظارہ بھی آتا ہے تو وہ اپنے جذبات کی بلندی سے اس پر تاریک سائے ڈالتا ہوا گذر جاتا ہے۔ اسلام کو وہ شہبازوں کا دین سمجھتا ہے نہ کہ عصا فقیر کا، اس لئے ضرور تھا کہ اُس کا مہدی بھی جاہ و جلال والا شمشیر زن ہلاکت آفرین ہوتا۔ وہ مہدی کے آنے کا اس وجہ سے قائل نہیں کہ نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے اسکی آمد کی پیشگوئیاں کی ہیں بلکہ اس لئے کہ نٹشے نے مہدی کے تخیل سے قوم کو زندہ کر دیا اس لئے یہ خیال اچھا ہے۔ چنانچہ اُس نے "ضربِ کلیم" کے صفحہ ۵۶ میں کہا ہے ؎

قوموں کی حیات اُن کے تخیل پہ ہے موقوف ÷ یہ ذوق سکھاتا ہے ادب مرغِ چمن کو
مجذوب فرنگی نے باندازِ فرنگی ÷ مہدی کے تخیل سے کیا زندہ وطن کو
اے وہ کہ تو مہدی کے تخیل سے ہے بیزار ÷ نومید نہ کر آہوئے مشکیں سے ختن کو

مودودی صاحب کا تصورِ نبوت

ڈاکٹر اقبال کے بعد ان خیالات کا اُپدیش سید ابوالاعلیٰ مودودی صاحب نے شروع کیا۔ پیشتر اس کے کہ ہم آپ کے مہدی کا حلیہ بیان کریں، رسالت اور تجدید دین کے متعلق آپ اور آپ کے ہمنواؤں کے خیالات کا جائزہ لینا ضروری ہے۔ جو لوگ خدا کی ہستی کے قائل نہیں اُن کو چھوڑ کر مسئلہ رسالت کے متعلق اعتقاد کی حسب ذیل صورتیں ہوسکتی ہیں:۔

اوّل:۔ کوئی نبی خدا بالارادہ نہیں بھیجتا۔ ہاں بعض ہستیوں میں نیکی کی فطری قابلیت دوسروں سے زیادہ ہوتی ہے، وہی نبی ہوتے ہیں۔

دوم:۔ دُنیا کے آغاز میں ایک ہی دفعہ ہدایت بالارادہ آچکی ہے۔

سوم:۔ بہ تدریج ہدایت آتی رہی ہے۔ اور اس کی آگے تین قسمیں ہیں:۔

الف :۔ حضرت محمد صلے اللہ علیہ وسلم کے بعد کوئی نبی نہیں آسکتا اور نہ نئی شریعت آسکتی ہے۔
ب :۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد بھی نئی شریعت آسکتی ہے۔
ج :۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد بھی نبی آسکتا ہے مگر بغیر نئی شریعت کے۔

پہلی صورت کا نتیجہ تقریباً وہی ہے جو اس صورت میں ہو تا کہ خدا کوئی نہیں، دُنیا اپنی ذاتی قوتوں پر قائم ہے۔ جو لوگ اپنی عقل پر بھروسہ رکھتے ہیں وہ یہی عقیدہ رکھتے ہیں۔ اس زمانہ میں برہمو سماجی ہندوؤں میں اور سر سید، ڈاکٹر اقبال اور مولنا مودُودی مسلمانوں میں اِسی خیال کے پابند ہیں۔ ان کے خیال میں نبوت ایک پیدائشی قابلیت کے سوا اور کچھ نہیں۔ جس طرح دوسری پیدائشی قابلیتوں کا حال ہے وہی اس کا ہے۔ ظاہر ہے کہ ایسے عقیدہ کا انسان ختم نبوت کے عام عقیدہ کا جو تیسری صورت (الف) ہے قائل نہیں ہو سکتا تھا۔ مگر برہمو سماجیوں کے علاوہ اس عقیدہ کے تمام مسلمان علماء بظاہر ختم نبوت کے بھی قائل ہیں۔ اگرچہ مودودی صاحب نے نظریۂ قابلیت کے میدان میں پھونک پھونک کر قدم رکھا ہے، اور اس طرح کہ عندالله رند کے رند رہے ہاتھ سے جنت نہ گئی۔ مگر ان کے رسالہ "دینیات" میں سے مندرجہ ذیل اقتباس ان کی ذہنیت پر روشنی ڈالنے کے لئے کافی ہے۔ آپ فرماتے ہیں:۔

"ایک اور شخص ایسا بے نظیر قانونی دماغ لیکر آتا ہے کہ قانون کے جو نکتے برسوں غور کرنے کے بعد بھی دوسروں کی سمجھ میں نہیں آتے، اس کی نظر خود بخود وہاں تک پہنچ جاتی ہے۔ یہ خدا کی دین ہے۔ کوئی شخص اپنے اندر یہ قابلیتیں پیدا نہیں کر سکتا۔ نہ تعلیم و تربیت سے یہ چیزیں پیدا ہوتی ہیں۔ دراصل یہ پیدائشی قابلیتیں ہیں . . . . . . خدا نے جس طرح ایک ایک ہنر اور ایک ایک علم و فن کی خاص قابلیت رکھنے والے انسان پیدا کئے ہیں اسی طرح ایسے انسان پیدا کئے ہیں جن میں خود خدا کے پہچاننے کی اعلیٰ قابلیت تھی۔ اس نے ان کو دین، اخلاق اور شریعت کا خاص علم اپنے پاس سے عطا کیا، اور انکو اس

خدمت پر مقرر کیا کہ دوسرے لوگوں کو ان چیزوں کی تعلیم دیں۔ یہی وہ لوگ ہیں جن کو ہماری زبان میں نبی یا رسول یا پیغمبر کہا جاتا ہے؛

ظاہر ہے کہ رسالت کی یہ توجیہ وہی ہے جو سرسید نے آج سے ساٹھ سال پہلے مغربی خیالات سے متاثر ہو کر کی تھی۔ ان لوگوں کے خیال میں پیغام رسالت کہیں باہر سے نہیں آتا بلکہ نبی کے اندر ہی سے آواز اٹھتی ہے، جو اس کی زبان پر آ کر لفظوں کی صورت اختیار کر لیتی ہے بعینہٖ اسی طرح جس طرح کوئی غیر معمولی شاعر کرتا ہے۔ یہ ملکہ ہر انسان میں ہوتا ہے مگر نبی میں بدرجۂ اتم پایا جاتا ہے۔ خدا کے ساتھ اگر اس کو کوئی تعلق ہوتا ہے تو اتنا کہ اس نے یہ خاصیت فطرتِ انسانی میں شروع سے رکھدی ہے۔ اسی طرح اللہ تعالےٰ نے دوسری قابلیتیں بھی انسانی سرشت میں ابتدائے آفرینش کے وقت سے ہی بو دی ہیں۔ جس انسان میں کوئی قابلیت کسی درجۂ کمال کو پا لیتی ہے اس کو اس قابلیت کے لحاظ سے دوسرے انسانوں پر یہ فوقیت ہوتی ہے کہ وہ اپنے وقت میں اس خاص صنف میں نئی راہوں کا بانی ہوتا ہے۔ اللہ تعالےٰ کو براہِ راست اس خاص قابلیت سے یا لاارادہ کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ جب ایسی خاص قابلیت کا انسان اپنی فطرت کی گہرائیوں میں ڈوب کر کوئی گوہر اصول نکال لاتا ہے تو اس کو الہام یا وحی جو جی چاہے کہہ لو۔ اگرچہ جناب مودودی صاحب نے اپنی تصنیفات میں جابجا ایسے جملے بکھیر دیئے ہیں جن سے آدمی خیال کرنے لگتا ہے کہ وہ خدا کو ایک فَعَّالٌ لِّمَا يُرِيدُ اور زندہ ہستی سمجھتے ہیں، مگر یہ سب کچھ محض رنگ بھرنے کے لئے ہے۔ اس میں حقیقت کو کچھ بھی دخل نہیں۔ وہ محض اسلامی طرزِ گفتگو میں وہی جاہلیتِ خالصہ کے لگ بھگ کوئی چیز مسلمانوں کے دلوں میں نفوذ کرنا چاہتے ہیں۔ ان کے نزدیک خدا کی حیثیت ایک ایسے انجینئر کی سی ہے جس نے پہلے ہی روز سے دنیا کی مشین کو مکمل کر کے چلتا کر دیا ہے۔ اب وہ بے اختیار چلتی جا رہی ہے۔ اس مشین کے اصول کے مطابق نبی خود بخود پیدا ہوتے رہتے ہیں۔ بعینہٖ اسی طرح جس طرح آم کے درخت میں آم لگتا ہے۔ اس تصورِ نبوت اور جاہلیتِ خالصہ میں صرف یہ فرق ہے کہ ایک میں اگر خدا ہی سرے سے

نہیں تو دوسرے ہیں نہ ہونے کے برابر ہے۔ مندرجہ بالا صورت دوم کے خدا یعنی آریوں کے خدا سے بھی یہ خدا زیادہ بیکار ہے۔ کیونکہ اس خدا نے کم ازکم ایک دفعہ تو آغازِ آفرینش میں بذریعہ الہام وید بھیج دیئے۔ مگر اس جاہلیت کے خدا نے تو آغاز میں صرف سرشت ہی میں اس کو گوندھ دیا ہے، اور آپ الگ ہو گیا ہے۔ نظریۂ قابلیت کا آخری نتیجہ یہی ہو سکتا ہے اور کچھ بھی نہیں۔

ڈاکٹر اقبال کا نبوت اور ختمِ نبوت کا تصوّر

سرسید خود تو براہِ راست علوم مغربی سے واقف نہ تھے۔ ڈاکٹر اقبال مغربی فلسفہ کے بھی واقف تھے، اور علم النفس میں جو جدید تحقیقات مغرب میں ہوئی ہے اسکا پورا مطالعہ آپ نے کیا ہوا تھا۔ اسلامی تعلیم سے بھی آپ بے بہرہ نہیں کہے جاسکتے۔ رسالت کا جو تجزیہ آپ نے کیا ہے وہ خالص نفسیاتی ہے، اور بالکل ورلی دنیا تک محدود۔ آپ نے اپنی کتاب "تعمیرِ جدید فکر اسلامیہ" میں شروع شروع میں تو ذرائع تحصیلِ علم کو دو قسموں داخلی اور خارجی میں تقسیم کرکے تمہید اٹھائی تھی۔ اس سے امید بندھتی تھی کہ آپ نبوت کو فوق الفطرت چیز قرار دیکر اس بحث سے الگ ہو جائیں گے۔ مگر آپ نے ایسا نہیں کیا اور اس حقیقت کو جو آپ کے دونوں داخلی اور خارجی حسیات سے باہر تھی ایسی اصطلاحات میں بیان فرمایا ہے، جو فلسفیوں کے لئے تو شاید قابلِ قبول ہو، مگر اسلام کو اس سے کچھ بھی تعلق نہیں ہے۔ آپ ارشاد فرماتے ہیں:۔

"نبی کی تعریف اِس طرح کی جاسکتی ہے کہ وہ باطنی (mystic) شعور کا ایک نمونہ یا قسم (sphere) ہے جس میں انفرادی احساس اپنے حدود سے باہر چھلک پڑتا ہے اور اجتماعی زندگی کے عوامل کو از سرِ نو رہنمائی کرنے یا وضع جدید میں لانے کے مواقع تلاش کرتا ہے۔ اس کی ذات میں زندگی کا محدود مرکز اپنی لامحدود گہرائیوں میں ڈوب جاتا ہے، اور پھر تازہ قوت کے ساتھ باہر نکلتا

ہے جو کہنہ کو تباہ کر دیتا ہے اور زندگی کی نئی راہوں کو عریاں کر دیتا ہے۔ اپنی ہستی کی جڑ سے یہ وصل انسان ہی کے ساتھ مخصوص نہیں ہے۔ بلکہ جس انداز سے لفظ وحی (مکاشفہ) قرآن کریم میں استعمال ہوا ہے وہ ظاہر کرتا ہے کہ قرآن اس کو حیات کی عالمگیر ملکیت تصور کرتا ہے۔ اگرچہ زندگی کی مختلف ارتقائی منازل میں اس کی صورت مختلف ہوتی ہے۔ پودے کا فضا میں آزادانہ اُگنا، جاندار کا اپنے ماحول کے مطابق کسی عضو کو نشوونما دینا اور انسان کا زندگی کی اندرونی گہرائیوں سے روشنی حاصل کرنا وحی کی مختلف صورتیں ہیں، جو وحی حاصل کرنیوالے کی مختلف حالتوں کے مطابق تبدیلی اختیار کرتی ہیں۔"

گویا نبوت محض نبی کے اندر ہی سے پھوٹتی ہے۔ جب وہ اپنی فطرت کی گہرائیوں میں ڈوب کر نکلتا ہے، تو ایک ساختہ پرداختہ اصول زندگی کا گوہر ہاتھ میں لے کر نکلتا ہے، جو کندہ ناتراش عوام کو سفر تلاش کی کوفت سے بچا لیتا ہے۔

جیسا کہ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں ان لوگوں کو ختم نبوت کے عقیدہ سے پرہیز چاہیئے تھی۔ کیونکہ انسانی فطرت خواہ کتنی بھی مکمل ہو چکی ہو اس میں اعادہ نہ ماننا علم نفسیات کے اوّلین اصول کے خلاف ہے۔ مگر علامہ اقبال نے یہاں ایک نہایت عجیب و غریب توجیہ ختم نبوت کی پیش کی ہے۔ آپ فرماتے ہیں:۔

"بنی آدم کے دور طفلی میں قوتِ نفس ایسی ہیئت اختیار کر لیتی ہے جس کو میں شعور نبوت کہتا ہوں۔ یعنی انفرادی فکر اور اُس کی کفایت شعارانہ راہ عمل جو گھڑے گھڑائے فیصلے آراء اور لائحہ مہیا کر دیتی ہے۔ مگر تعقل، شعور اور قوتِ ردّ و قدح کی تخلیق کے ساتھ زندگی اپنے ہی فائدہ کے لئے شعور کی ان غیر معقول راہوں کی نشوونما کو روک دیتی ہے جن میں سے قوت نفس بشری ارتقا کی اوّلین تدریجی حالتوں میں بہتی تھی۔ اسلام میں نبوت اپنی تکمیل کو اس وجہ سے

پہنچ گئی ہے کہ اُس نے اپنی تنسیخ کی ضرورت کو معلوم کرلیا ہے۔"

ختم نبوّت کا یہ نفسیاتی معمہ ہے جو علامہ موصوف نے حل کرنے کے لئے مسلمانوں کے سامنے رکھا ہے۔ چونکہ نبوّت انسان ہی کی فطرت کا داخلی جوش تھا، جو اس کی نوعی طفولیت میں اُبھر اُبھر آتا تھا اس لئے ادراک کے سنِ رُشد میں اس کو مٹا دینا ہی چاہیئے تھا۔ گویا نبوّت کا انتہائی کمال یہ ہے کہ اُس نے اپنی غیر معقولیت کو دریافت کرلیا ہے۔ ارتقائے بشری میں نبوّت محض ایک غیر معقولی حالت کا نام تھا۔ اِس غیر معقولی حالت نے ایسا کمال حاصل کیا کہ انسان کو معقولیات کی منزل پر پہنچا دیا، اور اپنا کام پُورا کرکے خودکشی کرلی۔ دوسرے لفظوں میں قرآن مجید رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی فطرت کی گہرائیوں سے گھڑے گھڑائے اصولوں کی صورت میں نکلا ہے، جو نبوّت کے انتہائی کمال کو پہنچے ہوئے ہیں۔ اور اُن کے انتہائی کمال کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ قرآن کریم نے معلوم کرلیا ہے کہ مَیں انسان کے غیر معمولی دَور کی پیداوار ہوں، اب میری کوئی ضرورت نہیں ہے، مجھے منسوخ سمجھنا چاہیئے۔ اللہ! اللہ!! اسلام کی بُنیادوں کو اس صفائی سے کھود دینا نہ عیسائیوں سے ہوسکا اور نہ آریوں سے بلکہ اس کا سہرا علامہ کے سر پر ہے۔

نبوّت کا یہ تصوّر خالص مادی ہے، اور اس ماحول کی پیدائش ہے جہاں ہر چیز کو معلومہ معیاروں سے جانچنا ہی حدِ کمال سمجھا جاتا ہے۔ مغربی علماء کا یہ قاعدہ ہے کہ جو چیز ان کو اپنے حسیات سے باہر نظر آتی ہے، اس کو نہیں چھیڑتے۔ وہ اپنی تحقیقات کو مشاہدات اور تجربات کی حد تک محدود رکھتے ہیں۔ اس سے آگے نہیں جاتے۔ اور اپنے اِس طرزِ عمل سے قرآن کریم کی آیہ کریمہ

لَا يُحِيطُونَ بِشَيْءٍ مِّنْ عِلْمِهِ	نہیں وہ احاطہ کرسکتے کچھ بھی اس کے علم کا،
إِلَّا بِمَا شَاءَ	مگر جتنا وہ چاہے۔

کا عملی ثبوت دیتے ہیں۔ مگر علامہ صاحب ہیں کہ کہیں رُکتے ہی نہیں، جب نبوّت منسوخ ہوچکی

ہے تو ظاہر ہے کہ اب کسی انسان کو اس کی کیفیت کا تجربہ نہیں ہو سکتا۔ پھر اس کو نفسیاتی خود ساختہ مسلمات کی زنجیروں میں جکڑنا محض قیاس آرائی نہیں ہے تو اور کیا ہے؟

مودودی صاحب کا نظریۂ مجدّد

ان لوگوں کے نزدیک جب نبی کا یہ حال ہے تو مجدّد کا تو ذکر ہی کیا حاصل ہے مودودی صاحب اپنی کتاب "تجدید و احیائے دین" کے صلا میں فرماتے ہیں:۔

"لیکن وہ بنیادی چیز جو مجدّد کو نبی سے جدا کرتی ہے یہ ہے کہ نبی اپنے منصب پر امرِ تشریعی سے مامور ہوتا ہے۔ اس کو اپنی ماموریت کا علم ہوتا ہے۔ اس کے پاس وحی آتی ہے۔ وہ اپنی نبوت کے دعوے سے اپنے کام کا آغاز کرتا ہے۔ اُسے لوگوں کو اپنی طرف دعوت دینی پڑتی ہے اور اُس کے دعوے ہی کو قبول کرنے یا نہ کرنے پر کفر و ایمان کا مدار ہوتا ہے۔ برعکس اس کے مجدّد کو ان میں سے کوئی حیثیت بھی حاصل نہیں ہوتی۔ وہ اگر مامور بھی ہوتا ہے تو امرِ تکوینی سے، نہ کہ امرِ تشریعی سے۔ بسا اوقات اُس کو خود اپنے مجدّد ہونے کی خبر نہیں ہوتی۔ بلکہ اُسکے مرنے کے بعد اُس کی زندگی کے کارنامے سے لوگوں کو اس کے مجدّد ہونے کا علم ہوتا ہے۔ اسے الہام ہونا ضروری نہیں۔ اور اگر ہوتا ہو تو ضروری نہیں کہ اُسے الہام کا شعور ہو۔ وہ کسی دعوے سے اپنے کام کا آغاز نہیں کرتا۔ نہ اسے کرنے کا حق رکھتا ہے۔ کیونکہ اس پر ایمان لانے یا نہ لانے کا کوئی سوال نہیں ہوتا۔ اگرچہ اس کے زمانے کے تمام اہل صلاح وخیر رفتہ رفتہ اس کے گرد جمع ہو جاتے ہیں۔ اور صرف وہی لوگ اس سے الگ رہتے ہیں جن کی طبیعت میں کوئی ٹیڑھ ہوتی ہے، مگر بہرحال اُس کو ماننا مسلمان ہونے کے لئے شرط نہیں ہوتا۔ ان تمام فروق کے مجدّد کو فی الجملہ اسی نوعیت کا کام کرنا ہوتا ہے جو نبی کے کام کی نوعیت ہے۔"

نظریۂ قابلیت کو اگر پیشِ نظر رکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ نبی اور مجدد دونوں ہی امرِ تکوینی سے کھڑے ہوتے ہیں اور نبی اور مجدد کے جن فرق کی طرف مودودی صاحب نے اس عبارت میں توجہ دلائی ہے، وہ محض آپ ہی کی قیاس آرائی ہے۔ ورنہ خود اُن کی اپنی تحقیقات میں بھی اس تفریق کی کوئی گنجائش نظر نہیں آتی۔ نبی کا دعویٰ یہی ہوگا نا کہ مَیں خدا کی طرف سے ہدایت کے لئے مامور ہؤا ہوں۔ اب اگر ہم نظریۂ قابلیت کی روشنی میں اس دعوے کو دیکھیں تو اس کا یہ دعویٰ بلا وجہ ہوگا۔ خدا نے اس کو کب مامور کیا ہے۔ اس کی ہدایت کے اصول تو خود اس کی فطرت کی گہرائیوں سے برآمد ہوئے ہیں۔ اس طرح تو نیوٹن بھی یہ دعویٰ کر سکتا تھا کہ میں خدا کی طرف سے لوگوں کو ریاضی سکھانے کے لئے مامور ہؤا ہوں۔ اس نظریہ کے مطابق نبی اور مجدد میں یہ فرق تو ہو سکتا ہے کہ نبی اپنی فطرت سے گوہرِ اصول نکالتا ہے، اور مجدد نبی ہی کی ہدایات کو پھیلا سکتا ہے، اپنی فطرت کی گہرائیوں سے کچھ بھی نہیں نکال سکتا۔ مگر یہ فرق کہ نبی دعویٰ کر سکتا ہے اور مجدد نہیں کر سکتا بالکل بے اصل اور غیر معقول نظر آتا ہے۔ دعوے کا تو سوال ہی نہیں۔ بلکہ پُوچھا جا سکتا ہے کہ نبی کو بھی دعویٰ کرنے کا کیا حق ہے؟ وہ بھی صرف یہ کہہ سکتا ہے کہ میری فطرت کا یہ یہ تقاضا ہے، مَیں تو اس اس کام کو صحیح سمجھتا ہوں۔ اس لئے اسے ضرور مان لو۔ نبی کا یہ کہنا کہ یہ خدا کا کلام ہے جو مَیں تمہیں سُناتا ہوں۔ ایسا دعویٰ ہے جس کی نظریۂ قابلیت کی روشنی میں کوئی حقیقت نہیں ہے۔ اور اس کا اپنے اصول کو منوانا نبوت نہیں بلکہ ہٹلری ہے۔ کیونکہ ہٹلر نے بھی اپنے اصول جرمن قوم میں پھیلانے کے لئے جرمنی کے لٹریچر کو بالکل تبدیل کر دیا تھا۔ باقی فرق جو نبی اور مجدد میں مودودی صاحب نے بیان فرمائے ہیں سب اسی اصول کی فروعات ہیں۔ یہ امر کہ ایسی خام خیالیاں اسلام کو سمجھنے کے لئے کہاں تک مدد دے سکتی ہیں، غور طلب ہے۔

امام ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ کا مذہب امرِ تکوینی اور امرِ تشریعی کی اصطلاحات جو مودودی صاحب نے استعمال کی ہیں سخت مغالطہ آمیز ہیں۔ ہم یہاں علامہ

ابن تمیمیہؒ کی کتاب "عبودیت" سے ایک اقتباس درج کرتے ہیں۔ جو ان اصطلاحات کے سمجھنے میں مدد دیگا۔ وھو ھذا:۔

"اکثر ایسے لوگ ہیں جو حقیقت کے متعلق کلام کرتے ہیں اور اس کی شہادت دیتے ہیں لیکن یہ حقیقت کونیہ ہے کہ اِس حقیقت کے اقرار اور اس کی شہادت اور معرفت میں مومن اور کافر متقی اور فاجر سب شامل ہیں۔ بلکہ شیطان بھی اور اہلِ نار بھی اِس حقیقت کا اعتراف کرتے ہیں۔ جیسا کہ شیطان نے کہا رَبِّ اَنْظِرْنِیْ اِلٰی یَوْمِ یُبْعَثُوْنَ الی آخرہ ...... اسی طرح کے اور بھی کئی خطاب ہیں جن میں شیطان نے اقرار کیا ہے کہ خدا تعالےٰ اس کا پروردگار اور خالق ہے بلکہ ہر ایک چیز کا خالق ہے ...... اور جو شخص حقیقتِ کونیہ پر ہی اڑ گیا، اور اُس حقیقتِ دینیہ پر قائم نہ ہوا جس کا اُسے حکم دیا گیا ہے اور جس حقیقت دینیہ سے مراد عبادتِ الٰہی اور اطاعتِ حکمِ خدا و حکم رسول ہے پس وہ شخص ابلیس کی جنس سے ہے، اور دوزخیوں کے گروہ سے "

یقیناً مودودی صاحب نے بھی امرِ تشریعی امرِ دینیہ ہی کے معنی میں استعمال کیا ہے۔ جو نظریہ ہم ان لوگوں کا نبوت کے متعلق پیش کر چکے ہیں اس سے ثابت ہوتا ہے کہ جو تفریق یہاں مودودی صاحب نے امرِ تکوینی اور امرِ تشریعی میں کی ہے وہ کچھ اصل نہیں رکھتی۔ نظریۂ قابلیت کے لحاظ سے نبی بھی امرِ تکوینی ہی سے کھڑا ہوتا ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ جناب نے یہ اصطلاحات یونہی بے سوچے سمجھے استعمال کر دی ہیں۔ وہ صرف یہ ثابت کرنا چاہتے تھے کہ نبی دعویٰ کرتا ہے اور اس کو نہ ماننے والا کافر ہوتا ہے، مگر مجدد دعویٰ نہیں کر سکتا اور اسکو نہ ماننے والا کافر نہیں ہوتا۔ آپ کے پاس اس نظریہ کو ثابت کرنے کے لئے تو کوئی مواد نہ تھا، نہ قرآن شریف میں اور نہ حدیث میں اس کی کوئی بنیاد تھی۔ سو آپ نے محض اس کمی کو پورا کرنے کے لئے یہ اصطلاحات استعمال کر ڈالیں تاکہ آپ کی فرضی تفریق میں دینی شان پیدا ہو جائے۔ آپ اپنے مقررہ فروق پہ بیشک قائم رہیں مگر

آپ کا ان اصطلاحات کی آڑ لینا اور ان میں اپنے من گھڑت "فروق" بھر دینا جو ان میں سما نہیں سکتے کسی طرح مناسب نہ تھا۔

اصطلاحِ مجدد کی بناء اسلام میں۔

اسلام میں مجدد کی اصطلاح کی بناء حدیث اِنَّ اللّٰہَ یَبْعَثُ لِھٰذِہِ الْاُمَّۃِ عَلٰی رَأْسِ کُلِّ مِائَۃِ سَنَۃٍ مَّنْ یُّجَدِّدُ لَھَا دِیْنَھَا پر ہے۔ اگر آپ اس حدیث کو صحیح اور قابلِ اتباع نہیں مانتے تو یہ اور بات ہے۔ اور اس صورت میں آپ کو یہ لفظ استعمال ہی نہیں کرنا چاہیئے تھا۔ کیونکہ یہ لفظ اسلام میں اسی حدیث کی بناء پر داخل ہوا ہے۔ اس کے سوا یہ لفظ کہیں بھی استعمال نہیں ہوا۔ محض لغوی اور عام معنی میں اس کو استعمال کرنے سے یہ مغالطہ پڑ جائیگا احتمال ہے کہ گویا آپ اس حدیث کی بناء پر نبی اور مجدد کے فروق بیان فرما رہے ہیں۔ حالانکہ یہ فروق جو آپ نے بیان کئے ہیں اس حدیث سے پیدا نہیں ہوتے۔ اس حدیث میں یہ باتیں قابلِ غور ہیں۔ (۱) اللہ تعالےٰ مجدد مبعوث کرے گا۔ (۲) ہر سو سال کے سر پر مبعوث ہوگا۔ (۳) وہ دین کی تجدید کے لئے مبعوث ہوگا۔ اس لئے جو مجدد اس حدیث کے مطابق آئیگا اس میں یہ تینوں شرطیں پائی جانی لازمی ہیں۔ بعثت کے معنی یہاں "امر تکوینی سے کھڑا ہونا" کرنا من گھڑت ہے اللہ تعالےٰ کی فاعلیت اور صدی کے سر کی شرط اس معنی کے مانع ہے۔ اگر آپ مجدد کو ان شرائطِ ثلاثہ سے مشروط نہیں مانتے۔ تو ظاہر ہے کہ آپ یہ لفظ اس حدیث کی بناء پر استعمال نہیں کرتے بلکہ محض لغوی معنوں میں استعمال کرتے ہیں۔ اس صورت میں بہتر یہ تھا کہ آپ کوئی اور لفظ استعمال کرتے۔ کیونکہ آپ کا تصورِ مجدد اس حدیث والے مجدد سے بالکل الگ ہے۔ اگر یہاں بعثت سے کھینچ تان کر تکوینی بعثت ہی مراد لیا جائے، تو بھی عَلٰی رَأْسِ کُلِّ مِائَۃِ سَنَۃٍ کی کوئی دور از قیاس تاویل کرنی پڑیگی جو ظاہری الفاظ سے ناممکن معلوم ہوتی ہے۔

مودودی صاحب کا تصورِ مہدیؑ

چونکہ مہدیؑ موعود بھی مجدد دین ہی کے زمرہ میں سے ہے اس لئے مجدد کی اس خود ساختہ تعریف

کو ہی اس پر چسپاں ہونا ضروری تھا۔ چنانچہ مہدی کے متعلق بھی آپ نے اپنا نظریہ پیش کرتے ہوئے اسی تعریف کو مدِ نظر رکھا ہے۔ پہلے ہم مودودی صاحب کے الفاظ میں امام موعود کا وہ نقشہ پیش کرتے ہیں جو آپ نے قدیم خیال کے مسلمانوں کی طرف منسوب کیا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:۔

"وہ سمجھتے ہیں کہ امام مہدی کوئی اگلے وقتوں کے مولویانہ وصوفیانہ وضع و قطع کے آدمی ہوں گے تسبیح ہاتھ میں لئے یکایک کسی مدرسے یا خانقاہ کے حجرے سے برآمد ہوں گے اور آتے ہی انا المہدی کا اعلان کریں گے۔ علماء اور مشائخ کتابیں لئے پہنچ جائیں گے اور لکھی ہوئی علامتوں سے اُن کے جسم کی ساخت وغیرہ کا مقابلہ کرکے انہیں شناخت کریں گے۔ پھر بیعت ہوگی اور اعلانِ جہاد کر دیا جائیگا۔ چلّے کھینچے ہوئے درویش اور سب پُرانے طرز کے "بقیۃ السلف" ان کے جھنڈے تلے جمع ہوں گے۔ تلوار تو محض شرط پوری کرنے کے لئے برائے نام چلانی پڑیگی۔ اصل میں سارا کام برکت اور روحانی تصرّف سے چلے گا۔ پھونکوں اور وظیفوں کے زور سے میدان جیتے جائیں گے۔ جس کافر پر نظر ماریں گے تڑپ کر بیہوش ہو جائیگا۔ اور محض بددعا کی تاثیر سے ٹینکوں اور ہوائی جہازوں میں کیڑے پڑ جائیں گے عقیدۂ ظہور مہدی کے متعلق عام لوگوں کے تصوّرات کچھ اسی قسم کے ہیں۔"

اس کے مقابلہ میں اپنا یہ تصوّر پیش کرتے ہیں:۔

"میں جو کچھ سمجھا ہوں اس سے مجھ کو معاملہ بالکل برعکس نظر آتا ہے میرا اندازہ یہ ہے کہ آنیوالا اپنے زمانے میں بالکل جدید ترین طرز کا لیڈر ہوگا۔ وقت کے تمام علومِ جدیدہ پر اس کو مجتہدانہ بصیرت حاصل ہوگی۔ زندگی کے سارے مسائل ہمہ کو وہ خوب سمجھتا ہوگا عقلی و ذہنی ریاست، سیاسی تدبر اور جنگی مہارت کے اعتبار سے وہ تمام دُنیا پر اپنا سکّہ جما دیگا اور اپنے عہد کے تمام جدیدوں سے بڑھکر جدید

ہوگا۔

مجھے اندیشہ ہے کہ اس کی جدتوں کے خلاف مولوی اور صوفی صاحبان ہی سب سے پہلے شورش بپا کریں گے۔ پھر مجھے یہ بھی امید نہیں کہ اپنی جسمانی ساخت میں وہ عام انسانوں سے کچھ بہت مختلف ہوگا کہ اس کی علامتوں سے اس کو تاڑ لیا جائے نہ میں یہ توقع رکھتا ہوں کہ وہ اپنے مہدی ہونے کا اعلان کرے گا۔ بلکہ شاید اُسے خود بھی اپنے مہدیٔ موعود ہونے کی خبر نہ ہوگی۔ اور اُس کی موت کے بعد اس کے کارناموں سے دُنیا کو معلوم ہوگا کہ یہی تھا وہ خلافت کو منہاج النبوت پر قائم کرنیوالا جس کی آمد کا مُژدہ سُنایا گیا تھا۔ جیسا کہ میں پہلے اشارہ کرچکا ہوں نبی کے سوا کسی کا یہ منصب ہی نہیں ہے کہ دعوے سے کام کا آغاز کرے، اور نہ نبی کے سوا کسی کو یقینی طور پر یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ کس خدمت پر مامور ہوا ہے۔ مہدویت دعویٰ کرنے کی چیز نہیں کرکے دکھا جانے کی چیز ہے۔ اس قسم کے دعوے جو لوگ کرتے ہیں، اور جو اُن پر ایمان لاتے ہیں، میرے نزدیک دونوں اپنے علم کی کمی اور اپنے ذہن کی پستی کا ثبوت دیتے ہیں۔

مہدی کے کام کی نوعیت کا جو تصور میرے ذہن میں ہے، وہ بھی اُن حضرات کے تصور سے بالکل مختلف ہے۔ مجھے اس کے کام میں کرامات و خوارق، کشوف و الہامات اور چلوں اور مجاہدوں کی کوئی جگہ نظر نہیں آتی۔ میں یہ سمجھتا ہوں کہ ایک انقلابی لیڈر کو دُنیا میں جس طرح شدید جدّوجہد اور کشمکش کے مرحلوں سے گذرنا پڑتا ہے، انہی مرحلوں سے مہدی کو بھی گذرنا ہوگا۔ وہ خالص اسلام کی بُنیادوں پر ایک نیا مذہب فکر (School of Thought) پیدا کریگا۔ ذہنیتوں کو بدلے گا۔ زبردست تحریک اُٹھائے گا، جو بیک وقت تہذیبی بھی ہوگی، اور سیاسی بھی۔ جاہلیت اپنی تمام طاقتوں کے ساتھ اُس کو کُچلنے کی کوشش کریگی،

مگر آخر وہ جاہلی اقتدار کو الٹ کر پھینک دیگا۔ وہ ایک ایسا زبردست اسلامی اسٹیٹ قائم کریگا جس میں ایک طرف اسلام کی پوری روح کارفرما ہوگی، اور دوسری طرف سائنٹفک ترقی اوج کمال پر پہنچ جائے گی جیسا کہ حدیث میں ارشاد ہوا ہے "اس کی حکومت سے آسمان والے بھی راضی ہوں گے اور زمین والے بھی، آسمان دل کھول کر اپنی برکتوں کی بارش کریگا اور زمین اپنے پیٹ کے سارے خزانے اگل دیگی۔"

اگر یہ توقع صحیح ہے کہ ایک وقت میں اسلام تمام دنیا کے افکار، تمدن اور سیاست پر چھا جانے والا ہے تو ایسے ایک عظیم الشان لیڈر کی پیدائش بھی یقینی ہے جس کی ہمہ گیر و پرزور قیادت میں یہ انقلاب رونما ہوگا۔ جن لوگوں کو ایسے لیڈر کے ظہور کا خیال سنکر حیرت ہوتی ہے مجھے ان کی عقل پر حیرت ہوتی ہے۔ جب خدا کی اس خدائی میں لینن اور ہٹلر جیسے ائمہ ضلالت کا ظہور ہو سکتا ہے تو آخر ایک امام ہدایت ہی کا ظہور کیوں مستبعد ہو" (تجدید و احیائے دین صفحہ ۲۲،۳۱، ۳۳)

یہ تصور ہے مودودی صاحب کا اس الامام المہدی کے متعلق جس کے بارہ میں آپ نے اسی کتاب کے صفحہ ۳۳ میں یہ اعلان فرمایا ہے:۔

"مجدد کامل کا مقام ابھی خالی ہے۔ مگر عقل چاہتی ہے، فطرت مطالبہ کرتی ہے اور دنیا کے حالات کی رفتار متقاضی ہے کہ ایسا "لیڈر" پیدا ہو، خواہ اس دور میں پیدا ہو، یا زمانے کی ہزار گردشوں کے بعد پیدا ہو۔ اسی کا نام الامام المہدی ہے جس کے بارے میں صاف پیشگوئیاں نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کے کلام میں موجود ہیں۔"

قدیم و جدید تصور مہدی میں فرق

ان اقتباسات پر غور کرنے سے معلوم ہوگا کہ جو تصور امام مہدی کا مودودی صاحب نے اٹھایا

ہے، وہ اصولاً وہی یا اسی قسم کا تصور ہے جو دیگر علماء و صوفیاء کا ہے۔ صرف فرق ہے تو یہ ہے کہ چونکہ اب نئے زمانے میں اسلحۂ جنگ تبدیل ہو گئے ہیں، اس لئے یہ نئے فیشن کا مہدی بھی جب آئے گا تو نئے قسم کے اسلحہ سے کام لے گا، اور اسلامی اسٹیٹ قائم کر دیگا۔ رہے گا وہی خونی کا خونی۔ چونکہ نبوت سے لے کر مجددیت تک یہ لوگ نظریۂ قابلیت ہی کے حامی ہیں، اس لئے حیرت ہے کہ یہ لوگ آمد مہدی کے کس طرح قائل ہو گئے۔ کیوں ان لوگوں نے بھی سرے سے آمد مہدی کا انکار نہیں کیا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان لوگوں کو نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کی پیشینگوئیوں سے کچھ بھی واسطہ نہیں۔ سیاست ان کے سروں میں گونج رہی ہے۔ اور تصورِ مہدی بھی ایک سیاسی چال سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا۔ اسلام کو محض سیاسی مقاصد کے حصول کا ایک ذریعہ سمجھ لیا گیا ہے۔ اور اُن کے نزدیک حکومتِ الہیہ بھی "پان اسلامزم" "مغربی دُنیا" اور "پاکستان" ہی کی قسم کی ایک چیز ہے۔ ورنہ خدا کے فرستادے اور پیشینگوئیوں سے آنے والے نہ کبھی پہلے اس طرح آئے ہیں اور نہ آئندہ آئیں گے۔ ان لوگوں کو تو سیاسی اقتدار چاہیئے۔ سکھ، ہندو، بُدھ، عیسائی سب ان کے محکوم ہوں۔ دوسری اقوام اسلام قبول کریں یا نہ کریں اس سے ان کو غرض نہیں۔ خدا کا دین پھیلے یا نہ پھیلے، مگر دُنیا کی سیاست کی باگ ڈور اُن کے ہاتھ میں ہو۔ جب تک ایسا امام نہ آئے جو فوراً مسلمانوں کو حکمران بنا دے یہ لوگ کسی کو اپنا امام تسلیم کرنے کو تیار نہیں۔ بلکہ یہ تو اپنے مزعومہ اصل امام مہدی پر بھی جو یہ سب کچھ ان کے لئے کریگا ایمان لانا پسند نہیں کریں گے۔ یہ تو کیا وہ اس کو مہدی کے دعوے کی بھی اجازت نہیں دیں گے۔ کیونکہ اگر بھولے سے اس بیچارے نے ایسا کر دیا تو جھٹ اس پر اور اس کے ماننے والوں پر لیست خیالی کا فتویٰ جو پہلے ہی گھڑ کر رکھ لیا گیا ہے چسپاں کر دیا جائے گا۔ اب بھلا امام صاحب کا نعوذ باللہ سر پھرا ہے کہ وہ اعلان کریں کہ مَیں وہی ہوں جس کے بارے میں نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام نے عظیم الشان پیشینگوئیاں کی ہوئی ہیں۔ تعجب ہے کہ امام مہدی ہو تو اتنا زبردست کہ عدیم المثال مذہب فکر اُٹھائے۔ سائنٹفک ایجادات کا

ماہر اجل ہو۔ اور بے نظیر اسلامک اسٹیٹ برپا کر کے مسلمانوں کے حوالے کر دے۔ مگر مرتے دم تک اپنی ذات سے واقف نہ ہو۔ اور اگر خدانخواستہ واقف ہو تو دم در کشم کا سا معاملہ ہو ع گھٹ کے مر جاؤں یہ مرضی مرے صیاد کی ہے۔ کیونکہ اگر اُس نے اشارۃً بھی کسی سے اپنی مہدویت کا ذکر کیا تو اس کی تمام خدمات خاک میں مل جائیں گی اور "کامل مجددیت" کے تخت سے اُس کو بُرا ہو کر اُترنا پڑے گا۔ ہاں اس کی تمام جانفشانی کا صلہ مسلمانوں کیطرف سے اُس کو اگر ملے گا تو یہ ملے گا کہ جب وہ فوت ہو جائے تو لوگ پکار اُٹھیں "یہ تھا منہاج نبوت پر آنیوالا جس کا مژدہ دیا گیا تھا"۔ حیرانی ہے کہ دعویٰ کرنا ایسا بُرا کیوں ہے، جو مجددِ کامل کو فوراً پست خیال بنا دیتا ہے۔ کیا محض اس لئے کہ جو فرضی تقسیم ان لوگوں کے دماغوں میں گھڑی گئی ہے کہ نبی دعویٰ کرتا ہے اور مجدد نہیں کر سکتا اس کا وہ پابند نہیں ہے۔ اور ان کے خود ساختہ تکوینی نظریہ کو نظر انداز کر دیتا ہے۔

حقیقت یہی ہے کہ پرانے خونی مہدی اور اس سیاسی مہدی کے تصورات میں صرف اتنا ہی فرق ہے کہ اول الذکر دعویٰ کرے گا، اور وہ خدا کا فرستادہ ہوگا، اور امر تشریعی سے کھڑا ہوگا۔ مگر یہ جدید قسم کا مہدی دعویٰ نہیں کرے گا۔ اس کی تخلیق اُسی طرح ہوگی جس طرح ائمہ ضلالت کی۔ ورنہ دونوں کے کام میں اصولاً کوئی فرق نہیں ہوگا۔ دونوں کی آمد کی غرض واحد ہے یعنی مسلمانوں کو سلطنت دلانا۔ باقی اصلاحات سے اس کا تعلق محض ثانوی حیثیت رکھے گا۔ جب تک وہ نئی قسم کے بم، نئی قسم کے ہوائی جہاز، نئی قسم کا سامانِ حرب و ضرب فراہم کر کے اسلامک اسٹیٹ برپا نہ کرلے اس کو امام مہدی کہنا واجب نہ ہوگا۔ ورنہ اس کو ماننے والے صرف پست خیال لوگ ہوں گے۔

اگر امام مہدی کا قدیم تصور مضحکہ خیز ہے تو مودودی صاحب کا جدید تصور بھی کچھ کم مضحکہ خیز نہیں۔ صاف معلوم ہوتا ہے کہ آپ محض ضد کی بنا پر اپنا تصور پیش کر رہے ہیں۔ ورنہ تحقیقات سے آپ کو کوئی واسطہ نہیں۔ چونکہ قدیم طرز خیال کے صوفیاء اور علماء کا تصور ایسا

ہے۔ اس لئے ہونا ہوا صل امام موعود اسباب کے لحاظ سے بالکل اس سے متضاد واقع ہونا چاہیئے۔ آپ نے کوئی دلیل نہیں دی کہ کیوں آپکا تصور درست ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ جس طرح پہلا تصور وہم ہی وہم ہے اسی طرح آپکا تصور بھی وہم ہی وہم ہے۔ دونوں تصور اسلام اور حقیقت سے کوسوں دور ہیں۔ پرانا مہدی اگر حجروں اور خانقاہوں کا پروردۂ توہم ہے تو نیا مہدی مادہ پرست عقلائے دہر کا زادہ امانی۔ پرانا مہدی جہاں بنتا ہے اس دنیا میں گنڈے، تعویذ، عملیات اور تیغ وسنان کا تذکرہ ہے اور جہاں نیا مہدی گھڑا جاتا ہے وہاں آئن سٹائن کے نظریات۔ نٹشے کی تعلیاں۔ لینن اور ہٹلر کی تشددی سیاست کی چہ میگوئیاں ہیں۔

اسلام کیسی بادشاہت قائم کرتا ہے۔

بے شک اسلام کا مقصد دنیا میں خدا کی بادشاہت قائم کرتا ہے۔ مگر یہ بادشاہت انسان کی تمام زندگی پر حاوی ہے۔ اسلام زندگی کے ہر پہلو کے لئے بہترین لائحۂ عمل پیش کر کے اس پر عمل کرانا چاہتا ہے۔ اس میں سیاست اور ملکی انتظام بھی شامل ہے۔ وہ انفرادی اور اجتماعی دونوں قسم کی زندگیوں کو لیتا ہے۔ وہ کسی بھی پہلو کو نظر انداز نہیں کرتا۔ وہ یہ نہیں کہتا کہ دنیا سے الگ تھلگ ہو کر روح کی صفائی میں مصروف ہو جاؤ اور کسی سے کچھ تعلق نہ رکھو۔ جب انسان دنیا میں آتا ہے تو اس کے گرد تعلقات اور تعلق کا ایک جم غفیر جمع ہو جاتا ہے۔ وہ کسی کا بیٹا اور کسی کا بھائی ہوتا ہے کسی کا باپ تو کسی کا خاوند ہو جاتا ہے۔ سب سے پہلے اس کے اپنے نفس کے حقوق ہوتے ہیں، پھر خاندان کے جس میں وہ پیدا ہوتا ہے اس کے حقوق، پھر اسکی بستی کے حقوق اور پھر وطن کے حقوق اس سے بڑھ کر تمام انسانی آبادی کے حقوق و فرائض، پھر تمام مخلوقات کے حقوق اور سب سے بڑھ کر اللہ تعالیٰ کے حقوق۔ اگر آقا ہے تو اپنے نوکروں کے متعلق اس کے فرائض ہیں اور اگر نوکر ہے تو اپنے آقا کے فرائض اس کے ذمہ ہیں۔ وہ مادر پدر آزاد ہو کر ایک لمحہ بھی اس دنیا میں سانس نہیں

لے سکتا۔ اسلام ان تمام شعبوں میں اس کی رہنمائی کرتا ہے۔ اس کے ہر کام پر خواہ وہ پبلک کام ہو یا پرائیویٹ نگرانی کرتا ہے۔ الغرض اسلام کا کام ہے کہ اس کو جمادات سے نکال کر حیوانیت میں داخل کرے پھر حیوانیت سے نکال کر اس کو انسان، انسان کو با اخلاق انسان، اور با اخلاق انسان سے ابھار کر باخدا انسان بنائے۔ بیشک اسلام انسانوں میں خدائی بادشاہت قائم کرنیکا نام ہے۔ مگر جو سیاسی نظریہ یہ لوگ امام مہدی کا پیش کرتے ہیں وہ اس کو ائمہ ضلالت کی طرح کا بڑا سیاسی لیڈر ہی بناتا ہے۔ پیشگوئیوں میں جس موعود کی نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام نے خوشخبری دی ہے، وہ خدا کی بادشاہت کے قیام کا کام انسان کے نفس سے شروع کریگا۔ وہ پہلے اس نقطہ مرکزی کو منور کریگا جس سے شعاعیں اٹھ اٹھ کر اس کے تمام ماحول کو نور سے بھر دینگی۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو فوجوں کی ضرورت نہ تھی، بلکہ نمرود کو ان پر ناز تھا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے پاس ساز و سامان نہ تھا، بلکہ فرعون کے پاس تھا۔ حضرت محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کو تلواریں اور نیزے اور برچھیاں دیکر نہیں بھیجا گیا تھا، بلکہ یہ چیزیں تو ابوجہل اور اس کے ساتھیوں کے ہاتھوں میں تھیں۔ الغرض کسی خدا کے بندے نے نہ تو اسلحہ خانے بنائے ہیں اور نہ مذاہب فکر اور سائینٹفک تحقیقات کے ادارے پہلے قائم کئے ہیں، اور نہ ان اشیاء پر بھروسہ کرکے وہ اعلائے کلمۃ الحق کے لئے کھڑے ہوئے ہیں۔

احساس کمتری اگر امام مہدی کا پہلا تصور حجرہ نشین صوفیاء اور خشک ملاؤں کی بے عملی کا نتیجہ ہے، تو اس کا نیا تصور احساسِ کمتری کی تخلیق ہے خلافتِ راشدہ کی شہادت کے بعد ایک طرف تو بے دست و پا علماء و صوفیاء تحت الثریٰ کی جانب روانہ ہوگئے، اور دوسری طرف بادشاہ سلطنت کے فلک الافلاک پر جا بیٹھے۔ ایک طرف تو بقول جناب مودودی صاحب "فکر و نظر مفلوج۔ قوتِ تنقید ماؤف اور علم و عقل کا استعمال موقوف" ہو گیا، اور دوسری طرف مغرب کے سیاسی اقتدار نے ایسا چندھیا دیا

کہ اللہ اور اُس کے رسولؐ کے صریح احکام سے آنکھیں بند کر کے زندگی کے مغربی نظریات دل لُبھا کر لے گئے۔ عیسائی رہبانیت نے گذشتہ صدیوں میں جس ردِ عمل کی پرورش دہریت کی صورت میں کی تھی اور جس میں "الحکم للہ" کی بجائے "الحکم للنفس" کی پریاں رقص کرنے لگی تھیں، اسی کو اسلام کا بھی نصب العین بنا لیا گیا۔ چنانچہ مودودی صاحب حضرت سید احمدؒ بریلوی علیہ الرحمۃ کی تحریک کی ناکامی کے اسباب بتاتے ہوئے تیسرا سبب یہ بیان فرماتے ہیں :-

"سید صاحب اور شاہ اسمٰعیل شہید جو عملاً اسلامی انقلاب برپا کرنے کے لئے اُٹھے تھے، انہوں نے سارے انتظامات کئے، مگر اتنا نہ کیا، کہ اہل نظر علماء کا ایک وفد یورپ بھیجتے، اور یہ تحقیق کراتے کہ یہ قوم جو طوفان کی طرح چھائی چلی جارہی ہے، اور نئے آلات، نئے وسائل، نئے طریقوں اور نئے علوم و فنون سے کام لے رہی ہے اس کی اتنی قوت اور اتنی ترقی کا راز کیا ہے۔ اس کے گھر میں کس نوعیت کے ادارات قائم ہیں۔ اس کے علوم کس قسم کے ہیں۔ اس کے تمدن کی اساس کن چیزوں پر ہے۔ اور اس کے مقابلہ میں ہمارے پاس کس چیز کی کمی ہے۔"

ہم یہ نہیں کہتے، کہ یورپ میں جو عام احیاء اور بیداری پیدا ہو چکی تھی، اسکو انگریزوں کی ہندوستان میں کامیابی کے ساتھ کوئی تعلق نہیں ہے۔ مگر فرض کریں کہ سید صاحبؒ ایسا وفد یورپ میں بھیجکر ان اُصول کی تحقیقات کرا بھی لیتے، تو سوال یہ ہے کہ اس کا نتیجہ کیا ہوتا؟ آج ہم دیکھ رہے ہیں، کہ وہ طاقتیں جو یورپ میں برسر اقتدار ہیں، اُن کی بنیاد نسل و وطن کی تفریق اور کمزور قوموں کی لُوٹ پر ہے۔ اور جو عوامل آج کام کر رہے ہیں ان کا آغاز حضرت سید علیہ الرحمۃ سے پہلے ہی یورپ میں ہو چکا تھا۔ ڈچ، فرانسیسی، ہسپانوی، پرتگالی اور انگریز بطور تاجروں کے ہندوستان اور مشرق میں داخل ہوئے۔ شروع شروع میں انکا مدعا ملک گیری نہ تھا، بلکہ اپنی اپنی تجارت کو فروغ دینا تھا۔ وہ سب ایک دوسرے کے حریف

تھے۔ بیشک اُن کے ساتھ پادری بھی آ گئے تھے۔ مگر اُن کی اصلی غرض مال و دولت جمع کرنا ہی تھی۔ جو خیالات اُس وقت یورپ میں چھا رہے تھے سب کا نقطۂ مرکزی دُنیاوی تھا۔ اُس وقت اگر علماء کا وفد یورپ میں جاتا بھی تو سوائے اس کے کہ وہ انہی خیالات کو لیکر ہندوستان واپس آتا اور زیادہ کیا کر سکتا تھا؟ یہ کام تو انگریزوں کی آمد کے ساتھ ہی ہندوستان میں بھی خود بخود شروع ہو گیا تھا۔ سید صاحبؒ کی تحریک کے عین بعد ہی سر سید صاحب کی تحریک اُٹھ کھڑی ہوئی تھی۔ اور اب تو یورپ تمام کا تمام عُریاں ہو کر ہماری نظروں کے سامنے آ گیا ہے۔ یورپ کے تمام خیالات ہم نے اپنا لئے ہیں۔ وہی رنگ وہی ڈھنگ یہاں بھی کارفرما ہیں نسل و وطن کے جادوگر وہی تماشے یہاں بھی دکھلا رہے ہیں۔ یہاں بھی مشینری کا جال اسی طرح پھیل گیا ہے۔ سیاسی چالوں کی نبض بھی اسی انداز سے جنبش کرنے لگی ہے۔ مگر ان تمام ترقیات نے اسلام کو کیا فائدہ پہنچایا ہے۔ سوائے اس کے کہ انہوں نے مسلمانوں کے بڑے بڑے زعماء کا بھی مطمح نظر تکوینی بنا دیا ہے۔ محال تھا کہ اس وفد کے علماء کا بھی یہی حال نہ ہوتا جو سر سید، علامہ اقبال اور مودودی صاحب کا ہوا ہے۔

مغربی شاہراہوں کی منزل

ان مغربی شاہراہوں پر چل کر ہم زیادہ سے زیادہ اسی منزل پر پہنچ سکتے ہیں جس پر یورپ، امریکہ، جاپان وغیرہ ممالک پہنچے ہیں۔ فرض کیجئے کہ دُنیائے اسلام بھی وہی تمام مادی نعماء آج حاصل کر لیتی ہے، جن سے یہ ممالک متمتع ہو رہے ہیں، اور تمام سائینٹفک ایجادات فلسفہ۔ ادب۔ معاشیات فوجی نظام وغیرہ میں وہی یدطُولیٰ مسلمانوں کو بھی حاصل ہو جاتا ہے، بلکہ وہ اِس سے بھی بڑھکر ترقی کر جاتے ہیں، تو کیا یہ ضروری ہے کہ اسلام بھی ساتھ ساتھ ترقی کرے گا؟ خود ان ممالک ہی کو دیکھئے کہ اِس روشنی نے ان کو کہاں پہنچا دیا ہے۔ اِس کے لئے ہم مودودی صاحب کے آرگن "ترجمان القرآن" کے حوالے سے ایک مغربی مبصر کا قول درج کرتے ہیں۔ پروفیسر جوڈ اپنی کتاب "رہنمائے شیطنت جدیدہ" کے صفحات ۳۶۱-۳۶۲ میں رقمطراز ہیں:-

"ہماری حیرت انگیز صنعتی فتوحات اور ہمارے شرمناک اخلاقی بچپن کے درمیان جو تفاوت ہے اس سے ہمارا ہر موڑ پر سابقہ پڑتا ہے۔ ایک طرف ہماری صنعتی ترقیوں کا حال یہ ہے کہ ہم بیٹھے بیٹھے سمندر پار سے اور ایک براعظم سے دوسرے براعظم کے لوگوں سے بے تکلف باتیں کرسکتے ہیں۔ سمندر کے اُوپر اور زمین کے نیچے دوڑتے ہیں۔ ریڈیو کے ذریعہ سیلون میں گھر بیٹھے لندن کے بڑے گھنٹہ (Big Ben) کی آواز سُنا کرتے ہیں۔ بچے ٹیلیفون کے ذریعہ ایک دوسرے سے باتیں کرتے ہیں۔ برقی تصویریں آنے لگیں۔ بے آواز کے ٹائپ رائٹر چل گئے۔ بغیر کسی درد و تکلیف کے دانت بھرے جاسکتے ہیں کھیتیاں بجلی سے بکائی جاسکتی ہیں۔ ربڑ کی سڑکیں بنتی ہیں۔ ایکس رے کے ذریعہ ہم اپنے جسم کے اندر جھانک کے دیکھ سکتے ہیں تصویریں بولتی اور گاتی ہیں۔ لاسلکی کے ذریعہ مجرموں اور قاتلوں کا پتہ چلایا جاتا ہے۔ برقی موجوں سے بالوں میں پیچ و خم پیدا کیا جاتا ہے آبدوز کشتیاں قطبِ شمالی تک اور ہوائی جہاز قطب جنوبی تک اُڑ کر جاتے ہیں۔ لیکن ان سب کے با وجود ہم سے اتنا نہیں ہو سکتا کہ ہم اپنے بڑے بڑے شہروں میں کوئی ایسا میدان بنا دیں جس میں غریبوں کے بچے آرام اور حفاظت کیساتھ کھیلیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ سالانہ دو ہزار بچوں کی جانیں ضائع ہوتی ہیں، اور نوے ہزار زخمی ہوتے ہیں۔ ایک مرتبہ میں ایک ہندوستانی فلسفی سے اپنے تمدن کے عجائبات کی تعریف کر رہا تھا۔ اسی زمانے میں ایک موٹر چلانیوالے نے (Pandins Dands) پر تین سو یا چار سو میل کی مسافت، مجھے یاد نہیں، بیس یا پچاس گھنٹے میں طے کی تھی۔ جب میں کہہ چکا تو ہندوستانی فلسفی نے کہا، ہاں یہ صحیح ہے کہ تم ہوا میں چڑیوں کی طرح اُڑتے اور پانی میں مچھلیوں کی طرح تیرتے ہو، لیکن ابھی تک تم کو زمین پر انسانوں کی طرح چلنا نہیں آیا۔"

اگر ہم اِس اقتباس کی بناء پر یہ کہیں کہ مہدیٔ موعود کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہوگا کہ دنیا کے لوگوں کو زمین پر انسانوں کی طرح چلنا سکھائے گا تو اس میں ذرا بھی مبالغہ نہیں ہے۔ یہ تو ایک گھر کے بھیدی کی رائے ہے، خود مشرقی نقادوں نے مغرب کی موجودہ چندھیا دینے والی تہذیب کے کیا کیا پرخچے نہیں اُڑائے :۔ علامہ اقبال کی شاعری کا بیشتر حصہ اسی موضوع پر ہے۔ اور ہم اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں کہ سائنسی ترقی نے کیا حشر بپا کر رکھا ہے۔

سائنسی ایجادات اور تجدیدِ دین

پھر اگر مودودی صاحب نے تاریخ پر غور کیا ہوتا، تو انہیں معلوم ہوتا کہ یورپ نے ان شاہراہوں پر چلنا پہلے کس سے سیکھا تھا جن یورپین علماء کے مودودی صاحب نے نام گنوائے ہیں وہ کس طرح یورپ میں پیدا ہوگئے تھے۔ صرف علامہ ابن خلدون کا مقدمہ ہی پڑھا ہوتا تو آپکو معلوم ہوجاتا کہ کئی مغربی سوشل علوم کا سنگِ بنیاد کن ہاتھوں نے رکھا تھا۔ وہ مادی ساز وسامان جن پر آج یورپ کو ناز ہے کس طرح یورپ میں پیدا ہوئے۔ عملی سائنس اور ایجادات کے پیشوا کون لوگ تھے۔ پریس کا استعمال پہلے کس نے کیا۔ دُوربین کب ایجاد ہوئی۔ اور کئی مفید ایجادیں جنکا تذکرہ ایک دفتر چاہتا ہے کس نے یورپ میں پھیلائیں۔ مگر سوال تو یہ ہے کہ تجدیدِ دین کے ساتھ ان باتوں کو کیا تعلق ہے؟ اور سید صاحبؒ اور شاہ صاحبؒ نے علماء کا وفد یورپ بھجوا کر تحقیقات نہ کروا کر اسلام کو کیا نقصان پہنچایا؟ اور اگر وہ ایسا کرتے اور یورپ کے علوم کو مشرق میں رواج دینے میں کامیاب بھی ہوجاتے تو اسلام کے نقطۂ مرکزی کو اس سے کیا فائدہ پہنچتا۔ یہ محض خیال آرائیاں ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ان لوگوں کی آنکھوں کو یورپ کی موجودہ مادی ترقی نے چندھیا دیا ہے۔ اور جو رنگین عینک تہذیبِ حاضرہ نے انکو چڑھا دی ہے اسلام کو بھی اسی رنگ سے دیکھ رہے ہیں۔ وہ چاہتے ہیں کہ موجودہ مسلمان بھی کسی معجزہ سے ویسے ہی ترقی یافتہ ہوجائیں جیسے اِس وقت مغرب ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آپ کے تصورِ مہدی میں وہی اجزا

ہیں جن اجزاء سے یورپ کا ڈھانچہ تیار ہوا ہے۔ اس لئے الامام المہدی وہی ہوگا جو اسی قسم کی ترقیوں پر مسلمانوں کو فائز کردے، اور تمام دُنیا کی باگ ڈور اُن کو سپرد کرکے اس نعرۂ تحسین کے ساتھ دفن ہو، یہ تھا منہاج نبوت پر آنیوالا جس کا مژدہ دیا گیا تھا۔"

یہاں ہم یہ بات بھی واضح کردینا چاہتے ہیں کہ اس کلام سے ہمارا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ مسلمان یہ ترقیاں نہ کریں، یا یہ اُن کے لئے مفید نہیں ہیں۔ بیشک وہ سب کچھ کریں اس پر کوئی اعتراض نہیں ہونا چاہیئے۔ بلکہ یہ ترقیاں دُنیاوی نقطۂ نگاہ سے ضروری ہیں۔ مگر ایسی ترقیوں کے لئے پیشگوئیوں والے امام نہیں آیا کرتے۔ یورپ میں کون الامام المہدی آیا تھا جس نے یہ مذاہب فکر اُن کے لئے اُٹھائے اور یہ سائنسی ترقیاں کردیں۔ اِن ترقیوں کے لئے قدرت کے اٹل قوانین ہیں۔ جو لوگ خواہ وہ کسی مذہب اور کسی مُلک کے ہوں ان قوانین سے فائدہ اُٹھانیکی کوشش کرینگے ضرور کامیابی حاصل کرلیں گے۔ کوئی چیز ان کے سدِّراہ نہیں ہے۔ ہندو، مسلمان، سکھ، عیسائی، بدھ سب اپنا اپنا شوق پُورا کرسکتے ہیں۔ اپنے اپنے زمانے اور بساط کے مطابق آغاز آفرینش سے قومیں ایسی ترقیاں کرتی رہی ہیں اور کرتی رہیں گی۔ مگر قرآن کریم کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ جو اقوام اِنہی ترقیوں کو اپنا اوڑھنا، بچھونا اور زندگی کا مقصد بنا لیتی ہیں آخروہی اسلام کے راستہ میں حائل ہوتی ہیں۔ قوم عاد اور قوم ثمود کو جن ترقیوں نے سرشار کیا تھا آج یورپ بھی انہی سے سرشار ہے۔ کیا "الامام المہدی" بھی اسی قسم کا میکدہ کھولے گا؟ مگر ؎

نشہ پلا کے گرانا تو سب کو آتا ہے
مزہ تو جب ہے کہ گرتوں کو تھام لے ساقی

پس چہ باید کرد

واقعی اِس وقت تمام اسلامی دُنیا پر ادبار و زوال کا اندھیرا چھایا ہوا ہے۔ مراقش سے لیکر چین تک انسانوں کا ایک سمندر ہے جس میں کوئی موج نہیں اُٹھتی کوئی حرکت پیدا نہیں ہوتی۔ مغرب نے ایک خوفناک اژدہا کی طرح تمام

مشرقی عالم کو اپنے حلقۂ آغوش میں کھینچ لیا ہوا ہے، اور پستی اِس حد تک پہنچ چکی ہوئی ہے کہ اس سے اُبھرنا ناممکن معلوم ہوتا ہے۔ دُنیا کے تمام مال و متاع ، زمین کے تمام خزانے عقل و خرد کے تمام نعماء مغربی اقوام کے ہاتھ میں ہیں۔ اور مشرق اس کے سامنے بالکل بے دست و پا ہوگیا ہے۔ یورپ اُن سے جو چاہتا ہے سلوک کرتا ہے اور جس طرح چاہتا ہے اُنہیں اپنی انگلیوں پر نچاتا ہے۔ ہر پہلو سے وہ مشرق سے ہزاروں سال آگے نکل گیا ہے۔ خواہ مخواہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ؏

پس چہ باید کرد اے اقوامِ شرق

کیا ہم ایک ایسے امام کا انتظار کریں جو کوہ ہمالیہ کی کسی خفیہ وادی میں تجربہ گاہ بنا کر نئی نئی طرز کے اسلحۂ جنگ تیار کر کے یکدم مغرب پر ٹوٹ پڑیگا، اور امریکہ، رُوس اور انگلستان کو انہی کے ہتھیاروں سے شکست دیکر تمام دُنیا پر اسلام ہی اسلام پھیلا دیگا یا کچھ اور کرنا چاہیئے؟ آخر کوئی ممکن طریقہ آپ ہی سوچیں۔ اگر آپ دُنیاوی فوقیت ہی چاہتے ہیں تو آؤ اسلامی تاریخ ہی کی ورق گردانی کر کے دیکھیں کہ پہلے بھی کبھی چھوٹے بڑے پیمانے پر مسلمانوں پر ایسی حالت آئی ہو؟ اگر کبھی آئی ہے تو انہوں نے کیا کیا تھا؟

الامام المہدی کا کام

جب تاتاریوں نے اسلامی حکومت کو مٹا دیا تھا ، تو اُس وقت علماء حق نے اپنی تلواریں میان میں کرلیں، اور قرآن مجید کو دونوں ہتھیلیوں پر رکھ کر تاتاری لشکر میں گھس گئے، اور اس وقت تک دم نہ لیا جب تک فاتح کو مفتوح نہ کرلیا۔ یہ ایک ترکیب تھی جو اُن لوگوں نے استعمال کی، جن کے دلوں میں اسلام کی کوئی چنگاری باقی تھی۔ کیا آپ کے دل میں بھی اسلام کی کوئی چنگاری باقی ہے؟ اگر نہیں تو پھر یقیناً یہ کام الامام المہدی کا ہے۔ جو از سرِ نو قرآن کے بجلی گھر سے دلوں کے تار جوڑ دیگا۔ اور بجھے ہوئے دلوں میں بھی خدا کے بلب روشن کر دیگا جس کی شعاع سے مغربی تہذیب کے طلسمات بھی جگمگانے لگیں گے۔ ہاں وہی الامام المہدی جو مولانا عبداللہ العمادی ایڈیٹر "وکیل" کے الفاظ "وہ شخص، بہت بڑا شخص جس کا قلم سحر تھا اور زبان جادو۔

وہ شخص جو دماغی عجائبات کا مجسمہ تھا۔ جس کی نظر فتنہ اور آواز حشر تھی۔ جس کی انگلیوں سے انقلاب کے تار اُلجھے ہوئے تھے اور جس کی دو مٹھیاں بجلی کی دو بیٹریاں تھیں" کا مصداق ہوگا۔ جس کی جماعت کے متعلق ڈاکٹر اقبال بھی یوں معترف ہوئے:۔

"میری رائے میں قومی سیرت کا وہ اسلوب جس کا سایہ عالمگیر ذات نے ڈالا ہے ٹھیٹھ اسلامی سیرت کا نمونہ ہے اور ہماری تعلیم کا مقصد ہونا چاہیئے کہ اس نمونہ کو ترقی دی جائے اور مسلمان ہر وقت اسے پیشِ نظر رکھیں۔۔۔۔ پنجاب میں اسلامی سیرت کا ٹھیٹھ نمونہ اس جماعت کی صورت میں ظاہر ہوا جسے فرقہ قادیانی کہتے ہیں۔"

اور مصری اخبار" الفتح" یوں رقمطراز ہوا:۔

"مَیں نے بغور دیکھا تو قادیانیوں کی تحریک حیرت انگیز پائی۔ انہوں نے بذریعہ تقریر و تحریر مختلف زبانوں میں اپنی آواز بلند کی ہے اور مشرق و مغرب کے مختلف ممالک و اقوام میں بصرفِ کثیر اپنے دعوے کو تقویت پہنچائی ہے۔ ان لوگوں نے اپنی انجمنیں منظم کرکے زبردست حملہ کیا ہے۔ یہاں تک کہ ان کا معاملہ بہت بڑھ گیا ہے۔ ورا ایشیا، یورپ، امریکہ اور افریقہ میں اُن کے ایسے تبلیغی مراکز قائم ہوگئے ہیں جو علم و عمل کے لحاظ سے تو عیسائیوں کی انجمنوں کے برابر ہیں، لیکن تاثیرات اور کامیابی میں عیسائی پادریوں کو اُن سے کوئی نسبت نہیں۔ قادیانی بہت بڑھ چڑھ کر کامیاب ہیں۔ کیونکہ اُن کے پاس اسلام کی صداقتیں اور پُر حکمت باتیں ہیں۔۔۔۔ جو شخص بھی ان لوگوں کے حیرت زا کارناموں کو دیکھیگا، اور واقعات کا پُورا اندازہ کریگا، وہ حیران و ششدر رہوئے بغیر نہیں رہ سکتا، کہ کس طرح اس چھوٹی سی جماعت نے اتنا بڑا جہاد کیا ہے جسے کروڑوں مسلمان نہیں کر سکے۔۔۔۔ باقی نام کے مسلمانوں پر موت طاری ہو چکی ہے۔ کیا اندریں حالات مسلمانوں پر واجب نہ تھا کہ اہل یورپ و امریکہ کے دماغوں سے اُن گندے عقائد کو زائل کریں جو وہ دینِ اسلام اور نبیٔ اسلام کے متعلق رکھتے ہیں۔ درحقیقت یہ مسلمانوں کے امراء، اغنیاء، عوام اور علماء کا فرض ہے لیکن آج

اوہام کا ازالہ کون کر رہا ہے؟ یقیناً کوئی نہیں سوائے اکیلے قادیانیوں کے۔ صرف وہی ہیں جو اس راہ میں اپنے اموال اور جانیں خرچ کر رہے ہیں۔ اور اگر دوسرے مدعیانِ اصلاح اس جہاد کے لئے بُلائیں یہانتک کہ اُن کی آواز یں بیٹھ جائیں اور لکھتے لکھتے اُن کے قلم شکستہ ہو جائیں تب بھی تمام عالمِ اسلام میں سے اِس کا دسواں حصّہ بھی اکٹھا نہ کر سکیں گے جتنا یہ تھوڑی سی جماعت مال و افراد کے لحاظ سے خرچ کر رہی ہے"

سائنسی ترقیات کا تعلق اسلام سے

جو ترقیات آج یورپ نے کی ہیں اُن کو ہم بُرا نہیں کہہ سکتے۔ ایسی ترقیاں بذاتِ خود نہ بُری ہوتی ہیں نہ اچھی اس لئے نہ یہ اسلام کے خلاف ہیں نہ حق میں مسلمان بھی ایسی ترقیاں کریں اور ساتھ اسلامی اصول پر کاربند رہیں تو بہت اچھی بات ہے۔ مگر یہ ترقیاں تو محض تکوینی ترقیاں ہیں اسلام کیساتھ ان کو ایسا ہی تعلق ہے جیسا دماغ کیساتھ ہاتھ وغیرہ کو۔ اگر دماغ صحیح ہے تو ہاتھ بھی اچھے کام کریگا۔ اور اگر دماغ صحیح نہیں تو ہاتھ بھی غلط کام کریگا۔ اسلام دُنیا کا دماغ ہے جب تک اسلام کو آپ اپنے آپ میں درست نہیں کریں گے دُنیا دی ترقیاں بیکار ہیں اور انکی خواہشات بیکار تر۔ ایسی خواہشات سے سوائے نقصان کے کوئی نتیجہ نہیں نکل سکتا۔ اس لئے اِس وقت مسلمانوں کے لئے جو چیز کار آمد ہے وہ یہ ہے کہ خود کو بھی اسلام پہ قائم کریں اور مغربی اور مغرب زدہ اقوام کو بھی اسلام کی طرف دعوت دیں۔ جو ممکنات خدا تعالےٰ نے انسان کی فطرت میں تکوین کئے ہیں ان کی تکمیل ہر انسان پر مباح ہے۔ اور ان ممکنات کو صحیح طریقہ پر کام میں لانا اسلام کا کام ہے۔ اسلام کا یہ کام نہیں ہے کہ ان تکوینی ترقیوں کو روکے بلکہ اس کا کام یہ ہے کہ ان ترقیوں کو مسلمان بنا دے۔ اور آنیوالے امام مہدی کا یہی سب سے بڑا اہم کام ہے کہ وہ دُنیا کی رگ رگ میں اسلام کو بھر دے۔

نبی بھیجنے کا الٰہی قانون

اسلام کا مرکزی اصل عبودیّت ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ کا صحیح معنوں میں بندہ بننا۔ عام طور پہ عالمِ ممکنات میں

انسان جو تگ ودو کرتا ہے وہ پیدائشی قوانین کے مطابق ہوتی ہے۔ مثلاً دولت کمانے یا ایجادات کرنے کے فطری اصول پر چل کر ہر کوئی کامیابی حاصل کر سکتا ہے۔ مگر دُنیا کا اخلاقی توازن قائم رکھنے کے لئے اللہ نے بعض استثنائی قوانین خاص اپنے ہاتھ میں رکھے ہوئے ہیں۔ جب جب لوگ اِن تکوینی ترقیات میں اس طرح غرق ہو جاتے ہیں کہ اپنے پیدا کرنیوالے مالک کو بھول جاتے ہیں' اور اپنی دانشمندی پر گھمنڈ کرنے لگتے ہیں' اور اخلاقی قدروں کی وقعت اُن کی نگاہ سے اُٹھ جاتی ہے' اور زمین میں فساد پھیلنے لگتا ہے' تو خدا تعالےٰ اُن بھٹکے ہوؤں کی راہبری کے لئے اُنہی میں سے ایک انسان کو چُن لیتا ہے' تاکہ اپنا اصلاحی نظام دُنیا کے سامنے پیش کرے۔ اور یہ اُسی وقت ہوتا ہے جب لوگ اپنی مادّی ترقی میں ایسے کھوئے جاتے ہیں کہ وہ الحاد کا شکار ہو جاتے ہیں، اور کہنے لگتے ہیں کہ ہم کو اپنی عقل کے سوا کسی چیز کی ضرورت نہیں۔

آپ دیکھتے ہیں کہ مُلک میں ایک قانونِ عام ہوتا ہے جس کو Statute Law کہتے ہیں۔ اِس قانون کو مُلک کی مجلسِ آئین ساز حاکمِ اعلیٰ کی مرضی سے بناتی ہے۔ یہ قانون تمام مُلک کے انتظام کے لئے عام ہوتا ہے۔ مگر اِس قانون کے علاوہ حکومت کے حاکمِ اعلیٰ (خواہ بادشاہ ہو یا وائسرائے) کو اختیار ہوتا ہے کہ وہ مُلک کے عام قانون کے علاوہ ایسے رُولز یا آرڈیننس جاری کرے جن سے مُلک کا انتظام باحسن طریق کامیابی کے ساتھ ہو سکے۔ اسی طرح اللہ تعالےٰ نے اِس دُنیا کو چلانے کے لئے عام فطری قانون بنا دیئے ہیں جن پر دُنیا کا نظام قائم ہے۔ یہ قوانین تکوینی کہلاتے ہیں۔ اِن عام قوانین سے بالا اللہ تعالیٰ نے اپنا یہ اختیار بھی رکھا ہے کہ جب ضرورت ہو اپنے خاص احکام انسانوں کو بذریعہ انبیاءؑ بھیجے۔ اللہ تعالےٰ یہ پیغام اپنے خاص ارادہ سے بھیجتا ہے۔ یہ تکوینی قوانین کا نتیجہ نہیں ہوتے۔ اور نہ نبی کی فطرت کی گہرائیوں سے نکلتے ہیں۔ نبی کا درجہ بالکل ریڈیو سٹ کا سا ہوتا ہے' جو اللہ تعالیٰ کی آواز کو جو گویا دار النشر سے اُٹھتی ہے' قبول کر کے لوگوں کو سُناتا ہے۔ اگر دار النشر

نہ ہو یا ریڈیو سٹ نہ ہو تو براڈ کاسٹ ناممکن ہو جاتا ہے۔ ریڈیو خواہ کتنا ہی صحیح کام کرتا ہو، اگر کسی مرکز سے براڈ کاسٹ ہی نہ کیا جائے تو وہ کوئی آواز پیدا نہیں کر سکتا۔ اور مرکز خواہ کتنا ہی صحیح اصول پر کام کرے، اگر کوئی ریسیور نہ ہو تو وہی نتیجہ ہوگا۔ اسی طرح اللہ تعالےٰ اپنا خاص پیغام پہنچانے کے لئے کوئی موزوں انسان چنتا ہے، جس کو اسلام میں نبی یا پیغمبر کہتے ہیں۔

نبی اور پیدائشی قابلیت یہ ٹھیک ہے کہ نبی میں خدا کا پیغام وصول کرنے کی صلاحیت ہوتی ہے، خواہ اس صلاحیت کا منبع آپ پیدائشی قابلیت ہی سمجھیں، مگر جب تک خدا اپنا پیغام نہیں بھیجتا اس پیدائشی قابلیت کا فائدہ اس لحاظ سے کچھ بھی نہیں ہو سکتا۔ مطلب یہ ہے کہ یہ پیغام نبی کی اپنی فطری قوت کا اظہار نہیں ہوتا۔ اللہ تعالےٰ نے اپنے پیغامات کو ایسے فوق الفطرت نشانوں کے ساتھ مختص کر دیا ہے، کہ سلیم الطبع لوگ اس کو پہچان لیتے ہیں۔ یہ نشانات غیر معمولی ہوتے ہیں۔ گو بظاہر وہ قوانین تکوینی کے مطابق ہی ہوتے ہیں، مگر ان میں ایک وجہ امتیاز ایسی ہوتی ہے جو ان کو غیر معمولی بنا دیتی ہے۔ اوّل تو خود نبی کا وجود ہی ایک بیّن نشان ہوتا ہے۔ اس کی پیدائش گو قانون کونیہ کے ماتحت ہی ہوتی ہے، مگر بعض ایسے حالات اللہ تعالیٰ پیدا کر دیتا ہے، کہ اس کی پیدائش ہی ایک زندہ معجزہ بن جاتی ہے۔

نبی اور دوسرے غیر معمولی انسانوں میں فرق دوسرے علوم کے جو Genius (کلاں گیر) پیدا ہوتے ہیں، ان کی پیدائش ایسے حالات میں ہوتی ہے کہ ان کا ماحول ان کی پیدائش کے لئے بظاہر سازگار ہوتا ہے۔ فقیداللہ ہر ماہر موسیقی وہیں پیدا ہوتے ہیں، جہاں موسیقی کا چرچا ہوتا ہے علم ریاضی کا ماہر بھی وہیں پیدا ہوگا، جہاں علم ریاضی کی ترقی کے اسباب پہلے ہی موجود ہوں۔ ان لوگوں کی پیدائش عین فطرت کے قوانین کے مطابق ہوتی ہے۔ مثلاً آپ نے کبھی نہیں

سُنا ہوگا کہ ایک بڑا سائینسدان افریقہ کے جنگلوں میں جہاں سائینس کا کوئی وجود نہ تھا، اچانک پیدا ہوگیا، جس نے ایسی ایسی ایجادات کی ہوں کہ خود مہذب دُنیا بھی اُس کی نظیر نہ پیش کرسکتی ہو۔ آین سٹائن کی پیدائش جرمنی یا انگلینڈ یا امریکہ میں تو قرینِ قیاس ہے، مگر ہندوستان کے قصبوں اور گونڈوں میں جن کو علم کی ہوا تک نہ لگی ہو اس کا پیدا ہونا ناممکن ہے۔ اس میں شک نہیں کہ ان علوم کے ماہرین کئی ایک نئی راہیں نکالتے ہیں، جو بظاہر پہلے موجود نہیں ہوتیں مگر بہرصورت یہ ایک ارتقائی اور تدریجی قدم ہوتا ہے۔ ہم کہہ سکتے ہیں کہ یہ نئی باتیں الہاماً اُن کے دل میں آتی ہیں۔ مگر یہ الہام کہیں باہر سے نہیں آتا۔ تکوینی قوانین کے حدود کے اندر ہی سے اُٹھتا ہے۔ ایسے تکوینی الہام تو چیونٹی اور شہد کی مکھی تک کو بھی ہوتے ہیں۔ اِس الہام اور نبی کے الہام میں بڑا فرق یہ ہے کہ نبی کا پیغام خدا کے خاص ارادہ کے ماتحت قوانینِ تکوینی سے بالا ہوتا ہے۔ اس کا فہم ان حالات پر غور کرنے سے ہوسکتا ہے جن حالات میں نبی کی پیدائش ہوتی ہے۔ فطری قوانین بیشک نبی میں پیغام وصول کرنے کی قابلیت تو پیدا کرتے ہوں گے مگر نبوت کا پیغام انسانی فطرت سے بالا ہوتا ہے۔ نبی ہمیشہ اُن لوگوں سے پیدا ہوتا ہے، جو تعلق باللہ کے اعتبار سے بالکل مُردہ ہوچکے ہوتے ہیں۔ اور حقائق کونیہ اُن کی رُوح پر تسلط جما چکے ہوتے ہیں۔ وہ خدا سے بالکل بے پرواہ ہوگئے ہوتے ہیں۔ وہ خدا کا ذکر تو کرتے ہیں، مگر ایسے طور پر کہ ان کے ذکر میں اس کی رُوح بالکل مرچکی ہوتی ہے۔ وہ اگر کسی پہلی الٰہی شریعت کے پابند بھی ہوتے ہیں، تو اس کا اثر صرف ظاہریت تک ہی رہ گیا ہوتا ہے۔ جو تار شریعت کو اللہ تعالیٰ کی معرفت سے جوڑتا ہے وہ ٹوٹ چکا ہوتا ہے۔ صرف کھوکھلے اعمال ہی رہ جاتے ہیں، ان میں مغز نہیں رہتا۔ اس لئے نبی بالکل ایسے حالات میں پیدا ہوتا ہے جو اُس کے آوردہ پیغام کے مخالف ہوتے ہیں۔ وہ ایسے مقام میں پیدا نہیں ہوتا جہاں اللہ تعالیٰ کا یہ تعلق ارتقاء کی کسی منزل پر پہنچ چکا ہوتا ہے، اور وہ آکر اس ارتقاء کی اگلی منزل ہی دریافت کرتا ہے۔ بلکہ وہاں تو

زندگی کا تانا بانا ہی بگڑ چکا ہوتا ہے۔ اور اس کی تعلیم کے بالکل برعکس ہوتا ہے۔ نبی آکر از سرِ نو الٰہی نغمہ چھیڑتا ہے۔ اس کی تعلیم اس کے ماحول سے کھلی بغاوت ہوتی ہے۔ وہ یہی اعلان کرتا ہے کہ تم گمراہی کی طرف جا رہے ہو۔ تمہارا کوئی عمل درست نہیں۔ تمہاری دنیاوی ترقیوں نے تم کو اندھا بنا دیا ہے۔ جو چمکدار نظریئے تم نے بنائے ہیں بر محض سراب ہیں۔ تمہاری عقلیں تم کو دھوکا دے رہی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جو لوگ اپنی عقلوں پر زیادہ نازاں ہوتے ہیں اور اپنی ترقیوں سے دُنیاوی طور پر زیادہ متمتع ہوتے ہیں نبی کی مخالفت پر اُٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔ اور اُس کو مٹا دینے پر تُل جاتے ہیں۔

انبیاءؑ کی باہمی فضیلت

یہاں ایک اور بات بھی غور طلب ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ بلحاظ نفسِ نبوت ایک نبی کو دوسرے نبی سے کوئی امتیاز نہیں ہوتا۔ اسی لئے قرآن کریم میں آیا ہے کہ لَا نُفَرِّقُ بَیْنَ اَحَدٍ مِّنْ رُّسُلِہٖ یعنی اللہ کے نبیوں میں ہم کوئی فرق نہیں کرتے۔ ہاں کام کے لحاظ سے ایک نبی کو دوسرے پر فضیلت ہو سکتی ہے۔ جیسا کہ قرآن کریم میں ہے تِلْکَ الرُّسُلُ فَضَّلْنَا بَعْضَھُمْ عَلٰی بَعْضٍ۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ کوئی نبی صرف ایک محدود قوم یا مُلک کے لئے آتا ہے۔ کسی نبی کو نئی شریعت دی جاتی ہے۔ اور کسی کو شریعت دی ہی نہیں جاتی۔ وہ پہلی ہی یا دوسرے نبی کی شریعت پر ہی عمل کرانے کے لئے آتا ہے۔ مثلاً حضرت موسیٰ علیہ السلام بنی اسرائیل کے لئے نبی بن کر آئے تھے۔ آپ کو نئی شریعت دی گئی تھی۔ اس کے برخلاف حضرت ہارون علیہ السلام آپ کے بھائی بھی بنی اسرائیل ہی کے لئے نبی تھے، مگر ان کو کوئی نئی یا الگ شریعت نہیں دی گئی تھی۔ ان کا کام یہ تھا کہ موسوی شریعت پر عمل کرائیں۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی بعثت کا خاص مقصد یہی تھا کہ جو موسوی شریعت بنی اسرائیل کے ہاتھ میں بیجان ڈھانچہ سا بن کر رہ گئی تھی، اُس میں از سرِ نو رُوح پھونکیں۔ اس وجہ سے بھی قرآن کریم میں آپ کو رُوح اللہ کہا گیا ہے۔ شریعت واقعی قوموں کے حالات اور ضرورت کے مطابق آتی رہی ہے۔ اس کے نزول

میں ضرور ایک ارتقائی پہلو بھی پایا جاتا ہے۔ مگر جب جب نئی شریعت آئی ہے انکو قوموں کے تکوینی ارتقاء کیساتھ صرف اسی قدر تعلق ہے کہ قوموں میں جتنی صلاحیت شریعت قبول کرنیکی تھی اسی قدر شریعت بھی اُن کو دی گئی۔ لیکن لامحالہ وہ عام قوانین فطرت سے ایک بالا قانون ہی کے طور پر نازل ہوتی ہے۔ ہر قوم کے مقام الحاد میں قدر مشترک یہی تھا کہ وہ اپنی اپنی بساط کے مطابق اللہ تعالےٰ کے منکر ہوتے رہے ہیں۔ اور اپنی ہی عقل اور طاقت پر انکو ایسا گھمنڈ رہا ہے کہ وہ اپنے حقیقی پیدا کرنیوالے اور حقیقی معبود کو بھول جاتے رہے ہیں۔ جو نبی شریعت نہیں لاتے وہ بھی خدا ہی کے حکم سے کھڑے ہوتے ہیں۔ اور خدا ہی کا پیغام دُنیا کو سناتے ہیں۔

نبوت کی صفاتِ عمومی اور صفاتِ خصوصی

شریعت کا حامل ہونا ایک نبی کے لئے دوسرے نبی سے باعث فضیلت ہو سکتا ہے مگر نفس نبوت کے لحاظ سے دونوں میں کوئی فرق نہیں ہوتا۔ ان باتوں میں سے جن میں تشریعی اور غیر تشریعی نبی میں اشتراک ہوتا ہے ایک یہ بات ہے کہ ہر نبی بشیر و نذیر بھی ہوتا ہے۔ اور اللہ تعالےٰ کی جو وحی تبشیر و تنذیر کے آیات پر حاوی ہوتی ہے دونوں پر یکساں اُترتی ہے۔ اور بھی بہت سی باتیں ہیں جو سب نبیوں میں مشترک ہوتی ہیں اور جن کو ہم نبوت کی صفاتِ عمومی کہہ سکتے ہیں۔ صرف صفاتِ خصوصی ایک نبی کی دوسرے نبی پر وجہ فضیلت ہوتی ہیں۔ کسی نبی میں نبوت کی صفاتِ عمومی کا پایا جانا اس کے نبی ہونے کے لئے کافی ہے۔ اِن صفات کے لحاظ سے تمام نبی یکساں اور برابر ہوتے ہیں بلحاظ صفاتِ خصوصی ان میں فرق کرنا جائز ہے۔ چنانچہ حضرت محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی ایک صفتِ خصوصی یہ ہے کہ آپ خاتم النبیین ہیں یعنی آپ پر تمام فضائلِ نبوت کا اختتام ہو گیا یعنی تمام وہ صفاتِ عمومی جو نبیوں میں مشترک ہیں اور تمام وہ صفات خصوصی جو منفرداً مختلف نبیوں میں پائی جاتی تھیں آپ کی ذات میں بدرجۂ اتم موجود تھیں۔ اِس

لحاظ سے سب نبیوں پر آپ کو فضیلت حاصل ہے۔ اسی لئے کہا گیا ہے ؎

حسنِ یوسف دمِ عیسےٰ ید بیضا داری
آنچہ خوباں ہمہ دارند تو تنہا داری

آپ پر تمام کی تمام شریعت نازل ہوئی ہے۔ آپ کسی ایک ملک یا ایک قوم کے لئے نبی نہیں ہیں۔ بلکہ ساری دنیا کیلئے ہیں۔

صفاتِ عمومی والی نبوت تاقیامت جاری ہے

یہ تو آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی صفتِ خصوصی ہے۔ مگر بلحاظ صفاتِ عمومی کے آپ بھی ویسے ہی نبی ہیں جیسے دوسرے نبی ....

....

جیسے آپ بشیر و نذیر ہیں ویسے ہی وہ نبی تھے۔ ہاں حضرت محمد رسول اللہ کو رحمۃ للعالمین کہا گیا ہے۔ آپ پر نبوت کے تمام فضائل ختم ہو چکے ہیں۔ اب کوئی نبی پیدا نہیں ہو گا جسکو آپ سے بڑھ کر فضائل دیئے جائیں گے۔ اس پر قرآن کریم شاہد ہے۔ مگر قرآن کریم کے مطالعہ سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ صرف صفاتِ عمومی والی نبوت بند نہیں کی گئی، بلکہ وہ آنحضرتؐ کی پیروی میں جاری ہے۔ قرآن کریم شروع سے آخر تک اس بات پر زور دیتا ہے کہ اللہ تعالےٰ دنیا کی ضرورت کے وقت اپنے مامور تاقیامت بھیجتا رہے گا۔ جب جب بھی دنیا بگڑیگی نبی آئیں گے۔ کہیں بھی قرآن شریف میں یہ نہیں آیا کہ اب نبی نہیں آئیں گے۔ اگر اس کا منشار یہ ہوتا کہ آئندہ نبی نہیں آئیں گے تو ضروری تھا کہ اسے واضح الفاظ میں بیان کیا جاتا۔ اس نے کوئی حد اپنے بعثتِ انبیاء کے اختیارات پر نہیں لگائی بلکہ اس کے خلاف اُس نے کافروں کے اس عقیدہ کی تردید کی ہے جو وہ مختلف زمانوں میں گھڑ لیتے رہے کہ اب کوئی نبی مبعوث نہیں ہوگا۔

بعثتِ انبیاء سے انکار کے وجوہ

جو لوگ اپنی عقلوں پر فخر کرنے لگتے ہیں، اور اللہ تعالیٰ کو اپنے کاروبار حیات میں نظر انداز کر دیتے ہیں وہ

نبیوں کی آمد کے خلاف ہوتے ہیں۔ وہ اپنی پرانی زندگی جس میں وہ آسودہ ہو چکے ہوتے ہیں چھوڑنا نہیں چاہتے۔ اس لئے وہ نبی کی آمد پر لَنْ یَّبْعَثَ اللّٰہُ اَحَدًا یعنی اللہ اب ہرگز کسی کو مبعوث نہیں کریگا کا اعلان کرتے ہیں اور نئے نبی کو اجنبی سمجھ کر اُسکا نہ صرف انکار کر دیتے ہیں بلکہ اُس کے خلاف آمادۂ جنگ ہو جاتے ہیں۔ دوسری وجہ بعثتِ انبیاءؑ سے انکار کی یہ ہوتی ہے کہ جو لوگ پہلے نبیوں پر ایمان رکھتے ہیں وہ اُن کی پرستش میں اس قدر غلو کر جاتے ہیں، کہ اپنے نبی کے بعد کسی نبی کی آمد کو برداشت نہیں کر سکتے، اور کہدیتے ہیں، لَنْ یَّبْعَثَ اللّٰہُ مِنْۢ بَعْدِہٖ رَسُوْلًا کہ اب اس نبی کے بعد اللہ تعالےٰ کسی کو نہیں بھیجیگا۔ اگر قرآن کریم میں اللہ تعالےٰ کو یہ منظور ہوتا کہ اب کوئی اور نبی خواہ کسی قسم کا ہو نہیں بھیجا جائے گا، تو اللہ تعالےٰ صاف لفظوں میں فرما دیتا کہ اب کوئی نبی نہیں بھیجا جائے گا۔ اور جس طرح حضرت یوسفؑ کے متعلق یہ خیال ہو گیا تھا کہ اب اُن کے بعد کوئی نبی نہیں آئیگا۔ اور اس خیال کے اظہار کے لئے اللہ تعالےٰ نے اُوپر کے الفاظ صاف طور پر استعمال کئے ہیں، اسی طرح صاف لفظوں میں وہ اپنا منشاء بیان کر دیتا اور واضح طور پر فرما دیتا کہ لَنْ یَّبْعَثَ اللّٰہُ مِنْۢ بَعْدِ مُحَمَّدٍ رَّسُوْلًا اَبَدًا یعنی اب محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد اللہ تعالیٰ کوئی رسول مبعوث نہیں کرے گا۔

خلافت علیٰ منہاج النبوّت کی ضرورت

اس میں کچھ شک نہیں کہ اسلام کا قانونِ سرمدی یعنی قرآن مجید مکمل ہے۔ لیکن صرف قانون کی تکمیل کافی نہیں ہوتی۔ قانون خود کچھ بھی نہیں کر سکتا، جب تک اس کو نافذ کرنیوالا کوئی نہ ہو۔ اگر قانون یہ ہو کہ قتل کی سزا پھانسی ہے اور اُس کو منوانے والا کوئی نہ ہو تو کوئی قاتل خود بخود پھانسی پر نہیں لٹک جائیگا۔ یہی وجہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ جسمانی کے بعد خلافتِ راشدہ قائم ہوئی اور جب تک کثرت سے وہ لوگ جنہوں نے براہِ راست رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات سے فیض حاصل کیا تھا زندہ رہے خلافت بھی منہاج النبوّت

پر قائم رہی۔ اور جوں جوں زمانہ آپ سے دُور ہوتا گیا، خلافت بھی کمزور ہوتی گئی یہاں تک کہ "ترک ناداں" نے اس کی قبا چاک کر دی۔ جوں جوں لوگ آپ سے دُور ہٹتے گئے، حضورؐ کی ذات خاص سے ان کی اثر پذیری کا جذبہ بھی توں توں کم ہوتا گیا، اور اب نوبت یہاں تک پہنچ گئی ہے، کہ کم از کم تین سو سال سے تمام اسلامی دُنیا جمود کی حالت میں ہے۔ حالانکہ قرآن کریم وہی ہے جو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے سُنایا تھا، اور جس کے اثر سے صحابہ کرامؓ جیسی صالح جماعت پیدا ہوئی تھی جس نے دُنیا کی کایا پلٹ دی تھی۔

ترکی خلافت کا مٹنا ضروری تھا خلافتِ رسولُ اللہ کی جو ظاہری صورت باقی رہ گئی تھی اُس کا مٹا دینا بھی ضروری تھا کیونکہ اب وہ ایسے ہاتھوں میں چلی آئی تھی جو اس کا بار اُٹھانے کے بالکل نااہل تھے۔ اللہ تعالیٰ نے اب پھر ارادہ کیا تھا، کہ نئی زمین اور نیا آسمان پیدا کرے۔ نام نہاد خلافت اب اس کا کام کرنے کے ناقابل ہو گئی تھی۔ اس کا مٹ جانا ہی بہتر تھا۔ اس میں خدا کا ہاتھ صاف نظر آتا ہے۔ غور کیجئے! ترکوں کے پاس اس سے کہیں زیادہ دُنیاوی سامان تھے جتنے کہ خلفاء راشدین کے پاس تھے۔ لیکن چونکہ ان میں رُوحِ اسلام باقی نہیں رہی تھی، اس لئے ان کی خلافت ننگِ اسلام تھی اور اس کا مٹنا ہی ضروری تھا۔ اللہ تعالیٰ کو سلطان عبدالمجید کی ضرورت نہیں اسکو تو خلافت کی ضرورت ہے۔ اس کا قرآن کریم کی سورہ نور میں صریح وعدہ ہے، کہ وہ صالح مومنین کو خلافت عطا کریگا، اور اُن کے ذریعہ سے دین کو تمکین بخشیگا۔ اور جماعت اسلامی کو اس سے تقویت پہنچائیگا۔ اور پھر اللہ تعالیٰ کا یہ بھی وعدہ ہے اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحَافِظُوْنَ۔ یعنی ہم نے قرآن مجید اُتارا ہے اور ہم اس کی ہر قسم کی حفاظت کے ذمہ وار ہیں۔ اس کے یہ وعدے کبھی جھُوٹے نہیں ہو سکتے۔ "ترک ناداں" ہزار خلافت کی قبا کو چاک کر دے مگر حقیقی خلافت کبھی مٹ نہیں سکتی۔ خلافت کو سرِنو منہاجِ نبوت پر قائم کرنا ایک بہت بڑے انقلاب کو مستلزم ہے۔ ٹوٹے ہوئے پھول پھر شاخ پہ نہیں

جوڑے جا سکتے۔ ہاں دوسری بہار میں خود بخود نئے پھول پیدا ہو سکتے ہیں۔ دوسری بہار کو لانے کے لیئے موسم خزاں کو باغ سے نکالنا ضروری ہے۔ اس لیئے ایک بہت بڑے انقلاب کی ضرورت تھی۔

الامام المہدی کا مقام اور کام

خلافتِ رسول اللہؐ پھر از سرِ نَو قایم ہونی ہے۔ اس خلافت کو قایم کرنیوالا بھی بہت بڑا انسان ہونا چاہیئے ایک نیا آدم عظیم جو نئی دُنیا کی بُنیاد رکھے۔ وہ معمولی غیر شعوری مجتہد نہیں ہو سکتا اور نہ ہر صدی کے سر پر آنیوالا عام مجدّد ہی ہو سکتا ہے۔ . . . . رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی عظیم الشان پیشگوئیاں اس کے بارے میں ہیں۔ وہی الامام المہدی یا مسیح موعود ہے۔ چونکہ اُس نے از سرِ نَو خلافت کو منہاج نبوّت پر قایم کرنا ہے اس لئے اسکا نبی ہونا بھی ضروری ہے۔ اور الامام المہدی وہی کام کریگا جو ایک نبی کرتا ہے۔ اسکا خدا تعالےٰ کی طرف سے مامور ہونا بھی ضروری ہے۔ وہ مودودی صاحب کی اصطلاح میں امرِ تشریعی پر کھڑا ہوگا۔ اس پر بھی اللہ تعالےٰ کا وہ کلام جو غیر تشریعی نبی پر بھی اُتر سکتا ہے اُتریگا۔ ہاں وہ صرف صفاتِ عمومی کے لحاظ سے نبی ہوگا۔ کامل شریعت حضرت محمد مصطفےٰ احمد مجتبےٰ صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم پر نازل ہو چکی ہے۔ اب اس میں کوئی افزائش نہیں ہوگی۔ کیونکہ اللہ تعالےٰ نے قرآن کریم میں صاف کہدیا ہے اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ۔ ہاں امام موعود کا کام یہ ہوگا کہ جب لوگ اس شریعت سے پھر گئے ہوں گے، وہ پھر ان کو اس پر قایم کریگا۔ وہ کوئی نیا مذہب فکر نہیں بنائے گا۔ اس کا مذہبِ فکر تو پہلے ہی قرآن کریم کی صورت میں موجود ہے۔ ہاں وہ لوگوں کی وہ غلطیاں درست کریگا جو وہ اس خدائی مذہبِ فکر میں اپنی طرف سے ڈال چکے ہیں۔ وہ لوگوں کے دِل از سرِ نَو قرآن کریم کے لئے اس طرح تشنہ بنا دیگا، کہ گویا کہا جائیگا کہ قرآن کریم دوبارہ اس پر نازل ہوا ہے۔ وہ قرآن کریم کے اتھاہ سمندر سے موتی نکال نکال کر علم کے خزانے بھر دیگا۔ وہ دُنیا میں اسی طرح بے سروسامان

کھڑا ہوگا جس طرح پہلے انبیاء کھڑے ہوتے رہے ہیں۔ ایک طرف ساری دُنیا کے ساز و سامان ہوں گے فلسفہ ہوگا۔ سائینٹفک ترقی اوجِ کمال پر ہوگی۔ بڑے بڑے ائمہ ضلالت اور انقلاب پیدا کرنے والے جاہلی لیڈر ہوں گے سیاسی تانے بانے کا طلسم لامتناہی ہوگا۔ کفر اپنی کوششوں کے ساتھ اس کو کچلنے کے درپے ہوگا۔ مگر دوسری طرف وہ تنہا صرف قرآن مجید اور سُنّتِ رسول اللہؐ کو لے کر نکلیگا۔ آخر وہ کفر کے تمام ہتھیار نکمے ثابت کر دیگا۔ وہ اکیلا میدان میں نکلیگا اور مسکینوں کی طرح اپنا کام شروع کریگا۔ اُسی طرح جس طرح تمام خدا کے مرسل کرتے آئے ہیں۔ پھر اللہ تعالےٰ اس کے لئے بھی وہی معجزہ دکھائے گا جو وہ ہمیشہ سے اپنے مرسلین کے لئے دکھاتا آیا ہے۔ یعنی کَتَبَ اللّٰہُ لَاَغْلِبَنَّ اَنَا وَرُسُلِیْ کا ازلی ابدی وعدہ اپنی پُوری شان سے پُورا ہوگا۔

وہ یقیناً خدا کی بادشاہت دوبارہ دُنیا میں قائم کرنے کے لئے آئیگا۔ مگر خدا کی بادشاہت کا مطلب نام نہاد مسلمانوں کو سیاسی عروج کی منزل پر پہنچانا نہیں ہے۔ وہ ہرگز ہرگز لینن اور ہٹلر کی طرح کا لیڈر نہیں ہوگا، جو سیاست کے طلسمات سے اپنا اصلاحی کام شروع کریگا وہ وہی کام کریگا جو تمام انبیاءؑ کرتے آئے ہیں۔ جن لوگوں کا خیال ہے کہ امام موعود بھی انقلابی لیڈروں کی طرح کا ایک لیڈر ہوگا، اللہ تعالےٰ اُن کی حالت پر رحم کرے۔ وہ نہ صرف خود فریب خوردہ ہیں بلکہ اپنے ساتھ دوسرے ناواقف مسلمانوں کو بھی فریب دے رہے ہیں۔

یہودیوں اور مسلمانوں میں مشابہت

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے وقت میں بھی بڑے بڑے یہودی علماء نے اپنی قوم کو غلط راستہ پر ڈال دیا تھا اور وہ سمجھتے تھے کہ مسیح علیہ السلام اِسی دُنیا کی بادشاہت یہودیوں کو دلائینگے۔ مگر آپؑ نے پکار پکار کر کہا کہ میری بادشاہت اِس دُنیا کی نہیں۔ چونکہ یہودیوں نے بھی خدا کی نعمت یعنی سلطنت کو اپنی غلط کاریوں سے کھو دیا ہوا تھا۔ اس لئے رہ رہ کر اُن کے دلوں میں اس کو دوبارہ حاصل کرنے کی اُمنگیں اُٹھتی تھیں۔ آخر اللہ تعالےٰ نے مسیح علیہ السلام کے ذریعہ

پیرووں کو اس دُنیا کی بادشاہت بھی دِل کھول کر دی، مگر ان یہودیوں کی اولاد اب تک "دیوارِ گریہ" سے لپٹ لپٹ کر اور چیخیں مار مار کر روتی چلی آتی ہے۔ پر کوئی سونے اور جواہرات کے تاج والا شہزادہ آج تک اُن کو نصیب نہ ہُوا۔ یہ اُن کو اللہ تعالےٰ نے اُس تمسخر کی سزا دی ہے، جو انہوں نے اس امن کے شہزادے کے ساتھ "یہودیوں کا بادشاہ" کا بورڈ چسپاں کر کے کیا تھا۔ بنی اسرائیل کے مولوی اور فقہا بھی ایک سیاسی مسیح کے طلبگار تھے۔ انہوں نے مسیح علیہ السلام کے اِس قول کو ٹھکرا دیا اور اسے اس کی کمزوری پر بطور دلیل پیش کیا، کہ "خدا کی بادشاہت میں وہی داخل ہونگے جو دل کے غریب ہیں۔" مگر جو استقلال اور قوتِ برداشت اس خدا کے مسیح نے صلیب پر چڑھ کر دکھائی اس کی نظیر سوائے نبیوں کے گروہ کے اور کہیں نہیں ملیگی۔ بعینہٖ آج مسلمان بھی خدا کے مہدی کے نہیں بلکہ ایک زبردست سیاسی لیڈر کے متمنی ہیں۔ وہ قیامِ امن کو کمزوروں کا فلسفہ سمجھتے ہیں۔ کفر جن ہتھیاروں سے اِس وقت لیس ہے اس نے ان کی آنکھوں کو خیرہ کر دیا ہے۔ اور وہ چاہتے ہیں کہ مسلمانوں کے پاس بھی ایسے ہی ساز و سامان ہوں تاکہ وہ کُفر کا مقابلہ کر سکیں۔ مگر وہ اس بات کو بھُول گئے ہیں کہ محمد صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم ابوجہلوں اور ابولہبوں ہی کے درمیان پیدا ہوتا ہے۔ ابراہیم علیہ السلام اور موسیٰ علیہ السلام نمرودیوں اور فرعونوں ہی کے مقابلہ میں آتے ہیں۔ ان کی ہر طرح مخالفت کی جاتی ہے۔ گالیاں دی جاتی ہیں۔ ان پر پتھر برسائے جاتے ہیں۔ اُن کو اور اُن کے پیرووں کو مجنون، بیوقوف، سفیہہ اور پست خیال وغیرہ وغیرہ کے القاب دیئے جاتے ہیں۔ ان کو طرح طرح کی اذیتیں دی جاتی ہیں تپتی ہوئی ریتوں پر بھونا جاتا ہے۔ گلیوں میں رسیاں باندھ کر گھسیٹا جاتا ہے۔ ناک میں دھُواں دیا جاتا ہے۔ غرض ہر طرح کے عذاب و عقاب ان کو دیئے جاتے ہیں۔ مگر وہ اور اُن کی ثابت قدم جماعت اس کا جواب صبر اور تحمل سے دیتی ہے۔ اور اُن کا یہ صبر و تحمل آخر میں دشمنوں کے بے حساب ساز و سامان پر بھاری ثابت ہوتا ہے۔ اور جس جماعت کو دُنیاوی لحاظ سے

نہایت ضعیف سمجھا جاتا ہے آخر ایک دن ایسی طاقت ثابت ہوتی ہے کہ وہ بھی جن کو پہلے دُنیا کی ہر ایک نعمت حاصل تھی اس کی ترقی دیکھ کر حیران رہ جاتے ہیں اور یک زبان ہو کر پکارنے لگتے ہیں کہ "کاش ہم بھی مسلمان ہوتے" وہ کیا چیز ہے جو نبی اور اس کی جماعت کو کامیاب بناتی ہے؟ وہ بڑی بڑی فوجیں یا رسالے نہیں ہوتے، گولیاں اور بم نہیں ہوتے اور نہ کوئی اور جنگی سامان ہوتا ہے۔ بلکہ وہ ان کا خُلق عظیم ہوتا ہے جو دیوار مرصوص بن کر دشمنوں کی راہ میں کھڑا ہو جاتا ہے۔ اور یہی نبی کا سب سے بڑا معجزہ ہوتا ہے۔ ایک مغربی مصنفہ مس ڈفنی ڈوماریئر نے اپنی طرز میں اس حقیقت کو ان الفاظ میں بیان کیا ہے:

"ٹینکوں طیاروں، توپوں اور جہازوں نے زمانہ گذشتہ میں بھی لوگوں کو دھوکہ دیا ہے، اور اب بھی دیں گے۔ مگر روح کے آلات زمانہ گزشتہ میں بھی انکو سہارا دیتے رہے ہیں اور آئندہ بھی دیں گے۔"

ہزیمت خوردہ ذہنیت جو تصور مہدی موعود کا مودودی صاحب نے پیش کیا ہے وہ ایک ایسے شخص کا تصور ہے جو موجودہ مغربی ترقیوں کو دیکھ کر بھونچکا رہ گیا ہے۔ جو موجودہ سائنٹفک ایجادات اور سیاسی عروج سے خائف اور ہزیمت خوردہ ذہنیت کا مالک ہے۔ جو ٹینکوں۔ ہوائی جہازوں اور ہٹلر کے مخفی ہتھیاروں کو صداقت کی قوت سے زیادہ قوی سمجھتا ہے۔ جس کو اپنی اخلاقی قوت پر ذرا بھروسہ نہیں جسکو اسلام کی کامیابی پر ذرا ایمان نہیں۔ ہمارا مدعا اس سے ہرگز یہ نہیں ہے کہ امام موعود اسباب ظاہری سے کام ہی نہ لیگا یا ایسا کرنا اس کو ممنوع ہے۔ مگر ہم یہ کہتے ہیں کہ اس کے لئے ان دُنیاوی سامانوں کو ناگزیر سمجھنا اور چھٹتے ہی اس کا سیاست پر ہاتھ مارنا اور زبردست اسلامی اسٹیٹ قائم کرکے نام نہاد مسلمانوں کے ہاتھ میں دے جانا ہرگز کسی فرستادہ خدا کا مطمح نظر نہیں ہوسکتا۔ مسلمان بیشک دُنیاوی ترقیاں بھی کریں اور اسٹیٹیں بھی قائم کریں۔ اور ہم دُعا کرتے ہیں کہ خدا جلد از جلد ان کے ارادوں کو پورا کرے۔ مگر وہ یاد رکھیں کہ ایسے خیالی پلاؤ

پکانے والے کبھی کامیابی کا منہ نہیں دیکھا کرتے ۔ ایسے توہمات وامانی نے اور قوموں کو پہلے بھی دھوکا دیا ہے، اور اب مسلمانوں کے لئے بھی کوئی مفید نہیں ہوں گے۔

کم ہمت کرنیوالا تصورِ مہدی

اِنہی غلط امیدوں کی وجہ سے سر سید نے مہدی کی آمد سے انکار کیا تھا ۔ اور اب بھی جو لوگ مہدی کو ایک موہوم خواب سمجھتے ہیں، اسی وجہ سے اس کی آمد کے منکر ہیں ۔ یہ امید لگائے رکھنا کہ کوئی سیاسی دیو پیدا ہو کر دنیا بھر کی حکومت مسلمانوں کو دلائیگا واقعی ان کو کم ہمت اور بیکار کرنیوالا ہے ۔ نہ کبھی دُنیا میں پہلے ایسا ہوا ہے اور نہ کبھی آئندہ ایسا ہو سکتا ہے ۔ ایسے تصورات شاعرانہ تو کہے جا سکتے ہیں، مگر حقیقت سے ان کو کوئی تعلق نہیں ہے ۔

امامِ ہدایت اور کرامات و الہامات

ڈاکٹر اقبال نے کامل انسان کا تصور نٹشے سے بھیک میں لیا تھا ۔ اور مودودی صاحب نے اسی تصور پر نقش و نگار کر کے اسے زیادہ جاذب بنانے کی کوشش کی ہے ۔ آپ فرماتے ہیں کہ "جب خدا کی خدائی میں لینن اور ہٹلر جیسے ائمہ ضلالت کا ظہور ہو سکتا ہے تو آخر ایک امام ہدایت کا ظہور کیوں مستبعد ہے" مگر وہ یہ بھول گئے ہیں کہ امام مہدی امامِ ہدایت ہوگا، امام ضلالت نہیں ہوگا ۔ اسلئے اس کا طریق کار ائمہ ہدایت کا طریق ہوگا نہ کہ ائمہ ضلالت کا ۔ آپ فرماتے ہیں :-

"مجھے اس کے (یعنی مہدی کے) کام میں کرامات و خوارق و کشوف و الہامات اور چلّوں اور مجاہدوں کی کوئی جگہ نظر نہیں آتی" (تجدید و احیائے دین ص۳۲)

"کوئی جگہ نظر نہیں آتی"، کی بھی خوب کہی ۔ جب مہدی موعود نہ صرف نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کی عظیم الشان پیشگوئیوں کے مطابق ظہور کرے گا، بلکہ اس کے متعلق پچھلے انبیاءؑ نے بھی اپنی قوموں کو خبر دی ہو کہ نوعِ انسان کی دُنیوی زندگی ختم ہونے سے پہلے دینِ اسلام اُس کے ذریعہ ساری دُنیا پر چھا جائیگا، تو کس قدر حیرت کی بات ہے کہ وہ شخصیت جو یہ تمام انقلابات برپا کریگی خدا کے نشانات سے بالکل کوری ہو ۔ جس کی پیدائش ہی معجزانہ انداز سے ہوگی وہ

خود معجزوں سے عاری ہوگا عجیب قسم کی منطق ہے۔

امر تکوینی سے کھڑا ہونیوالا مہدی (غیر تشریعی) تو ہو سکتا ہے اگر جو مہدی بشارت کے طور پر آئے گا یقیناً خدا کے خاص ارادہ سے آئیگا اور امر تشریعی ہی سے کھڑا ہوگا۔ خدا تعالیٰ کے موعود مہدی کو نیچریت کے طفلی بتوں سے تولنا انصاف ہرگز نہیں ہے۔ کیا آپ اپنے مفروضہ مغربی مادی نظریات سے نہایت خوفزدہ ہیں۔ اور نظریات بھی وہ جو اب خود مغربی دنیا میں بھی دقیانوسی سمجھے جاتے ہیں۔ آپ کو معلوم ہی نہیں کہ وہ مادی نظریات جو انیسویں صدی عیسوی میں یورپ میں رائج تھے۔ اور جن پر سرسید نے اپنی تحقیقات کی بناء رکھی تھی اب یورپ ہی اس کو قابل ترک قرار دے چکا ہے۔ آپ کو معلوم ہی نہیں کہ دنیا کہاں سے کہاں نکل گئی ہے۔ آپ وہی لکیر پیٹتے چلے جا رہے ہیں۔ پھر آپ کے عقیدہ کی بنیاد نہ قرآن شریف میں ملتی ہے اور نہ احادیث نبوی میں۔ اگر آپ سرسید کی طرح معجزات کا سرے سے ہی انکار کر دیتے تو بھی کچھ بات بن جاتی۔ مگر تعجب تو یہ ہے کہ آپ پہلے خدا کے بندوں نے جو معجزات دکھائے ہیں، ان کے قائل ہیں اور صرف امام مہدی کو خوارق و معجزات سے عاری مانتے ہیں۔ سوال ہو سکتا ہے کہ اگر پہلے نشانات آسکتے تھے تو اب کیوں بند ہیں؟ کرامات و خوارق، کشوف و الہامات، چلّے اور مجاہدے جہاں تک خدا کی کتاب کے مطابق ہیں اگر مہدی کی ذات میں بھی ان کا ظہور ہو تو کونسا امر مانع ہے۔ اس کے خوارق تو ویسے ہی ہونگے جیسے انبیاء کے نہ کہ جھوٹے گدی نشینوں اور پیرزادوں کے۔ اسکے چلّے اور مجاہدے ویسے ہی ہونگے جیسے نبیوں کی عبادتیں نہ کہ رہبانوں اور ہندو سادھوؤں جیسے اور نہ ان صوفیوں کی طرح کے جنہوں نے اسلامی حدود پھلانگ کر عیسائیوں، بدھوں اور ویدانتیوں کے طریقے اختیار کر رکھے ہیں۔ محض اس لئے کہ بعض مسلمان نقیروں نے بھی غیر اسلامی اثر کے ماتحت دین میں بدعتیں داخل کر دی ہیں، امام موعود کو روحانی طاقتوں اور تائید ربانی سے عاری خیال کر لینا مرض الحاد کی علامت ہے۔ امام موعود کی تو ہر ایک سانس معجزہ ہوگی۔ وہ ضرور اسی طرح خدائی نشانات کے ساتھ آئے گا جس طرح دوسرے نبی آتے رہے ہیں۔ بے شک وہ

ہماری طرح کا ہی ایک انسان ہوگا، مگر اُس پر خدا کی وحی نازل ہوگی معجزات اُس کے جلوہ میں چلیں گے۔ یہی اللہ تعالےٰ کی قدیمی سُنّت ہے جو کبھی تبدیل نہیں ہوسکتی۔

ڈاکٹر اقبال اور مودودی صاحب کا مہدی خدائی مہدی نہیں۔

ڈاکٹر اقبال اور مودودی صاحب کا مہدی نہ خدائی مہدی ہے اور نہ خدا سے اس کو کوئی تعلق ہے۔ یہ محض اُن کے اپنے ہی تصورات کی پیدائش ہے۔ یہ لوگ صرف سیاسی تفوق کے بھوکے ہیں۔ اُن کا خیال ہو کہ یورپ کی موجودہ بیداری جرمنی کے تصورِ فوق الانسان کی وجہ سے ہے اس لئے وہ مغرب زدہ مسلمانوں میں مہدی کے تخیل کو از سرِ نو زندہ کرنا چاہتے ہیں، جو سرسید کے زیرِ اثر مرچکا تھا۔ ان کا مہدی صرف مصلحتی مہدی ہے۔ وہ تو ایسا مہدی چاہتے ہیں، جو غضب کا ماہرِ جنگ، عدیم المثال سائنسدان اور وحید العصر زعیم ہو۔ آپ کہتے ہیں "خواہ اس دَور یا زمانے کی ہزار گردشوں کے بعد آئے، آئے گا ضرور" مگر ہم کہتے ہیں کہ آپ کی صفات والا مہدی ہزار تو کیا، لاکھوں لاکھ تو کیا اربوں گردشوں کے بعد بھی نہیں آئے گا۔ اگر مہدی کسی مدرسے یا خانقاہ کے حُجرے سے نہیں نکلیگا، تو وہ کسی لیباریٹری یا جنگی کارخانہ سے بھی ظہور نہیں کریگا۔ خدا کا مُرسَل تو صرف ایک خدا کے سہارے پر ہی آتا ہے۔ دُنیوی لحاظ سے وہ ہمیشہ بے دست و پا ہوتا ہے۔ وہ ایک شیطانی دُنیا میں اعلائے کلمۃ الحق کے لئے اکیلا ہی کھڑا ہوتا ہے۔ شروع شروع میں جو لوگ اس کی دعوت کو قبول کرتے ہیں، وہ بھی کوئی بڑے آدمی نہیں، بلکہ اکثر نسبتاً چھوٹے مگر شریف طبقے سے تعلق رکھتے ہیں، جن پر مُترفین زمانہ طرح طرح کے ستم ڈھاتے ہیں۔ ایک فوق العادت جذب ہوتا ہے جو انکو ایسی قربانیوں کے قابل بنا دیتا ہے کہ جن کی نظیر ملنا مشکل ہے۔ بیشک قرونِ اُولیٰ میں مسلمان مجاہدوں نے میدانِ جنگ میں بھی بڑے بڑے کارنامے دکھائے ہیں، مگر حضرت بلال رضی اللہ عنہ کا آگ سی جلتی ہوئی ریت پر بھُونا جانا لیکن اُف نہ کرنا اور زبان سے سوائے کے اللہ

اِلّا اللہ کے کچھ نہ نکالنا کچھ اور ہی شان رکھتا ہے۔ میدانِ جنگ میں اللہ اکبر کا نعرہ لگا کر دشمن کی فوج میں گھس جانا واقعی بڑی بہادری ہے، مگر حق کے لئے دست و پا بستہ سنگسار ہو جانا، ٹوٹ جانا مگر گردن خم نہ کرنا حقیقی اعجاز ہے۔ یہی اعجاز ہے جس سے نبوت قائم ہوتی ہے۔

خلافت علیٰ منہاج النبوت کا دور

خلافت رسول اللہ کا پہلا دور ختم ہو چکا ہے۔ ترکِ ناداں نے خلافت کے آخری چیتھڑے بھی سپردِ آتش کر دیئے۔ مُسلم کی سادگی اور غیروں کی عیاری دیکھ لی ہے۔ جبریہ بادشاہی کے بعد پھر خلافت کو منہاجِ نبوت پر قائم ہونا ہے۔ یہی اسلام کی نشأۃ ثانیہ کا دور ہے۔ اس لئے دورِ خلافت کا آغاز کرنیوالا نہ صرف رسول اللہ صلے اللہ علیہ و آلہ وسلم کا صحیح معنوں میں خلیفہ ہی ہونا چاہیئے بلکہ اُس کا فیضِ رسول اللہ سے نبی ہونا بھی ضروری ہے۔ بداطوار اور جبریہ بادشاہی کے بعد خلافتِ حقہ خود بخود قائم نہیں ہو سکتی۔ اللہ تعالےٰ ہی اس خلافت کو دوبارہ زندہ کر سکتا ہے ؎

چوں دورِ خسروی آغاز کردند
مُسلماں را مُسلماں باز کردند

بداطوار اور جبریہ بادشاہیوں کے بعد صرف ایسا ہی شخص خلافت کو منہاجِ نبوت پر قائم کر سکتا ہے، جو نبیوں کے ظِلّ میں آئے۔ دوسرے الفاظ میں جو حضرت محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ و آلہ وسلم کا کامل نمونہ ہو۔ ان تمام پیشگوئیوں کے مطالعہ سے جو امامِ موعود کے بارے میں ہیں، یہی معلوم ہوتا ہے، کہ وہ خاتم النبیینؐ ہی کی خو بُو رکھتا ہوگا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے امام مہدی کا نام اپنا نام اور اس کے باپ کا نام اپنے باپ کا نام بیان فرمایا ہے۔ یہ رُوحانی اشارہ اِس بات کی طرف ہے کہ وہ خاتم النبیینؐ کا ظِلّ اور پرتو ہوگا۔ امرِ تکوینی سے کھڑا ہونیوالا غیر شعوری امام خلافتِ مُردہ کو زندہ کر کے اس کو منہاجِ نبوت پر قائم نہیں کر سکتا۔ یہ کام تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا بروزِ کامل ہی کر سکتا ہے۔

امام مہدی سب قوموں کا موعود ہوگا

حدیث شریف میں آنیوالے امام کا نام ابن مریم بھی رکھا گیا ہے۔ اور ابن ماجہ کی ایک حدیث یہ بھی ہے کہ لَا مَھْدِیَ اِلَّا عِیْسٰی۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مہدی اور عیسیٰ ایک ہی موعود کے دو نام ہیں۔ اس میں یہ بھی اشارہ ہے کہ چونکہ امام موعود جناب خاتم النبیینؐ کی نیابت میں آئیگا اس لئے اس کا پیغام بھی ہر قوم اور ہر ملک کے لئے ہوگا۔ وہ صرف نام کے مسلمانوں کو حکومت دلانے کے لئے نہیں آئیگا بلکہ تمام دُنیا کے لئے آئیگا۔ خلافتِ راشدہ کے بعد مسلمان اسی غلطی کا شکار ہوگئے تھے کہ امام موعود صرف نام کے مسلمانوں کی امداد کے لئے ہی آئیگا۔ اسی لئے اُن کے تصورِ مہدی میں فوجی عنصر کا غلبہ ہوتا گیا۔ یہاں تک کہ مہدی اب محض سیاسی لیڈر بن کر رہ گیا ہے۔ جس طرح نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا پیغام عام ہے اسی طرح نشأۃ ثانیہ کا امام بھی جو دوبارہ خلافتِ رسولؐ اللہ کو منہاج نبوت پر قائم کریگا اُس کا پیغام بھی تمام دُنیا کے لئے عام ہوگا۔ وہ نہ صرف مسلمانوں کے لئے آئیگا بلکہ ہندوؤں، بدھوں، عیسائیوں، یہودیوں، زردشتیوں غرض ہر مذہب وملت کے لوگوں کے لئے کھڑا ہوگا۔ تمام ادیان جو اس وقت موجود ہیں، اور جو کسی آنیوالے کے منتظر ہیں، اُن کے اس خیال کی بنا، اپنی اپنی کتاب کی پیشگوئیوں پر ہے۔ ہر ملک اور ہر قوم میں خدا کے نبی آتے رہے ہیں۔ سب نے ایک آنے والے کے متعلق پیشگوئی کی ہوئی ہے۔ اور یہ عجیب حقیقت ہے کہ ہر دین میں جو آنے والے کا وقت بتلایا گیا ہے وہ بھی ایک ہی ہے۔ اس سے بھی ثابت ہوتا ہے کہ وہ ایک ہی شخص ہونا چاہیئے۔ سب قوموں اور ملکوں کے نبیوں نے ایک ہی خدا سے علم پاکر اس آنے والے کی پیشگوئی کی تھی، اس لئے بھی وہ ایک ہی شخص ہونا چاہیئے۔ اس لئے یہ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ ایک قوم نے دوسری قوم سے یہ خیال اُڑایا ہو، جیسا کہ بعض قیاس آرائیاں کرنیوالوں کی رائے ہے۔ چنانچہ مودودی صاحب بھی تجدید واحیائے دین میں فرماتے ہیں:۔

"بہت ممکن ہے کہ انبیاء علیہم السلام کے کلام سے نکل کر یہ چیز دُنیا کی دوسری قوموں میں بھی پھیلی ہو اور جہالت نے اس کی رُوح نکال کر اوہام کے لبادے اس کے گرد لپیٹ دیئے ہوں۔"

لیکن مودودی صاحب اس بات کو نظر انداز کر گئے ہیں کہ قرآن مجید میں ہے وَإِنْ مِّنْ أُمَّةٍ إِلَّا خَلَا فِيهَا نَذِيرٌ۔ کوئی قوم اور کوئی مُلک نہیں جہاں خدا کا نبی نہ آیا ہو۔

یہاں یہ بات بھی قابلِ غور ہے کہ مہدی ایک ایسا مشترک نام ہے جس کا اطلاق ہر قوم کے موعود پر ہو سکتا ہے۔ مہدی کے معنی ہیں ہدایت یافتہ۔ اس لئے مسیح بھی مہدی ہے نہکلنک اوتار بھی مہدی ہے۔ اور میتریہ بھی مہدی ہے۔ جس طرح دریائے بیاس۔ دریائے راوی دریائے چناب و دریائے جہلم دریائے سندھ میں گرنے کے بعد پنج ند کہلاتے ہیں اسی طرح مہدی بھی ایک جامع نام ہے۔ اور آخری دین کا نام بھی اسلام رکھا گیا ہے۔ تاکہ اس نام میں تمام مذاہب آجائیں۔ اس لئے امام مہدی کا ایک بہت بڑا کام یہ بھی ہے کہ وہ تمام ادیان کی صحیح تعلیم کو اس کھوٹ سے جو امتدادِ زمانہ کے ساتھ اس میں رل گیا ہے الگ کر کے سب دینوں میں اسلام کا چہرہ دکھائے، اور دُنیا سے اس تفریق کو مٹا دے جو نبیوں کی تعلیم کو تحریف کرنے سے دُنیا کے مختلف ادیان کے پیروؤں میں پیدا ہو گئی ہے۔ گویا قرآن کریم میں تمام گزشتہ نبیوں کی تعلیم ایک جگہ جمع کر دی گئی ہے۔ اور رسول کریمؐ کو خاتم النبیین اس لئے بھی کہا گیا ہے کہ تمام نبوتوں کا اختتام آپؐ کی ذات میں ہو گیا ہے ؎

ہر نبوت را بروشد اختتام

اس لئے اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم جیسی مکمل تعلیم کو ایسے زمانے میں نازل کیا جب کہ قدرتِ خدا نے اس کی مکمل حفاظت کے ایسے سامان پیدا کر دیئے تھے کہ اب اس میں کسی تحریف اور کمی بیشی کا امکان نہیں رہ سکتا تھا۔ اس تعلیم کو دوبارہ زندہ کرنے والے کا نام مہدی رکھا گیا ہے۔

عقیدۂ حلول ونزول کی تردید ... کرنے میں ایک

...عیسائیوں اور مسلمانوں کا عقیدہ تھا کہ وہی حضرت عیسیٰ علیہ السلام جو پہلے آچکے ہیں اور ...آسمان پر آرام فرما رہے ہیں، دوبارہ بجسدہ العنصری نزول کریں گے۔ اسی طرح ہندوؤں کا بھی یہی خیال ہے کہ وہی کرشن علیہ السلام تشریف لائیں گے جو مہابھارت کے زمانے میں آئے تھے، بلکہ وہ تو اس کو خدا ہی سمجھتے ہیں، جو انسانی قالب میں حلول کرکے دنیا کی بار بار اصلاح کرتا ہے۔ سوامی دیانند بھی ستیارتھ پرکاش میں کہتے ہیں کہ کرشن علیہ السلام نے جو کہا ہے کہ میں دوبارہ آؤں گا اس کا مطلب صرف یہی ہو سکتا ہے کہ وہ دوبارہ جنم لیں گے۔ ان سب موعودوں کے لئے ایک ہی لفظ استعمال کرکے اسلام نے اس عقیدۂ حلول ونزول کی تردید کردی ہے۔ اور اس بات کی طرف بھی اشارہ کردیا ہے کہ ایسے خیال محض غلط فہمی پر مبنی ہیں۔ ایک مہدی تو ضرور آئے گا، مگر نہ اس میں حضرت کرشن کی روح ہوگی، اور نہ وہ آسمان سے نازل ہوگا۔ بلکہ وہ فی ذاتہٖ تمام گذشتہ انبیائؑ سے الگ ہوگا اور دیگر انسانوں کی طرح الگ روح اور جسم لے کر آئے گا۔ ہاں اس میں تمام انبیائؑ کی صفات اور خوبو ہوگی۔ وہ ہندوؤں کے لئے وہی کام کرے گا جو کرشن علیہ السلام نے کیا تھا اور عیسائیوں کے لئے وہی کام کرے گا جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے کیا تھا۔ وہ امام ہدایت ہوگا۔ اور اسی اسلام کو از سر نو زندہ کرے گا جو کرشنؑ اور مسیحؑ اور دیگر انبیائؑ لائے تھے۔

امام مہدی ناطرفدار ہوگا

مہدی موعود کے لئے مشرق ومغرب کی تفریق نہیں ہوگی۔ وہ کسی واحد قوم کا طرفدار نہیں ہوگا جو دوسری سب قوموں کو ہلاک کرے گا، اور صرف ایک قوم کو عروج دلائے گا۔ نہ وہ نام نہاد مسلمانوں کی حمایت پر اٹھے گا، اور نہ عیسائیوں اور ہندوؤں کی امداد کرے گا۔ وہ تو

اللہ کا دین دلوں پر قائم کرنے کے لئے کھڑا ہوگا۔ اس کے لئے سب برابر ہوں گے۔ اسکا ایک بڑا کام یہ ہوگا کہ وہ سب کے دلوں سے ان غلطیوں کا ازالہ کریگا جو حقیقی الٰہی دین کے سمجھنے میں ان میں رائج ہو گئی ہوئی ہیں۔

زمانہ امامِ موعود کو پکار رہا ہے

آج ہم دنیا پر نگاہ ڈالیں تو نظر آئے گا کہ سچا دین اسلام لوگوں کے دلوں سے بالکل نکل چکا ہوا ہے۔ اس عہد کی بڑی خصوصیت یہ ہے کہ وہ روحانی بیماریاں جو پہلے نبیوں کے وقت میں محدود الاثر تھیں آج وہی بیماریاں وسیع پیمانے پر ہر طرف پھیل رہی ہیں۔ پہلے جہاں ایک قوم انفرادی طور پر مثلاً تجارت میں خیانت کے طریقے برتتی تھی، اور اپنے غریب ہمسایوں کی محنت سے خود بیش از بیش فائدہ اٹھانے کی کوشش کرتی تھی، تو اب قوموں کی قومیں اور ملکوں کے ملک اس جذبۂ خبیثہ سے متاثر ہیں۔ اور جہاں پہلے چند افراد فلسفہ اور عقل سے اندھے ہو جاتے تھے، اب ہر ملک و قوم میں بے شمار ایسے لوگ پیدا ہو گئے ہیں جو اس مرض میں گرفتار ہیں۔ آج کمیت اور کیفیت دونوں کے لحاظ سے ہوا و ہوس کا زہر مشرق سے مغرب اور شمال سے جنوب تک ساری فضا میں پھیل گیا ہے۔ اس سے بھی بڑھ کر لوگوں کی ایک کثیر تعداد یک زبان ہو کر بول اٹھی ہے کہ لَنْ یَّبْعَثَ اللّٰہُ اَحَدًا اب خدا کسی کو مبعوث نہیں کرے گا۔ یہی بیماری سب بیماریوں کی جڑ ہے۔ لوگ دُنیا میں ایسے محو ہو گئے ہیں کہ تمام اخلاقی قدریں ان کی نگاہ سے اوجھل ہو گئی ہیں۔ بازاروں میں پھرئیے۔ مساجد میں جائیے۔ مندروں، کلیساؤں، کچہریوں میں جستجو کیجیے، کسی پیشہ، کسی کاروبار پر نگاہ دوڑائیے کذب طرازی اور حرص و ہوا ہی کی کارفرمائیاں نظر آئیں گی۔ پھر ہر طرف نسل، وطن اور تجارت کے فلک بوس بت نصب ہو گئے ہیں۔ جن کے گرد تمام انفرادی اور اجتماعی مفاد گھوم رہے ہیں۔ مذاہب ان باتوں کی تفصیل تحصیلِ حاصل ہے۔ ہندوؤں میں رام اور کرشن کی صحیح تعلیم پر گمراہ فلسفہ

کی رنگ آمیزی ایک طرف اور دوسری طرف جہالت کی سیاہی مسلط ہوچکی ہے۔
جو پیغام جناب مسیح علیہ السلام۔ زردشت علیہ السلام۔ کنفیوشس علیہ السلام نے دیا تھا
اور جو تعلیم قرآن پاک نے پیش کی تھی وہ کیا عقائد اور کیا اعمال کے لحاظ سے سرتاپا مسخ
ہوکر رہ گئی ہے۔ اور سوائے قرآن کریم کے تمام آسمانی صحیفے جو ایران چین ہند کنعان اور
مصر میں نازل ہوئے تھے ان میں ایسی تحریفیں کردی گئی ہیں کہ اصل تعلیم کی صورت پہچاننا
محال ہوگیا ہے۔ قرآن کریم کو آسمانی کتاب ماننے والے بھی صرف زبانی جمع خرچ تو بڑھ چڑھ کر
کریں گے مگر اعمال کے رو سے دوسروں سے بھی کہیں پیچھے رہ گئے ہیں۔ تمام دنیا ایک ہی
الحادی رنگ میں رنگین ہوچکی ہے۔ نوبت یہاں تک پہنچ چکی ہے کہ ہر قوم کے حساس
لوگ اپنے اپنے موعود کو بلا رہے ہیں۔ ان کو یقین ہوچکا ہے کہ یہی وقت ایسی ہستی کے
ظہور کا ہے جو ان کو نکبت سے آکر نکالے گی۔ اس کے سوا اور کوئی چارۂ کار نظر نہیں آتا۔
ہندو کہتا ہے "کنھیا جلد آ بھارت کو آج ہی تیری ضرورت ہے" مسیحی کہتا ہے "اے یسوع
مسیح جلد آسمان سے اُتر آ دنیا تیرا انتظار کر رہی ہے" مسلمان بھی مہدئ مسعود اور مسیح موعود
کی آس لگائے بیٹھا ہے۔

موعودِ کُل ادیان ایک ہی ہے

سوال یہ ہے کہ اگر یہ سب جُدا جُدا موعود اسی ایک زمانے میں آجائیں تو دنیا کی کیا حالت ہوگی۔ ایک
طرف کرشن سب کو ہندو بنانے پر تُلا ہوگا تو دوسری طرف مہدی اور عیسٰے کسرِ صلیب اور
قتل خنزیر میں منہمک ہوگا۔ اور تیسری جانب یسوع مسیح آسمان سے نازل ہوکر مسیحیوں
کے لئے آسمانی بادشاہت قائم کر رہا ہوگا۔ عجیب قسم کا فساد ہوگا۔ اگر اللہ تعالےٰ ایک ہے
اور اس کی تعلیم بھی ایک ہے تو محال ہے کہ ایک ہی وقت میں مختلف الخیال موعود دنیا
میں اکٹھے آجائیں۔ اس طرح تو ہر ایک موعود کا مشن آپ ہی اپنی تردید بن جائیگا۔ مسلمانوں
کا عیسیٰ اگر صلیب توڑنا چاہے گا تو عیسائیوں کا یسوع اس کو کب ایسا کرنے دے گا۔

علیٰ ہذالقیاس کرشن گوپال گائے کی حفاظت کرے گا تو مہدی اور عیسےٰ ضرور اس سے برسر پیکار ہوں گے۔ عجیب قیامت برپا ہوگی' اور بجائے امن کے ابتری پھیل جائے گی۔ ایک لمحہ فکریہ کی ضرورت ہے۔ سوچئے اس سے کیا یہ صاف عیاں نہیں ہوتا کہ اصل میں تمام گزشتہ انبیاءؑ نے جو اپنے اپنے ملک اور اپنی اپنی قوم کو ایک موعود کی خبر دی ہوئی ہے۔ اور جو نشان اس کے بتائے ہوئے ہیں وہ ایک وقت میں تب ہی پورے ہوسکتے ہیں کہ آنیوالا ایک ہی ہو جس کا مشترکہ نام الامام المہدی ہے۔ وہی ہندوؤں کا نہہ کلنک اوتار، عیسائیوں کا یسوع مسیح اور مسلمانوں کا مہدی یا عیسےٰ ہے سکھوں کا جیٹھا، یہودیوں کا عہد کا نبی' زردشتیوں کا فارسی الاصل نبی' بدھوں کا میتریہ وغیرہ وغیرہ۔ اگر آج ہی سب آنیوالوں کے آنے کا وقت ہے تو ضرور وہ ایک ہی ہے۔ اور یہی وقت اس کے آنے کا ہے۔ زمین و آسمان کے مرکز سے یہ آواز اٹھ رہی ہے۔ انسان کی فطرت کی یہی پکار ہے۔ اس سے یہی ثابت ہوتا ہے کہ تمام ادیان کا موعود واحد ہے کیونکہ سب نبی ایک ہی خدا کی طرف سے علم پاکر اس کی خبر دیتے رہے ہیں۔ ان مشترکہ بیماریوں کا جو سب ادیان کے لوگوں کو لاحق ہوگئی ہیں علاج بھی ایک ہی ہے۔ اور ایک ہی ہے جو علاج کرنے والا ہے۔ اس موعود کا یہ بھی کام ہے کہ وہ دنیا پر ثابت کرے کہ تمام گذشتہ انبیاءؑ ایک ہی خدا کی طرف سے پیغام لائے تھے۔ خواہ وہ کسی قوم یا کسی ملک میں پیدا ہوئے ہوں ان کا پیغام ایک ہی تھا۔ وہ ایک ہی آفتاب ہے جو اپنی شعاعیں مختلف اوقات میں مختلف اقوام پر بھیجتا ہے۔ اور جو آخر کار قرآن کی صورت میں ہمیشہ کے لئے نصف النہار پر چمک رہا ہے۔

موعودِ کل ادیان صرف اسلام کا پیغام کیوں پیش کریگا

بعض لوگ شائد یہ اعتراض کریں کہ امام موعود صرف اسلام کا پیغام ہی کیوں دیگا؟ کیا وجہ ہے کہ وہ صرف قرآن کریم ہی کو دنیا کے سامنے پیش کرے گا، اور

وید مقدس، انجیل مقدس اور دوسری کتابوں کو کیوں نہ پیش کرے گا ؟ اس کا جواب اجمالاً پہلے آچکا ہے۔ مگر بیان ذرا وضاحت سے پھر بیان کر دیتے ہیں۔

ہم نے ابھی ابھی یہ لکھا ہے کہ قرآن کریم میں تمام گذشتہ صحیح اسلامی تعلیم جمع کر دی گئی ہے۔ زمانہ ایسا آگیا تھا کہ ایسا کیا جاتا۔ ذرا گذشتہ صدیوں پر نظر ڈال کر دیکھیں۔ قرآن کریم کے آنے کے بعد تمام کرۂ ارض ایک واحد خاندان بن گیا ہے۔ آمد و رفت کے ذرائع اس قدر وسیع ہو گئے ہیں کہ اب بڑے بڑے ملک ایک بڑے شہر کے محلے معلوم ہوتے ہیں۔ پھر پریس وغیرہ کی ایجاد سے قرآن کریم میں تحریف کا امکان بالکل نہیں رہا۔ لیکن اس کے خلاف پہلی ایک بھی آسمانی کتاب اپنی اصلی صورت میں نہیں مل سکتی۔ خود ان کتابوں کے معتقدین کو بھی اس امر کا کھلا اعتراف ہے۔ قرآن کریم کے سوا ایک بھی آسمانی کتاب ایسی نہیں ہے جس کے متعلق یقینی طور پر کہا جا سکے کہ یہ وہی کتاب ہے جو پہلے پہل اُس کے نبی پر نازل ہوئی تھی۔ یہ ایک لمبی بحث ہے اس مختصر مضمون میں اس کی گنجائش نہیں۔ اس لئے امام موعود کا ایک عظیم الشان کام یہ بھی ہے کہ وہ یہ ثابت کرے کہ صرف قرآن کریم ہی ایک ایسی جامع کتاب ہے جس میں تمام پہلی کتابیں شامل ہیں۔ اور آئندہ کے لئے بھی تا قیامت دُنیا کو روحانیات میں رہنمائی کی جس قدر ضرورت ہو گی وہ قرآن کریم میں موجود ہے۔ وہ موعود تمام دُنیا کو چیلنج دے گا کہ لے آؤ اپنی اپنی کتابیں اور اُن کو قرآن کریم کے سامنے پیش کرو، تم کو خود بخود معلوم ہو جائے گا کہ یہی کتاب اب مکمل ہدایت کی کتاب ہے۔ یہی اللہ تعالےٰ کے پیغام کا آخری ایڈیشن ہے۔ پھر وہ دہریوں کو جو کسی نبی یا کتاب کے قائل نہیں دعوت دے گا کہ لے آؤ اپنا تمام فلسفہ اور سائنس کا پلندہ قرآن کریم کے سامنے اس کا کچھ بھی وقار نہیں ہو گا۔ وہ کہیگا واقعی تم نے مٹی۔ ہوا۔ پانی اور آگ کو رام کر لیا ہے، اور زمین کے دبے ہوئے خزانے نکال لئے ہیں، تم آسمانوں پر اُڑنے لگے ہو، مگر جب تک اپنے مرکز یعنی رُوح کو

ٹھیک نہیں کروگے یہ سب ترقیاں بجائے مفید ہونے کے تمہارے لئے ہلاکت کا باعث ہوں گی۔ وہ اِن سائنس اور فلسفہ کے متوالوں کو خدائے واحد کی طرف زور شور سے دعوت دے گا۔ وہ یہ نہیں کہے گا کہ یہ ترقیاں کرنا چھوڑ دو۔ مگر وہ یہ ضرور کہیگا کہ اِن ترقیوں کے پیچھے اتنا نہ پڑو، کہ خدا کو بھول جاؤ۔ تا ایسا نہ ہو کہ بجائے مفید ہونیکے یہی ترقیاں تمھاری ہلاکت کا سامان بن جائیں۔ یہی نہیں بلکہ وہ تمام مذاہب کے روحانی پیشواؤں۔ پیروں۔ راہبوں۔ سادھوؤں اور لیڈروں کو بلائے گا اور کہے گا اگر تمھارے دین زندہ ہیں، اگر تم کو اللہ تعالےٰ کی تائید حاصل ہے، تو آؤ میرے مقابلہ میں روحانی نشانات دکھاؤ۔ وہ قرآن کریم کے مخفی خزانوں کو کھول دے گا۔ وہ اسلام کو از سرِنو قایم کردے گا۔ وہ خلافتِ رسول اللہؐ کو از سرِنو منہاجِ نبوت پر کھڑا کرے گا۔ اُس کے آنے پر پہلی خلافت جو بادشاہی کے ہاتھوں میں آکر مدّت سے دم توڑ رہی ہوگی آخری سانس لے گی، اور جاں بحق ہوگی۔ کیونکہ نئی عمارت اُٹھانے کے لئے ضروری ہے کہ پُرانے کھنڈروں کو بُنیاد سے اُکھاڑ کر صاف کر دیا جائے۔ اور پُرانے ملبہ کو ہٹا کر نئے سامان اور نئے مصالحہ سے عمارت کو قایم کیا جائے۔ اس لئے وہ موعود ضرور ہے کہ خدا کا مامور نبی ہو۔ پہلی خلافت کو بھی اللہ تعالےٰ ہی نے نبی کے ذریعہ منہاجِ نبوت پر قایم کیا تھا، اور اب اسلام کی نشاۃ ثانیہ کی خلافت کو بھی منہاجِ نبوت پر اللہ تعالےٰ ہی ایک نبی کے ذریعہ جو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے فیض سے مقامِ نبوت پر کھڑا ہوگا قایم کرے گا۔ وہ اس اسلام کے محل کو جو آدمؑ۔ نوحؑ۔ کرشنؑ۔ بدھؑ موسٰیؑ اور عیسٰی علیہم السلام اور محمد صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے تیار کیا تھا پھر ایک مضبوط چٹان پر ہمیشہ کے لئے کھڑا کر دے گا، جہاں سے خورشید ازلی اپنی نور پاش شعاعیں تمام دُنیا میں پھیلائے گا۔ وہ کوئی خون آشام شمشیریں لے کر نہیں نکلے گا، نہ وہ بڑے بڑے اسلحہ خانے بنائے گا۔ نہ اس کے جلَو میں توپ خانے اور بمبار جہاز

ہوں گے۔ وہ کوئی ایسا ہلاکت کا سامان لے کر نہیں آئے گا، جن پر صرف ائمۂ کفر ہی کو ناز ہو سکتا ہے۔

نبوت یا سیاسی اغراض کا ذریعۂ حصول ؟

یہاں آخر میں ہم مودودی صاحب کی کتاب "تجدید و احیائے دین" سے ایک اور اقتباس درج کرتے ہیں جس کے مطالعہ سے معلوم ہوگا، کہ خدائی نبوت کو کس طرح اپنی سیاسی اغراض کا ذریعۂ حصول بنایا جا رہا ہے۔ وھو ھٰذا۔

"پس دنیا میں انبیاء علیہم السلام کے مشن کا منتہائے مقصود یہ رہا ہے کہ حکومتِ الٰہیہ قائم کر کے اس پورے نظامِ زندگی کو نافذ کریں جو وہ خدا کی طرف سے لائے تھے۔ وہ اہلِ جاہلیت کو یہ حق دینے کے لئے تیار تھے، کہ اپنے جاہلی اعتقادات پر قائم رہیں اور جس حد کے اندر ان کے عمل کا اثر انہی کی ذات تک محدود رہتا ہے اس میں اپنے جاہلی طریقوں پر بھی چلتے رہیں، مگر وہ انہیں یہ حق دینے کیلئے تیار نہ تھے، اور فطرۃً نہ دے سکتے تھے، کہ اقتدار کی کنجیاں اُن کے ہاتھ میں رہیں اور وہ انسانی زندگی کے معاملات کو جاہلیت کے قوانین پر چلائیں۔ اس وجہ سے تمام انبیاء نے سیاسی انقلاب برپا کرنے کی کوشش کی۔ بعض کی مساعی صرف زمین تیار کرنے کی حد تک رہیں جیسے حضرت ابراہیمؑ، بعض نے انقلابی تحریک عملاً شروع کر دی مگر حکومتِ الٰہیہ قائم ہونے سے پہلے ہی اُن کا کام ختم ہو گیا جیسے حضرت مسیحؑ، اور بعض نے اس تحریک کو کامیابی کی منزل تک پہنچا دیا جیسے حضرت موسیٰؑ اور سیدنا محمد صلے اللہ علیہ وسلم۔"

اگرچہ یہ تو درست ہے، کہ انبیاء علیہم السلام اس پورے نظامِ زندگی کو نافذ کرنا جو وہ خدا طرف سے لاتے ہیں، اپنا اوّلین فرض سمجھتے ہیں لیکن اس کا یہ مطلب سمجھنا کہ اُن کا منتہائے مقصود ہی یہ ہوتا ہے کہ وہ سیاست کو اپنے ہاتھ میں لے لیں، نہایت درجہ غلط ہے۔

انبیاء علیہم السلام کی تمام مساعی کو اس طرح سیاست کی دیوی کی بھینٹ چڑھا دینا ظاہر کرتا ہے کہ ان لوگوں کو اس نظام زندگی کی جس کو نبی خدا کی طرف سے لاتے ہیں کوئی ضرورت نہیں، بلکہ وہ صرف سیاسی اقتدار پر قبضہ جمانے کے لئے بے قرار ہیں۔ ذہنی اور اخلاقی انقلاب کے ساتھ ساتھ سیاسی انقلاب کا ظہور میں آنا انبیاء کے کام اور کوشش کا نتیجہ تو ہو سکتا ہے۔ مگر یہ کہنا کہ ان کے مشن کا منتہائے مقصود ہی سیاسی اقتدار کی کنجیاں اپنے ہاتھ میں لینا ہے مسلم حاضر کو گمراہی کی طرف لے جانے والا ہے۔ اس وقت چونکہ سیاسیات کا زور ہے، اس لئے ہر کس و ناکس جو لیڈری کرنا چاہتا ہے، سمجھتا ہے کہ مسلمانوں کی صحیح رہنمائی یہی ہے کہ اُن کی تمام تر توجہ سیاسیات کی طرف جھکا دی جائے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ قرآن کریم میں حکومت کے بہترین اصول بیان ہوئے ہیں اور اس میں بھی کوئی شبہ نہیں کہ ان اصول پر حکومت قائم کرنے کے لئے حکومت کی باگ ڈور اپنے ہاتھ میں لینا بھی انبیاء کا مقصد ہوتا ہے۔ ہم یہ نہیں کہتے کہ انبیاءؑ نے سیاسی انقلاب بپا کرنے کی کوشش نہیں کی، اور نہ ہم یہ کہتے ہیں کہ سیاسی انقلاب بپا کرنا اور اقتدار کی کنجیاں اپنے ہاتھ میں لینا انبیاءؑ کے لئے ممنوع ہے، مگر ہم یہ ضرور کہیں گے کہ انبیاءؑ کا منتہائے مقصود یہ کبھی نہیں رہا کہ وہ صرف سیاست پر قبضہ کریں، بلکہ ان کا منتہائے مقصود انسان کی تمام عملی زندگی کو ایک خاص معیار کے مطابق بلند کرنا ہوتا ہے، خواہ وہ عملی زندگی حکومت کے کاروبار میں ہو، یا بازار کی خرید و فروخت میں۔ انبیاءؑ نیچے سے کام شروع کرتے ہیں، شروع ہی میں وہ سیاست پر ہاتھ نہیں مارا کرتے۔ وہ پہلے لوگوں کا کیریکٹر بناتے ہیں، ایسا کیریکٹر جو دُنیا کے ہر کاروبار میں خدا کی بادشاہت

قائم کردے۔ مندرجہ بالا اقتباس اس لحاظ سے سخت گمراہ کن ہے کہ وہ سیاست کو جو انسان کی عملی زندگی کا صرف ایک پہلو ہے انبیاءؑ کا منتہائے مقصود قرار دیتا ہے۔

اخلاقی انقلاب کے بغیر سیاسی انقلاب ناممکن ہے

اس ضمن میں خود مودودی صاحب کے مندرجہ ذیل الفاظ قابلِ غور ہیں۔ آپ حضرت سید احمد صاحب بریلوی علیہ الرحمۃ کی ناکامی کا دوسرا سبب یہ بیان فرماتے ہیں:۔

"اس علاقہ (سرحد) میں سیاسی انقلاب برپا کرنے کے لئے ضروری تھا، کہ خود اس علاقہ ہی کی آبادی میں پہلے اخلاقی وذہنی انقلاب برپا کر دیا جاتا۔ تاکہ مقامی لوگ اسلامی نظامِ حکومت کو سمجھنے اور اس کے انصار بننے کے قابل ہو جاتے۔ دونوں لیڈر (سید صاحبؒ اور شاہ اسمٰعیل صاحبؒ۔ ناقل) غالباً اس غلط فہمی میں مبتلا ہو گئے کہ سرحد کے لوگ چونکہ مسلمان ہیں، اور غیر مسلم اقتدار کے ستائے ہوئے بھی ہیں، اس لئے وہ اسلامی حکومت کا خیر مقدم کریں گے۔ اسی وجہ سے انہوں نے جاتے ہی وہاں جہاد شروع کر دیا، اور جتنا ملک قابو میں آیا، اس پر اسلامی خلافت قائم کر دی۔ لیکن بالآخر تجربہ سے ثابت ہو گیا کہ نام کے مسلمانوں کو اصلی مسلمان سمجھنا اور اُن سے وہ توقعات رکھنا جو اصلی مسلمانوں ہی سے پوری ہو سکتی ہیں، محض ایک دھوکا تھا۔ وہ لوگ خلافت کا بوجھ سہارنے کی طاقت نہ رکھتے تھے۔ جب ان پر یہ بوجھ رکھا گیا، تو خود بھی گرے، اور اس پاکیزہ عمارت کو بھی لے گرے۔"

اس اقتباس کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ خود مودودی صاحب بھی

اِس صداقت کے قایٔل ہیں کہ جب تک ذہنی اور اخلاقی انقلاب کسی گروہ میں پہلے پیدا نہ ہو۔ سیاسی انقلاب برپا نہیں کیا جا سکتا۔ اور اگر کچھ عرصہ کے لئے انقلاب ہوتا بھی ہے تو اس کا اثر دیر پا نہیں ہوتا۔ حقیقی انقلاب ذہنی اور اخلاقی انقلاب ہی ہوتا ہے۔ سیاسی انقلاب تو محض اس انقلاب کا ایک پھل یا نتیجہ ہوتا ہے۔ اس لئے انبیاء علیہم السلام کا اصل کام یعنی منتہائے مقصود ذہنی اور اخلاقی انقلاب برپا کرنا ہی ہوتا ہے۔ کیونکہ جس گروہ یا قوم میں ذہنی یا اخلاقی انقلاب کمال کو پہنچ جاتا ہے، ناممکن ہے کہ سیاسی انقلاب خود بخود رونما نہ ہو۔ لیکن افسوس ہے کہ مودودی صاحب سیاسی انقلاب کے اتنے والہ و شیدا ہیں۔ کہ جہاں انبیاء علیہم السلام کے کام کا ذکر ہے، وہاں اس حقیقت کو بالکل نظر انداز کر گئے ہیں۔ انگریزی مشہور مثل کے مطابق یہ بات گاڑی کو گھوڑے کے آگے جوتنے کے مترادف ہے۔ جو غلطی مودودی صاحب کی رائے میں سید صاحبؒ اور شاہ صاحبؒ نے عملاً کھائی تھی، کہ ذہنی اور اخلاقی انقلاب پیدا کرنے سے پہلے سیاسی انقلاب اُٹھانے پر تُل گئے تھے، اور بالآخر بقول اُن کے اسی غلطی کی وجہ سے اُن کو ناکامی کا مُنہ دیکھنا پڑا، وہی غلطی خود مودودی صاحب قولاً کر رہے ہیں۔ سید صاحبؒ اور شاہ صاحبؒ کے وقت تو پھر بھی مسلمانوں میں کسی قدر مُسلمانی باقی تھی، اور جاہلی اقتدار بھی کوئی اتنا مضبوط نہ تھا، مگر آج جب کہ بالکل ہی مُسلمانی در کتاب و مسلمان در گور والا معاملہ ہے، اور جاہلی اقتدار اُس وقت کی نسبت ہزاروں نہیں بلکہ لاکھوں گُنا زیادہ مضبوط ہے، مسلمانوں کیسامنے انبیاء علیہم السلام اور پھر امام موعود کو سیاسی اندازوں اور قدروں میں پیش کرنا مسلمانوں کے ذہنوں کو پراگندہ کرنا نہیں تو اور کیا ہے۔ یہ تو ایسا ہی ہے کہ ایک دِق کا مریض جس کو چارپائی سے ہلنا بھی دوبھر ہے، اُسے اُبھارنے کیلئے

کہا جائے کہ انسان کا کام ہے کہ کوہ ہمالیہ کی چوٹی پر دَوڑتا ہوُا چڑھ جائے، اور پھر دم لیئے بغیر دَوڑتا ہوُا اُتر آئے۔ ظاہر ہے کہ مریض اپنے طبیب سے یہ لن ترانیاں سُن کر ہی دم توڑ دے گا۔ حالت تو یہ ہے کہ وہ ممالک جو بظاہر اسلامی ممالک کہلاتے ہیں اُن میں بھی رائی کے دانہ کے برابر مُسلمانوں کو سیاسی آزادی نصیب نہیں، اور موجودہ عالمگیر جنگ نے تو ان کا رہا سہا وقار بھی خاک میں ملا دیا ہے، اور ان اسلامی ممالک کا پول بھی کھُل گیا ہے جن پر چند سال ہوئے ہندوستان کے بڑے بڑے مسلمان لیڈر بڑے نازاں تھے۔ آج سارے اسلامی ممالک مل کر جاپان جیسے ایک چھوٹے سے جزیرہ کا بھی مقابلہ نہیں کر سکتے۔ چند بمبار چین سے لے کر طرابلس تک کے مسلمانوں کو محکوم بنانے کے لئے کافی ہیں۔ سید صاحبؒ اور شاہ صاحبؒ اور وہ مخلص اور باعمل علماء کی جماعت جو اُن کے ساتھ تھی اُس زمانے میں جبکہ جاہلی اقتدار اتنا طاقتور نہ تھا جتنا کہ آج ہے اگر کوئی سیاسی انقلاب پیدا نہ کر سکے تو آج محض چند بےعملوں کی نری سیاست سیاست کی پُکار سے کیا ہو سکتا ہے۔

فرض کریں کہ اِس وقت کوئی امام ایسا آبھی جائے جو بڑا ماہر جنگ اور سائینٹفک ایجادات کے خزانے کے خزانے اپنے ساتھ رکھتا ہو، تو بتایا جائے کہ آخر وہ مُسلمان کہاں سے آئیں گے جو اُس کا ساتھ دیں گے۔ اور جو دُنیا میں حکومتِ الٰہیہ قائم کر دیں گے۔ یا تو یہ مانا جائے کہ وہ امام اکیلا ہی سب ائمۂ ضلالت سے نپٹ لے گا، یا پھر یہ مانا جائے کہ وہ کسی خارق عادت طریق سے مسلمانوں کی رگوں میں بجلیاں بھر دے گا۔ لیکن مودودی صاحب خوارق کے تو قائل نہیں جو ایسے موعود میں پائے جائیں، لہٰذا اس کو اکیلے ہی سب کام خود کرنا پڑے گا۔ لیکن اگر وہ حکومتِ الٰہیہ قائم کرنے سے پیشتر ہی کسی لڑائی

میں مارا گیا تو پھر کیا ہوگا؟ اگر کہا جائے کہ کوئی اور خدا کا بندہ اُٹھ کر یہ کام پورا کرے گا، تو پھر امام موعود جس کے متعلق پیشگوئیاں ہیں، وہ پہلا امام ہوگا یا یہ دوسرا؟ ہم تو یہی دُعا کرتے ہیں کہ خدا اِس سیاست کے مرض سے مسلمانوں کے لیڈروں کو صحت عطا کرے۔ آمین

انبیاءؑ کا طریقِ کار

آخری اقتباس سے معلوم ہوتا ہے کہ مودودی صاحب بھی اِس بات کو اچھی طرح سمجھتے ہیں کہ وہ عظیم الشّان کام جس کے لئے انبیاءؑ علیہم السلام مبعوث ہوتے ہیں یہی ہوتا ہے، کہ وہ ذہنی اور اخلاقی انقلاب پیدا کریں۔ مگر اِس ظالم سیاست نے آپ کو کچھ ایسا اندھا کر دیا ہے کہ اچھی طرح جانتے ہوئے بھی جب کہنے پر آتے ہیں، تو انبیاءؑ علیہم السلام کو بھی نعوذ باللہ ائمۂ ضلالت کا سا سیاسی لیڈر بنا دیتے ہیں۔ نبی تو ہمیشہ یہی کوشش کرتا ہے کہ جہاں تک ممکن ہو دُنیا میں امن کو قائم رکھتے ہوئے لوگوں کی قلبِ ہیئت کر دی جائے۔ وہ فساد اور فساد کے طریقوں سے گریز کرتا ہے۔ اور جب تک وہ خود اور اُس کی جماعت اپنی جان کے خطرہ میں نہیں پڑ جاتے، وہ کوئی سیاسی محاذ قائم نہیں کرتا۔ وہ آگ میں جل جانا اور صلیب پر چڑھ جانا قبول کرتا ہے، وہ گالیاں اور ٹھٹھے سُنتا ہے، پتھر کھاتا اور طرح طرح کی اذیتیں سہتا ہے حتّٰی کہ اپنی جماعت کے مخلص افراد کو ذبح ہوتے دیکھتا ہے، مگر مُلک کے نظام کو حتّی الوسع درہم برہم نہیں ہونے دیتا۔ خود سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی حیاتِ طیبہ میں ہم کو سینکڑوں مثالیں ایسی ملتی ہیں کہ باوجودیکہ آپؐ نے حق کہنے سے کبھی گریز نہیں کیا آپؐ نے مُلکی امن کے لئے ظاہری مصالح کو بھی قربان کرنے میں ذرا ہچکچاہٹ نہیں دکھائی۔ صُلح حدیبیہ کا واقعہ

کس قدر عبرت انگیز ہے۔ آپؐ اللہ تعالےٰ کی بشارت پر عمرہ ادا کرنے کیلئے مکہ کو جا رہے ہوتے ہیں۔ پندرہ سو تلواریں میانوں میں تلملا رہی ہیں۔ مگر حضورؐ صرف امن کی خاطر ایسی شرائط پر صلح کر لیتے ہیں، جو جاں نثار صحابہؓ کو بھی حیرت میں ڈال دیتی ہیں۔ وہ صحابہؓ جن کی تلواروں کا لوہا قریش جنگِ بدر اور اُحد میں آزما چکے تھے۔ شرائط ضبطِ تحریر میں آنے سے پہلے حضرت ابو جندل رضی اللہ عنہ پا بہ زنجیر مسلمانوں کے آگے اپنی حالتِ زار کی اپیل کرتے ہیں مگر حضرت رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اُن کو مکّہ میں واپس بھیج دیتے ہیں کہ قریش کے ظلم و ستم کو صبر سے برداشت کریں۔ اللہ! اللہ!! اس سے بڑھ کر امن کو قائم رکھنے کے لئے سعی کی مثال تاریخ میں کہاں ملتی ہے؟ مگر شاید آج کل کے مسلمان رسول پاکؐ اور صحابہؓ سے زیادہ اسلامی سیاست کو سمجھتے ہیں کہ خواہ مُلک میں فساد اور فتنہ پھیلے اُن کے نزدیک سیاسی اقتدار حاصل کرنا انبیاءؑ کا مُنتہائے مقصود ہے۔

پھر رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کو مکّہ میں عرب کی بادشاہی پیش کی جاتی ہے۔ اگر آپؐ سیاسی چالوں کو پرِکاہ کے برابر بھی سمجھتے، تو آپؐ اس کو قبول فرما لیتے، اور طاقت اور اقتدار حاصل کر کے اپنا پُورا نظامِ زندگی لوگوں میں رائج کر دیتے۔ مگر آپؐ نے اِس بادشاہت کو قبول نہ فرمایا۔ مودودی صاحب کے نزدیک شائد یہ بھی نعوذ باللہ سیاسی غلطی ہوگی۔

قوم کی غلط رہنمائی

ظاہر ہے کہ نبوّت کی سیاسی تعریف کر کے موجودہ بے ہُنر مسلمان کو غلط راستہ کی طرف رہنمائی کی جا رہی ہے۔ اور اس مُسلمان کو جس کی ذہنی اور اخلاقی حالت صِفر کے برابر ہے سیاست کے طلسمات میں اُلجھانے کے لئے نبوّت کو ایسی صورت میں پیش کیا جا رہا ہے کہ مسلمان اپنی ذہنی اور اخلاقی پستی کو رفع کرنے کی طرف مائل ہی نہ ہو سکیں۔

کتنا غضب ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام جیسے اولوالعزم پیغمبر کی تمام مساعی توزمین تیار کرنے میں خرچ ہو جائیں اور حضرت عیسٰے علیہ السلام کی انقلابی تحریک عملی جامہ پہن کر بھی حکومتِ الٰہیہ قائم کرنے میں ناکام رہے۔ مگر آجکل کا مسلمان باوجود اپنی نہایت بے ہنری کے یہ چاہتا ہے کہ ایک غیر شعوری اور امر تکوینی سے کھڑا ہونے والا امام اس کی تمام بیماریوں کو نظرانداز کرتا ہوا اُس کے لئے ایسی حکومت قائم کردے جو منہاج نبوت پر ہو۔ اِس سے بڑھ کر موجودہ مسلمان کیساتھ اور کیا دشمنی ہوسکتی ہے کہ وہ بیچارہ توسا گودانہ اور کھچڑی بھی ہضم نہیں کرسکتا مگر اس کو پلاؤ اور متنجن کی دعوت دی جارہی ہے۔ جو لوگ صرف مسلمانوں کی سیاسی حالت کو بہتر بنانا چاہتے ہیں اور اسلام کو درمیان میں نہیں لاتے اُن سے ہم کو کوئی تعرض نہیں ہے۔ وہ اپنی بساط کے مطابق ٹھیک کر رہے ہیں جو اُن کے اصول ہیں وہ دنیاوی نقطۂ نظر سے ہیں، دینی نقطۂ نظر سے نہیں ہیں۔ وہ کسی حد تک کامیابی کا منہ دیکھ سکتے ہیں۔ مگر جو لوگ اسلام کی ترقی دیکھنا چاہتے ہیں، اُن کو یاد رکھنا چاہئیے کہ موجودہ مسلمان جبتک ذہنی اور اخلاقی بنیادوں پر اپنے آپکو محکم نہ کرلیگا سیاسیات کے رنگین تخیلات اُس کے لئے زہر قاتل کا حکم رکھتے ہیں۔ اور اُس کو ایسے امام موعود کا تصور دلانا جو اُس کے لئے سیاسی اقتدار بیٹھے بٹھائے کہیں سے لادے، اسے بِن آئی موت مارنے کا موجب ہوگا۔

نبی کا کام قرآن مجید میں

نبی کے کام کو اللہ تعالےٰ نے قرآن کریم میں کئی جگہ بیان فرمایا ہے۔ یہاں صرف ایک آیت کریمہ پیش کی جاتی ہے۔

اللہ تعالےٰ فرماتا ہے:۔

كَمَآ اَرْسَلْنَا فِيْكُمْ رَسُوْلًا مِّنْكُمْ يَتْلُوْا عَلَيْكُمْ اٰيٰتِنَا وَيُزَكِّيْكُمْ وَ	جیسا کہ ہم نے تم میں تمہیں میں سے رسول بھیجا ہے جو ہماری آیات پڑھکر تم کو سُناتا ہے اور تم کو پاک کرتا ہے اور

قرآن مجید مترجم

مع حواشی تفسیریہ

جس کا ترجمہ

حضرت علامہ میر محمد اسحٰق صاحب نے کیا

طرز کتابت یسرنا القرآن

ملنے کا پتہ

مکتبہ احمدیہ قادیان

رجسٹرڈ [illegible]

حمائل شریف مترجم

جس کا ترجمہ

حضرت حافظ روشن علی صاحبؓ

و

حضرت علامہ میر محمد اسحٰق صاحبؓ

نے کیا

ملنے کا پتہ

مکتبہ احمدیہ [illegible]

[illegible]